Marfat.com

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ



Marfat.com

Marfat.com

تاریخ ادبِ اُردو

۱۷۰۰ء تک

جلد اوّل

از

پروفیسر سیّدہ جعفر ——— پروفیسر گیان چند جین

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔۱، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 6179657, 6103381, 6103938

Marfat.com

Tareekh Adab-e-Urdu (Vol. I)

By : Prof. **Syeda Jafer, Prof.** Gian Chand Jain

138850

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت: جولائی، ستمبر 1998ء شک 1920ء

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت ₹/170

سلسلۂ مطبوعات : 806

ناشر : ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔I، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

Marfat.com

دیباچہ

زبان کا تعلق علاقے سے ہوتا ہے۔ یہ علاقہ پھیل بھی سکتا ہے، سمٹ بھی سکتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایک زبان بولنے والے بڑی تعداد میں ہجرت کر کے نئے علاقے میں جاتے ہیں، تو ان کی زبان وہاں بھی پھلتی پھولتی ہے۔ زبان کی ذیلی بولیاں ہوتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یوں بھی ہوتا ہے بولی ارتقا کی منزلیں طے کر کے زبان کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ اردو کے سلسلے میں تو یہ بھی ہوا ہے کہ دو کھڑی بولیاں (کھڑی اور ہریانوی) اور تین پڑی بولیاں (برج، بندیلی اور قنوجی) کے ارتقا کا سنگم وہ زبان ہے، جو مختلف عہدوں میں مختلف ناموں سے موسوم ہوئی، اور ان ناموں میں ہندی اور ہندوستانی یا زبانِ ہندوستان بھی ہیں اور آج اسے اردو کہتے ہیں۔

بعض دریاؤں کے منبعے کئی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر دریائے جہلم کا سرچشمہ ویری ناگ مشہور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کُلر ناگ، جھیل، مارسل، تارسل۔ اور بھی کئی چشمے ہیں جن کے پانی سے پہاڑی نالے بنتے ہیں اور سب کا پانی جہلم میں جاتا ہے۔ اس طرح اردو کے سرچشمے بھی کئی بولیوں میں ہیں۔ دکنی کی انفرادی حیثیت بھی ہے اور محی الدین قادری زورؔ کے مرتبے کے عالمِ زبان، دکنی کو اردو کی بنیاد سمجھتے ہیں اور محمود خاں شیرانی جیسے بحر العلوم پنجابی کو اردو کی اصل بتاتے ہیں۔

Marfat.com

اردو کتنی بولیوں کی نکھری ہوئی شکل ہے یا اردو کے دائرے میں کتنی بولیاں ہیں، یہ بھی ایک اہم موضوع ہے، لیکن اس سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ آریہ قبائل جو زبان بولتے ہوئے برِ صغیر میں آئے تھے، اور جس میں وید مقدس ہیں، اسی کی ادبی شکل سنسکرت کہلائی اور سنسکرت کی اہم پراکرتیں ملک کے مختلف حصوں میں نمو پزیر ہوئیں۔ موجودہ انبالہ سے موجودہ الہ آباد تک کے علاقے میں سب سے اہم پراکرت پالی کا فروغ ہوا اور یہی ارتقائی مرحلوں سے گزرتی ہوئی ہمیں ورثے کی صورت میں ملی اور یہی عام بول چال کی اردو، ہندی اور ادبی اردو بھی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ زبان ہندوستانی تشخص کی ایک علامت بن گئی اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ قومی کونسل سرگرمی سے اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ اس زبان کا رشتہ اپنی جڑوں سے گہرا ہو اور یہ ہندوستان کے متنوع لسانی منظر نامے میں فروغ پاتی رہے۔

پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر سیدہ جعفر نے آغاز و ارتقا سے ۱۷۰۰ء تک کی تاریخِ اردو ادب خاص توجہ سے لکھی۔ اس موضوع پر حامد حسین قادری کا داستانِ تاریخِ اردو، نصیر الدین ہاشمی کی دکن میں اردو، جمیل جالبی کی تاریخ ادبِ اردو جیسی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پروفیسر جین اور پروفیسر جعفر نے نہ صرف ان کتابوں کے اندراجات پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی ہے، بلکہ دوسرے مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے اور کچھ اہم نکات واضح کیے ہیں۔

یقین ہے کہ اس کتاب سے ایک اہم تعلیمی ضرورت پوری ہو گی۔

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ)

ڈائریکٹر

Marfat.com

فہرست

1 - پیش لفظ		17 - خواجہ مسعود سعد سلمان	373
2 - مقدمہ	9	18 - خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر	374
پہلا باب :- (گیان چند جین)		19 - حضرت مخدوم علاءالدین علی احمد صابر کلیری	383
3 - اُردو زبان کا آغاز وارتقاء	16	20 - شیخ شرف الدین بوعلی قلندر، پانی پتی	〃
4 - قدیم ہند آریائی	16	21 - امیر خسرو	385
5 - وسطی ہند آریائی	17	22 - امیر حسن سجزی	419
6 - جدید ہند آریائی	23	23 - شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری	422
7 - کھڑی بولی	28	24 - مولانا مظفر بلخی	424
8 - ہندوستانی	49	25 - شیخ نورالحق پنڈوی	425
9 - ہندی	53	26 - شیخ امین الدین لکھنوی	〃
10 - اُردو کے مختلف نام اور آغاز کے نظریے	60	27 - مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی	426
11 - دکنی، گجری اور دکنی کا فرق، دکنی کی خصوصیات	95،	28 - شیخ پیارے	427
دوسرا باب :- (سیدہ جعفر)		29 - میراں سید محمد جونپوری	428
12 - دکن میں اُردو کا تاریخی وتہذیبی پس منظر	118	30 - حضرت سید خوندمیر	433
13 - بہمنی سلطنت		31 - شیخ جمال کنبوہ	434
14 - عادل شاہی سلطنت	187	32 - شیخ عبدالقدوس گنگوہی	435
15 - قطب شاہی سلطنت	258	33 - سلطان بابر	437
تیسرا باب :- (گیان چند جین)		34 - ابے چند بھٹناگر	〃
16 - شمالی ہند میں اُردو شاعری ۱۶۰۰ تک	371	35 - شہنشاہ اکبر	441

Marfat.com

36-نوری	443	47 - میرا بائی 457
37-بہرام بخاری سقّا	〃	48 - سورداس مدن موہن 〃
38- شیخ علی متقی محدّث	445	49 - تلسی داس 458
39- ملّا شیری	446	50 - عبدالرحیم خانخاناں 〃
40-بہاء الدین برناوی	449	51 - ٹوڈرمل 〃
41-رامانند	452	52 - پرمانند داس 459
42-کبیر	〃	53 - عالم 〃
43-دھرم داس	455	54 - سوامی پنڈت نرنجن 460
44-گرونانک	〃	55 - جمال 〃
45-بسیکن	456	56 - دادودیال 〃
46-کرشن مشن	〃	57 - شاہ حسین 461

Marfat.com

مقدمہ

کئی سال پہلے کی بات ہے، ترقی اُردو بیورو نئی دلّی نے چار جلدوں میں اردو ادب کی تاریخ تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ پہلی جلد ۱۷۰۰ء تک کا احاطہ کرتی تھی۔ اس کی ذمّے داری مجھ ہیچ مداں پر ڈالی گئی۔ میں نے بیورو کو لکھا کہ ۱۷۰۰ء تک کا اردو ادب زیادہ تر دکن کا ادب ہے۔ میرے حیدرآباد میں ملازمت کرنے کے یہ معنی نہیں کہ میں دکنیات کا ماہر ہوں۔ میرے لیے دوسری قباحت یہ تھی کہ میں اس وقت اقبال کے اردو کلام کی تاریخی تدوین کر رہا تھا۔ ان دونوں مجبوریوں کے پیشِ نظر میں نے تجویز کی کہ یہ کام میرے بجائے ڈاکٹر سیدہ جعفر کو دے دیا جائے۔ بیورو نے مجھے لکھا کہ کام آپ ہی کیجیے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر سے آپ مدد لے سکتے ہیں۔ بیورو کے اصرار کے پیشِ نظر میں نے نیم رضامندی سے لکھا کہ اگر سیدہ جعفر کو میرے ساتھ شریک مصنف کر دیا جائے تو میں یہ ذمّے داری قبول کرتا ہوں۔ بیورو نے میری درخواست قبول کر لی۔ میں نے اقبال کا کام روک کر تاریخ کا کام شروع کر دیا۔

یہ تاریخ ایک طرح سے اردو ادب کے دکنی دَور کی تاریخ ہے۔ اس میں شمالی ہند کے ادب اور ادیبوں کا ذکر خال خال ہی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد کئی جلدوں میں لکھی جانے والی چار تاریخوں کی جلدِ اول میں اسی موضوع کو لیا گیا ہے۔ یہ تاریخیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ تاریخِ ادب اردو جلد اول مرتبہ ڈاکٹر عبدالقیوم۔ ابتدا سے ۱۷۰۰ء کراچی ۱۹۶۱ء کئی جلدوں کا منصوبہ تھا لیکن بقیہ جلدیں شائع نہ ہو سکیں۔ یہ میری نظر سے نہیں گزری۔ اسے مختلف مقالہ نگاروں نے لکھا ہے۔

۲۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول ۱۲۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک، علی گڑھ ۱۹۶۲ء۔ اس

Marfat.com

تاریخ کی بھی بقیہ جلدیں شائع نہ ہوسکیں۔ زیرِ نظر تاریخ کو ہم نے ۱۲۰۰ء سے کچھ بعد میں شروع کیا ہے لیکن آخری حد ۱۷۰۰ء میں ہے۔

۳۔ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، چھٹی جلد۔ اردو ادب (اوّل) ابتدا سے ۱۷۰۰ء تک، لاہور ۱۹۷۱ء۔

۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو جلد اوّل، آغاز سے ۱۷۵۰ء تک، لاہور ۱۹۷۵ء اس میں ولی، داؤد اور سراج تک کو لے لیا گیا ہے۔

ان تاریخوں کے ہوتے ایک مزید تاریخ ادب لکھنے کا کیا جواز ہے؟ واضح ہو کہ ایک بار ادبی تاریخ لکھ دینے کے بعد یہ فریضہ ہمیشہ کے لیے ادا نہیں ہو جاتا۔ ضخیم انگریزی کتاب "امریکی ادب کی تاریخ" کے مختصر مقدمے میں لکھا ہے کہ ہر نسل کو امریکی ادب کی تاریخ لکھنی چاہیے۔ انگریزی کے ایک مضمون نگار روبرٹ اسپلر نے اپنے عالمانہ مضمون، ادبی تاریخ کے آخر میں لکھا ہے

> "ان وجوہ سے کہا گیا ہے کہ ہر قوم اور ہر نسل کو اپنی تاریخ (ادبی اور دوسری) خود لکھنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ ماضی بدل جاتا ہے، یہ نہیں بدلتا، بلکہ انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو اپنے علم، اپنی قوتِ تشریح اور ماضی کے متعلق اپنے فیصلے کو، اپنے حال کو بہتر طریقے پر سمجھنے اور مستقبل کو زیادہ عقل مندی سے تشکیل دینے کے کام میں لاتا ہے۔ ادبی تاریخ کے یہی فوائد ہیں"۔[1]

پھر یہ بھی تو ہے کہ ہر دس پندرہ برس میں اتنا نیا مواد سامنے آجاتا ہے کہ تاریخِ ادب کو نئے سرے سے لکھنا بار آور فعل ہوتا ہے، تحصیلِ حاصل نہیں۔ اہلِ نظر زیرِ نظر تاریخ کو دیکھ کر فیصلہ کریں گے کہ اس نے ماسبق تاریخوں کے مواد اور معلومات میں کچھ اضافہ (معمولی نہیں معتدبہ) کیا ہے یا نہیں؟

بیوروکی فرمائش قبول کرنے کے بعد میں نے تاریخ کا کام شروع کر دیا۔ پہلی منزل اس کا خاکہ

---

1. Robert SPILLER, "Literary History" in The Aims and Method of Scholarship in Modern Language and Literatures, Editor James Thorpe (American Studies Research Centre, Hyderabad, 1974) P. 68.

Marfat.com

بنانے کی تھی، اردو کی ادبی تاریخ، بالخصوص قدیم دور کی تاریخ میں ابواب کی تقسیم کیوں کر کی جائے، دور کی بنا پر، علاقے کی بنا پر یا اصناف کی بنا پر؟ ہندی کے ڈاکٹر وِنے موہن شرما لکھتے ہیں۔

"ادبی تاریخ کے ادوار کی تقسیم ایسا مسئلہ ہے کہ جو کبھی حل نہ ہو سکے گا۔ ادب کی تاریخ ملک کی تاریخ کے ساتھ چلنی چاہیئے۔" [1]

میں نے اس کتاب کا خاکہ بناتے وقت تین ملحوظات: ادوار، علاقہ اور نوعِ ادب کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ دور کا معاملہ مشکل نہ تھا کہ یہ تاریخ محض ۱۷۰۰ء پر ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے محض دو دور بنائے، ایک ابتدا سے ۱۶۰۰ء تک، دوسرا ۱۶۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک یعنی سترھویں صدی عیسوی۔ اردو کی ادبی تاریخ میں ۱۶۰۰ء کوئی سرحد نہیں، محض سہولت کی خاطر یہاں توقف کیا ہے۔ علاقے میں شمالی ہند، گجرات اور دکن کی تقسیم کی گئی۔ دکن کو بھی بیدر و بیجاپور (کرناٹک) اور گولکنڈہ میں بانٹ دیا گیا۔ نثر و نظم کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لیا گیا لیکن اس طرح نہیں جیسے کہ رام بابو سکسینہ نے کیا تھا کہ پہلے نظم کی پوری تاریخ تھی، پھر نثر کی، میں نے دَور، علاقہ اور نثر و نظم کو سمو کر خاکہ تیار کیا۔

خاکہ ۱۳ بابوں پر مشتمل ہے۔ اس میں چھے چھے باب دونوں نے لیے۔ بارھویں باب کا کچھ حصّہ میں نے لکھا، کچھ ڈاکٹر سیدہ نے۔ میں نے اپنا کام مکمل کر کے بیورو کو بھیج دیا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بہت تفصیل سے کام کیا، اس لیے انھوں نے زیادہ وقت لیا۔ میں نے اپنے اوراق دلّی سے واپس منگا کر ان میں کہیں کہیں ترمیم کی۔ اب دونوں مصنفوں کی نگارشات کو سمو کر کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کے بھرے پُرے تعاون و تنخامت دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ تاریخ زیادہ تر اُن کی تصنیف ہے۔ جس میں چند صفحات میں نے بھی لکھ دیے ہیں۔

اجتماعی طور پر تیار کی ہوئی تواریخ ادب پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ مضامین کا مجموعہ ہوتی ہیں، گٹھی ہوئی واحد کتاب نہیں۔ عبرت و عشرت نے مثنوی پدماوت لکھی تھی جس کا مادۂ تاریخ 'تصنیفِ دو شاعر' ہے۔ زیرِ نظر کتاب پر زیادہ سے زیادہ یہی اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ

---

[1] ڈاکٹر وِنے موہن شرما، شودھ پرودھی (نیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء) ص ۱۳۰۔

Marfat.com

یہ دو مصنفوں کی تحریروں کا مجموعہ ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ نگارشات دو لخت نہیں، یہ مل کر ایسی منضبط واحد کتاب بن گئی ہے جس کا ہر باب اپنے ماسبق اور مابعد باب کے ساتھ پیوستہ ہے۔

واضح ہو کہ دونوں اہل قلم اپنے اپنے بہرہ کی تصنیف میں بالکل آزاد رہے ہیں، ایک نے دوسرے کے کام میں دخل نہیں دیا۔ جس مصنف کی تحریر ہے، اس کے حسن و قبح کی پوری ذمّے داری اسی کی ہے، دوسرے کی نہیں۔ ادب کی قلم رو میں جمہوریت ہوتی ہے، آمریت نہیں۔ یہاں اختلاف رائے اور آزادیِ اظہار کی اجازت ہے، اس لیے ہم دونوں نے گوارا کیا ہے کہ بعض موضوعات کے بارے میں ہم ایک دوسرے سے مختلف بات کہہ جائیں مثلاً شاہ برہان الدین جانم کے عرصۂ حیات کے تعیّن میں۔ ممکن ہے کہ بعض واقعات یا تخلیقات کے سنین ہم دونوں نے مختلف لکھے ہوں۔ ہمیں اپنے اپنے موقف کا اختیار ہے۔ قاری پڑھ کر طے کر سکتا ہے کہ کس کے بیان کو ترجیح دے ویسے اس قسم کے اختلافی بیانات کم سے کم ہی ہوں گے۔

تاریخِ ادب کے تصور کے بارے میں میں نے اپنی کتاب "تحقیق کا فن" کے بارھویں باب "ادبی تاریخ" میں تفصیل سے بحث کی ہے، یہاں مختصراً کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

ادبی تاریخ ایک طرف تاریخ ہے، دوسری طرف ادب۔ کارلائل نے تاریخ کو عمائد کی سوانحات کا مجموعہ قرار دیا تھا۔ ابتدائی ادبی مورخوں نے ادبی تاریخ کو بھی مشاہیرِ ادب کی سوانحوں کا مجموعہ سمجھا۔ اگلا قدم تھا تنقید سے متاثر ہونے کا۔ ادبی تاریخ سوانح نگاری اور تنقید کے امتزاج سے بنی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادبی تاریخ مختلف ادیبوں پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ بن گئی۔ بعد میں اس میں اصنافِ ادب کی شعریات کا بھی اضافہ کیا گیا۔ ادبی تاریخ کو سیاسی تاریخ سے تحریک ملی تھی لیکن بعد میں یہ سماجی تاریخ نیز افکار کی تاریخ سے متاثر ہوئی۔ ادبی تاریخ کو نہ محض سوانحات کا مجموعہ ہونا چاہیے، نہ تنقیدی مضامین کا، اور نہ اسے سماجی تاریخ بن جانا چاہیئے جیسا کہ ادب کا معاشرتی پس منظر میں مطالعہ کرنے والوں نے کیا۔

انگریزی کے مضمون نگار رابرٹ اسپلر کا پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس نے اس موضوع پر بڑی دیدہ وری سے لکھا ہے۔ اس نے ادبی تاریخ نویسی کے چار رویّوں کا ذکر کیا جن میں ایک ارتقائی تعلق بھی ہے:

۱۔ قدیم ترین طریقہ یہ تھا کہ تخلیقات کو ان کے مصنف، عہد اور علاقے کے سیاق

Marfat.com

میں بیان کر دیا جائے۔ ان پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو نظر انداز کر دیا جائے۔

۲۔ دوسرے نظریے کے مطابق ادبی مورّخ کے لیے صرف ادبی اثرات و عوامل اہم ہیں، دوسرے عوامل کی کوئی اہمیت نہیں۔ ماضی کی ادبی تخلیقات کے مآخذ اور تحریکات کی تلاش کی جائے نیز اُن تخلیقات نے بعد کی تخلیقات پر جو اثرات ڈالے ان کی نشاندہی کی جائے۔

۳۔ تیسرے نظریے کے مطابق ادبی عوامل کے ساتھ تخلیق کار اور اس کی ثقافت نیز قارئین کی کلچر کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ یعنی ادب کو سماج کے آئینے میں دیکھا جائے۔ اسپلر کے نزدیک یہی بہترین نظریہ ہے۔

۴۔ چوتھا نظریہ ادب پر دیومالا، اساطیر، علامتوں اور اقدار وغیرہ کے اثرات کو دیکھنے پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ واضح ہو کہ یہ دراصل نقاد کا میدان ہے۔

اسپلر کے مطابق ادبی مورّخ کا کام تاریخی تنقید کرنا ہے جو ادبی تنقید سے مختلف ہوتی ہے ادبی مورّخ ان عوامل کی نشاندہی کرتا ہے جن کے زیرِ اثر تخلیقات وجود میں آئیں۔ اسے ادبی نظریہ سازی اور تنقیدی تجزیے کا کام دوسروں پر چھوڑنا ہوگا۔

ہم نے اپنی تاریخ میں سیاسی اور سماجی پس منظر دیا ہے، بقدرِ بالیت تنقید کی ہے، اصناف کے فنی پہلو اور ارتقاء کو واضح کیا ہے اور آخر میں ہندی اور فارسی روایات کی آویزش و آمیزش پر نظر ڈالی ہے، لیکن سب سے زیادہ توجہ کی ہے ادیبوں اور ان کی تصانیف سے متعلق حقائق کی صحت پر۔ پروفیسر سرور نے علی گڑھ تاریخِ ادب اردو جلد اوّل کے مقدمے میں لکھا تھا:

"پہلی جلد میں معلومات پر قدرتاً زیادہ زور ہے، اس لیے یہ تنقیدی کم ہے، تحقیقی زیادہ۔ اسی لیے نمونوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔"

ہماری تاریخ بھی تحقیقی زیادہ ہے، تنقیدی کم، اردو کا ابتدائی دَور ابھی تک دھند لکے میں ہے۔ ادیبوں کی پوری سوانح تو درکنار، ان کے صحیح نام تک کا علم نہیں ہوتا۔ اُن کی کتابوں کی تاریخیں طے نہیں۔ مشاہیر کی زندگی کے اہم واقعات ہوں کہ ان کی تصانیف کا زمانہ، ایک تاریخِ ادب میں کوئی سنہ دیا ہوتا ہے، دوسری میں کچھ اور۔ اسی لیے ہم نے دور کی قدامت کے پیشِ نظر تحقیقی پہلو پر بطورِ خاص توجہ کی ہے۔ یاد رہے کہ اردو میں History اور Date دونوں کے لیے ایک ہی لفظ "تاریخ" مستعمل ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری تاریخِ ادب

Marfat.com

میں ماہ وسال کی صحت پر زور دینا چاہیئے۔

ہم نے ہر باب کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے کہ یہ کس کی تصنیف ہے۔ لیکن بعض ابواب کے کچھ حصّے دوسرے مصنّف کے لکھے ہوئے ہیں۔ ذیل میں صراحت کی جاتی ہے۔

آٹھواں باب ڈاکٹر سیّدہ جعفر نے لکھا ہے لیکن اس میں وجہی کی سوانح اور تصانیف کی تحقیق و تفصیل میری ہے۔ وجہی کی شعری تخلیقات پر تنقید ڈاکٹر سیّدہ جعفر نے لکھی ہے۔ دسواں باب بھی ڈاکٹر سیّدہ جعفر کا ہے لیکن اس میں ذیل کے عنوانات پر میں نے لکھا ہے۔

ملّا وجہی۔ خلاصۂ سب رس۔ داستان امیر حمزہ دکن۔ قصۂ جنگِ امیر حمزہ۔

بقیہ پورا باب ڈاکٹر سیّدہ جعفر نے لکھا ہے۔ بارھواں باب میرے ذمّے تھا لیکن اس میں پانچ اہم ادبی اصناف: مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور رباعی پر انھوں نے لکھا ہے اور بڑی شرح و بسیط سے لکھا ہے۔

شرح و تفصیل سے لکھنا پروفیسر سیّدہ جعفر کی خصوصیت ہے۔ اس کی معراج تاریخی پس منظر کا باب ہے۔ اردو کے ایک استاد کے لیے تاریخ کے اتنے متنوّع مآخذ سے واقفیت قابل حیرت اور قابلِ داد ہے۔ ظاہر ایہ تفصیل کچھ زیادہ معلوم ہوگی لیکن اس سے کم از کم یہ فائدہ تو ہوگا کہ شمالی ہند کے قارئین، جو دکنی تاریخ سے کم واقف ہوتے ہیں، اس مفید مواد کو یک جا پا سکیں گے۔ سیدہ جعفر صاحبہ نے اپنے حصّے کے ابواب کا تمہیدی جائزہ لیتے ہوئے نیز مختلف مصنفین پر لکھتے ہوئے جس تفصیل سے کام لیا ہے، وہ دوسرے مصنّف کے بس کی بات نہیں۔ ان کی تحریر کے فٹ نوٹوں، نیز آخر کی کتابیات پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے کتنی دُور دور تک جال پھینکا ہے۔ ان کی تحریر کی دو خصوصیات کی طرف اشارہ کروں گا۔

۱۔ انھوں نے اردو کے مروجّہ مآخذ کے علاوہ ہندی، مراٹھی اور کسی حد تک سنسکرت کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے جہاں دوسرے اردو والوں کی رسائی نہیں ہوتی۔

۲۔ عام طور سے تاریخ کی کتابوں میں شاعروں اور نثاروں کی تخلیقات کے جو نمونے دیے جاتے ہیں، ایک کے بعد دوسرا مورّخ انھیں کو نقل کرتا چلا آتا ہے۔ ڈاکٹر سیّدہ جعفر نے اصل مآخذ کو دیکھا ہے اس لیے اس کا خیال رکھا ہے کہ گھسے پٹے اقتباسات درج نہ کریں بلکہ نئے نمونے درج کریں۔

ان کی محنتِ شاقہ اور استیعاب کو دیکھ کر مجھے خیال آتا ہے کہ پوری کتاب انھیں کے قلم سے

Marfat.com

لکھی گئی ہوتی تو قارئین کو کتنا مزید مواد مل جاتا۔

میں نہ دکن کا متوطن ہوں نہ دکنی ادب کا ماہر۔ ترقی اردو بیورو کے اربابِ حلّ و عقد کا مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے اس لائق سمجھ کر میرے ناتواں کندھوں پر یہ ذمّے داری ڈالی۔ میں نے امتثالِ امر میں قبول کیا۔ جہاں تک ڈاکٹر سیّدہ جعفر کا سوال ہے، یہ ان کا میدان ہے۔ وہ عمر بھر اس کی سیاحی کرتی رہی ہیں۔ ہم دونوں سے جو کچھ بن پڑا وہ حاضر ہے۔ اس میں اغلاط ضرور در آئی ہوں گی۔ جو محقق ان کی نشاندہی کریں گے ہم ان کے ممنون ہوں گے۔

گیان چند

۱۴/ اگست ۱۹۸۸ء

حیدرآباد

Marfat.com

پہلا باب

اردو زبان کا آغاز و ارتقا

اردو زبانوں کے ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ آریہ ۱۵۰۰ ق م تک ہندوستان (غیر منقسم برِّ صغیر) میں داخل ہو چکے تھے اور ۱۵۰۰ ق م اور ۱۲۰۰ ق م کے بیچ مغربی ہندوستان میں بس گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ مشرق اور وسطِ ہند کی طرف بڑھتے گئے۔ ہندوستان میں ان کی زبان کی تین منزلیں کی جاتی ہیں۔

- ہند آریائی
  - قدیم ہند آریائی ۱۵۰۰ ق م تا ۵۰۰ ق م
    - پَہلی پراکرت (جو ویدک سنسکرت کی ماں تھی)
    - ویدک سنسکرت ۱۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ ق م
    - کلاسیکل سنسکرت ۱۰۰۰ ق م تا ۵۰۰ ق م
  - وسطی ہند آریائی ۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ ء
    - پالی ۵۰۰ ق م تا آغازِ سنہ عیسوی
    - پراکرت آغازِ سنہ عیسوی تا ۵۰۰ ء
    - اَپ بھرنش ۵۰۰ ء تا ۱۰۰۰ ء
  - جدید ہند آریائی ۱۰۰۰ ء تا حال

بعض علما، ان تاریخوں کو سو سال اِدھر اُدھر کر کے پیش کرتے ہیں مثلاً پالی کو ۶۰۰ ق م سے شروع کرتے ہیں، پراکرت کو ۶۰۰ ء تک لے جا کر اپ بھرنش کو اس کے بعد شروع کرتے ہیں۔ زبانوں کی تاریخ میں یکایک کسی نقطے پر تبدیلی نہیں ہوتی۔ اوپر محض سہولت کے لیے ایک مخصوص سنہ لکھ دیا گیا ہے ورنہ تبدیلی کی حد تقریباً سو سال پر پھیلی ہوتی ہے۔

قدیم ہند آریائی

ویدک سنسکرت کو عام طور پر سنسکرت نہ کہہ کر ویدک بھاشا کہا جاتا ہے۔ سنسکرت کہہ کر

Marfat.com

کلاسیکل سنسکرت یا لوک سنسکرت مراد لی جاتی ہے ۔ اس دور میں آریہ بنگال تک پہنچ چکے تھے۔ جب کوئی زبان کسی وسیع علاقے میں بولی جاتی ہے تو اس میں علاقائی اختلافات کے زیرِ اثر بولیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس دور کی سنسکرت میں چار بولیاں مانی گئی ہیں۔

۱۔ شمالی (اُدیچیہ) ۔ ۲۔ وسطی (مدھیہ دیشی) ۔ ۳۔ مشرقی (پراچیہ) ۔ ۴۔ جنوبی (دکشنی)۔

ان میں ادیچیہ یعنی شمال مغرب کی بولی سب سے زیادہ فصیح اور وقیع تھی۔ آریہ جیوں جیوں مشرق اور جنوب کی سمت بڑھتے گئے مقامی باشندوں (دراویڑ وغیرہ) سے چھوت چھات بڑھتی گئی جس کی وجہ سے زبان کی فصاحت متاثر ہوگئی۔ واضح ہو کہ مدھیہ دیش سے مراد موجودہ مدھیہ پردیش نہیں بلکہ انبالہ، دلّی، میرٹھ، آگرہ اور مرادآباد وغیرہ کا علاقہ ہے۔ جو ہندوستان کا دِل کہلاتا تھا۔

وسطی ہند آریائی

وسطی ہند آریائی کی صورتِ حال اتنی واضح، قطعی اور متفقہ نہیں۔ مختلف علماء کے بیچ کچھ اختلافات ہیں۔ یہاں اس طرح درج کیا جاتا ہے جس پر نسبتاً زیادہ اتفاق ہے۔

وسطی ہند آریائی کے پہلے دور میں دو زبانیں ملتی ہیں: پالی اور اشوکی پراکرت۔

پالی۔ مہاتما گوتم بدھ اور مہابیر سوامی نے اپنے دھرموں کی تلقین و تبلیغ کے لیے سنسکرت کا استعمال نہیں کیا۔ مہاتما بدھ کے اپدیش پالی میں ملتے ہیں جس سے کم از کم یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ پانچویں صدی ق م کے قریب جنوبی بہار میں سنسکرت کا اثر ختم ہو چکا تھا۔ پالی کا تقریباً تمام ادب بودھ دھرم سے متعلق ہے۔ مہاراجہ اشوک کا بیٹا مہندر راجتین سے پالی کو لنکا لے گیا۔ پالی اصلاً کہاں کی زبان تھی اس امر پر اتفاق نہیں۔ مستشرقین بہ شمول گریرسن اور اہلِ لنکا اسے مگدھ کی زبان مانتے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اسے اڑیسہ کی، کوئی اجین کی، کوئی اودھ کی زبان کہتا ہے۔ ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹرجی کی رائے میں یہ مدھیہ دیش (دلّی اور مغربی یوپی) کی زبان تھی ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی بھی یہی رائے ہے۔ ساخت کے اعتبار سے یہ مغربی صوبے کی بولی معلوم ہوتی ہے، مشرق کی نہیں۔ پالی کے بارے میں پراسرار بات یہ ہے کہ اس میں بودھ دھرم سے ہٹ کر کوئی ادب کیوں نہیں ملتا؟ کیا یہ عوامی زبان نہیں تھی؟ یا یہ کہ مذہبی ادب محفوظ رہ گیا، غیر مذہبی

Marfat.com

تحریریں تلف ہوگئیں۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی رائے ہے کہ پالی کا ارتقا سنسکرت سے نہیں بلکہ ویدک بھاشا اور اپنے عہد کی بولیوں سے ہوا ہوگا کیوں کہ اس کی قواعد کے بعض روپ سنسکرت کے مقابلے میں ویدک بھاشا سے زیادہ مماثل ہیں [1]

اشوکی پراکرت :- اشوک نے اپنی حکومت کے فرمان اور دینی اصول جا بجا چٹانوں اور لاٹوں پر کندہ کرا دیے۔ یہ شِلا لیکھ تعداد میں ۲۰ سے زیادہ ہیں اور ۲۶۲ ق م اور ۲۵۰ ق م کے بیچ کے ہیں۔ یہ شمال مغرب میں شہباز گڑھی، منصورہ (صوبۂ سرحد) اور مغرب میں گرنار (گجرات) سے لے کر پورب تک ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مضمون اشوک کے دارالسلطنت سے اردھ ماگدھی میں بھیجا گیا اور اسے مقامی زبانوں سے مخلوط کر کے لکھا گیا۔ ان کی زبان پالی سے بہت کچھ مماثلت رکھتی ہے۔

پراکرت دور : مولودِ مسیح سے ۱۵۰۰ء تک

انھیں پراکرت کہنے کی دو وجوہِ تسمیہ بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ سنسکرتی، تہذیب کو اور "پرکرتی" قدرت یا فطرت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت مہذّب زبان تھی، پراکرتیں فطری یعنی عوامی اور غیر مرصّع تھیں۔

۲۔ پشیل نے لکھا ہے کہ بعض قواعدئین اس لفظ کا تجزیہ پراک + کرت = پہلے سے بنی ہوئی، کرتے ہیں۔ اس مفہوم میں یہ سنسکرت سے بھی پہلے تھیں اور عوام میں بول چال کے طور پر رائج تھیں۔

ہم نے پراکرت کی ابتدا مسیحی سنہ سے کی ہے لیکن یہ محض کتابی سہولت کی بات معلوم ہوتی ہے۔ جب پانچ سو چھ سو قبل مسیح کے قریب سنسکرت بول چال کی زبان نہیں رہی تو سارا ملک پالی میں تو بات چیت کرتا نہ ہوگا۔ پالی کے دور میں بھی تین چار یا پانچ زبانیں ضرور تھیں جیسا کہ اشوکی پراکرتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ پراکرتوں کی بہت سی شکلیں ہیں۔ پراکرتوں کے ماہر وولنر نے کہا ہے کہ پڑھے لکھے اشخاص میں مختلف پراکرتیں ایک دوسرے کے

---

[1] سامانیہ بھاشا وگیان (الہ آباد، طبع ششم شک سمبت ۱۸۸۳) ص ۳۶۲

Marfat.com

یے قابلِ فہم تھیں [1] کوئی شخص جس کی مادری زبان پراکرت ہو اور اس نے سنسکرت بھی پڑھی ہو، وہ کسی بھی ادبی پراکرت کو سمجھ سکتا تھا۔ ابتدا میں مختلف پراکرتوں کا فرق اور بھی کم تھا۔

پراکرت کے مشہور قواعد نویس ورزوچی نے چار پراکرتوں کا ذکر کیا ہے ۔

مہاراشٹری، شورسینی، ماگدھی، پَیشاچی۔

دوسرے قواعد نویس ہیم چندر نے تین اور نام دیے ہیں

آرش، چولکا پَیشاچی اور اَپ بھرنش ۔

ہیم چندر جین تھا۔ اس نے آرش (رائے ساکن) کا ذکر کیا ہے جو جینیوں کی مرغوب پراکرت اردھ ماگدھی ہے چولکا پَیشاچی کو پَیشاچی کی بولی ماننا چاہیے۔ اَپ بھرنش پراکرتوں سے بعد کی زبانوں کا گروہ ہیں۔ اس طرح وزرچی اور ہیم چندر کے امتزاج سے پانچ مستند پراکرتوں کے نام حاصل ہوتے ہیں۔

مہاراشٹری، شورسینی، اردھ ماگدھی، ماگدھی، پَیشاچی

پہلے ان پر غور کیا جاتا ہے۔ بعد میں مزید پراکرتوں کے نام لیے جائیں گے ۔

مہاراشٹری: اس کے نام سے ایسا لگتا ہے کہ یہ مہاراشٹر یعنی جنوب کی پراکرت رہی ہوگی چنانچہ ژول بلاک نے مراٹھی کو اسی سے ماخوذ کیا ہے لیکن ڈاکٹر من موہن گھوش اور سکمار سین مہاراشٹر کے معنی بڑا ملک، لے کر اسے پورے ملک کی زبان مانتے ہیں۔ گھوش کی رائے ہے کہ یہ شورسینی کی بعد کی شاخ ہے جو شمال سے دکن چلی گئی۔

یہ شاعری اور موسیقی کی زبان ہے۔ سنسکرت ڈراموں کے گیت اسی میں ملتے ہیں۔ یہ قواعد نویسوں کی محبوب بولی ہے۔ وہ ساری پراکرتوں میں پہلے مہاراشٹری کے قواعد درج کرتے ہیں پھر دوسری پراکرتوں کا اسی سے مقابلہ کر کے فرق کرتے ہیں۔

شورسینی۔ یہ مدھیہ دیش کی بولی ہے گو اس کا مرکز شورسین یعنی متھرا کا علاقہ تھا۔ اس کے قدیم نمونے اشوگھوش کے سنسکرت ناٹکوں میں ہیں۔ دگامبر جینیوں نے بھی اس

---

1. Woolner, An Introduction to Prakrits, P.P.8-9, as referred by Tarapore Wala, Principles of the Science of Language. P.P.109.

Marfat.com

میں اپنے مذہبی گرنتھ لکھے ۔اُن کی بولی کو جَین شورسینی کہتے ہیں۔ یہ شورسینی کے دوسرے نمونوں سے قدرے مختلف ہیں۔ ان کے علاوہ شورسینی کی کوئی مستقل کتاب نہیں ۔ یہ سنسکرت ناٹکوں میں متوسّط طبقے کے مردوں اور تمام عورتوں کے استعمال میں آتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا استعمال وسیع تھا۔خیال ہے کہ یہ شمالی ہند میں اپنی علاقائی حدود سے باہر بھی استعمال ہوتی تھی۔ اس کی ایک بولی آبھیری (اہیری) اور دوسری بولی اونتی کا ذکر آتا ہے۔ اونتی اجین کا پرانا نام ہے۔ اونتی بولی اجین کے آس پاس کی شورسینی تھی جس پر مہاراشٹری کا اثر تھا۔

اردھ ماگدھی۔ یہ جغرافیائی اور لسانی اعتبار سے شورسینی اور ماگدھی کے بیچ کی ہے۔ اس کا مقام اودھ اور مشرقی یوپی تھا۔ یہ تمام پراکرتوں میں سب سے قدیم ہے۔ اس کے قدیم نمونے دو ہیں ۔ اوّل تو یہ اشوک کی پراکرتوں کی تہہ میں دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے اس میں سویتامبر جینیوں کے ۴۵ گرنتھ ہیں۔ واضح ہو کہ دگامبر جینیوں کی مذہبی کتابیں شورسینی میں اور سویتامبروں کی اردھ ماگدھی میں ہیں۔ آخرالذکر کا کہنا ہے کہ ان کے گرنتھ بہت قدیم ہیں۔ پہلے انھیں سینہ بہ سینہ منتقل کیا گیا اس کے بعد ان کو چندرگپت موریہ کے عہد (چوتھی صدی ق م) میں پاٹلی پُتّر میں مرتب کیا گیا۔ ان کی باقاعدہ تدوین پانچویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ سچ یہ ہے کہ موجودہ روپ میں ان کی زبان کسی طرح چوتھی صدی قبل مسیح کی نہیں۔ جین لوگ اپنی اردھ ماگدھی کو آرش (بہ سکونِ را) بولتے ہیں)

گریرسن کا خیال ہے کہ اردھ ماگدھی، شورسینی اور ماگدھی کے بیچ ایک عبوری شکل ہے۔ اس میں نظم و نثر دونوں ملتی ہیں۔

ماگدھی یہ پورے مشرقی ہندوستان کی بولی تھی گو اس کا مرکز مگدھ یعنی جنوبی بہار تھا۔ چوں کہ یہ آریاؤں کے مرکز سے دور پڑتی تھی اس لیے اس پر غیر آریائی بولیوں کا شدید اثر تھا۔ آریہ اس پراکرت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سنسکرت ڈراموں میں نیچے طبقوں کے لوگ اسی میں بات چیت کرتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی مستقل کتاب نہیں۔ یہ صرف سنسکرت ڈراموں میں استعمال ہوتی ہے۔

پیشاچی۔ سنسکرت میں پشاچ (کچا گوشت کھانے والا) بھوت کو کہتے ہیں۔ اردو

Marfat.com

کے قاعدے سے اس کی صفتِ نسبتی پشاچی (بہ کسرہ اوّل) ہونی چاہیے لیکن سنسکرت میں پَے شاچی (بہ فتحۂ اوّل) کہتے ہیں۔ مہابھارت میں ایک پشاچ قوم کا ذکر ہے۔ یہ شمال مغرب میں کشمیر کے پاس رہتی تھی۔ شاید یہ آریوں کی کوئی علاحدہ شاخ تھی جو اصل قافلے سے پہلے چلی آئی تھی۔ پیشاچی اور دردی زبانوں کا رشتہ واضح نہیں۔ گریرسن اسے دردی سے متاثر زبان مانتا ہے۔ دردی زبانوں کا مرکز بھی یہی ہے لیکن دردی زبان ہند آریائی نہیں۔ پرشوتم دیو پیشاچی کو سنسکرت اور شورسینی کا مسخ روپ کہتا ہے۔ کچھ بھی ہو یہ ظاہر ہے کہ یہ بہت حقیر سمجھی جاتی تھی۔ اس میں گناڈھیہ نے بَرہت کتھا جیسی عظیم کتاب لکھی۔ یہ گم ہو گئی ہے لیکن اس کے ایک جزو کا سنسکرت ترجمہ کتھا سَرِت ساگر میں ملتا ہے۔

پراکرتوں کے بعد جو متعدّد اَپ بھرنشیں ملتی ہیں بعضوں نے ان کے ماقبل ایک ایک پراکرت بھی وضع کی ہے۔ اس طرح کھش، براچڑ، ناگر، ٹکی، پہاڑی وغیرہ پر قیاس کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مختلف مقامات پر مختلف پراکرتیں ضرور رہی ہوں گی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ادب میں مندرجہ بالا پانچ ہی استعمال ہوتی تھیں یعنی یہ زیادہ اہم اور وسیع پراکرتیں تھیں۔

اَپ بھرنش

موٹے طور پر اُن کا زمانہ ۵۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک کہا جاتا ہے گو بعض نے ۵۰۰ء کے بجائے ۶۰۰ء کہا ہے۔ اَپ بھرنش کے معنی بھرشٹ یا مسخ شدہ ہیں۔ پنڈتوں کے اس لفظ کا پہلا استعمال ویاڈی کے یہاں اور اس کے بعد پتنجلی کی مشہور کتاب مہابھاشیہ (ڈیڑھ سو قبل مسیح کے قریب) میں ملتا ہے لیکن وہاں یہ زبان کے معنی میں نہیں بلکہ سنسکرت 'تت سم' کے بگڑے ہوئے روپ کے معنی میں ہے۔ زبان کے معنی میں چھٹی صدی عیسوی میں بھامہ کے کاویالنکار (کاویہ النکار) اور چنڈ کے پراکرت لکشم میں ملتا ہے۔ اپ بھرنش، میں پ مفتوح ہے لیکن اردو ہندی کے موجودہ مزاج کے مطابق ہم اسے ساکن بول سکتے ہیں۔ اپ بھرنش الفاظ پہلی بار بھرت کے ناٹیہ شاستر (۳۰۰ء) میں اور اس کے بعد کالی داس کی وِکرم اُروشی میں نظر آتے ہیں لیکن اَپ بھرنش نے بول چال میں پراکرت کی جگہ ۵۰۰ء کے قریب ہی حاصل کی ہوگی۔ یہ زبانیں دسویں گیارھویں صدی تک رائج رہیں۔ اس کے بعد جدید زبانیں ابھرنے لگیں۔ گیارھویں اور بارھویں صدیاں ایک قسم کا عبوری دور ہیں۔ شاعری میں اپ بھرنش کا استعمال چھٹی ساتویں صدی سے شروع

Marfat.com

ہوا اور تقریباً پندرھویں صدی عیسوی تک رہا۔

اَپ بھرنش سب سے پہلے شمال مغرب کی زبان میں ظاہر ہوتی ہیں۔ کچھ نے اپ بھرنشوں کو بنیادی طور سے اہیروں اور گوجروں سے منسوب کیا ہے۔ اپ بھرنشوں کی تعداد کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ ذیل میں کچھ قدیم وجدید ماہرین کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ نمی سادھو نے اُپ ناگر، آبھیر (اہیری) اور گرامیہ (دیہاتی) تین قسمیں بتائی ہیں۔

۲۔ مارکنڈے نے پراکرت نسترو شو میں ۲۷ اَپ بھرنشوں کا نام گنایا ہے لیکن ان میں تین کو اہم مانا ہے:

۱۔ گجرات کی ناگر۔ ۲۔ سندھ کی براچڑ اور ۳۔ دونوں کے بیچ کی اُپ ناگر ان کی ناگر اور نمی ساگر کی اُپ ناگر ایک ہی ہیں۔ مارکنڈے کی اپ بھرنشوں میں اُپ ناگر مہذب اور براچر دیہاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا ۲۷ ناموں میں بولیاں ہی نہیں ذیلی بولیاں بھی شامل کرلی گئی ہوں گی۔

۳۔ ڈاکٹر یاکوبی نے علاقائی اعتبار سے چار اُپ بھرنش مانی ہیں: مغربی، مشرقی، شمالی، دکنی۔

۴۔ ڈاکٹر تگارے نے اَپ بھرنش کی تاریخی قواعد میں یاکوبی کی تقسیم پر غور کر کے شمالی کو خارج کر کے محض تین مانی ہیں۔

۵۔ ڈاکٹر نامور سنگھ نے ہندی کے ارتقا میں اپ بھرنش کا حصّہ، نامی کتاب میں دکنی اپ بھرنش کو بھی حشو مان کر محض مشرقی اور مغربی پر اکتفا کی ہے۔

ڈاکٹر بھولا ناتھ تِواری نے اس مسئلے پر غور کر کے کہا کہ سنسکرت کے آخری دور میں بھاشا کے کئی مقامی روپ ابھر چکے تھے۔[1] اشوکی پراکرتوں میں بھی مختلف مقامی بولیوں کا پتہ چلتا ہے۔ پراکرتوں میں کم از کم پانچ ضرور اہم تھیں۔ اُدھر ۶۱۵۰۰ - ۶۱۴۰۰ تک ذیل کی جدید ہند آریائی زبانیں وجود میں آچکی تھیں۔

۱۔ پنجابی۔ ۲۔ لہندا۔ ۳۔ سندھی۔ ۴۔ راجستھانی۔ ۵۔ گجراتی۔ ۶۔ مراٹھی۔ ۷۔ کھڑی بولی، برج۔ ۸۔ اودھی، چھتیس گڑھی۔ ۹۔ پہاڑی۔ ۱۰۔ بھوج پوری، مگہی، میتھلی، ۱۱۔ اڑیا۔

---

[1] ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری: بھاشا وگیان (ہندی) ص ۱۸۵۔

13885D

Marfat.com

۱۲ آسامی - ۱۲ بنگالی -

پانچ اور ۱۳ کو ملانے والی سیڑھی دو یا تین نہیں ہو سکتی وہ پانچ اور ۱۳ کے بیچ ہوگی ۔
جدید زبانوں کو پیشِ نظر رکھ کر تواری نے ذیل کی سات اَپ بھرنشیں فرض کی ہیں .

شورسینی ۔ پیشاچی ، مہاراشٹری ۔ اردھ ماگدھی ۔ ماگدھی ۔ براچڑ ۔ کھش

ناگر اپ بھرنش شورسینی ہی کا مغربی روپ تھی ۔ تارا پور والا نے لکھا ہے کہ ایک سوراشٹری پراکرت تھی جس کے بہت سے کتبات ملتے ہیں ۔ اس پر شورسینی کا زبردست اثر ہوا جس سے وہاں کی اپ بھرنش اپنی پیش رو پراکرت سے مختلف ہوگئی ۔ اِس اپ بھرنش کو ناگر اَپ بھرنش کہتے ہیں ۔ چوں کہ اپ بھرنش بول چال کی زبانیں یا بولیاں تھیں اس لیے ان کی صحیح تعداد کا تعین نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ یقینی ہے کہ ان میں شورسینی ممتاز تھی ۔

اَپ بھرنشوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے ذخیرۂ الفاظ میں سنسکرت کے تت سم (اصل تلفظ والے) الفاظ بہت کم ہیں ۔ تدبھو (تبدیل شدہ) اور دیسی الفاظ ہی ہیں ۔ کچھ فارسی اور ترکی الفاظ بھی مسخ ہو کر آ گئے ہیں ۔

جدید ہند آریائی

ہارنلے نے ۱۸۸۰ء میں کوڑی زبانوں کی تقابلی قواعد، لکھی ۔ معلوم نہیں کیوں اس نے ہند آریائی کے لیے گوڑی ، کا لفظ استعمال کیا ۔ اس نے پہلی بار یہ نظریہ پیش کیا کہ ہندوستان میں آریہ دو گروہوں میں آئے ۔ جب دوسرا گروہ آیا تو وہ مرکز میں گھس کر وہاں بس گیا اور اس علاقے کے پیشتر کے باشندے ہٹ کر مغرب ، جنوب اور مشرق میں منتشر ہو گئے ۔ اس طرح آریائی زبانوں کے دو گروہ بیرونی اور اندرونی ہو گئے ۔ بیرونی گروہ قدیم تر اور اندرونی گروہ مابعد کا ہے گریرسن نے ہارنلے کا نظریہ الٹ کر قبول کیا کہ پہلا گروہ درمیان میں بسا رہا ، بعد کا گروہ تینوں طرف یعنی مغرب ، جنوب اور مشرق میں بس گیا ۔ اندرونی گروہ میں مغربی ہندی ، مشرقی ہندی ، پنجابی ، پہاڑی ، راجستھانی اور گجراتی ہیں ۔ صوتیات کی بنا پر گریرسن نے اندرونی اور بیرونی گروہوں کے تقریباً ۱۵ اختلافات درج کیے ہیں لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ آریاؤں کے دونوں گروہ زیادہ سے زیادہ ۱۲۰۰ ق م تک ہندوستان میں آ چکے ہوں گے ۔ موجودہ زبانیں ۶۱۲۰۰ کے بعد ظہور پذیر ہوئیں ۔ کیا ان کی صوتی خصوصیات ۲۴۰۰ سال قبل اِن کے علاقے

Marfat.com

میں پیدا ہو چکی تھیں۔ کیا ویدک بھاشا یا سنسکرت یا پالی میں بیرونی اور اندرونی گروہ کی مختلف صوتی خصوصیات ملتی ہیں۔ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے ہارنلے اور گریرسن کے اندرونی اور بیرونی گروہ کے نظریے کی تردید کی ہے۔

ہارنلے، گریرسن، چٹرجی، بھولا ناتھ تواری وغیرہ نے آپ بھرنشوں کے رشتے سے جدید ہند آریائی زبانوں کی مختلف گروہ بندیاں کی ہیں۔ میں گروہ بندی کو نظر انداز کر کے صرف اُن زبانوں کا آپ بھرنش سے رشتہ قایم کرتا ہوں جنھیں اندرونی گروہ کی زبانیں کہا گیا ہے، نیز ان زبانوں پر بھی غور کرتا ہوں جنھیں فی الوقت ہندی نے اپنے وسیع حصار میں شامل کرنا چاہا ہے۔ ذیل کے چارٹ میں لسانیات کا نشان ے ظاہر کرتا ہے کہ اس سے پہلے کی زبان نشان کے بعد کی زبان سے نکلی ہے۔

مغربی ہندی ے شورسینی اپ بھرنش
راجستھانی ے اُپ ناگر اَپ بھرنش
گجراتی ے ناگر اپ بھرنش
مشرقی ہندی ے اردھ ماگدھی اپ بھرنش
پہاڑی ے کھَش اپ بھرنش
پنجابی ے ٹکّی اَپ بھرنش

ان کے بارے میں چند مشاہدات پیش کرتا ہوں، مغربی ہندی کو سب سے آخر میں لوں گا مشرقی ہندی۔ اس کی تین بولیاں اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی ہیں۔ آخری دو مشرقی مدھیہ پردیش کی بولیاں ہیں انھیں اودھی کے مقابلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مثلاً ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں چھتیس گڑھی مادری زبان والوں کی تعداد ۶۷ لاکھ تھی۔

بہاری۔ ماگدھی اپ بھرنش سے چار زبانیں نکلیں: بنگالی، آسامی، بہاری، اڑیا۔ دراصل بہاری کے نام سے کوئی واحد زبان نہیں۔ یہ تین بولیوں کا مجموعہ ہے جو یہ ہیں۔

۱۔ میتھلی۔ یہ شمالی مشرقی بہار کی بولی ہے۔ اس کا مرکز دربھنگہ ہے۔ اس میں اچھا ادبی ذخیرہ ہے۔ میتھلی والے اسے علاحدہ زبان کہلانے پر مُصر ہیں چنانچہ ساہتیہ اکادمی نے میتھلی کو ہندی سے الگ زبان مان لیا ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں میتھلی مادری زبان والوں کی تعداد سوا اکسٹھ لاکھ تھی۔

Marfat.com

ب بگہی ۔ یہ جنوبی بہار کی بولی ہے ۔ یہ خاص ماگدھی کا علاقہ ہے ۔ یہ پٹنہ، گیا، ہزاری باغ، وغیرہ میں رائج ہے ۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری میں اس بولی کے بولنے والوں کی تعداد ۶۶۳۸۵۰۰ یعنی تقریباً ساڑھے چھیاسٹھ لاکھ تھی۔

ج بھوج پوری ۔ یہ مغربی بہار میں ضلع شاہ آباد، چمپارن، بھوج پور وغیرہ میں اور مشرقی یوپی میں گورکھپور اور بنارس کمشنری کی زبان ہے ۔ ڈاکٹر ادے نراین تواری نے اپنے تحقیقی مقالے بھوج پوری بھاشا اور ساہتیہ، میں بھوج پوری کو ہندی سے الگ زبان مانا ہے ۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری میں اس کے بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ ۴۳ لاکھ سے اوپر تھی۔

بہار کی سرکاری اور تہذیبی زبان ہندی ہے ۔ اہلِ ہندی بہار کی بولیوں کو ہندی کی بولی قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ بولیاں مغربی ہندی کے مقابلے میں بنگال سے نزدیک تر ہیں۔

ا راجستھانی ۔ یہ مدھیہ دیش کی زبان کا جنوبی مغربی پھیلاؤ ہے ۔ یہ شورسینی یا اس کے روپ اپ ناگر اپ بھرنش سے نکلی ہے ۔ اس کی بولیوں میں ایک میواتی ہے جس کا اردو کے آغاز کے سلسلے میں نام لیا جاتا ہے ۔ بہار کی طرح راجستھان کی سرکاری اور تہذیبی زبان ہندی ہے ۔ ساہتیہ اکادمی نے میتھلی کی طرح راجستھانی کو بھی ہندی سے علاحدہ زبان تسلیم کر لیا ہے ۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری میں صرف ۲۱ لاکھ لوگوں نے اپنی زبان راجستھانی لکھائی۔

گجراتی ۔ یہ ناگر اپ بھرنش سے نکلی ہے جو سوراشٹری اور شورسینی اپ بھرنش کے میل سے بنی یا اسے شورسینی کا مغربی روپ کہہ سکتے ہیں ۔ گجراتی زبان ہندی سے بہت نزدیک ہے ۔ راجستھانی سے اس کی مماثلت اور بھی زیادہ ہے ۔

پہاڑی ۔ یہ کمش پراکرت اور کھش اپ بھرنش سے نکلی ہے ۔ بعض اسے شورسینی سے ماخوذ کرتے ہیں ۔ اس کی تین خاص بولیاں ہیں ۱ ۔ نیپال کی مشرقی پہاڑی یا گورکھالی ۲ ۔ یوپی کے پہاڑوں کی کمایونی اور گڑھوالی ۳ ۔ ہماچل کی بولیاں۔

پنجابی: ڈاکٹر بنارسی داس پنجابی کی سات بولیاں مانتے ہیں ۔ ہم باریکیوں میں نہ جاکر مشرقی پنجاب کی بولی کو پنجابی اور مغربی پنجاب کی بولی کو لہندا کہیں گے ۔ ڈاکٹر کالا سنگھ بیدی نے لکھا ہے کہ کسی زمانے میں پنجاب دو مشہور حصّوں ٹک اور کیکئی میں منقسم ہو گیا تھا ۔ ٹک کی بولی ٹکی اور کیکئی علاقے کی بولی کیکئی کہلائی ۔ یہ دونوں پیشاچی اپ بھرنش کی بیٹیاں تھیں لیکن شورسینی سے شدید طور پر متاثر ہوئیں ۔ ٹکی علاقے میں ماجھی پنجابی (جو پنجابی کی معیاری بولی

Marfat.com

ہے) اور کیکئی علاقے میں لہندا رائج ہے[1]۔ گریرسن نے پنجابی اور لہندا کو علاحدہ زبانیں مانا ہے لیکن پنجاب کے ماہرین لسانیات اسے تسلیم نہیں کرتے[2]۔ گریرسن کا ایک عجیب نظریہ یہ ہے۔

ایک زمانے میں پورے پنجاب میں لہندا بولی جاتی تھی۔ بعد میں مغربی ہندی کی کسی بولی نے اسے مغرب کی طرف کو ہٹانا شروع کیا اور لاہور سے آگے تک دھکیلتی چلی گئی۔ اس طرح پنجابی ایک ملواں زبان ہے جو لہندا پر ہندی کی تہہ چڑھنے سے بنی ہے۔ پنجابی اندرونی گروہ کی اور لہندا بیرونی گروہ کی زبان ہے۔

اس نظریے کا کوئی جواز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تیرھویں، چودھویں صدی عیسوی میں ہوتا۔ زبان کو دھکیلنے یا اس پر تہہ چڑھنے کی گنجائش صرف اسی وقت ہے جب کہ بڑے پیمانے پر نقل آبادی ہوا ہو۔ کوئی زبان اپنے بولنے والوں کے جائے بغیر دوسرے علاقے کی زبان پر نہیں چھا سکتی۔ تیرھویں چودھویں صدی عیسوی میں یا جدید ہند آریائی کے کسی اور دور میں دلّی سے مغرب کی طرف آبادی کا کوئی انتقال نہیں ہوا۔ جدید ہند آریائی زبانیں تاریخی دور میں ابھری ہیں۔ اس زمانے کے رکارڈ موجود ہیں لیکن ایسی کوئی تحریریں نہیں ملتیں جن سے ثابت ہو کہ کسی زمانے میں مشرقی اور وسطی پنجاب میں لہندا بولی جاتی تھی۔

مغربی ہندی

مغربی ہندی گریرسن کا دیا ہوا نام ہے ورنہ اس نام کی کوئی زبان نہ آج ہے نہ پہلے کبھی تھی۔ گیارھویں بارھویں صدی میں مدھیہ دیش میں اس کی مختلف بولیاں واضح نہیں ہوئی تھیں اس لیے اس وقت کی زبان کو مغربی ہندی کہہ سکتے ہیں۔ یہ شورسینی کی سچی جانشین ہے۔ اس کی پانچ بولیاں ہیں۔

---

[1] کے۔ ایس۔ بیدی: عین ہندوستانی زبانیں ص۶۲۔ ناشر کتب خانۂ انجمن ترقی اردو دہلی۔ سنہ اشاعت ندارد

[2] محمود شیرانی: پنجاب میں اردو ص۸۰۔ نسیم بک ڈپو۔ ۱۹۷۵ء۔

Marfat.com

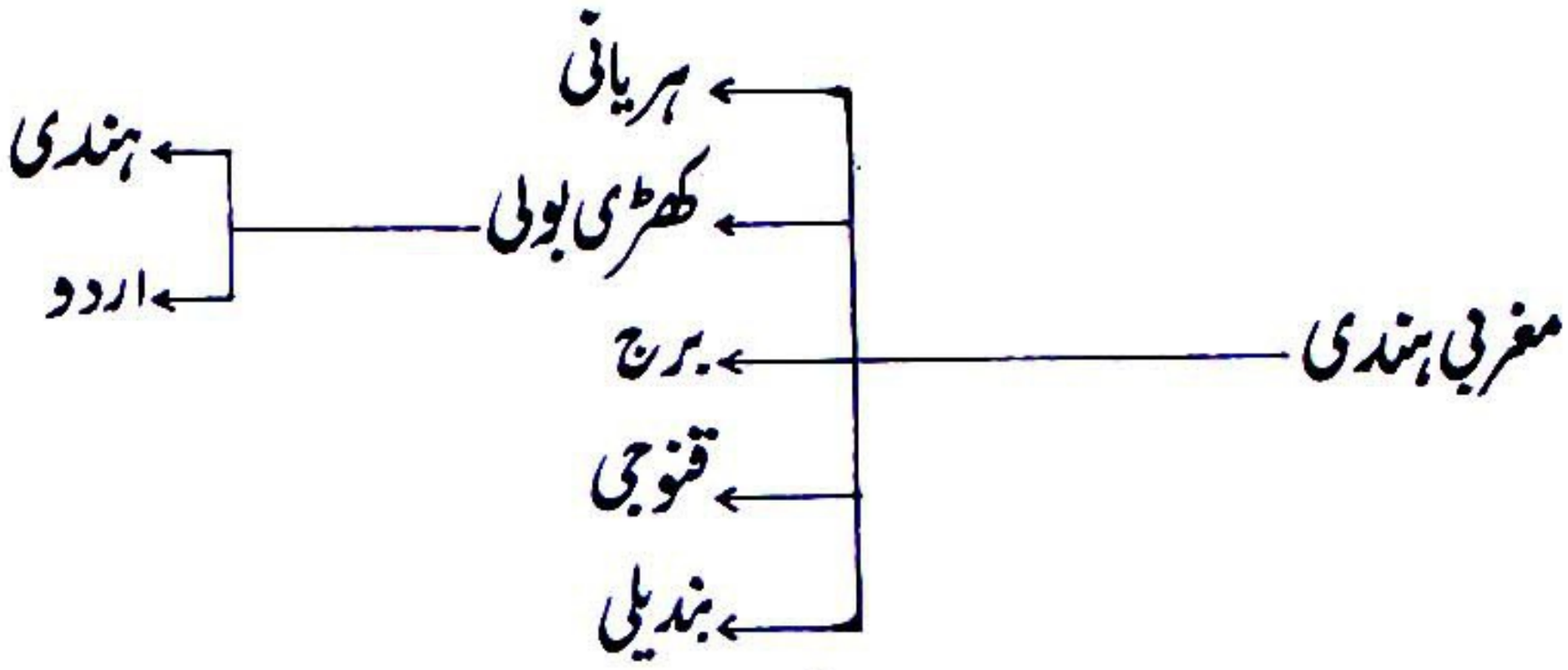

ان میں اختتامِ لفظ کے اعتبار سے ہریانی اور کھڑی بولی میں آ کا لہجہ ہے جب کہ بعد کی تین میں اُو کا لہجہ ہے۔ اب ان کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

ہریانی۔ یہ ہریانہ کی بولی ہے۔ لسانیات میں اسے بانگرو کہتے ہیں۔ اس پر راجستھانی اور پنجابی کا شدید اثر ہے۔ ہانسی کی ہریانی کو معیاری بولی مان سکتے ہیں۔

کھڑی بولی کا علاقہ حسب ذیل ہے:۔

ہریانہ کے ضلع انبالہ کی تحصیل انبالہ۔ دلّی کا شہری علاقہ۔ یوپی میں ضلع دہرہ دون کا میدانی علاقہ۔ ضلع سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، ضلع بلند شہر کا شمالی حصّہ، ضلع بجنور، مراد آباد، رام پور۔

ان کے علاوہ یہ پورے ہندوستان میں شہروں کی تہذیبی بولی نیز کل ہند رابطے کی زبان ہے۔ یہی مغربی ہندی کی معیاری بولی ہے۔ اس کے آغاز کے بارے میں ہم بعد میں غور کریں گے۔

برج میں اُو کا لہجہ ہے۔ یہ شورسینی کے مرکزی علاقے کی بولی ہے۔ ماضی میں اس میں بہت شاندار ادب تخلیق ہوا ہے۔ کرشن بھگتی کا ادب کہیں بھی لکھا جائے بالعموم برج ہی میں لکھا گیا۔ برج کا علاقہ آگرہ کمشنری (ضلع ایٹہ کو چھوڑ کر)، بدایوں، بریلی، راجستھان میں بھرت پور، دھول پور، کرولی، مدھیہ پردیش میں گوالیر وغیرہ ہیں۔ مہاراشٹری اَپ بھرنش کی طرح یہ شاعری کی بولی ہے۔ گیت اور پکّے گانے کے بول برج ہی میں کھلتے ہیں۔ اگر شاہجہاں اپنا دارالسلطنت آگرے سے دلّی نہ لے جاتا تو پورے ملک کی مشترک زبان برج ہی ہوتی۔ کھڑی بولی نہیں۔

قنوجی۔ ہندی کے لفظ کنوجی کو اہلِ اردو 'ق' سے لکھتے ہیں۔ قنوجی بولی کا علاقہ قنوج (ضلع فرّخ آباد)، ایٹہ، شاہ جہاں پور اور پیلی بھیت ہے۔ ہردوئی اور اُناؤ کے کچھ حصّوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ گریرسن اسے برج سے الگ ماننے میں ہچکچاتا ہے لیکن اس میں برج سے یہ فرق ہے کہ برج میں اُو کا رواج ہے تو قنوجی میں اَو کا۔ پرشوتم داس ٹنڈن کو پیش کیے ہوئے ہندی

Marfat.com

ارمغاں راج رشی ابھینندن گرنتھ میں ایک مضمون نگار نے ثابت کیا کہ قنوجی برج سے علاحدہ بولی ہے۔

بندیلی۔ یہ یوپی میں جھانسی کمشنری اور وندیا پردیش میں بندیل کھنڈ کی بولی ہے۔ شمال میں آگرہ تک اور جنوب میں بھوپال تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ہندی کی رزمیہ نظم آلھا کھنڈ یا آلھا اودل مشہور ہے۔ ہندی کے مشہور شاعر کیشو داس نے بندیلی میں شاعری کی ہے۔ اس میں بھی اُو کا لہجہ ہے۔

گریرسن نے مغربی ہندی اور مشرقی ہندی نام رکھ کر ایک غلط فہمی عام کردی ہے۔ اگر یہ دونوں مختلف پراکرتوں اور اَپ بھرنشوں سے نکلی ہیں تو انھیں ایک نام ہندی دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوا کہ مشرقی ہندی اور مغربی ہندی ایک زبان ہندی کی بولیاں ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے چند اصطلاحوں کے معنی صاف کر لیے جائیں. یہ ہیں۔

کھڑی بولی، ہندوستانی، ہندی، اردو اور دکنی

کھڑی بولی

کھڑی بولی کی تاریخ جاننے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ اس سے کون سی زبان یا بولی مراد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے مفہوم پر اتفاق نہیں کیوں کہ یہ اصطلاح مختلف معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔ ہندی، ہندوستانی جیسے ناموں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے، ہند آریائی اور ہندی، میں ہندوستھانی کی پانچ شکلیں قرار دیں:۔

۱۔ اردو۔

۲۔ اعلیٰ ہندی یا ناگری ہندی

۳۔ ہندوستھانی (ہندوستانی) خاص اسے بنیادی کھڑی بولی کہا جا سکتا ہے جس کے ذخیرۂ الفاظ میں اردو اور ناگری ہندی کے درمیان ایک توازن رہتا ہے۔ اس میں کافی فارسی عربی عناصر ہیں اور سنسکرت الفاظ بھی استعمال کرتی ہے.... یہ اردو اور ہندی کے درمیان نقطۂ اتصال کی بنیاد ہے۔

Marfat.com

۴- علاقائی ہندوستانی - یہ مغربی اتّر پردیش اور مشرقی پنجاب (اتّر پردیش کے روہیل کھنڈ اور میرٹھ ڈویژن میں اور ضلع انبالہ و مشرقی پنجاب میں) کی علاقائی بولیاں ہیں۔

۵- بازار ہندی یا بازار ہندوستانی یا عوام کی ہندوستھانی - یہ (۱) اور (۲) کی سادہ شکل ہے - یہ بازار ہندوستانی ہی شمال ہند کی عام استعمال کی زبان ہے۔ [1]

یہ سب کھڑی بولی کی بھی شکلیں ہیں لیکن ان میں بالخصوص نمبر '۳' اور نمبر '۴' کھڑی بولی ہیں - علاقائی کھڑی بولی نسبتاً غیر فصیح دیہاتی روپ ہے اور ۵ ہندوستانی اس کا منزّہ روپ۔ ہندی ساہتیہ کوش میں کھڑی بولی کی تعریف میں اس کے دو روپ تسلیم کیے گئے ہیں ہندی تعریف کا اردو ترجمہ یہ ہے

"علم زبان کے نقطۂ نظر سے کھڑی بولی شبد کا استعمال دلّی میرٹھ کے قریب واقع دیہاتی برادری کی دیہاتی بولی کے لیے ہوتا ہے - اسے گریرسن نے ورناکیولر ہندوستانی نام دیا ہے - ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے جن پد یہ (علاقائی) ہندوستانی کہا ہے - لسانیاتی نقطۂ نظر سے کھڑی بولی ہی اسٹینڈرڈ ہندی ہندوستانی نیز اردو کی بنیادی بولی ہے - ادبی سیاق میں کبھی کبھی اودھی، برج وغیرہ بولیوں کے ادب سے الگاؤ کرنے کے لیے جدید ہندی ادب کو کھڑی بولی ادب سے موسوم کیا جاتا ہے - اس معنی میں کھڑی بولی شبد اسٹینڈرڈ ہندی کا مترادف ہوگیا ہے، کھڑی بولی لفظ کا یہ عام مفہوم ہے - اوّل الذکر استعمال مخصوص معنی میں ہے۔" [2]

یہ اقتباس ماخوذ ہے ڈاکٹر امبا پرشاد سُمن کی ہندی کتاب 'ہندی اور اس کی اُپ بھاشاؤں کا سوروپ' سے - خود ڈاکٹر سُمن کی رائے ہے:-

---

[1] سنتی کمار چٹرجی: ہند آریائی اور ہندی - مترجم عتیق صدیقی (نیشنل بک ٹرسٹ دلّی، ۱۹۷۷ء) ص ۴۹-۱۴۲

[2] ڈاکٹر دھیریندر ورما وغیرہ: ہندی ساہتیہ کوش (گیان منڈل کاشی، ۱۹۵۸ء) ص ۲۴۹ بحوالہ ڈاکٹر امبا پرشاد سمن: ہندی اور اس کی اُپ بھاشاؤں کا سوروپ (ہندی ساہتیہ سمیلن، پریاگ، ۱۹۶۶ء) ص ۱۲۵

Marfat.com

"جن پدیہ (علاقائی) کھڑی بولی کے ادبی روپ کا نشو ونما دو دھاروں میں ہوا، فارسی لپی میں لکھی جانے والی عربی فارسی آمیز بھاشا اردو کہلائی اور ناگری لپی میں لکھی جانے والی سنسکرت آمیز بھاشا ہندی کہلائی" (صـ۱۲۴)

فاضل عالم لسانیات ڈاکٹر اشوک کیلکر اپنی انگریزی کتاب میں لکھتے ہیں:

"معاصر کھڑی بولی ہندی اردو، علاقائی ہندوستانی (لیکن ورناکیولر ہندوستانی نہیں) اور علاقائی دکھنی (قدیم ادبی دکھنی سے مختلف) کا احاطہ کرتی ہے" [1]

ان کی مراد یہ ہے کہ کھڑی بولی میں ہندی، اردو، مغربی یوپی کی بول چال کی ہندوستانی اور دکن کی بول چال کی موجودہ دکنی شامل ہیں۔ ورناکیولر ہندوستانی کو خارج کرتے ہوئے غالباً ان کی مراد پورے ملک کی رابطے کی زبان ہندوستانی سے ہے جس کے مختلف صوبوں میں مختلف صوبائی روپ ہو جاتے ہیں۔

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ کھڑی بولی کا اطلاق ایک طرف اردو ہندی کی فصیح شکلوں پر بھی ہوتا ہے، دوسری طرف مغربی یوپی کی بول چال کی زبان پر بھی جس کا سب سے نیچا روپ دیہات کی کھڑی بولی ہے۔ سچ یہ ہے کہ کسی معیاری زبان اور اس کے تقریری روپ میں جو فرق ہوتا ہے وہ سماجی لسانیات کے طبقوں کی بنا پر ہے، یہ کوئی دو زبانیں نہیں بن جاتیں۔ مغربی یوپی کے دیہات کی مسخ شدہ بولی بھی کھڑی بولی ہے، اس علاقے کے شہروں کے پڑھے لکھے ہندو مسلمانوں کی معیاری زبان بھی کھڑی بولی ہے۔ مثلاً یہ اظہارات ملاحظہ ہوں ؎

ا	ب
۱- تسّے ئی تو کے راہوں	تجھ سے ہی تو کہہ رہا ہوں
۲- بڑا جاڈّا پڑ رہا ہے	بڑا جاڑا پڑ رہا ہے
۳- مرغیں (دوسری یے مجہول) کاں گئیں	مرغیاں کہاں گئیں

ان میں سے پہلے کالم ہی کے نہیں، دوسرے کالم کے جملے بھی کھڑی بولی ہیں۔ گھریلو بول چال میں مَیں کالم 'ا' کے سب جملے بولتا ہوں۔ نیم مزاحیہ لہجے میں بولی کا لفظ جاڈّا بھی بول جاتا ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں گھر میں ایک زبان اور باہر مجلسوں میں دوسری

---

[1] Kelkar, Studies in Hindi-Urdu. (Poona, 1968) P. 19.

Marfat.com

زبان بولتا ہوں۔ انگریزی بول چال کے یہ فقرے دیکھیے۔

ا	ب
It ain't any good	It is not any good
I wanna go	I will not go
I ain't giving nothing	I am not giving anything

کالم 'ا' کے جملے بھی اسی طرح انگریزی ہیں جیسے کالم 'ب' کے یہی کیفیت تقریری اور تحریری کھڑی بولی کی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مقدمۂ تاریخِ زبان اردو میں بالعموم کھڑی بولی سے مغربی یوپی کی دیہاتی بولی مراد لی ہے گو ایک دفعہ وہ اسے وسیع تر معنوں میں بھی لیتے ہیں مثلاً

ا۔ "اس کی مزید توضیح اردو کے ایک دیہاتی نام یعنی کھڑی بولی سے کی جاتی ہے۔
(مقدمۂ تاریخِ زبان اردو طبع ہفتم صـ ۲۰۵)

"کھڑی بولی، دیہاتی نام نہیں۔ جیساکہ آگے دیکھا جائے گا اسے اول گلکرسٹ للتو لال اور سدل مسر نے استعمال کیا اور اس کے بعد ماہرین لسانیات نے۔

۲۔ "کھڑی بولی کے ادبی نمونے اردو کی شکل میں اور اردو رسم خط میں سب سے پہلے دکن میں ملتے ہیں فخر دین نظامی بیدری کی تصنیف مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (۱۴۲۱ء اور ۱۴۳۵ء کے درمیان) اس کا پہلا مستند نقش ہے:
(طبعِ ہفتم صـ ۴۸-۲۴۷)

یہی صحیح موقف تھا لیکن ان دو موقعوں کے علاوہ انھوں نے کھڑی بولی کو محض دیہاتی مسخ شدہ روپ کے معنی میں استعمال کیا ہے جو کھڑی بولی کے ساتھ انصاف نہیں کیوں کہ اس طرح اس کے ایک روپ یعنی جزو کو کل قرار دے دیا گیا ہے۔ دوسرے تمام مصنفین نے اس علاقے کے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کی بولی کی تمام سطحوں کو ملا کر کھڑی بولی قرار دیا ہے بلکہ زیادہ تر نے اردو ہندی کو بھی کھڑی بولی میں شامل کیا ہے۔

کھڑی بولی کی نوعیت جاننے کے بعد اس کی تاریخ پر نظر ڈال لی جائے۔

Marfat.com

الٰہ آباد یونیورسٹی کے ہندی کے پروفیسر ڈاکٹر ماتا بدل جیسوال نے اپنے ڈی لٹ کے مقالے مانک ہندی کا ایتہاسک ویاکرن (معیاری ہندی کی تاریخی قواعد) جلد اوّل میں 'کھڑی بولی' نام کی تحقیق کی ہے۔ جب یہ مقالہ غیر مطبوعہ تھا تبھی مصنف نے راقم الحروف کو دیکھنے کا موقع دیا۔ ذیل کے بیان میں اس سے نیز دوسرے مآخذ سے مدد لی گئی ہے۔

جیسوال کے مطابق ۱۷۹۸ء یا انیسویں صدی کی ابتدا میں گل کرسٹ نے Sterling Tongue یا اسٹینڈرڈ اسپیچ کا ترجمہ کھڑی بولی کیا۔ ۱۸۰۳ء میں گلکرسٹ، للّولال اور سدل مسر تینوں نے اس لفظ کا استعمال کیا۔ بعد کی دو کتابوں: پریم ساگر اور چندراوتی ترجمہ ناسکیتو پاکھیان کی تاریخ سمبت ۱۸۶۰ وکرمی ہے جو برابر ہے ۱۸۰۳ء کے۔ انیسویں صدی کے پہلے دہے میں مرکّب، کھڑی بولی، کا استعمال گل کرسٹ نے چھے بار، للّولال نے پانچ بار اور سدل مسر نے دو بار کیا۔ اس کے استعمال کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ان کہانیوں میں سے کئی کھڑی بولی، ہندوستانی کے شُدھ ہندوی ڈھنگ کی ہیں اور کچھ برج بھاشا میں دی جائیں گی[1]

۲۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ برج بھاشا کے ساتھ کھڑی بولی کو شامل نہیں کیا جا سکا ہندوستانی کا یہ بہتر اسلوب اس بھاشا کے طلبا کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوتا۔ [2]

۳۔ اصلی کھڑی بولی میں ہندوستانی کی قواعد پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور عربی و فارسی کو تقریباً چھوڑ دیا جاتا ہے۔ [3]

۴۔ شکنتلا کا دوسرا ترجمہ کھڑی بولی یا ہندوستان کی خالص بولی (Sterling Tongue of India) میں ہے۔ ہندوستانی سے مختلف یہ صرف اس بات میں ہے کہ عربی و فارسی کا لفظ چھانٹ دیا جاتا ہے۔ [4]

---

1. Gilchrist: The Hindee story Teller, Vol-II, 1802, P. 7.
2. Gilchrist: The Oriental fabulist 1803, P. 5.
4. The Oriental Fabulist 1803 P. 5.
۳۔ بحوالہ ڈاکٹر عبدالودود اردو سے ہندی تک، ص ۳۰۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ ۱۹۷۶ء
5 The Hindee Roman Oethoepigraphical ---1804, P.19_

Marfat.com

۵ - پریم ساگر کو جو ایک بہت ہی خوبصورت کتاب ہے للّولال جی نے ہمارے طالب علموں کے لیے ہندوستانی کی تعلیم کے لیے، برج بھاشا کی خوبصورتی و پاکیزگی کے ساتھ کھڑی بولی میں، انگریزی ہندوستان کے، ہندو عوام کے وسیع طبقے کے، حقیقی استفادے کے نظریے سے لکھا ہے [1]

للّولال :-

۶- سمبت ۱۸۶۰ء میں للّوجی لال کوی برہمن گجراتی آگرے والے دِس کا سار لے، یامنی بھاشا (مسلمانی زبان) چھوڑ، دلّی آگرے کی کھڑی بولی میں کہہ، نام پریم ساگر دھرا [2]

۷ - اس میں جو پوتھیاں برج بھاشا و کھڑی بولی و ریختے کی گِنائی ہیں سب پرسِدھ ہیں [3]

سدل مسر

۸- اب سمبت ۱۸۶۰ء میں ناسکیتو پاکھیان کو جس میں چندراولی کی کتھا کہی ہے، دیوانی سے کوئی کوئی نہیں سمجھ سکتا، اس لیے کھڑی بولی میں کیا [4]

۹- گلکرسٹ نے ..... ایک دن آگیا دی کہ ادھیا تم رامائن کو ایسی بولی میں کرو جس میں فارسی عربی نہ آوے۔ تب میں اس کو کھڑی بولی میں کرنے لگا۔ [5]

گل کرسٹ نے کھڑی بولی کو ہندوستان کی اصل زبان کہا ہے، برج سے مختلف گردانا ہے اور اس میں عربی فارسی الفاظ سے احتراز پر زور دیا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ بول چال کی سہل ہندوستانی مراد لیتے ہیں۔ للّولال اس اصطلاح کو مغربی یوپی کی

---

[1] بحوالہ اردو سے ہندی تک صـ۳۱

[2] للّولال پریم ساگر

[3] للّولال: لال چندر کا صـ۳ - ۱۸۱۹ء

[4] سدل مِسر: ناسکیتو پاکھیان

[5] " " " صـ۲

Marfat.com

زبان کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یا منی بھاشا اور ریختے سے انھوں نے اردو مراد لی ہے۔ اردو اور برج بھاشا کو چھوڑ کر کھڑی بولی محض بول چال کی ہندوستانی رہ جاتی ہے۔ انھوں نے کمال یہ کیا کہ کھڑی بولی کو دلّی کے ساتھ آگرے سے بھی منسوب کر دیا۔ بہت ممکن ہے کہ اس وقت تک آگرے میں بھی کھڑی بولی شہری تہذیبی بولی ہو گئی ہو۔ سدل مسر نے کھڑی بولی سے مراد کھڑی بولی ہندی لی ہے جس میں عربی فارسی الفاظ کم سے کم ہوتے ہیں۔

کھڑی بولی کی وجہِ تسمیہ کیا ہے؟ اس کے مقابل کوئی پڑی بولی نہ تھی نہ یہ اصطلاح رائج ہے حالانکہ ہندی کے ادیب چندر دھر شرما گلیری نے 'پڑی' کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔

"ودیشی مسلمانوں نے آگرے، دلّی، سہارنپور، میرٹھ کی پڑی بھاشا کو کھڑی کر اپنے لشکر اور سماج کے اُپ یوگی بنایا"

لسانی اعتبار سے گلیری کا یہ قول بے مغز اور بے معنی ہے۔ آگرہ، دلّی سہارنپور کی بول چال کی زبان یکساں نہیں، نہ یہ 'پڑی' ہے۔ پڑی اور کھڑی کے معنی کیا ہیں؟

بنسی دھر ودیالنکار نے کہا کھڑی بولی، سنسکرت 'کھر' سے بنا جس کے معنی سخت، کٹھور، کھردرا ہے، جس میں نرمی نزاکت نہ ہو۔ [1]

راجا شیو پرشاد ستارۂ ہند نے بھی لکھا تھا کہ اس زبان کو صرف گنوارو آبادی میں برداشت کیا جا سکتا ہے۔ [2]

مولوی عبدالحق کی بھی ایسی ہی رائے ہے۔ لکھتے ہیں

'کھڑی بولی کے معنی ہندوستان میں عام طور پر گنواری بولی کے ہیں جسے ہندوستان کا بچّہ بچّہ جانتا ہے۔ وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ، [3]

---

[1] رسالہ اردو ۶۳۴ء۔ جلد ۱۴ ص ۷۷-۱۷۴ بحوالہ ڈاکٹر جیسوال: مانک ہندی کا ایتہاس ویاکرن (غیر مطبوعہ ہندی مقالہ) جلد ۱۔ ص ۲۰۷

[2] بحوالہ ڈاکٹر عبدالودود: اردو سے ہندی تک ص ۳۱

[3] رسالہ اردو جولائی ۶۳۳ء۔ ص ۵۹۰

Marfat.com

مولوی عبدالحق کا لسانیاتی شعور کمزور ہے۔ وہ ملک کی عام رابطے کی زبان ہندوستانی کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ کھڑی بولی ہی ہے جو مختلف علاقوں میں جا کر قدرے بدل جاتی ہے۔ اس کے لیے تحقیر کا کوئی مقام نہیں۔ گراہم بیلی نے مولوی عبدالحق کے مشاہدے پر اعتراض کیا تو عبدالحق نے کھڑی بولی کو برج بھاشا کے مقابل کیا جو صحیح تھا۔ کہا

"ہندی میں عموماً برج بھاشا میں نظم لکھی جاتی تھی اور اس میں جو مٹھاس اور لوچ تھا وہ کھڑی بولی میں نہیں تھا اور اس کا نام کھڑی بولی اس لیے رکھا گیا تھا کہ یہ بولی سخت تھی اور کانوں کو اتنی میٹھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔"[1]

ڈاکٹر دھریندر ورما نے بھی کہا

"برج بھاشا کی نسبت واستو میں کھڑی سی لگتی ہے۔"[2]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں

"دراصل کھڑی بولی کے تصور کے لیے برج بھاشا کا پس منظر ضروری ہے۔ ایک کا تعلق (آ) گروہ کی زبانوں سے ہے اور دوسری کا (اُو) گروہ والیوں سے۔ اگر یہ کہا جائے کہ برج بھاشا کے مقابلے میں یہ کھڑی لگتی ہے تو بات ذرا عقلیات کے دائرے سے نکل کر حسیات میں آجاتی ہے ..... یہی وجہ ہے کہ بندیل کھنڈ میں اسے ٹھاڑ بولی اور مارواڑ میں اسے 'ٹھاٹھ' بولی کہتے ہیں۔ ٹھاڑ اور ٹھاٹھ دونوں کا مفہوم کھڑا ہوتا ہے ..... یہی کھڑا لہجہ ہریانے کے علاقے اور جاٹوں کی زبان میں اکھڑ بن جاتا ہے۔"[3]

گو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ذکر نہیں کیا لیکن بندیل کھنڈ اور مارواڑ کا ذکر ڈاکٹر گراہم بیلی کے مضمون شائع شدہ بلیٹن اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز جلد ۸ صـ ۳۶۴ سے لیا گیا ہے "ٹھاڑ" کے معنی 'کھڑا' ہونا چاہیے لیکن کیا ٹھاٹھ' کے معنی بھی 'کھڑا' ہیں؟ میں نہیں کہہ سکتا۔ 'آ' کے لہجے کو کھڑا ماننا رسم الخط کا پیدا کیا ہوا مغالطہ ہے۔ اردو میں 'آ' اور ہندی میں 'ا' کی

---

[1] اردو اپریل ۳۷ء صـ ۴۶۳

[2] ہندی بھاشا کا اتہاس صـ ۶۳

[3] مقدمہ تاریخ زبان اردو طبع ششم ۱۹۷۸ء۔ صـ ۲۲۹

Marfat.com

ماترا دونوں کھڑے ڈنڈے کی طرح ہوتی ہیں لیکن صوتیاتی اعتبار سے دیکھیے تو 'آ' کہتے وقت زبان بالکل مسطح حالت میں ہوتی ہے اور سب سے نیچے پڑی رہتی ہے جب کہ 'اُو' کہنے میں قدرے اوپر کو اٹھتی ہے۔ ہاں کھڑے کے معنی اکھڑ اور درشت لیے جائیں تو دوسری بات ہے اور یہ درشتی 'آ' کے لہجے سے نہیں بلکہ تشدید اور معکوسی آوازوں کی کثرت کی وجہ سے ہے۔ برج میں تشدید بہت کم ہے، کھڑی بولی میں اس سے زیادہ، ہریانی میں اور زیادہ اور پنجابی میں ان سب سے زیادہ۔ اس کے علاوہ کھڑی کے 'ڑ' کی جگہ برج میں بیشتر 'ر' آتی ہے، کھڑی کے 'ڈ' 'ڈھ' کی جگہ 'ڑ' 'ڑھ' سے کام چلایا جاتا ہے مثلاً کھڑی کے سانڈ، گڈریا کو برج میں سانڑ، گڑریا کہا جائے گا۔ شدید اور ثقیل آوازوں کی کمی کی وجہ سے برج کھڑی سے زیادہ شیریں ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنی کتاب "اردو کی کہانی" لاہور ۱۹۷۵ء میں ایک نیا ہی نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ مشرقی سی۔پی (انگریزی عہد کا سنٹرل پراونس یا صوبۂ متوسط، جو بڑی حد تک موجودہ مدھیہ پردیش ہے) کو کھڑ دیس کہتے ہیں۔ اس کا حدود اربعہ یہ ہے

مشرق میں اڑیسہ، شمال میں چھتیس گڑھ، جنوب میں تلنگانہ

اس طرح یہ علاقہ موجودہ مدھیہ پردیش کا جنوبی ضلع جگدل پور رہا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس علاقے کو ماضی میں کھڑ دیس کہتے ہیں۔ سہیل بخاری کہتے ہیں 'کھڑی' کے معنی ہیں 'کھڑ دیس کی بولی'۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اس علاقے میں ایک بولی 'کھڑیا' نام کی ہے۔ 'ہو سکتا ہے کہ یہی اردو ہو'۔ ان کا قیاس یہ ہے کہ اردو کھڑ دیس کی کھڑیا بولی سے نکلی [1]

کھڑی بولی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ان کا قیاس اس لیے بے بنیاد ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں گلکرسٹ، للّو لال اور سدل مِسر نے اسے یہ نام دیا۔ ان کے ذہنوں میں نہ کھڑ دیس ہوگا نہ وہاں کی کھڑیا بولی۔ اردو کو اس سے ماخوذ کرنا اور بھی دور از کار ہے۔ جگدل پور غیر متمدن قبائل کا ضلع ہے۔ وہاں کی بولی اور اردو میں کون سی مشابہت ہے۔

کھڑی بولی کے سلسلے میں مناسب ہوگا کہ قبل مسیح دور کے مدھیہ دیش اور اس کے

---

[1] ڈاکٹر سہیل بخاری: اردو کی کہانی ص ۱۵۶۔ لاہور۔ ۱۹۷۵ء

Marfat.com

نزدیکی علاقوں کا جغرافیہ پیش کر دیا جائے ۔ اسے ڈاکٹر واسو دیو شرن اگروال نے ' پانینی کالین بھارت' (پانینی کے عہد کا ہندوستان) میں دیا ہے۔ یہاں ڈاکٹر ہردیو باہری کی کتاب گرامین ہندی بولیاں سے لے کر درج کیا جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں آریوں کے قبیلوں کو جَن اور ان کے اقامتی علاقے کو جَن پدیا راشٹر کہتے تھے۔ مدھیہ دیش میں ۱۲ مہا جَن پَد تھے۔ اس کے ملحقہ مرو پردیش کا بھی مدھیہ دیش سے گہرا تعلق تھا مدھیہ دیش کے ۱۳ جَن پدیہ ہیں۔

۱۔ کُرُو جَن پدیہ سب سے اہم تھا۔ اس کے دو حصّے تھے۔ جمنا کے مغرب میں کُرُوون یا کرو جانگل یا کرو کشیتر (ہریانہ) تھا جسے منو نے برھما ورت کہا ہے۔ یہ سرسوتی اور گھگھر ندی کے بیچ تھا۔ بعد میں اس کی توسیع ہوئی۔ اس کی راجدھانی اندر پرست یعنی موجودہ دلی تھی۔ جمنا کے مشرق میں کرو پردیش ہے جس کی راجدھانی ہستناپور تھی جو میرٹھ کے قریب ہے۔ بعد میں یہ دونوں جن پد مل کر ایک ہو گئے۔ ان کی راجدھانی دلّی بن گئی۔

۲۔ پانچال۔ موجودہ قنوج سے کچھ دور مغرب میں گنگا کے کنارے اس کی راجدھانی تھی۔ شمالی پانچال بریلی کے آس پاس اور جنوبی پانچال فرّخ آباد کے آس پاس تھا۔ شمالی کی راجدھانی اہی چھیتر (جو اب بھی جینیوں کا تیرتھ ہے) اور جنوبی کی راجدھانی قنوج تھی۔

۳۔ شورسین۔ پہلے اس کی راجدھانی متھرا تھی۔ بعد میں آگرہ ہو گئی۔ اس کی زبان شورسینی کہلائی۔

۴۔ متسیہ۔ یہ شورسین کے جنوب مغرب میں تھا۔ اس کی راجدھانی ڈھنڈھاڑ (موجودہ جے پور) تھی۔

مندرجہ بالا چاروں جَن پدوں کو مِلا کر برھم رشی دیش کہتے تھے۔

۵۔ مَرو جو متسیہ کے مغرب میں تھا۔ اسے اب مارواڑ کہتے ہیں۔ مرو کے معنی ریگستان ہیں۔

۶۔ اونتی۔ اسے بعد میں مالوہ کہا گیا۔ اس کی راجدھانی پہلے وِدیشا پھر اجین اور آخر میں دھار ہوئی۔

۷۔ چیدی۔ یہ چھوٹا جن پد تھا۔ اس کی بولی بندیلی ہے۔ اس کا مرکز اوڑچھا تھا۔

Marfat.com

۸۔ وَتس یا بگھیل کھنڈ۔ یہ کوسل دیس کے بیچ میں تھا۔

۹۔ کوسل۔ اس کے دو حصّے تھے۔ شمالی کوسل کی راجدھانی ساکیت یعنی ایودھیا۔ بعد میں فیض آباد تھی۔ جنوبی کوسل موجودہ چھتیس گڑھ ہے۔ اسے اسلامی دور میں گونڈ وانا کہتے تھے۔

۱۰۔ مَلّ۔ اس کا مقام موجودہ گورکھپور ہے۔ اس کی راجدھانیاں کُشی نگر اور پاوا (پاواپوری بہار میں جینیوں کا تیرتھ ہے) تھیں۔

۱۱۔ کاشی۔ اس کی راجدھانی وارانسی ہے۔ اس جَن پد نے پھیل کر متّل کو اپنے اندر ضم کر لیا اور دونوں کی راجدھانی وارانسی رہی۔

۱۲۔ مگدھ۔ کاشی کے مشرق میں مگدھ جَن پد تھا۔ دوسری طرف انگ تھا جو موجودہ بھاگلپور ہے۔ انگ ٹوٹ کر مہتھلا (وجّی) اور بنگال میں مل گیا۔

۱۳۔ درجی یا وجّی۔ اس کی راجدھانی ویشالی تھی۔ اس میں آٹھ ذیلی جَن پد تھے جن میں لچھوی اور ودیہہ قابل ذکر ہیں۔ ودیہہ ہی مِتھلا ہے۔ یہاں کی زبان میتھلی کہلائی جس طرح گوتم بدھ کا تعلق مگدھ سے ہے اسی طرح جینیوں کے مہابیر سوامی لچھوی کے رہنے والے تھے۔

ان ۱۳ جَن پدوں میں موجودہ ہندی پردیش یعنی دلّی، ہریانہ، راجستھان، یوپی، بہار، مدھیہ پردیش کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ مجھے اس میں شک ہے کہ اس پورے علاقے کو مدھیہ دیش کہتے تھے۔ جن پہلے چار جن پدوں کو ملا کر برھم رشی دیش کہا گیا ہے وہی اصلی مدھیہ دیش تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ اب بھی عظیم ہندی علاقے کی بولیاں انھیں جن پدوں سے ملتی جلتی ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں راہول سانکرتاین نے لسانی صوبوں کو جن پدوں کے مطابق تقسیم کرنے کا سجھاؤ دیا۔ اس میں کھڑی بولی کی دو راجدھانیاں ہوتیں میرٹھ اور دلّی۔ اودھی کی لکھنؤ اور الہ آباد بھوج پوری کی بنارس اور چھپرا۔ [1]

دھریندر ورما کے مطابق کُرُو جن پد انبالہ، دلّی، میرٹھ اور بجنور کے آس پاس تھا جو کھڑی بولی کا علاقہ ہے۔ راہول سانکرتاین نے یہاں کی بولی کو 'کوروی' نام دیا۔ ڈاکٹر

---

[1] ڈاکٹر رام بلاس شرما: بھاشا اور سماج (ہندی) ص ۱۱۴ اور اس کے بعد

Marfat.com

ہردیو باہری اس علاقے کی علاقائی کھڑی بولی کو 'کوروی' اور ملک بھر کی رابسطے کی زبان کو کھڑی بولی کہنا پسند کرتے ہیں[1] لیکن راہول سانکرتاین ہوں یا ہردیو باہری زبانوں کے نام کسی کے کہنے پر نہیں رکھے جاتے۔ اب کوئی امید نہیں کہ مغربی یوپی کی زبان یا بولی کو کوئی کوروی، کہے گا۔

فورٹ ولیم کالج میں پریم ساگر چھپی تو اس کے سرورق پر کھڑی کو انگریزی میں Khari لکھا تھا جسے کھڑی اور کھری دونوں پڑھا جا سکتا ہے بعض حضرات 'ڑ' کے لیے انگریزی حرف d لکھنا پسند کرتے ہیں اور وہ کھڑی کو Khadi لکھتے ہیں۔ اس لیے پریم ساگر کی Khari کو بہتوں نے کھری پڑھ لیا۔ گلکرسٹ نے انیسویں صدی کے آغاز میں اسے ہندوستان کی Sterling Tongue کہا تھا۔ اسٹرلنگ کے معنی کھری، مصدقہ، ٹکسالی، معیاری ہیں۔ بیلی کے نزدیک کھڑی کو کھری بنانا مغربیوں کا کام تھا۔ چندر بلی پانڈے نے کھڑی کی اس طرح تاویل کی کہ اسے سچ مچ کھری کے مفہوم میں لے لیا۔ وہ ایک جملہ 'چاول کھڑا رہ گیا'، کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ اس میں کھڑا کے معنی کچا یا اصلی حالت میں ہیں۔ اس طرح کھڑی بولی فطری، ٹھیٹ یا خالص بولی کو کہتے ہیں۔ پانڈے شاید اسے ٹھیٹ یا خالص اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کی آمیزش نہیں۔

کھڑی بولی کی سرپرستی اور ترقی میں مسلمانوں اور اردو والوں کا خاص ہاتھ تھا۔ چندر دھر شرما گلیری کے مشاہدے کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"کھڑی بولی یا پکّی بولی یا ریختہ یا جدید ہندی کے ابتدائی عہد کی نثر و نظم کو دیکھ کر یہی جان پڑتا ہے کہ اردو تخلیق میں فارسی عربی تت سموں یا تدبھووں کو نکال کر سنسکرت یا ہندی تت سم اور تدبھو رکھنے سے ہندی بنالی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہندو تو اپنے گھروں کی صوبائی بولی میں رنگے تھے، ان کی روایتی شیرینی انھیں عزیز تھی۔ باہری مسلمانوں نے آگرہ، دلّی، سہارنپور اور میرٹھ کی پڑی بھاشا کو کھڑی کر اپنے لشکر

---

[1] ہندی کی گرامین بولیاں ص ۱۴۱ - الہ آباد - ۱۹۶۶ء

Marfat.com

اور سماج کے لیے مفید بنایا۔ کسی صوبائی بھاشا سے ان کو روایتی لگاؤ نہ تھا۔ ان کی بھاشا عوام کی یا قومی زبان ہو چلی۔ ہندو اپنے اپنے صوبوں کی بھاشا کو نہ چھوڑ سکے۔ اب تک یہی بات ہے۔ ہندو گھرانوں کی بولی صوبائی ہے خواہ لکھا پڑھی اور ادب کی زبان ہندی ہو۔ مسلمانوں میں بہتوں کے گھر کی بولی کھڑی بولی ہے۔ درحقیقت اردو کوئی بھاشا نہیں ہے، ہندی کی ذیلی بولی ہے لیکن ہندوئی زبان کا کام مسلمانوں نے بہت کچھ کیا۔ اس کی عمومیت بھی انھیں کی مہربانی سے ہوئی۔ پھر ہندوؤں میں بیداری ہونے پر انھوں نے ہندی کو اپنا لیا۔ ہندی نثر کی بھاشا للولال جی کے وقت سے شروع ہوئی ہے۔ اردو نثر اس سے پرانی ہے۔ کھڑی بولی کی شاعری ہندی میں نئی ہے۔ ابھی تک برج بھاشا بنام کھڑی بولی کا جھگڑا چل ہی رہا تھا، اردو نظم کی بھاشا اس کے بہت پہلے ہو گئی ہے۔ پرانی ہندی نثر اور نظم کھڑے روپ میں مسلمانی ہے۔ ہندو شاعروں کی یہ روایت رہی ہے کہ ہندو کرداروں سے صوبائی بھاشا کہلاتے تھے اور مسلمان کرداروں سے کھڑی بولی"۔ [1]

اس قول میں اردو بے زاری یا مسلم بے زاری سہی لیکن انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ کھڑی بولی کا فروغ اردو اور مسلمانوں کی بدولت ہوا۔ ہندی نے اردو کے بعد کھڑی بولی کو اختیار کیا۔ وہ تو بھوے سے یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ جدید ہندی اردو میں سے فارسی عربی الفاظ نکال کر اور سنسکرت الفاظ شامل کر کے بنی ہے لیکن آگے معلوم نہیں کیوں یہ کہہ جاتے ہیں کہ اردو ہندی کی ذیلی بولی ہے۔ گویا اردو سے ہندی بنی اور ہندی سے اردو۔ یہ الجھے ہوئے ذہن کا غماز ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندی رسالوں میں زوروں میں بحث چل رہی تھی کہ ہندی ادب اپنے اظہار کے لیے کھڑی بولی کو اپنائے یا برج کو۔ رادھا چرن

---

[1] بحوالہ پدم سنگھ شرما: اردو ہندی اور ہندوستانی (ہندی کتاب) ص ۳۰ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۵۱ء۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔

Marfat.com

گوسوامی نے ہندوستھان بابت ۵ جنوری ۱۸۸۸ء میں جو لکھا، اردو ترجمے میں ملاحظہ ہو

"ہم اندازہ کرتے ہیں کہ اگر کھڑی بولی کی کوشش کی جائے تو پھر کھڑی بولی کی جگہ تھوڑے دنوں میں خالی اردو کی شاعری کا پرچار ہو جائے۔ ادھر سرکاری کتابوں میں فارسی الفاظ گھس ہی پڑے ہیں، ادھر شاعری میں بھی فارسی بھری گئی تو سہل ہی جھگڑا نپٹا۔" [1]

ڈاکٹر کپل دیو سنگھ اپنی کتاب 'برج بھاشا بہ نام کھڑی بولی' میں لکھتے ہیں

"برج بھاشا دکھڑی کے جھگڑے میں ڈر تھا کہ اردو کی نقل کرتے کرتے ہندی کوی اردو کے کوی نہ ہو جائیں"۔ [2]

ہزاری پرشاد دویدی نے امرت پتر کا بابت ۱۱ اپریل ۱۹۵۳ء میں لکھا

"شروع شروع میں کھڑی بولی مسلمانوں کی بھاشا مانی جاتی تھی۔ بعد میں بیدار ہندو مصنفوں نے اسے اس وصف سے آزاد کیا"۔ [3]

ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے کھڑی بولی کی نوعیت کے بارے میں یہ رائے دی ہے

"A peculer thing about Khari Boli Hindi is that those who speak or use it as an inheritance having this language as the language of the house. have for the last 250 years shown a decided preference for perso-Arabic words and now do not feel happy once the highly Sanskritized Hindi which is being proposed as the pan-Indian official language."

ہندی کے ابتدائی محققین نے کھڑی بولی کے آغاز کے بارے میں بھی قیاس آرائیاں کی ہیں۔ چوں کہ یہ لوگ تاریخی لسانیات سے نابلد تھے اس لیے لال بجھکڑ کی طرح قیاس

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر کپل دیو سنگھ: برج بھاشا بہ نام کھڑی بولی۔ ونود پستک بھنڈار۔ اسپتال روڈ آگرہ۔ طبع اول مئی ۵۶ء

[2] " " "

[3] بہ حوالہ برج بھاشا بہ نام کھڑی بولی

Marfat.com

اور تاویل کرتے ہیں۔

بابو جگن ناتھ داس رتنا کرنے ہندی ساہتیہ سمیلن کے بیسویں اجلاس منعقدہ کلکتہ میں کھڑی بولی کی پیدائش برج بھاشا اور پنجابی کے میل سے مانی ہے[1]۔ پنڈت شونراین شکل سرس نے رسالہ سدھا بابت جولائی ۴۴ء میں لکھا ہے کہ "کھڑی بولی اردو اور برج بھاشا کے میل سے بنی۔ فعل اور فاعل اردو کے اور دوسرے لفظ برج بھاشا کے ہیں"[2]

ظاہر ہے کہ سرس جی کو تاریخی لسانیات کا کوئی شعور نہیں۔ وہ اردو اور کھڑی بولی کی تقدیم و تاخیر کا معکوس نظریہ رکھتے ہیں۔ ان سے بھی زیادہ عجیب بلکہ سچ مچ لال بجھکڑانہ نظریہ لالہ بھگوان دین کا ہے۔

فارسی میں کچھ برج، کچھ بانگڑو کی ٹیک لگا کر کھڑا کر دیا گیا اور اس کا نام پڑ گیا کھڑی بولی[3]

لالہ جی کو فارسی اور اردو کا فرق معلوم نہیں۔ چندر دھر شرما گلیری نے بھی کہا تھا کہ کھڑی بولی یا موجودہ ہندی، اردو تخلیقات میں سے عربی فارسی الفاظ نکال کر سنسکرت ہندی الفاظ رکھنے سے بنائی گئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کھڑی بولی گلکرسٹ کا دیا ہوا نام ہے جو اس نے ہندوستان کی عام رابطے کی، بول چال کی زبان کو دیا۔ اس کا لسانیاتی مفہوم ایک دوسرے مستشرق گریرسن نے متعین کیا اس نے لسانیاتی جائزۂ ہند میں مغربی ہندی کی پانچ بولیاں قرار دیں جن میں اہم ترین کھڑی بولی ہے۔ اس کی حدود اربعہ یہ ہیں۔

ہماچل میں کیلسا کے مشرق و جنوب میں، ضلع انبالہ کا مشرقی حصہ، یوپی میں ضلع دہرہ دون کا میدانی علاقہ، ضلع سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، ضلع بلند شہر کا شمالی حصہ ضلع بجنور، مراد آباد اور ضلع رام پور۔

اس علاقے میں یہ شہروں اور دیہاتوں کی واحد بولی ہے۔ دوسرے علاقوں میں شہروں اور مہذب سوسائٹی میں اس کا دخل ہو گیا ہے لیکن ان علاقوں میں کہیں بھی

---

[1] بحوالہ برج بھاشا بہ نام کھڑی بولی صہ ۴۵ تا ۴۹

[2] " " " "

[3] بحوالہ ڈاکٹر جیسوال: مانک ہندی کا اتہاسک دیا کرن جلد اوّل صہ ۲۹۹۔ غیر مطبوعہ نسخہ

Marfat.com

عوامی بولی نہیں، وہ لکھنؤ ہو کہ بنارس کہ حیدر آباد۔

جدید ماہرین لسانیات عام طور سے یہ مان کر چلتے ہیں کہ مغربی ہندی شورسینی اَپ بھرنش سے پیدا ہوئی۔ اہلِ اردو میں سب سے پہلے شوکت سبزواری نے یہ خیال ظاہر کیا کہ شورسینی سے کھڑی بولی پیدا نہیں ہوئی، برج ہوئی ہے۔ برج کو کھڑی بولی کی نہ ماں کہا جا سکتا ہے نہ بہن[1] انھوں نے ایک طرف کھڑی بولی اور دوسری طرف شورسینی اَپ بھرنش و شورسینی پراکرت کے بہت سے اختلافات دکھا کر دعوا کیا کہ کھڑی بولی ان سے ماخوذ نہیں[2]۔ الہ آباد یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ ہندی، ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے نے مجھ سے کہا کہ یہ نظریہ کہ کھڑی بولی شورسینی سے ماخوذ ہے کب کا باطل ہو گیا، یہ صرف اردو والوں میں باقی ہے۔ راہول سانکرتاین نے کھڑی بولی کو کوروی اَپ بھرنش سے ماخوذ کیا ہے لیکن یہ کوروی تھی کہاں؟ یہ راہول کی ایجاد کی ہوئی اَپ بھرنش ہے جس کا نہ کوئی نمونہ موجود ہے نہ کہیں اس کا نام آیا ہے۔

ڈاکٹر ماتا بدل جیسوال نے کھڑی بولی کی دو خصوصیات گنوائیں:

۱- بہت سے الفاظ کا آ پر ختم ہونا۔

۲- حال کے صیغے میں آتا ہے، کرتا ہے وغیرہ

آ کا لہجہ اُو والی شورسینی سے ماخوذ نہیں ہو سکتا۔ آ کی مختلف تاویلیں حسب ذیل ہیں:

۱- ڈاکٹر اودے نرائن تواری اسے پنجابی کا اثر بتاتے ہیں۔ ان کے مطابق پنجابی میں یہ دَردی یا پیشاچی یا کیکئی اپ بھرنش سے آیا لیکن کیکیہ (کیکئی) اپ بھرنش یا دردی میں مذکر میں آ کی مثالیں نہیں ملتیں۔

۲- سنسکرت کا لاحقہ "ک" آ میں بدلا مثلاً گھوٹک، > گھوڑا۔ گردبھک > گدھا۔ لوہک، > لوہا۔ مستک، > ماتھا۔ شوکت سبزواری بھی یہی مانتے ہیں[3]

---

[1] اردو زبان کا ارتقا ص ۱۰۲

[2] داستانِ زبان اردو ص ۱۱۵ تا ص ۱۱۸ چمن بک ڈپو۔ دلّی۔

[3] اردو زبان کا ارتقا ص ۱۰۸

Marfat.com

۳۔ سنسکرت وِسرگ (آخر میں آنے والی ہائے مختفی یا حرکت کی ماترا) آبن گیا لیکن یہ ادبی زبان میں تھا۔ بولی ادبی زبان سے متاثر نہیں ہوتی۔

۴۔ بعض کے نزدیک فارسی 'آ' کا اثر ہے لیکن اگر یہ اسلامی اثر ہوتا تو سب سے پہلے سندھ میں ظاہر ہوتا لیکن سندھی 'اُو' آخر والی زبان ہے۔ خود فارسی میں بھی افعال کا خاتمہ 'آ' پر نہیں ہوتا۔

جیسوال 'آ' کو ٹکّی یا ٹاکّی یا ٹکری اَپ بھرنش سے ماخوذ کرتے ہیں۔ مارکنڈے کی ۲۷ اَپ بھرنشوں میں ٹکّی بھی شامل ہے۔ راج شیکھر نے دسویں صدی میں کاویہ میمانسہ میں لکھا ہے کہ ٹکّی ٹک اور بھاڈنک یا بھادانک دیس کی بولی تھی۔ ٹک سے مراد مشرقی پنجاب (موجودہ ہریانہ اور ہندوستانی پنجاب) ہے اور بھادانک دلّی میرٹھ کا علاقہ تھا۔ ٹکّی کے نمونے نہیں ملتے۔ گیارھویں صدی میں ایک مصنّف راول کیلی (رمفتوح، الف مفہوم، واؤ معروف نیز کیلی میں یائے مجہول) کئی خطّوں کی محبوباؤں کے بعد ٹکّی محبوبہ کا بیان کرتا ہے۔ اس مختصر بیان میں دو مذکّر الفاظ 'آ' پر ختم ہوتے ہیں: کبڈا، بچھڑا۔ اس کے علاوہ آٹھویں صدی کی ایک کتاب کُوَلیہ مالا میں مدھیہ دیش کی بھاشا میں تیرے، میرے، لفظ ملتے ہیں جو ٹکّی اپ بھرنش کے ہو سکتے ہیں۔ ان الفاظ کو دیکھ کر ڈاکٹر ماتا بدل جیسوال نے نتیجہ نکالا کہ کھڑی بولی ٹکّی اَپ بھرنش سے نکلی ہے[1]

اس نظریے پر دو اعتراض ہیں۔ اوّل تو یہ کہ محض دو الفاظ کی بنا پر ٹکّی اَپ بھرنش کی 'آ' والی خصوصیت طے کرنا اور صرف ان الفاظ کی وجہ سے کھڑی بولی کو ٹکّی سے ماخوذ کرنا مناسب نہیں۔ واضح ہو کہ راول کیلی کی مندرجہ بالا چند سطور کے سوا ٹکّی اپ بھرنش کا کوئی نمونہ محفوظ نہیں۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ٹک مشرقی پنجاب کا نام تھا۔ ظاہر ہے ٹکّی مشرقی پنجاب کی اَپ بھرنش تھی جو جمنا کے پورب میں نہیں تھی۔ راج شیکھر کی شہادت پر اسے بھادانک یعنی مغربی یوپی تک بڑھا لیا گیا تاکہ اسے کھڑی بولی کے علاقے پر منطبق کیا جا سکے۔ اگر ٹکّی کھڑی بولی کا ماخذ ہے تو مشرقی پنجابی، ہریانی اور کھڑی بولی کا ایک خاندان یا گروہ ہوگا اور برج، قنوجی اور بندیلی کا دوسرا گروہ۔ اس طرح

---

[1] ڈاکٹر جیسوال کا مقالہ جلد اوّل ص ۴۴۵

Marfat.com

مغربی ہندی کا گروہ ٹوٹ جائے گا۔ گریرسن اور چٹرجی جیسے ماہرین کے فیصلے کے برخلاف ہمیں مغربی ہندی کے زمرے سے انحراف کی مجال نہیں۔ ٹکّی کو کھینچ تان کر مشرق میں میرٹھ تک بھی لے آیا جائے تو بھی وہ کسی طرح گنگا کے پورب میں بجنور، مرادآباد اور رامپور تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس طرح نہ صرف مغربی ہندی کے زمرے کے، بلکہ کھڑی بولی کے علاقے کے بھی حصّے بخرے ہو جائیں گے۔ میرٹھ کی بولی لاہور کی بولی کے ساتھ ایک گروہ میں آجائے گی اور مرادآباد کی بولی سے مختلف قرار دی جائے گی حالانکہ لاہور کی زبان اور میرٹھ کی زبان میں وہ قرب نہیں جو لاہور کی زبان اور مغربی پنجاب کی زبان میں ہے۔ اس طرح ٹکّی کو کھڑی بولی کے مغربی علاقے (گنگا جمنا کے دوآبے) پر مسلّط کرنا تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ٹک علاقے کی اَپ بھرنش میرٹھ اور رام پور وغیرہ کی کھڑی بولی کو جنم نہیں دے سکتی۔

اہلِ اردو کے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کھڑی بولی کس اَپ بھرنش سے نکلی جب کہ ہندی سنسکرت کے علما میں بھی اتفاق نہیں۔ ڈاکٹر بابورام سکسینہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر رہ چکے ہیں، ساگر یونیورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر تھے، تاریخی لسانیات کے ماہر ہیں، ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر رہ چکے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کھڑی بولی کس اَپ بھرنش سے نکلی ہے۔ انھوں نے جواب دیا: "بھائی میں نہیں جانتا ڈاکٹر ہردیو باہری سے پوچھو۔" جب ڈاکٹر بابورام سکسینہ جیسا سنسکرت، پراکرت و اَپ بھرنش اور لسانیات کا عالم اس کے بارے میں کچھ نہ کہنا چاہے تو ناواقفان اردو کیوں کر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ہم اَپ بھرنش کا نام لیے بغیر یہی کہہ سکتے ہیں کہ اَپ بھرنشوں کے آخری دَور میں دلّی، میرٹھ، مرادآباد، رام پور وغیرہ میں جو اَپ بھرنش بولی جاتی تھی کھڑی بولی اسی کا ترقی یافتہ روپ ہے۔ ہم اس اَپ بھرنش کو نام نہیں دے سکتے۔ ہو سکتا ہے یہ مشرقی پنجاب کی ٹکّی اَپ بھرنش اور آگرہ کی شورسینی اَپ بھرنش کے بیچ کا کوئی روپ ہو۔

اب کھڑی بولی کی کچھ مبیّنہ خصوصیات اور اس کے دو علاقائی حصّوں پر غور کیا جاتا ہے۔ ژول بلوک اور ان کے بعد ڈاکٹر رام بلاس اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کھڑی بولی کے دو حصّے کیے ہیں۔ ایک میں گنگا جمنا کے دوآبے کے اضلاع سہارنپور، مظفرنگر، میرٹھ اور اب ضلع غازی آباد شامل ہیں۔ دوسرے میں موجودہ مرادآباد کمشنری ہے جو تین ضلعوں بجنور، مرادآباد اور رام پور پر مشتمل ہے۔

Marfat.com

پہلے حصّے کی زبان کو ڈاکٹر رام بلاس شرما ہریانوی ہی کا ایک روپ مان کر اسے "کرو جن پد کی بانگرو بھاشا" کہتے ہیں۔[1] دوسری طرف ڈاکٹر امبا پرشاد سُمن کا خیال ہے۔

"موجودہ ہند آریائی زبانوں میں سے جس صوبائی زبان سے علاقائی کھڑی بولی میل کھاتی ہے وہ پنجابی بھاشا ہے۔"

(ہندی کتاب، ص۱۵۳)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں مطلع کرتے ہیں۔

"ہندوستانی کے بارے میں گریرسن اور لائل دونوں کی رائے یہی ہے کہ بولی ہندوستانی کا ڈول اور کینڈا دیگر بولیوں کی بہ نسبت برج سے زیادہ قریب ہے۔"[2]

"گریرسن نے اسے [کھڑی بولی کو] برج بھاشا کا ایسا روپ مانا ہے جو پنجابی میں بتدریج ضم ہوتا چلا گیا ہے۔"

(مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو طبعِ ہفتم ص۶۸)

گویا کھڑی بولی کو مختلف حضرات نے برج، ہریانی اور پنجابی سے نزدیک بتایا۔ بولی جغرافیے کا قاعدہ ہے کہ ایک زبان یا بولی کے کچھ خصائص پڑوس کی زبان یا بولی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس آخر الذکر میں صرف ایک زبان ہی کے نہیں بلکہ دوسرے اطراف پر واقع دوسری زبانوں کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ پنجابی کے کچھ خصائص ہریانی میں پائے جاتے ہیں اور ہریانی کے بعض خصائص کھڑی بولی میں مثلاً تشدید کی افراط دوسری طرف کھڑی بولی میں برج کی خصوصیات بھی ملتی ہیں مثلاً سے، نے کو فتح اوّل سے بولنا یا کرتا ہے، کرتا ہوں کی جگہ کرے ہے، کروں ہوں، کا استعمال۔ کھڑی بولی کے بعض خصائص دیکھ کر کوئی اسے برج سے مماثل قرار دیتا ہے کوئی ہریانی سے۔

گریرسن نے لسانی جائزۂ ہند کے لیے ملک کے مختلف ضلعوں کے کلکٹروں اور پٹواریوں

---

[1] بھارت اور پراچین بھاشا پریوار جلد اوّل ص۲۳۸ بحوالہ مسعود حسین خاں ص۲۴۷

[2] لسانیاتی جائزۂ ہند جلد سہم حصّہ اوّل اور انسائیکلو پیڈیا برٹینکا بحوالہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں، طبع ہفتم ص۶۹

Marfat.com

سے فراہم کردہ معلومات کی بنا پر ہندوستان کی زبانوں اور بولیوں کی تعیّن کی۔ اس وقت سے آبادی کی نوعیت بدل گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ لسانیات جاننے والے حضرات ملک کا لسانیاتی جائزہ لیں۔ اس کی عدم موجودگی میں ملک کی بولیوں کے بارے میں بہت سے امور دھندلکے میں ہیں۔ اگر لسانیاتی طریقے پر بولی اٹلس بنایا جائے تو نقشے پر مختلف خصائص کے لسانی خط (Isogloss) کھینچے ہوں گے۔ اہم لسانی خطوط سے محصور مشترک علاقے کو ایک بولی یا ذیلی بولی کا علاقہ قرار دیا جائے گا۔ فی الحال بولیوں کے تعلق سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس میں حقیقت کے ساتھ قیاس کا بھی دخل ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کھڑی بولی کے جن دو علاقائی حصّوں کو تسلیم کیا ہے مجھے ان کی قطعیت میں شبہ ہے۔ وہ دو آبے کے اضلاع کو اضلاع مشدّدہ کہتے ہیں۔ میں ضلع بجنور کا رہنے والا ہوں۔ انھیں معلوم نہیں کہ تشدید ضلع بجنور کی ایسی خصوصیت ہے جس کے لیے یہاں کے باشندوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ عموماً مشدّد مصمتے سے پہلے مختصر مصوتہ ہوتا ہے۔ مثلاً کتّا، ڈبّا لیکن ضلع بجنور کی تشدید کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں طویل مصوتے کے بعد مشدّد مصمتہ آتا ہے مثلاً بوتّل، لوٹّا، بیٹّا، اونچّا، دیکھّا، ساتھّی۔ اس عمل میں ہوتا یہ ہے کہ طویل مصوتہ اپنا طول کھو کر دو ماترا کے بجائے ڈیڑھ ماترا کا بولا جاتا ہے اور بعد میں آنے والا مشدّد مصمتہ بھی دوہرے مصمتے سے کم ڈیڑھ مصمتے کے برابر بولا جاتا ہے مثلاً اہلِ بجنور بیٹّا کے ٹ کو اتنا طویل نہیں بولتے جتنا بٹّا کے ٹ کو۔ بولی کی منطق کون جان سکتا ہے۔ ہم بولی کی ل کو مشدّد بولتے ہیں لیکن 'گولی' کی ل کو نہیں۔ بولا کی 'ل' کو مشدّد کرتے ہیں، تولا کی ل کو نہیں۔

اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک تشدید کا سوال ہے دریائے گنگا حدِ فاصل نہیں۔ اس خصوص میں بجنور کی بولی مظفر نگر اور میرٹھ سے نزدیک تر ہے بہ نسبت مرادآباد کے۔ صوتی خصوصیات کا تدریجی فرق مغرب سے مشرق ہی کو نہیں چلتا بلکہ شمال سے جنوب کو بھی ہے اس لیے گنگا کو حدِ فاصل مان کر کھڑی بولی کے دو علاقے قرار دینا محلِ نظر ہے۔

کھڑی بولی کی جن صوتی خصوصیات کا ذکر ہندی کے اہلِ لسانیات اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کرتے ہیں وہ مجھے پریشان کرتا ہے کہ یہ کہاں کی کھڑی بولی کی

Marfat.com

خصوصیات ہیں۔ امباپرشاد سمن لکھتے ہیں

"کھڑی بولی کی طرح بانگرو میں بھی ٹ، ل اور ڈ کی نمایاں حیثیت ملتی ہے"

(صـ۱۲۱)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کہتے ہیں

"بولی ہندوستانی میں پنجابی، راجستھانی اور ہریانی کی طرح (ٹ) اور (ل) کا استعمال آزادی سے پایا جاتا ہے"

(صـ۹۹)

"پہلے فقرے میں 'بڈا'، کھڑی بولی کے تلفظ کے مطابق ہے"

(صـ۸۲)

آگے چل کر کھڑی بولی کی خصوصیات کے سلسلے میں وہ ذیل کی دو خصوصیات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

"اس کی سب سے بڑی خصوصیت معکوسی ٹ (ʈ) کا کثرت سے استعمال ہے۔

(صـ۲۵۰)

"معیاری اردو کے برعکس کھڑی /ڑ/ اور /ڑھ/ پر/ڈ/ اور/ڈھ/ کو ترجیح دیتی ہے"

(صـ۲۵۱)

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں میں ضلع بجنور کا باشندہ ہوں۔ سہارنپور، مظفر نگر اور میرٹھ میں میرے رشتے دار بھرے پڑے ہیں۔ میں ان ضلعوں میں شہروں اور قصبوں میں گیا ہوں، دیہات میں نہیں گیا — میں نے کہیں بھی 'بڑا' کو 'بڈا' بولتے نہیں سنا۔ کہیں یہ غلط فہمی اردو کی قدیم تحریروں سے تو نہیں ہوئی۔ وہاں 'ڑ' کو بھی 'ڈ' سے ادا کر دیا جاتا تھا۔ املا تلفظ کا صحیح ترجمان نہ تھا۔

میں نے ٹ اور ڑ بھی نہیں سنے۔ گنگا کے مشرقی اضلاع میں تو ان آوازوں کا سوال ہی نہیں۔ میں نے دوآبے کے اضلاع میں بھی یہ آوازیں نہیں سنیں۔ امباپرشاد سمن نے اپنی کتاب میں تحصیل باغپت، ضلع میرٹھ کے دو گاؤں کے دو جاٹ اور تیاگی لوگوں کی بات چیت کا نمونہ درج کیا ہے۔ اس میں ٹ پایا جاتا ہے، جس کے معنی ہیں کہ وہاں دیہات

Marfat.com

میں بولا جاتا ہوگا۔ انھوں نے کالڑ، دالڑ، بجلڑ جیسے الفاظ بھی دیے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ ان الفاظ میں لڑ بولا جاتا ہے یا محض 'ڑ' ایک بار ساگر کے گرمائی لسانیاتی اسکول میں میں نے ایک مراٹھی گو استاد لسانیات کے سامنے بیٹھ کر بار بار لڑ کی آواز نکالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ہر بار یہ کہا کہ میں یا تو 'ڑ' بول جاتا ہوں یا محض ل۔ اس کی وجہ سے میرا خیال ہے کہ کھڑی بولی کے بولنے والوں کے لیے ل بولنا ممکن ہی نہیں۔ جن صورتوں میں اسے لڑ سمجھا جا رہا ہے وہ محض 'ڑ' ہو سکتا ہے۔ چوں کہ ل کی آواز کو 'ڑ' میں بدلا گیا ہے اس لیے علمائے لسانیات اسے لڑ پر محمول کرتے ہوں گے۔

اس طرح ن ڑ، ل، ڈ کی ترجیح کھڑی بولی کی ایک اقلیت تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ گنگا کے مشرق میں تو یہ ہے نہیں۔ دوآبہ کے اضلاع میں بھی شہروں اور قصبوں میں بالکل نہیں ملتی، صرف دیہات میں ہوگی۔ دیہات کی مسخ شدہ بولی (Batois) کو کسی زبان کا نمایندہ روپ نہیں مانا جا سکتا۔

امبا پرشاد لکھتے ہیں کہ میرٹھ ضلع کی باغپت تحصیل کی بولی کھڑی بولی کی بہترین نمایندہ ہے (ص ۱۲۶)۔ شاید وہ ثقیل مصمتوں اور تشدید کی کثرت کی بنا پر ایسا کہہ رہے ہوں گے۔ جہاں تک صفائی زبان کا تعلق ہے آج مراد آباد کی کھڑی بولی بہترین ہے دلّی یا میرٹھ یا بجنور کے دیہاتیوں کی زبان اتنی صاف نہیں جتنی مراد آباد کے دیہات کی۔ یہاں تشدید کا عنصر سرے سے غائب ہے۔ بجنور کی بولی پر ہریانی کا اثر ہو سکتا ہے۔ بریلی کی بولی پر برج کا لیکن مراد آباد اور رام پور کی بولی خالص کھڑی بولی ہے جس پر پاس پڑوس کی بولیوں کا واضح اثر نہیں۔

ہندوستانی

یہ نام یوروپیوں کا دیا ہوا ہے لیکن اس سے پہلے ہم دکن میں اس لفظ کے استعمال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پیرس کے قومی کتب خانے میں ایک مخطوطہ افسانۂ ہندی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے یورپ میں دکھنی مخطوطات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہے۔

"شروع کرتا ہوں میں اس زبانِ ہندوستانی کو خدا کے نام سوں، کیسا خدا کہ

Marfat.com

اسمان وزمیں کتیں (کے تیئں) خدا اپنے کن فیکوں کے اشارہ سوں پیدا کیا ہے.....
تمام بزرگ اور زمانہ کہ (کے) دانش مندوں سیں عرض کرتا ہوں کہ اس
زبان ہندوستانی کہ (کے) درمیان کچے زبان کیسو صاحبان کے نظروں آوے اس
کتیں اپنے مبارک زبان سیں صحیح فرمانوں گے اور کہنے والا تقصیر نہ وں گے۔" [1]

اس کی زبان کے پیشِ نظر میرا اندازہ ہے کہ یہ کتاب اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصفِ دوم کی تصنیف ہو سکتی ہے۔ اس کی ابتدا میں دو جگہ' زبانِ ہندوستانی' آیا ہے۔ وجہی نے سب رس میں زبانِ ہنارو ستان کہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نسخے میں زبان ہندوستان' ہی لکھا ہو اور اسے نصیر الدین ہاشمی نے زبان ہندوستانی پڑھ لیا ہو۔ بہر حال اگر یہ' ہندوستانی' بھی ہے تو اسے شمالی ہند کی زبان کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ انگریزوں کے وضع کردہ لفظ ہندوستانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ابتدائی مستشرقین نے لغت اور قواعد کی کتابیں پرتگالی، لاطینی، ڈچ اور انگریزی میں لکھیں وہ ابتداءً اس زبان کو Indostan Language کہتے تھے ایک سیاح John Fryer نے ایک انگریز درویش ٹام کوریٹ Tom Coryate کا ذکر کیا ہے جو ۱۶۱۶ء میں ہندوستان میں تھا اور جسے انڈسٹان زبان پر پوری قدرت حاصل تھی[2]۔ عتیق صدیقی نے لکھا ہے کہ' ۱۶۳۰ء میں فارسی، ہندوستانی، انگریزی و پرتگالی لغت سورت میں مرتب کیا گیا[3]۔ لغت کے بارے میں مزید تفصیل نہیں دی لیکن ظاہر ایہ پرتگالی میں مرتب ہوئی ہوگی۔ اس میں ہماری زبان کے نام میں ہندوستانی یا اس کا مترادف پرتگالی لفظ رہا ہوگا۔ گریرسن کے بیان کے مطابق ایک یوروپی پادری Franciscuss M Turonensio نے ۱۷۰۴ء میں ہندوستانی زبان کی

---

[1] نصیر الدین ہاشمی: یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۶۲۴

[2] لکشمی ساگر وارشنے: فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۳ بحوالہ' عتیق صدیقی: گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۴۷

[3] گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۷۲

Marfat.com

کی ایک لغت ۱۷۰۴ء میں لکھی[1]۔ ایک زمانے میں اس کا مسوّدہ شہر روم کے کتب خانے میں محفوظ تھا مگر ۱۸۹۰ء میں گریرسن نے اس کی تلاش کی تو نہ مل سکا۔ اس کے بعد ہالینڈ کے باشندے جون جوشوا کیٹیلر (John Joshua Ketelaer) نے غالباً ۱۷۱۵ء میں لاطینی میں Lingua Hindostanica لکھی[2]۔ ۱۷۴۴ء میں جرمن پادری شُلز نے گرامیٹکا ہندوستانیکا لکھی[3]۔ اس کے بعد مختلف مستشرقین اس زبان کی قواعد اور لغت تیار کرتے رہے اور ان کی زبان کو ہندوستانی کہتے رہے۔

۱۷۸۵ء میں گلکرسٹ نے کمپنی سے اپنی انگریزی ہندوستانی لغت کے بارے میں مراسلت شروع کی۔ اس کی A Dictionary, English and Hindustani کی پہلی جلد ۱۷۸۶ء میں اور دوسری جلد ۱۷۹۰ء میں شائع ہوئی[4]۔ یہ جلدیں ڈاکٹر مختار الدین احمد کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں اور عتیق صدیقی نے اپنی کتاب کے آخر میں اس کے سرورق کا عکس دیا ہے۔ گویا ۱۷۸۶ء میں انگریزی میں پہلی بار اس زبان کے لیے ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد گلکرسٹ کی تصانیف میں متعدّد بار یہ لفظ ملتا ہے۔ اس نے ۱۷۹۶ء میں انگریزی میں ہندوستانی زبان کی قواعد شائع کی۔ فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی شعبہ قایم کیا گیا جس کا پروفیسر گلکرسٹ تھا۔ کلکتہ میں ہندوستانی پریس بھی قایم ہوا۔ اس کے بعد ہندوستانی لفظ عام ہو گیا ہندی کے مصنّفین یہ کہتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کی ہندوستانی دراصل

---

[1] گلکرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۴۹-۵۰ عتیق صدیقی نے اس بیان کے لیے رام بابو سکسینہ کی تاریخ کے حصّۂ نثر صفحہ ۵ کا حوالہ دیا ہے۔ مجھے اس تاریخ میں یہ بیان نہیں مل سکا۔

[2] رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو حصّۂ نثر صفحہ ۱۷۔ ایڈیشن ۱۹۵۲ء لکھنؤ حامد حسن قادری: داستانِ تاریخ اردو صفحہ ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۰ء آگرہ۔ نیز عتیق صدیقی صفحہ ۲۷۲

[3] رام بابو سکسینہ حصّۂ نثر صفحہ ۱۷۔ نیز عتیق صدیقی صفحہ ۲۷۲

[4] عتیق صدیقی صفحہ ۹۱

Marfat.com

اردو تھی۔ ڈاکٹر وراشنے لکھتے ہیں۔

"کمپنی نے جس ہندوستانی کو اپنایا تھا وہ عربی فارسی آمیز، خاص فہم ہندوستانی یا اردو تھی۔" [1]

چوں کہ کمپنی کے ہر ملازم کو فارسی سیکھنی پڑتی تھی اس لیے ہندوستانی لکھنے بولنے میں بھی وہ فارسی الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ہندی کے آغاز کے بعد مستشرقین نے ہندوستانی کا لفظ اردو کے لیے مخصوص کر دیا۔ برٹش میوزیم، انڈیا آفس وغیرہ کے اردو مخطوطات اور مطبوعات کی فہرستوں کو ہندوستانی مخطوطات و مطبوعات کی فہرست کہا جاتا ہے۔

بیسویں صدی میں ہندوستانی کا جدید مفہوم سامنے آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ گریرسن کا عطا کردہ ہے۔ اس نے لسانیاتی جائزۂ ہند جلد اوّل حصّہ اوّل باب ۱۵ میں کھڑی بولی کے دو روپوں اردو اور ہندی کا ذکر کیا ہے اس کے بعد اس نے ان دونوں کی قدرِ مشترک کا نام ہندوستانی قرار دیا۔ لیکن وہ کھڑی بولی کو بھی ورناکیولر ہندوستانی کہتا ہے۔ مہاتما گاندھی نے اسی کو اپنایا۔ یہ دونوں رسوم الخط یعنی دیوناگری اور اردو میں لکھی جا سکتی تھی۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مشکل عربی فارسی اور سنسکرت الفاظ نہیں لائے جاتے۔ ایسی زبان بات چیت اور قصّے کہانی کے لیے تو کفایت کر سکتی ہے لیکن علمی و ادبی موضوعات بالخصوص تکنیکی علوم کے لیے کافی نہیں ہوگی۔ وہاں عربی یا سنسکرت میں سے کسی ایک کا سہارا لینا ہوگا۔ بہر حال ہندوستانی سے مراد کھڑی بولی ہی ہے۔ ہمارے دستور میں دفعہ ۳۵۱ میں اس کا ذکر آگیا ہے۔

It shall be the duty of the Union to promote the spread of the Hindi language --- to secure its enrichment by assimilating without interfering with its genius, the forms, style and expression used in Hindustani and in the other languages of India specified in the Eighth Schedule.

---

[1] امپیریل گزٹیرس ہوم۔ مقالہ۔ جلد ۴۔ ص ۲۷۵-۲۷۶ بحوالہ جیسوال: مقالہ جلد اول ص ۱۸۴
یا وارشنے: فورٹ ولیم کالج ص ۸۶

Marfat.com

ہندی

انیسویں صدی کی ابتدا تک 'ہندی' نام اردو کے لیے مستعمل تھا۔ تلسی داس، سورداس، کبیر اپنی شاعری کی زبان کو محض بھاشا کہتے ہیں۔ سنسکرت کے مقابل پالی، پراکرت، اَپ بھرنش کو بھاشا کہا جاتا تھا۔ اس لیے بعد میں برج اور کھڑی بولی کو بھی بھاشا کہا گیا۔ رام پرشاد نرنجنی مصنف یوگ واشسٹ، دولت رام مؤلفِ پدم پران اور نشچل داس مصنفِ وچار ساگر اپنی کھڑی بولی کو بھاشا کہتے ہیں۔ اردو کے مصنفین بھی ہندی بہ شمولِ برج و اودھی کو بھاشا کہتے تھے۔ ڈاکٹر جیسوال نے اپنے مقالے میں ہندی زبان کے لیے ہندی کے استعمال کی قدیم ترین مثالیں یہ دی ہیں۔

۱۸۱۲ء میں کیپٹن ٹیلر نے لکھا۔

۱۔ "میں صرف ہندوستانی یا ریختہ کا ذکر کر رہا ہوں جو فارسی خط میں لکھا جاتا ہے میں ہندی کا ذکر نہیں کرتا جس کی اپنی پی ہے ..... جس میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال نہیں ہوتا اور مسلمانی حملے سے پہلے جو تمام شمال مغرب کی زبان تھی۔"

۲۔ ۱۸۱۴ء میں فورٹ ولیم کالج والے این۔ بی۔ ایڈمنسٹن (N. B. Edmond Stone) نے لکھا 'برج ہندی کی بولیوں میں ہے'

۳۔ ۱۱ر اکتوبر ۱۸۲۴ء کو ولیم پرائس نے خود کو ہندی کا پروفیسر کہا۔

اس تاریخ کے بہت بعد تک بعض حضرات اردو کے لیے بھی ہندی کا لفظ استعمال کرتے رہے۔ کھڑی بولی ہندی انیسویں صدی میں تشکیل پذیر ہوئی۔ گریرسن نے لسانیاتی جائزۂ ہند میں دو گروہ مغربی ہندی اور مشرقی ہندی قائم کیے جس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ یہ دونوں ایک زبان ہندی کی بولیاں ہیں حالانکہ خود گریرسن کا مقصود یہ نہ تھا۔ اس نے لسانیاتی جائزۂ ہند کی جلد اوّل حصّہ اوّل، باب پندرہ میں ہندی اردو کے بارے میں چند صفحات لکھے ہیں۔ وہاں اس نے واضح کیا کہ 'ہندی' سے دو معنی مراد لیے جاتے ہیں: ایک تو سنسکرت آمیز کھڑی بولی اور دوسرے پنجاب اور بنگال کے درمیان بولی جانے والی تمام بولیاں۔ پھر اس نے جلد ۹ میں کہا۔

Marfat.com

"ہندی نام عام طور سے ان تمام آریائی زبانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو مغرب میں پنجاب، مشرق میں مہانندا، شمال میں ہمالہ اور جنوب میں نربدا کے درمیان بولی جاتی ہیں"[1]

جنوبی سرحد ٹھیک نہیں۔ نربدا بھوپال سے کچھ نیچے ہوشنگ آباد کے پاس سے گزرتی ہے۔ اس کے جنوب میں مدھیہ پردیش کا بڑا علاقہ ہے اور وہاں موجودہ اصطلاح کے لحاظ سے ہندی بولی جاتی ہے۔

گریرسن نے مشرقی ہندی اور مغربی ہندی کو لفظ ہندی کے اشتراک کے باوجود دو مختلف زبانیں مانا ہے۔ مشرقی ہندی کا ذکر چھٹی جلد میں اور مغربی ہندی کا نویں جلد میں کیا۔ نویں جلد کے پہلے صفحے ہی پر لکھا ہے۔

"مغربی ہندی کے مشرق میں ایک اور زبان مشرقی ہندی ہے .... زبانوں کے ان دونوں گروہوں میں شدت سے متضاد خصوصیات ہیں"

"ڈاکٹر گراہم بیلی کو بھی اس مشکل کا احساس ہے کہ کبھی ہندی میں اودھی راجستھانی، برج اور بہاری میں شامل کر لی جاتی ہیں اور کبھی اس کا محض اعلا ہندی ہوتا ہے۔ وہ دلّی، سہارنپور اور الہ آباد کے درمیانی علاقے کو ہندی کا صحیح نمایندہ مانتے ہیں"[2]

جو شخص ان زبانوں، بولیوں اور علاقے سے محض سرسری واقفیت رکھتا ہے وہ کہیں نہ کہیں چوک کر بیٹھتا ہے۔ بیلی نے الہ آباد تک کے علاقے کو ہندی کا نمائندہ قرار دیا۔ الہ آباد تو درکنار اس سے بہت پہلے شمال مشرق میں کانپور بھی اودھی کا علاقہ ہے۔ بیلی اودھی کو ہندی میں نہیں ڈالنا چاہتے ہوں گے۔ ناواقفیت کی وجہ سے الہ آباد لکھ گئے۔

ہندی کے ماہرینِ لسانیات کے بیانوں میں بھی اس طرح کی دُبدھا پائی جاتی

---

[1] جلد ۹۔ حصہ اوّل ص ۳۔ بحوالہ ڈاکٹر عبدالودود: اردو سے ہندی تک ص ۵۲۔

[2] ڈاکٹر گراہم بیلی: اردو اور ہندی کا تلفظ۔ بلیٹن اسکول آف اورینٹیل اسٹڈیز لندن ۲۷ حصہ ۳۔ سنہ ۲۳-۱۹۲۱ء۔ اردو ترجمہ شائع شدہ اردو ادب دسمبر ۵۶ء۔

Marfat.com

ہے۔کبھی وہ اس کا حصار پورے شمالی ہند کی زبانوں تک پھیلا دیتے ہیں کبھی سمٹ کر مغربی ہندی یا کھڑی بولی پر آجاتے ہیں۔چند بیانات

۱۔ شمالی ہند کی ہر زبان، جس میں سنسکرت سے آئے ہوئے الفاظ ہیں، ہندی ہے بشرطیکہ وہ اپنے جدید ادب کی وجہ سے اپنی علاحدہ حیثیت کی مدعی نہ ہو۔ایودھیا سنگھ[1]

۲۔ ڈاکٹر دھیریندر ورما نے اپنی تین کتابوں میں 'ہندی' کے تین معنی مراد لیے ہیں۔

اپنے کتابچے گرامین ہندی میں مغربی ہندی، مشرقی ہندی، راجستھانی، پہاڑی، بہ شمول نیپالی اور پنجابی کو بھی ہندی کے حصار میں لے آتے ہیں۔

اپنی دوسری کتاب میں وہ پنجابی کو اس سے خارج کر دیتے ہیں لیکن پہاڑی (نیپال، یوپی اور ہماچل کے پہاڑوں کی بولیاں)، کو اس میں شامل رکھتے ہیں[2]

تیسری کتاب میں وہ راجستھانی، مشرقی ہندی اور بہاری کو ہندی سے علاحدہ زبانیں مانتے ہیں[3]

۳۔ ڈاکٹر سوریہ پرشاد اگروال نے ہندی کے چار ذیلی گروہ قرار دیے ہیں۔

۱۔ پنجابی اپ بھاشا کھنڈ۔ ۲۔ راجستھانی اپ بھاشا کھنڈ۔ ۳۔ بہاری اپ بھاشا کھنڈ۔ ۴۔ ہندی اپ بھاشا کھنڈ۔ جس سے مراد مغربی اور مشرقی ہندی ہے[4]

۴۔ ڈاکٹر شیام سندر داس صرف مغربی ہندی کو ہندی کہنا پسند کرتے ہیں۔[5]

۵۔ ڈاکٹر ادے نراین تواری نے مغربی ہندی، مشرقی ہندی اور بہاری کو ہندی میں شامل کیا ہے لیکن راجستھانی کو نہیں۔ دوسری طرف بھوج پوری پر اپنے تحقیقی مقالے میں تسلیم کرتے ہیں کہ بہاری (بھوج پوری جس کی بولی ہے) پوربی ہندی سے الگ ہے۔[6]

---

[1] ایودھیا سنگھ: ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا اتہاس۔ ص ۱۱

[2] ہندی بھاشا کا اتہاس۔ ص ۱۶۸

[3] ہندی بھاشا اور لپی ص ۳۳

[4] بھاشا وگیان ص ۱۵۹ و ص ۱۷۷

[5] بھاشا وگیان ص ۱۰۵۔ پانچواں ایڈیشن

[6] ہندی بھاشا کا ادگم اور وکاس

Marfat.com

۶۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما ہندی کا دائرہ بڑھانے میں کسی سے پیچھے نہیں لیکن وہ راجستھانی اور پنجابی کو ہندی کی بولیاں نہیں مانتے۔ انھیں دوسرے درجے کا شہری قرار دے کر کہتے ہیں کہ ان کے علاقے میں نچلی سطح کا کام ان زبانوں میں اور اونچی سطح کا کام ہندی میں ہونا چاہیے۔[1] انھوں نے ایسا ماضی میں کہا۔ پنجابی صوبے اور اکالی عروج کے بعد وہ پنجاب میں ہندی کے استعمال کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے۔

'ہندی' کے گوناگوں مفاہیم کے بعد ہندی کے آغاز کے نظریے ملاحظہ ہوں۔ یہ اہلِ اردو کے لیے دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

گریرسن نے للّولال کی کتاب لال چندرِکا کو ۱۸۹۶ء میں شائع کیا تو اس کے دیباچے میں لکھا۔

"اس طرح کی زبان کا اس سے پہلے بھارت میں کہیں پتہ نہ تھا اس لیے جب للّولال نے پریم ساگر لکھا تب وہ ایک بالکل نئی بھاشا گھڑ رہے تھے۔"[2]

رام چندر شکل نے بھی صاف اعتراف کیا۔

"اگر للّولال اردو نہ جانتے ہوتے تو پریم ساگر سے عربی فارسی الفاظ دُور رکھنے میں اتنے کامیاب نہ ہوتے جتنے ہوئے۔ بہت سے عربی فارسی الفاظ بول چال کی زبان میں اتنے مل گئے تھے کہ انھیں صرف سنسکرت ہندی جاننے والے کے لیے پہچاننا بھی مشکل تھا۔"[3]

آر۔ ڈبلو۔ فریزر نے لکھا ہے کہ جدید ہندی بھاشا کو دو پنڈتوں (للّولال اور سدل مسر) کی اختراع سمجھنا چاہیے۔[4]

---

[1] بھاشا اور سماج ص ۴۱۲

[2] بحوالہ کپل دیو سنگھ: برج بھاشا بہ نام کھڑی بولی۔ ص ۳۱۔ آگرہ۔ طبعِ اوّل مئی ۵۶ء

[3] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۹۸۔ پندرھواں ایڈیشن

[4] آر۔ ڈبلو۔ فریزر: لٹریری ہسٹری آف انڈیا۔ ۱۹۱۵ء۔ بحوالہ وارشنے: آدھنک ہندی ساہتیہ ص ۲۷۳۔ ۱۹۵۳ء

میں نے اسے ڈاکٹر کپل دیو سنگھ کے مقالے برج بھاشا بہ نام کھڑی بولی سے لیا۔ ص ۳۱ اور اس کے بعد۔

Marfat.com

چندر دھر شرما گلیری لکھتے ہیں۔

"کھڑی بولی یا پکّی بولی یا ریختہ یا موجودہ ہندی کے ابتدائی دور کی نثر اور نظم کو دیکھ کر یہی جان پڑتا ہے کہ اردو تخلیق میں فارسی عربی تت سموں یا تدبھووں کو نکال کر سنسکرت یا ہندی تت سم اور تدبھو سے ہندی بنا لی گئی ہے"[1]

ہندوستان میں تاریخی لسانیات کے ابوالاباء ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی لکھتے ہیں۔

"تاریخی اور لسانیاتی اعتبار سے اردو، ہندی یا سنسکرت زدہ کھڑی بولی کا ترمیم شدہ مسلم روپ نہیں۔ سچ اس کے برعکس ہے۔ فارسی زدہ ہندوستانی جو دلّی میں مغل دربار کے حلقوں میں پیدا ہوئی (اس سے پہلے ہم اس کا آغاز دکن کی دکنی بولی اور جنوبی ہند کی مسلم سلطنتوں احمد نگر، بیجاپور، برار، بیدر اور گولکنڈہ میں پاتے ہیں) اسے ہندوؤں نے اختیار کر لیا۔ چوں کہ عربی فارسی الفاظ ان کے لیے بے مصرف تھے انھوں نے دیوناگری پلی کو اختیار کر کے بہت زیادہ سنسکرت زدہ لفظیات کو لیا اور باہر کے فارسی عربی الفاظ سے پرہیز کیا۔ . . . . . "

مندرجہ بالا نظریے کے سنسکرت الفاظ والی ہندی، فارسی زدہ اردو کے نقوش پر مبنی ڈاکٹر تاراچند نے پیش کیا تھا۔ "اس وقت میں اس نظریے کے خلاف تھا، اب مانتا ہوں کہ ڈاکٹر تاراچند درست تھے"[2]

اردو کے محققین کی طرح ہندی مورخین نے بھی جدید ہندی کو طرح طرح کی زبانوں اور بولیوں سے ماخوذ کیا ہے۔ اردو کے قدیم محققین کی طرح یہ لوگ بھی لسانیات سے واقف نہ تھے سب کچھ اندازے ہی سے کہتے تھے۔ اس سلسلے میں

---

[1] بحوالہ پدم سنگھ شرما: ہندی اردو اور ہندوستانی ص ۳۰

[2] Dr. S.K. Chatterji: India: A polyglot nation and its linguistic problem visa vis national integration P.P.52-53, Mahatma Gandhi Memorial Research Centre, Bombay, 1973.

Marfat.com

ڈاکٹر ماتا بدل جیسوال نے اپنے مقالے میں اچھی طرح بحث کی ہے۔ زیادہ تر وہاں سے اور کچھ دوسری کتابوں سے لے کر مختلف آرا کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

معیاری ہندی یا جدید کھڑی بولی ہندی کے آغاز کے چار نظریے ہیں۔

۱۔ اردو سے نکلی۔ ۲۔ برج سے نکلی۔

۳۔ مشرقی پنجابی، کھڑی بولی، ہریانی، راجستھانی اور برج کے میل سے پیدا ہوئی۔

۴۔ صرف کھڑی بولی سے نکلی۔

سب سے پہلے لیجیے پہلے نظریے کو۔ ڈاکٹر جیسوال کے مطابق انیسویں صدی کے کئی مصنف مثلاً بھارتیندو ہریش چندر، بالمکند گپت، جگن ناتھ داس رتناکر، بھگوان دین، چندر دھر شرما گلیری، مہابیر پرشاد دیوی اردو سے ہی ہندی کی پیدائش مانتے ہیں [1]

ان میں سے اکثر حضرات بیسویں صدی تک بقید حیات تھے۔ مجھے اس میں شبہ ہے کہ یہ سب ایسا مانتے تھے کیوں کہ ان میں سے بعض نے ہندی کو برج بھاشا سے ماخوذ کیا ہے جیسا کہ آگے درج کیا جائے گا۔ جدید ہندی کو برج سے ماخوذ کرنے والے چند علماء کے بیانات ملاحظہ ہوں ؎

جیسوال کے مطابق ہندی کو برج سے ماخوذ کرنے والوں میں بالمکند گپت جگن ناتھ داس رتناکر اور لالہ بھگوان دین وغیرہ تھے (مقالہ حصہ اوّل ص۲۹۹)۔ عجیب بات یہ ہے کہ جیسوال ان تینوں ناموں کو اردو سے اخذ کے سلسلے میں بھی دے چکے ہیں۔

بالمکند گپت اپنی کتاب 'ہندی بھاشا' (۱۹۶۴ وکرمی یعنی ۷-۱۹۶۰) میں لکھتے ہیں

"ورتمان ہندی بھاشا کی جنم بھومی دلّی ہے۔ یہاں پر برج بھاشا سے وہ پیدا ہوئی۔ وہیں اس کا نام ہندی رکھا گیا" [2]

گوسوامی گرچرن نے مضمون 'ہندی اور برج بھاشا' میں برج کو ہندی کی

---

[1] جیسوال کا مقالہ جلد اوّل ص۲۴۸

[2] بحوالۂ ڈاکٹر کپل دیو سنگھ: برج بھاشا بہ نام کھڑی بولی ص۲۵

Marfat.com

ماں بتایا [1]

جگن ناتھ داس رتنا کر نے بیسویں ہندی ساہتیہ سمیلن کلکتہ کی صدارت کی۔ اپنے خطبۂ صدارت میں کھڑی بولی (یعنی جدید ہندی) کی پیدائش برج اور پنجابی کے میل سے مانی ہے۔ [2]

لالہ بھگوان دین نے کہا تھا کہ فارسی میں کچھ برج، کچھ بانگڑو کی ٹیک لگا کر بولی کو کھڑا کر دیا گیا اور اس کا نام پڑ گیا کھڑی بولی [3]

کچھ لوگ ہریانی سے ہندی کو ماخوذ کرتے ہیں۔ ان کے دو گروہ ہیں۔ کچھ ہریانی سے براہ راست ہندی کو نکالتے ہیں تو کچھ بالواسطہ۔ ان کے مطابق ہریانی سے اردو نکلی اور اردو سے انیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں ہندی پیدا ہوئی۔ کچھ لوگ کھڑی بولی اور ہریانی دونوں کو ہندی کا ماخذ مانتے ہیں [4]

کچھ کے مطابق جدید مشرقی پنجابی، کھڑی بولی، ہریانی، شمال مغربی برج اور شمال مشرقی راجستھانی کے علاقوں میں دسویں تا بارھویں صدی میں ایک ہی بولی بولی جاتی تھی۔ جدید معیاری ہندی اسی سے نکلی۔ اس طرح معیاری ہندی مندرجہ بالا بولیوں کا معیاری روپ ہے [5]

کچھ لوگ مندرجہ بالا علاقے کی زبان کو 'قدیم دہلوی' کہہ کر اس سے ہندی کو ماخوذ کرتے ہیں۔

ایسے ڈاکٹر ماتا بدل جیسوال کا نتیجہ دیکھیے۔ انھوں نے اوّل اس کھرے اصول کو درج کیا جسے اردو میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کہہ چکے ہیں۔

"دو معیاری زبانیں مل کر کسی تیسری معیاری زبان کو جنم نہیں دیتیں، [6]

[1-2] بحوالہ ڈاکٹر کپل دیو سنگھ : برج بھاشا یہ نام کھڑی بولی صہ ۴۵

[3] ڈاکٹر جیسوال کا مقالہ جلد اوّل صہ ۲۹۹

[4] " " " صہ ۳۱۱

[5] " " " صہ ۳۱۲

[6] " " " صہ ۲۴۸

Marfat.com

پھر وہ لکھتے ہیں

"نہ معیاری ہندی کی اختراع معیاری اردو سے ہوئی۔ نہ معیاری اردو کی معیاری ہندی سے۔ دونوں کی ہندی، ہندوی یا دہلوی سے ہوئی۔ دونوں کھڑی بولی کے جدید معیاری اسلوب ہیں"[1]

میں ڈاکٹر جیسوال کے دونوں فیصلوں سے متفق ہوں۔

ہندی بعض کے نزدیک گیارھویں صدی میں اور بعض دوسروں کے نزدیک تیرھویں صدی میں پیدا ہوئی۔ پرانا نظریہ یہ تھا کہ مغربی ہندی، جس کی شاخ کھڑی بولی ہے، شورسینی اپ بھرنش سے پیدا ہوئی۔ اب معیاری ہندی کو کوئی کوروی اپ بھرنش سے اور کوئی ٹکی اپ بھرنش سے اخذ کرتا ہے۔ یہ بہرحال دلّی میرٹھ کے علاقے کی اپ بھرنش سے مستخرج ہوئی۔ جیسوال نے معیاری ہندی کے ارتقا کے تین دور کیے ہیں۔

۱۔ قدیم دور ۱۰۰۰ء سے ۱۴۰۰ء تک۔ ۲۔ وسطی دور ۱۴۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک،
۳۔ جدید دور ۱۸۰۰ء تا حال۔[2]

ان حدود فاصل کی کوئی لسانیاتی وجہ نظر نہیں آتی۔ یہ زبان سے زیادہ ادب کے دور معلوم ہوتے ہیں۔ جیسوال نے جدید دور کے جو چار ذیلی دور کیے ہیں وہ صاف صاف تاریخِ ادب سے متعلق ہیں یعنی۔

۱۔ ابتدائی دور ۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۰ء۔ ۲۔ بھارتیندو کال ۱۸۵۰ء تا ۱۹۰۰ء
۳۔ دویدی کال ۱۹۰۰ء تا ۱۹۲۵ء۔ ۴۔ معاصر کال ۱۹۲۵ء تا حال

ظاہر ہے کہ ۱۹۰۰ء یا ۱۹۲۵ء میں ہندی زبان کے روپ میں کوئی موڑ نہیں آیا۔ مندرجہ بالا محض ادبی ادوار ہیں

اردو کے مختلف نام اور آغاز کے نظریے

ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی لکھتے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر جیسوال کا مقالہ جلد اوّل ص ۲۷۳ [2] " " ص ۴۴۵ اور اس کے آگے

Marfat.com

"اردو الطائی لفظ ہے اور اُور ڈ (الف مضموم ، واو معروف ساکن، رَ ساکن، د پر مختصر ضمّہ یعنی چھوٹے اُو کی ماترا) اور یُرت کی شکل میں ملتا ہے۔ اردو اس لفظ کی فارسی شکل ہے۔ ترکی لفظ کے معنی ہیں تنبو، خیمہ، قیام گاہ، پڑاؤ، بستی یا سردار کا پڑاؤ۔ ترکی اور منگول بادشاہوں کے کیمپ یا خیمے ہی ان کے دربار ہوتے تھے۔" [1]

الطائی منگولی زبانوں کا ایک خاندان ہے جس کی سب سے اہم زبان ترکی ہے چٹرجی آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"فارسی اور ہندوستانی کلامی عادتوں میں ختامی طویل مصوّتے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ان کے مناسب حال اس میں ترمیم ہو کر یہ لفظ اردو ہوگیا ترکی میں یہ لفظ لشکر، گھر، وطن کے مفہوم میں باقی ہے۔ جدید ترکی (عثمانلی) میں ترکوں کا وطن کے لیے ترک اُردُو رائج ہے۔" [2]

یعنی ترکی میں اس لفظ کے تلفظ کے شروع میں طویل مصوّتہ اور آخر میں مختصر مصوّتہ ہے ڈاکٹر ایرکان ترکمان، صدر شعبۂ اردو، سلجوق یونیورسٹی، قونیہ، ترکی نے اپنے مضمون 'لفظ اردو کا مطلب اور تاریخی پس منظر' میں بھی اردو کا ترکی تلفظ 'اوردو' ہی لکھا ہے۔ انھوں نے ترکی میں اس لفظ کے مختلف معنی دیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے

۱۔ یوسف خاص حاجب نے اپنی کتاب قوتا دغو بیلیک (۱۰۷۲ء) میں اردو کو محل یا شہر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

۲۔ اسی صدی میں محمود کاشغری نے دیوانِ لُغات التُرک میں اردو کے معنی لکھے ہیں وہ شہر جس میں خاقان (بادشاہ) مقیم ہوتا ہے۔

۳۔ کلاؤزن نے اپنی لغت میں اردو کے معنی بادشاہ کے رہنے کا محل یا خیمہ دیے ہیں۔

۴۔ ترکی کے چغتائی لہجے میں اردو سے مراد لشکر، قیام گاہِ لشکر وغیرہ ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر عتیق صدیقی (مترجم) ہند آریائی اور ہندی ص ۱۷۰

[2] " " " " ص ۱۷۱

Marfat.com

۵۔ شمس الدین سامی کی مشہور ترکی عثمانی لغت میں اوردو کے معنی "لشکر، ایک ملک کے وہ حصّے جو زمینی فوج کے مطابق تقسیم کیے جاتے ہیں" دیے ہیں.

۶۔ جدید ترکی کی سرکاری لغت میں اردو کے معنی ہیں ۱۔ پوری فوج ۲۔ فوج کا ایک ڈویژن ۳۔ آدمیوں کا گروہ جو ایک ہی مقصد رکھتا ہے۔ اردو بازاری کے معنی فوجی بازار ہیں۔ ترکی کے ہر بڑے شہر میں اردو بازار ہوتا ہے۔ [1]

محمد حسین آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں۔

"ترکی میں اردو بازارِ لشکر کو کہتے ہیں۔" [2]

لیکن اگر 'اردو' میں بازار کا مفہوم پوشیدہ ہوتا تو 'اردو بازار' کی ترکیب کی کیا ضرورت تھی۔ محمود شیرانی کے مطابق سب سے پہلے یہ لفظ "جہاں کشائے جوینی" میں ملتا ہے [3] ہندوستان میں یہ لفظ تزک بابری میں ملتا ہے [4] دونوں جگہ اس کے معنی شہزادوں یا سرداروں کے خیمے یا قیام گاہ کے معنی میں آئے ہیں۔ شاہ جہاں نے جب دلی میں لال قلعہ تعمیر کیا اسے قلعۂ معلّٰی کہنے لگے اور بازار کو اردوئے معلّٰی. میر امن باغ و بہار میں لکھتے ہیں۔

"تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا تب سے شاہ جہاں آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلّی جڑ ہے، وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلّٰی خطاب دیا۔" [4]

بعد میں اس بازار کو اردوئے معلّٰی کے بجائے اردو بازار کہا جانے لگا۔ فرہنگ آصفیہ میں اردو بازار کے سلسلے میں لکھا ہے۔

"چوں کہ اوّل اوّل اس کی شاہ جہانی لشکر سے ابتدا ہوئی لہٰذا اس کا نام بھی اردو

---

[1] "لفظ اردو کا۔ طلب اور تاریخی پس منظر"۔ اخبار اردو، اسلام آباد، جولائی ۱۹۸۷ء۔ ص ۱۰۲

[2] آبِ حیات، شیخ مبارک علی لاہور، بارِ دوازدہم۔ ص ۲۰

[3] جلد اوّل ص ۱۴۰ بحوالہ پنجاب میں اردو، نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۷۵ء ص ۲۹

[4] باغ و بہار۔ مکتبہ جامعہ ۱۹۷۰ء ص ۱۴

Marfat.com

پڑ گیا۔ قلعۂ معلّیٰ کے لاہوری دروازے کے سامنے اردو بازار کے نام سے ایک بازار بھی آباد ہو گیا۔ جو بلاقی بیگم کے کوچہ اور چاندنی چوک کی سڑک کے جنوبی پہلو پر واقع ہے"۔ [1]

سرسیّد آثار الصنادید میں لکھتے ہیں۔

" اور اس کے آگے بڑا بازار جس میں چاندنی چوک وغیرہ سب بازار شامل ہیں مگر اگلے زمانے میں یہ بازار لاہوری بازار کہلاتا تھا۔ یہ بازار قلعہ کے لاہوری دروازے سے فتح پوری تک ہے۔ اس بازار کے پہلے حصّے کو تو اردو بازار کہتے ہیں اور اس کے آگے جہاں ترپولیہ اور کوتوالی ہے وہ اسی نام سے مشہور ہے اور اس کے آگے چاندنی چوک کہلاتا ہے اور اس کے آگے فتح پوری کا بازار"۔ [2]

اس طرح اگلے زمانے کا اردو بازار لال قلعے کے مرکزی دروازے سے گرد دوارہ سیس گنج اور کوتوالی تک کا حصّہ تھا۔ موجودہ اردو بازار اس سے مختلف ہے۔ یہ جامع مسجد کے پیچھے ہے اور اسے اردو بازار اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں اردو کی کتابوں کی دکانیں ہیں۔

پہلے پہلے اُردوئے معلّیٰ کی زبان کو زبانِ اردوئے معلّیٰ کہا گیا۔ پھر زبانِ اردو یا اردو کی زبان اور آخر میں محض اردو۔ ان کے استعمال کی قدیم ترین مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ طبقات الشعرا (۱۱۸۸ھ) میں قدرت اللہ شوق نے ولی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ شاہ سعد اللہ گلشن نے اسے مشورہ دیا۔

"شما زبانِ دکنی را گزاشتہ ریختہ را موافقِ اردوئے معلّیٰ شاہ جہاں آباد موزوں بکنید"

معلوم نہیں شوق کا ماخذ کیا ہے۔ اگر شاہ گلشن نے ولی کو مشورہ دیتے وقت واقعی اردوئے معلّیٰ شاہ جہاں آباد، کہا تو اس فقرے کے استعمال کی قدیم ترین مثال ہے

---

[1] جلد اوّل ص ۲۱

[2] پنجاب میں اردو، ص ۳۲

Marfat.com

۲- میر نے نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ میں لکھا

در فنِ ریختہ کہ شعرے است بطورِ شعرِ فارسی بہ زبانِ اردوئے معلّٰی شاہ جہاں آباد دہلی کتابے تا حال تصنیف نہ شدہ۔

۳- قائم نے ۱۱۶۸ھ میں لکھا

"اکثرے از ترکیباتِ فرس کہ موافق محاورۂ اردوئے معلّٰی مانوسِ گوش می یابند ایں جملہ جواز الا بیان می دانند" [1]

۴- نوطرز مرصّع کی تکمیل ۱۷۷۵ء م ۱۱۸۹ھ میں ہوئی۔ تحسین لکھتا ہے۔

"جو کوئی حوصلہ سیکھنے زبانِ اردوئے معلّٰی کا رکھتا ہو" [2]

۵- علی ابراہیم خاں خلیل نے گلزارِ ابراہیم (۱۱۹۸ھ) میں اصالت خاں ثابت کے احوال میں معلّٰی کا لقب حذف کر کے محض 'زبانِ اردو' کا ذکر کیا۔

"تتبع زبانِ اردو نمودہ۔ عمرے در ریختہ گوئی بسر بردہ" [3]

۶- میر امّن نے باغ و بہار ۱۸۰۱ء میں لکھا۔

حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے مُنھ سے یوں سنی ہے۔

پہلے اردوئے معلّٰی شاہ جہاں آباد یا محاورۂ اردوئے معلّٰی یا زبانِ اردوئے معلّٰی کہا گیا۔ بعد میں معلّٰی حذف ہو کر زبانِ اردو اور پھر اردو کی زبان کہا گیا۔ نام کے ارتقاء میں آخری منزل حرفِ اضافت کا حذف ہے۔ کسی سابقے لاحقے کے بغیر محض 'اردو' کا استعمال پرانا ہے۔ اس سلسلے میں محمد اکرام چغتائی نے اپنے ایک مضمون میں قدیم ترین استعمال کی کھوج کی جس کے نتائج یہ ہیں [4]

۱- میر محمدی مائل دہلوی قائم کے شاگرد تھے۔ ان کا دیوان ۱۱۷۶ھ میں مرتب ہوا۔

---

[1] مخزنِ نکات ص ۳۳ - طبعِ اوّل ۱۹۲۹ء - اورنگ آباد

[2] نوطرز مرصّع مرتبۂ نورالحسن ہاشمی - پہلا ایڈیشن ۱۹۵۸ء الہ آباد - ص ۵۴

[3] گلزارِ ابراہیم مع گلشنِ ہند مرتبۂ ڈاکٹر زور ص ۸۸ - ۱۹۳۴ء - علی گڑھ

[4] اردو بمعنی زبان کے متعلق نئی تحقیق، مشمولہ رسالہ اردو نامہ شمارہ ۲ بابت دسمبر ۱۹۶۶ء ص ۳۳

Marfat.com

تاریخِ ترتیب کا قطعہ یہ ہے

ہوا دیواں مرا جب صاف اللہ کی عنایت سوں — گفتہ دل ہوا، پڑھ ریختہ، اربابِ محفل کا
میں سر نیوڑائے بیٹھا تھا ..... زانو پر — لکھا تاریخ ہاتف نے کھلا ہے باغ مائل کا
۱۱۷۶ھ

تیسرے مصرع میں محذوف الفاظ 'پے تاریخ' ہو سکتے ہیں۔ فقرۂ تاریخ میں مائل میں ہمزہ کو 'ما' مان کر ۱۰ عدد لیے جائیں تو ۱۱۷۶ھ برآمد ہوتا۔ جو ترتیبِ دیوان کی تاریخ ہے۔

اس دیوان میں ایک قطعہ ہے جس میں کوئی شخص، مائل سے پوچھتا ہے۔

ع — بتلا کہ شعرِ ہندوی کس عہد سے چلا

سائل اور مائل کے مکالمے کے جستہ جستہ شعر یہ ہیں

بولا وہ شخص، یہ تو کہانی میں سب سنی — اردو کا .... بتا دے مسلسل کھلا کھلا
مشہورِ خلق اردو کا تھا ہندوی لقب — اگلے سفینوں بیچ یہ لکھ گئے ہیں سب اولا
شاہِ جہاں کے عہد سے خلقت کے بیچ میں — ہندوی تو نام مٹ گیا اردو لقب چلا

۲۔ اس کے بعد مصحفی کا یہ شعر ملتا ہے

خدا رکھے، زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی — کہیں کس مُنھ سے ہم، اے مصحفی، اردو ہماری ہے

ڈاکٹر گراہم بیلی نے اپنے ایک مضمون[1] میں یہ شعر لکھ کر کہا کہ ہمیں معلوم نہیں مصحفی نے یہ شعر کب کہا تھا لیکن" وہ ۱۷۷۶ء میں ایک مسلّم شاعر تھا"[2]

He was a recognised poet in 1776.

غلط نقل کرنے کی مثال ڈاکٹر شوکت سبزواری کا یہ بیان ہے

"ڈاکٹر بیلی کا قیاس ہے کہ یہ ۱۷۷۶ء کے قریب کہا گیا"[2]

بعد میں لکھنے والوں نے اس شعر کو قطعیت کے ساتھ ۱۷۷۶ء سے منسوب کر دیا۔

"خدا رکھے" کس کے لیے آیا ہے؟ اپنے لیے یا میر و مرزا کے لیے۔ غالباً 'میر و مرزا' کے لیے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں اس وقت تک زندہ تھے۔ سودا ۱۱۹۵ھ میں اور میر ۱۲۲۵ھ میں مرے۔ اس لیے بہت ممکن ہے کہ یہ شعر ۱۱۹۵ھ سے

---

[1] ڈاکٹر گراہم بیلی: The Journal of Royal Asiatic Society April 1930. P. 343. بحوالہ محولہ بالا مضمون ص ۲۹

[2] داستان زبان اردو ص ۷

Marfat.com

پہلے کا ہو۔

۳ - مرزا جان طپش نے اپنا دیوان ۱۱۹۵ھ/ ۸۵-۱۷۸۴ء میں مرتب کیا۔ اس کے آغاز میں ایک فارسی دیباچہ ہے جس میں اردو زبان کے آغاز اور اردو شاعری کے ارتقار پر اظہار خیال کیا ہے۔ میرے پیش نظر اس کا اردو ترجمہ ہے۔ پہلے جملے ہی میں کہتے ہیں۔

"زبانِ اردو کے معنی ہیں دہلی کا روزمرہ، [1]

اردو کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"اسی طرح لفظ اردو اس زبان کے لیے مخصوص ہوگیا" [2]

۴ - شیرانی نے پنجاب میں اردو میں حضرت مراد شاہ کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے عزیزانِ وطن کے نام ایک منظوم خط 'نامۂ مراد' کے نام سے لکھا۔ اس کی تاریخ ۱۲۰۳ھ [3] ہے اس میں ذکر قبولیتِ اردو کے تحت یہ شعر لکھا

وہ اردو کیا ہے؟ یہ ہندی زباں ہے — کہ جس کا فائل اب سارا جہاں ہے
پسند طبع وزرا و شہاں ہے — غرض جو کچھ ہے اب اردو زباں ہے

۵ - محمد باقر آگاہ ویلوری نے ہشت بہشت کے نام سے آٹھ رسالے لکھے۔ ان میں ساتویں کا نام "من درپن" عرف معجزاتِ نبی کریم ہے۔ یہ ۱۲۰۶ھ میں لکھا گیا۔

تھے بارا سو کے اوپر چھے برس جب — ہوا یہ نسخۂ دلکش مرتب

اسی میں کہتے ہیں

اگر بھاکے میں اردو کے میں کہتا — کوئی اس کو یہاں کے لوگوں سے نہ چہتا [4]

---

[1] اردو زبان کی ابتدا۔ کلیاتِ طپش کا دیباچہ مترجم ڈاکٹر عندلیب شادانی رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۶۹ء صہ ۱۲۱

[2] ایضاً ایضاً ایضاً صہ ۱۳۴

[3] محمد اکرم چغتائی: اردو بمعنی زبان کے متعلق نئی تحقیق۔ اردو نامہ کراچی شمارہ ۲۶ بابت دسمبر ۱۹۶۶ء صہ ۳۰ - ۱۹۶۶ء - صہ ۳۰

[4] فہرست مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو جلد اول مرتبۂ افسر صدیقی امروہوی و سید سرفراز علی رضوی کراچی ۱۹۶۵ء صہ ۸۶

Marfat.com

'کوئی اس' ملا کر بر وزنِ فَعَل پڑھے تبھی مصرع موزوں ہوگا۔ اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دکنی کو شمالی ہند کی اردو سے مختلف گردانتے ہیں۔ بھاکے سے مراد بھاشا یعنی زبان ہے۔

۶۔ گلکرسٹ نے ۱۷۹۶/۱۱۔ ۱۲۱۰ھ میں لکھا

"In the mixed dialect also called OORDOO or the polished language of the court, and which even at this day pervades the vast provinces of a once powerful empire"[1]

۷۔ باقر آگاہ نے مثنوی گلزارِ عشق ۱۲۱۱ھ کے دیباچے میں لکھا۔

جب زبانِ قدیم دکنی، اس سبب سے آگے مرقوم ہوا، اس عصر میں رائج نہیں ہے اسے چھوڑ دیا اور محاورہ صاف و شستہ کو، کہ قریب روزمرّہ اردو کے ہے، اختیار کیا۔[2]

۸۔ نامۂ مراد کے مصنف مراد شاہ نے ۱۲۱۲ھ چار درویش کا قصہ مثنوی مراد المجتبیٰ میں لکھا۔ اس میں کہتے ہیں

یہ قصہ جو ہے چار درویش کا　　اگر نظم ہو تو بہت ہے بجا
و لیکن ہو اردو زباں میں بیاں　　کہ بھاتی ہے ہر ایک کو یہ زباں[3]

یہ سب مثالیں اٹھارویں صدی کے آخر کی ہیں۔ انیسویں صدی میں اس زبان کو عام طور سے اردو کہا جانے لگا لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ لوگ ہندی یا ریختہ بھی کہتے رہے۔ غالب تک نے کہا۔

---

1. Gilchrist: A grammer of the Hindoostanee language, 1796 P. 261.- with reference from De Graham Bailey: "Urdu, the name and the language" incldded in the journal of the Royal Asiatic Society, April 1930 P 393
بحوالہ مضمون اکرم چغتائی۔ اردو نامہ ص ۳۰

۲ بہ حوالہ جمیل جالبی: تاریخ ادبِ اردو جلد اوّل ص ۵۱۴

۳ پنجاب میں اردو۔ ص ۳۴۲۔ لکھنؤ ۱۹۸۱ء نیز محمد اکرم چغتائی کا محولہ بالا مضمون ص ۳۲

Marfat.com

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی　　گفتۂ غالب، ایک بار جا کے اسے سنا کہ یوں

اردو کے آغاز کے نظریے۔

۱۔ سب سے مقبول نظریہ یہ ہے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے بنی۔ اس نظریے کا ذکر سب سے پہلے میر محمدی مائل دہلوی نے مذکورہ بالا قطعے (قبل ۱۱۷۶ھ) میں کیا۔ اکرم چغتائی نے یہ پورا قطعہ چھاپ دیا ہے[1]۔ اس کے یہ شعر ملاحظہ ہوں

گیارہ صدی شروع ہوئی جب کہ جگ منے　　باہم ہوئے یہ ہندو مسلماں خلا ملا

دربار اکبری میں وہ... تھے رات دن　　ہر ہر گلی میں تھا اسی خدمت کا پرتالا[2]

محذوف لفظ 'ملتے' یا 'باہم' ہو سکتا ہے۔ اس کے آگے مائل شہر دلّی کی تاریخ بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں

شاہِ جہاں کے عہد سے خلقت کے بیچ میں　　ہندوی تو نام مٹ گیا اردو لقب چلا

اس قطعے میں کام کی کئی باتیں کہی گئی ہیں

۱۔ اردو شاعری کی ابتدا گیارھویں صدی ہجری میں ہوئی جب کہ ہندو مسلمان باہم ہو گئے تھے۔ یہ میل جول دربارِ اکبری میں خصوصیت سے تھا۔

دقّت یہ ہے کہ شہنشاہ اکبر گیارھویں صدی ہجری سے بہت پہلے ہوا ہے۔

۲۔ شاہ جہاں کے وقت سے اس زبان کا نام اردو پڑ گیا۔

مائل کے بعد مرزا جان طپش اس نظریے کو پیش کرتے ہیں۔ ان کا دیوان 'گلزار مضامین'، ۱۱۹۹ھ میں مرتّب ہوا اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس کی ابتدا میں فارسی میں اردو زبان کی ابتدا اور ابتدائی اردو شاعروں کے بارے میں ایک تحریر ہے جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے رسالہ اردو کراچی بابت اکتوبر ۱۹۴۹ء میں شائع کر دیا۔ اردو کی ابتدا سے متعلق طپش کے بیان کا خلاصہ یہ ہے

"دہلی میں مسلمانوں کی فتح سے قبل جو زبان بولی جاتی تھی وہ ہندی الاصل تھی۔ جب معزالدین سام (شہاب الدین غوری) نے رائے پتھورا کا کام تمام کیا تو اس زبان

---

[1] محمد اکرم چغتائی: مائل دہلوی کا ایک اہم تاریخی قطعہ۔ رسالہ فنون لاہور۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء

[2] اکرم چغتائی کا مضمون اردو نامہ دسمبر ۶۶ء میں۔

Marfat.com

ہیں اہلِ اسلام کے عربی وفارسی الفاظ گھل مل گئے۔ جب محمد شاہ تغلق اہلِ دہلی کو دولت آباد لے گیا اور واپس لایا تو دکھنی الفاظ بھی دہلی والوں کی زبان میں مل گئے شاہ جہاں کے شاہ جہاں آباد بنانے کے بعد دہلی کی زبان میں نمایاں فرق ہوگیا۔ پرانی ہندی متروک ہوگئی لیکن دکھنی الفاظ جیوں کے توں رہے ہیں[1]

'جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے میر امّن نے بھی اردو کے آغاز کے سلسلے میں اکبر اور شاہ جہاں کا نام لیا ہے۔ باغ وبہار کی ابتدا میں انھوں نے اردو کی جو حقیقت لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدا جُدا تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں بین دین، سودا سُلف، سوال وجواب کرتے، ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔

جب حضرت شاہ جہاں نے شاہ جہاں آباد بسایا، وہاں کے بازار کو اردوئے معلّٰی خطاب دیا۔ تمدان زبانِ اردو کی منجھتے منجھتے ایسی منجی کہ کوئی شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھائی۔

اکبر کا دارالخلافہ آگرہ تھا جو برج بھاشا کا مقام ہے۔ شاہ جہاں دارالسلطنت کو دلّی لے آیا۔ اس لیے دلّی کو اردو کا آمیزہ تیار ہونے کا مقام قرار دینا بہتر ہے۔ میر امّن کے نظریے کو ہو بہو نقل کیا، سرسیّد نے آثارالصنادید میں، فارسی ظہیر الانشا کے مصنّف نے، امام بخش صہبائی نے رسالہ قواعد اردو میں اور محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں[2] ان میں سے کسی نے اکبر کا نام نہیں لیا۔ سب نے شاہ جہاں کے عہد میں اردو کی داغ بیل ڈالی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اردو کو عربی فارسی اور ہندی کے اختلاط کا نتیجہ قرار دینے کا نظریہ آغازِ اردو کے نظریوں میں سب سے اہم ہے۔ میر محمدی مائل دہلوی، باقر آگاہ دیباچۂ مثنوی

---

[1] رسالہ اردو۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء۔ ص ۱۲۱-۱۲۲

[2] پنجاب میں اردو ص ۵۲-۵۳

Marfat.com

گلزارِ عشق ۱۲۱۱ھ) اور میر امّن سے لے کر ڈاکٹر مسعود حسین خاں تک کتنے حضرات اس کے شکار ہوئے۔ اس کی بہترین تردید ڈاکٹر شوکت سبزواری نے کی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ایک نظریہ جسے میں غیر سنجیدہ سمجھتا ہوں یہ ہے کہ اردو کھچڑی ہے۔ چٹر یا لائی چاول کا دانہ، چڑا لایا مونگ کا دانہ۔ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔ عربی فارسی الفاظ مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ ہندوؤں نے ہندی افعال و حروف فراہم کیے۔ ہندو مسلمان کے میل ملاپ سے اردو نے مغلوں کے زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے جنم لیا"[1]

سبزواری نے یہ نتیجہ ٹکر اور میکس مولر کے ان اصولوں سے اخذ کیا۔

"زبان دوسری زبان کے الفاظ جتنے چاہے مستعار لے کر اپنا لے، ایک زندہ اور بولی جانے والی زبان غیر زبان کے صرفی، نحوی قاعدے اور تعمیری اصول کبھی نہیں اپناتی۔ یہ زبان کی فطرت اور اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ زبان کی تاریخ اسے جھٹلاتی ہے"، ٹکر[2]

"زبانوں کی تقسیم اور ان کے رشتوں اور قرابتوں کی تعین، ان کی صرفی نحوی ساخت کے مطابق کی جاتی ہے۔ فرہنگ الفاظ کی اس سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں"، میکس مولر[3]

یہ تسلیم کہ صرفی نحوی ساخت نہایت اہم ہے لیکن لفظیات میں بنیادی الفاظ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے بنیادی الفاظ یہ ہیں۔

۱۔ بنیادی افعال مثلاً آنا، جانا، کھانا، پینا، بیٹھنا، سونا وغیرہ

۲۔ بنیادی اعداد مثلاً ایک، دو، تین، دس، بیس، سو وغیرہ

---

[1] شوکت سبزواری: داستانِ زبان اردو ص۴۴۔ چمن بک ڈپو۔ اردو بازار۔ دہلی

[2] T.G. Tuckee: Natural History of Language. P.102
بحوالہ داستانِ زبانِ اردو ص۶۰

[3] Max Muller. Science of Language, 2nd lecture, Pp. 86-90 Smith edition
بحوالہ داستانِ زبانِ اردو ص۳۱

Marfat.com

۳۔ بنیادی رشتے مثلاً ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹا، بیٹی وغیرہ
۴۔ اہم اعضائے جسم مثلاً آنکھ، ناک، کان، مُنھ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ
۵۔ بنیادی ضمیر مثلاً میں، ہم، تو، تم، وہ وغیرہ
۶۔ بنیادی حروف مثلاً کو، سے، تک، پر، میں وغیرہ

ایک خاندان کی زبانوں میں ان الفاظ میں ضرور مماثلت ہوگی۔ شوکت سبزواری نے میکس مولر کے اصول کو ذہن میں رکھ کر دو قابلِ قدر اصول پیش کیے۔

۱۔ "ایک غلط فہمی جسے میں سب سے زیادہ خطرناک اور لسانی بحثوں میں حقیقت سے بھٹکانے والی سمجھتا ہوں یہ ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کو جوڑ کر کوئی تیسری زبان وضع کی جا سکتی ہے جو پہلی دو زبانوں سے جدا اور آزاد ہو۔ دو یا دو سے زیادہ رنگوں کی آمیزش سے ایک نیا اور دونوں سے مختلف رنگ ضرور تیار کیا جا سکتا ہے لیکن دو زبانوں کی ترکیب سے کسی تیسری زبان کی تعمیر ناممکن ہے۔ زبان نامی اور ذی حیات چیز ہے جو دوسری نامی چیزوں کی طرح مسلسل تغیر و ارتقا کے زیرِ اثر وجود میں آئی۔ پاس پڑوس کی زبانوں سے غذا حاصل کر کے، ان کی فضا میں سانس لے کر وہ فربہ اور توانا تو ہو سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ مل کر کسی تیسری زبانوں کو جنم دینا اس کے بس کی بات نہیں"[1]

۲۔ "زبان یک بیک وجود میں نہیں آتی۔ اس میں ارتقا ہوتا ہے۔ زبان زبان کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے، لوگوں کا یہ سمجھنا غلط ہے کہ زبان آپ ہی آپ پیدا ہوئی۔ کسی ایک زبان کے موجودہ روپ کو لے کر یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ قدیم ترین زبان ہے۔ زبان کا آغاز، جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس کے موجودہ خط و خال کا ابھرنا اور نمایاں ہونا ہے کہ وہ اپنی اصل سے ممتاز ہو جائے اور اس میں اس کی ہمسر بولیوں میں فرق کیا

---

[1] داستانِ زبانِ اردو ص ۳۷-۳۶

Marfat.com

جا سکے۔ اگرچہ اس ابھار اور نکھار کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں کی جا سکتی لیکن ہر زبان کی زندگی میں ایک ایسا دور آتا ہے جب اس کے خط و خال اور اس کی امتیازی خصوصیات ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔۔۔۔۔۔ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کا آغاز اس دور کے لگ بھگ ہوا۔ زبان کے آغاز کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ آغاز نہیں ارتقا ہے"۔[1]

تاریخ، تقابلی لسانیات کے یہ ایسے مسلمات ہیں جن کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ ان کی روشنی میں اردو کے آغاز کے وہ تمام نظریے باطل ہو جاتے ہیں جن میں اردو کو کئی زبانوں یا بولیوں کے اختلاط سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک اردو کی اصل ہوگی جس سے اردو کا ارتقا ہوا۔ بقیہ سب کا ذکر کرنا یا انھیں کوئی اہمیت دینا بے سود ہے۔

میر امّن اور ان کے مقلدین سر سیّد، صہبائی وغیرہ یہ واضح نہیں کرتے کہ شاہ جہاں کے دور میں بازار میں اُردو کن کن زبانوں کے میل سے بنی۔ ان کا زور بیرونی مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کے اختلاط پر ہے، ان کی جو بھی زبانیں رہی ہوں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو مرکّب تیار کرنے والی زبانوں میں سے کسی ایک زبان پر (مثلاً پنجابی، ہریانی، برج) پر زور دیتے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اختلاط کے مقام سے زیادہ اُنس رکھتے ہیں۔ ان میں لسانیات سے ناواقفین کے علاوہ چند ماہرین لسانیات بھی ہیں۔

گذشتہ اوراق میں کھڑی بولی اور ہندی کے سلسلے میں کچھ ایسے اقوال درج کیے جا چکے ہیں جن میں انھیں برج سے ماخوذ یا اس پر مبنی کہا گیا ہے۔ اردو کے سلسلے میں بھی بعض کی یہی رائے تھی۔ چند اقوال

۱۔ "ہندوستان میں مدّت تک زبانِ ہندی کہ اسے برج بھاکا کہتے ہیں رواج رکھتی تھی۔ اگرچہ لغت سنسکرت ان کی اصل اصول اور مخزنِ فنون فروع و اصول ہے، پیچھے محاورۂ برج میں الفاظِ عربی و فارسی بہ تدریج

---

[1] داستان زبانِ اردو ص ۲۶-۲۷

Marfat.com

داخل ہونے لگے اور اسلوبِ خالص کو اس کے کھونے لگے جب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ مسمّٰی ہوئی" [1]

۲۔ انیسویں صدی کے نصفِ دوم میں ہورنلے (Hoernle) نے گوڈین (Godian) زبانوں کی گرامر لکھی۔ اس میں کہتے ہیں۔

"اردو۔ مقابلۃً حال کی پیداوار ہے۔ دہلی کے نواح میں مسلم اقتدار کا مرکز تھا۔ اردو بارھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی۔ یہ علاقہ برج، ماروڑی پنجابی کے لیے سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقامی باشندوں اور مسلمان سپاہیوں کے اختلاط و ارتباط سے ایک ملی جُلی زبان وجود میں آئی جو صرفی نحوی اصول کی حد تک برج ہے، اگرچہ اس میں پنجابی اور ماروڑی کی آمیزش بھی ہے۔ اس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ بدیسی یعنی فارسی و عربی" [2]

انھوں نے اردو کو خاص طور سے برج پر مبنی بتایا ہے۔ ان کا یہ مشاہدہ صحیح نہیں کہ اردو یا کھڑی بولی صرفی و نحوی اصول کی حد تک برج ہے۔ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ ہورنلے ہی سے متاثر ہو کر آزاد نے آبِ حیات کی بسم اللہ ان الفاظ سے کی۔

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے"

آزاد کے دوسرے مقلّد سید احمد اللہ قادری ہیں۔ ان کی اردوئے قدیم کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصے کے بعد اردو زبان کی صورت اختیار کر لی" [3]

مخلوط زبان کے نظریے کی خامی ڈاکٹر شوکت سبزواری واضح کر چکے ہیں۔ اردو یا

---

[1] باقر آگاہ: دیباچہ مثنوی گلزارِ عشق ۱۲۱۱ھ بحوالہ جائزہ: تاریخ جلد اوّل ص ۵۲۳

[2] گرامر آف دی گوڈین لینگویجز۔ مقدمہ ص ۶۔ بحوالہ داستانِ زبانِ اردو ص ۵۴

[3] اردوئے قدیم (لکھنؤ بارِ سوم ۱۹۶۷ء) ص ۶۷

Marfat.com

کھڑی بولی برج بھاشا سے نہیں نکل سکتی کیوں کہ اس میں اور برج بھاشا میں متعدد اختلافات ہیں جن میں سے اہم ترین یہ ہے کہ اردو میں آ کا لہجہ غالب ہے برج میں اُو کا۔ اردو کو تشدید سے عار نہیں جب کہ برج میں یہ شاذ ہے۔ دونوں کے صرفی اصول، ضمائر وغیرہ میں کافی فرق ہے۔ انھیں شیرانی نے 'پنجاب میں اردو' میں، ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو میں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے داستانِ زبانِ اردو میں تفصیل سے دکھایا ہے۔ ان کی شرح تحصیل حاصل ہوگی۔ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے کھڑی بولی اور برج کے دو خاص فرق بتائے ہیں۔

۱۔ برج میں اُو کا لہجہ اور کھڑی بولی میں آ کا لہجہ۔

۲۔ اتصالی ضمیروں کا فرق۔ کھڑی میں اِس، جس، کِس، اُس۔ برج میں یا، جا، کا، وا۔ [1]

ہورنلے کے بعد گریرسن نے ۱۸۸۰ء کے ایک مضمون میں اردو کو مخلوط زبان قرار دیا۔

"اردو قواعد اور فرہنگ الفاظ کے لحاظ سے مخلوطِ عام اور مشترک زبان ہے۔ اس میں شمالی ہندوستان کی مقامی بولیوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، تیلگو زبان کے الفاظ شامل ہیں۔ اس کے صرفی نحوی قواعد نے شمالی ہند کی عام بولیوں سے خوشہ چینی کی ہے اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کسی ایک مخصوص اور معین زبان سے ترقی پاکر بنی ہے" [2]

لیکن بعد میں لسانیاتی جائزۂ ہند میں انھوں نے اپنے فیصلے میں ترمیم کی اور راہِ راست پر آگئے۔ لکھتے ہیں

"ہندوستانی کے آغاز کے بارے میں آج تک اہلِ علم نے (جن میں میں خود بھی شامل ہوں) جو کچھ لکھا ہے میر امّن کے دیباچۂ باغ و بہار سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ میر امن کے بیان کے مطابق اردو ان مختلف لوگوں کی بولیوں کی معجونِ مرکب ہے جو دہلی کے بازاروں میں جمع ہو گئے تھے۔

---

[1] اردو ترجمہ از عتیق صدیقی۔ ہند آریائی اور ہندی ص ۱۰۳

[2] کلکتہ ریویو جلد ۷۱ بابت ۱۸۸۰ء۔ ص ۱۵۶۔ بحوالہ داستانِ زبانِ اردو ص ۵۵

Marfat.com

اس غلط فہمی کو اوّل اوّل سر چارلس لایل نے ۱۸۸۰ء میں دور کیا۔ ہندوستانی زبانوں کے تفصیلی جائزے نے اب اس کو ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستانی (اردو) بالائی دوآبے اور مغربی روہیلکھنڈ کی (بول چال کی) زبان ہے، ان گھڑ اور گنوار الفاظ و محاورات نکال کر جسے ادبی نکھار سنگھار دے دیا گیا ہے"۔[1]

گریرسن کا یہ فیصلہ سائنٹفک مطالعے کا نتیجہ ہے اور صحیح ہے۔ پہلا فیصلہ تاثراتی تھا اور غلط تھا۔

بہر حال میر امّن کا اختلاط کا نظریہ مقبول و جاری رہا۔ مختلف علاقوں اور زمانوں سے اُنس رکھنے والے اردو علما نے سوچا کہ اگر اردو بیرونی مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کی زبان کے میل سے بنی ہے تو اس کی تخصیص دلّی اور عہدِ شاہجہانی ہی سے کیوں کی جائے۔ اس منتر کا اطلاق دوسرے مقامات اور دوسرے زمانوں پر کیوں نہ کیا جائے۔

۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اردو' شائع ہوئی۔ اس کی اہمیت ادبی تاریخ و تحقیق کے لحاظ سے بہت کم اور لسانی تحقیق کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ عرض حال میں وہ لکھتے ہیں۔

اردو زبان کے آغاز کا سرزمین پنجاب سے منسوب کرنا کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے۔ اس سے پیشتر شیر علی خاں صاحب سرخوش اپنے پُر لطف تذکرہ اعجاز سخن میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔

شیرانی کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے۔

مسلمانوں نے سب سے پہلے سندھ میں حکومت قائم کی۔ یہ ممکن ہے کہ وہاں انھوں نے کوئی ہندوستانی زبان اختیار نہ کی ہو لیکن پنجاب میں جہاں ان کی حکومت کم و بیش ۱۷۰ سال تک رہی انھوں نے سرکاری، تجارتی و معاشرتی اغراض سے کوئی نہ کوئی ہندوستانی زبان اختیار کی ہو گی۔ اسی زبان کو وہ دلّی لے آئے

---

[1] لسانی جائزۂ ہند۔ جلد ۹، حصّہ اوّل ص ۴۴، حاشیہ۔ بحوالہ داستانِ زبانِ اردو ص ۵۶

Marfat.com

ہمیں معلوم نہیں کہ ان کے آنے سے پہلے دلّی میں کون سی زبان بولی جاتی تھی ؟ وہ راجستھانی ہوگی یا برج ۔ غالباً برج تھی لاہور سے جو زبان آئی وہ پنجابی نما اردو یا اردو نما پنجابی رہی ہوگی ۔ دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہی اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہوگئی ۔

شیرانی نے اپنا نظریہ 'پنجاب میں اردو' کے مقدمے میں بیان کر دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ انھیں اردو سے قبل کی لسانی صورتِ حال کی کوئی واقفیت نہ تھی ۔ لکھتے ہیں ۔

"کہا جاتا ہے کہ مغربی ہندی جس کی برج بھاشا ، ہریانی ، راجستھانی ، پنجابی اور اردو شاخیں ہیں قدیم پراکرت شورسینی کی یادگار ہے ۔ لیکن جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی ہے ۔ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی" [1]

وہ تاریخی لسانیات کی مبادیات تک سے اتنے بے خبر ہیں کہ مغربی ہندی میں راجستھانی اور پنجابی کو بھی شامل کر بیٹھے ۔ کاش اس کی شاخوں میں وہ اردو کی جگہ کھڑی بولی لکھ دیتے تو صحیح خطوط پر چلتے ۔ انھوں نے قنوجی کا بھی نام لیا ہے لیکن محض اٹکل پچّو ۔ انھیں ماقبل اردو کی زبانوں اور اس کے علاقوں کا کوئی تصور نہیں ۔ وہ دیکھتے ہیں کہ سہارنپور اور میرٹھ میں سولہویں سترہویں صدی عیسوی کے شعرا عبدالقدوس گنگوہی اور مخدوم بہاء الدین برناوی نے برج میں شاعری کی ہے اور اس کی بنا پر یہ نتیجہ نکال لیا کہ " اب سے تین صدی پیشتر اس علاقے کی یہ زبان نہ تھی بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا" [2]

مسلمانوں کی آمد دہلی یعنی بارھویں صدی عیسوی کی زبان ، وہ سولھویں سترھویں صدی کے نمونوں کی بنا پر طے کرتے ہیں ۔ پھر یہ بھی نہیں جانتے کہ برج میں ملک

---

[1] پنجاب میں اردو ۔ نسیم بک ڈپو ستمبر ۱۹۸۱ء ۔ ص ۱۸

[2] 〃 〃 〃 ص ۱۹

Marfat.com

بھر میں شاعری ہوئی ہے بالخصوص کرشن بھگتی کی شاعری۔ اس کی بنا پر برج کو ان علاقوں کی زبان نہیں قرار دے سکتے بالکل اسی طرح جیسے بنگال کے شعرا تو ورودت، اروند وگھوش اور ٹیگور کی انگریزی شاعری کے پیش نظر بنگال کی زبان انگریزی نہیں طے کی جا سکتی یا انیسویں صدی میں غالب کی فارسی شاعری اور بیسویں صدی میں اقبال کی فارسی شاعری کو دیکھ کر دلی یا پنجاب کی زبان فارسی نہیں مانی جا سکتی۔

شیرانی کا یہ خلفشار تو دیکھیے کہ ایک طرف وہ یہ کہتے ہیں

"لیکن جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی ہے۔ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی" [1]

دوسری طرف وہ یہ لکھتے ہیں۔

"اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے" [2]

اور پھر کہتے ہیں۔

"دہلی میں یہ زبان (مسلمانوں کے ساتھ پنجاب سے آئی ہوئی زبان) برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے" [3]

اگر اردو اس زبان سے بنی ہے جو دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی تو وہ پنجاب سے مسلمانوں کے ساتھ دہلی کیوں کر آئی۔ ایک طرف وہ برج کو اردو کی ساخت سے بالکل بے دخل کر دیتے ہیں دوسری طرف اردو کو پنجاب سے آئی ہوئی زبان اور برج کے آمیزے سے تیار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو کی بنیادی زبان دہلی اور میرٹھ کی بولی کو نہیں مانتے۔ انھیں اس کے خدوخال کے بارے میں اندازہ ہی نہیں۔ وہ صرف یہ مانتے ہیں کہ اردو قدیم پنجابی سے ماخوذ ہے چنانچہ

---

[1] پنجاب میں اردو۔ نسیم بک ڈپو ستمبر ۱۹۸۱ء۔ صـ۱۸

[2] " " " " صـ۱۹

[3] " " " " صـ۲۲

Marfat.com

وہ اپنا پورا زور قدیم اردو اور پنجابی کی مماثلت دکھانے میں صرف کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر گراہم بیلی بھی شیرانی سے متفق ہیں۔ لکھتے ہیں

"اردو ۱۰۲۷ء کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئی۔ قدیم پنجابی اس کی ماں ہے اور قدیم کھڑی بولی مائدر (سوتیلی ماں)۔ برج سے براہِ راست اس کا کوئی رشتہ نہیں مسلمان سپاہیوں نے پنجابی کے اس روپ کو جو ان دنوں دہلی کی قدیم کھڑی بولی سے زیادہ مختلف نہ تھا اختیار کیا اور اس میں فارسی الفاظ اور فقرے شامل کر دیے۔"[1]

گراہم بیلی صاحب شیرانی سے بھی تیز ہیں۔ انھوں نے صریحاً اردو کو قدیم پنجابی سے پیدا کیا جب کہ شیرانی نے اس میں برج کی آمیزش کی تھی بیلی نے کھڑی بولی کو شامل کیا۔ یہ بھی شیرانی کے تضاد کا شکار ہیں کہ ان کی طرح اردو کو اوّل لاہور میں پیدا کرتے ہیں بعدہ دلّی میں۔ انھوں نے اردو کے آغاز کا سنہ ۱۰۲۷ء طے کیا جب کہ کسی اور نے اردو کا آغاز مسلمانوں کی فتح دہلی سے پہلے قیاس نہیں کیا۔

اردو یا کھڑی بولی کے آغاز میں پنجابی کا کوئی حصہ رہا ہے، اس کی تردید ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مقدمۂ تاریخ زبان اردو میں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے داستانِ زبانِ اردو میں کی ہے۔ دونوں نے پنجابی اور اردو کے صرفی و نحوی اختلافات اجاگر کیے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے دلائل زیادہ مضبوط ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

۱۔ پنجابی اور اردو میں اہم صوتی و صرفی اختلافات ہیں مثلاً پنجابی میں ٹ اور اردو میں ن ہے۔ پنجابی میں دو حرکات کا اجتماع ہوتا ہے مثلاً گھوڑی آں، اردو میں نہیں ہوتا۔ پنجابی میں ہائے مخلوط کو حذف کرنے کا رجحان ہے۔ پنجابی کا میلان تشدید کی طرف ہے جب کہ اردو اس معاملے میں اعتدال پسند ہے، پنجابی میں دو حرفی لفظوں میں بھی تشدید آتی ہے اور یہ لفظ مشدد الآخر ہوتے ہیں جب کہ اردو میں عربی کے چند الفاظ (مثلاً ردّ) کو چھوڑ کر ایسا نہیں ہوتا۔

---

[1] جرنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء ص ۲۹۱ بحوالہ داستانِ زبانِ اردو ص ۵

Marfat.com

بَ - پنجابی اور اردو کے مختلف فیہ سرمایہ میں اردو کی بعض چیزیں قدیم تر ہیں مثلاً اردو کے بس کو پنجابی میں ہ (ہائے ہوز) میں بدل دیا جاتا ہے جیسے سسرا سے سوہرا، بیس سے بیہہ یا محض بی - س سنسکرت اور پراکرت وغیرہ میں بھی ہے، پنجابی میں ترمیم ہوئی ہے اردو کرتا اور پنجابی کرداں میں ت قدیم تر ہے کہ یہ سنسکرت میں بھی تھا مثلاً پٹھت (پڑھتا ہے)

تفصیل کے لیے مسعود حسین خاں اور شوکت سبزواری کی کتابیں دیکھیے جس کے بعد شک نہیں رہتا کہ اردو یا کھڑی بولی پنجابی سے مختلف ہے - بیلی نے یہ بھی کہا کہ اس عہد میں پنجابی اردو سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ ایسا ہی ڈاکٹر زور کا عقیدہ ہے۔

شیرانی کے بعد ڈاکٹر زور نے اپنا نظریہ پہلے اپنی انگریزی کتاب Hindustani Phonetics میں اور پھر اردو کتاب 'ہندوستانی لسانیات' میں پیش کیا۔ انگریزی کتاب پر تاریخِ طباعت درج نہیں لیکن ڈاکٹر زور کا مقدمہ ۱۹۳۰ء کا ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کتابچے کی اشاعت ۱۹۳۰ء ہی میں ہوگئی ہوگی - اس کے صـ۱۹ تا ۲۱ پر دیے ہوئے ان کے نظریے کا خلاصہ اِس طرح ہے "اردو کی بنیاد مسلمانوں کی فتح دہلی سے پہلے ہی پڑ گئی تھی لیکن اس فتح سے قبل اردو کو زبان کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ یہ اس زبان سے ماخوذ ہے جو جدید ہند آریائی عہد کی ابتدا میں صوبۂ سرحد اور راۓ آباد کے نیچے بولی جاتی تھی۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ پنجاب کی بارھویں صدی کی زبان پر مبنی ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ اس زبان پر مبنی نہیں جو دلی اور گنگا جمنا کے دوآبے میں بولی جاتی تھی کیوں کہ جدید ہند آریائی عہد کی ابتدا میں پنجاب اور دلّی کے قریبی اضلاع کی زبان میں بہت کم فرق رہا ہوگا ..... بارھویں صدی کے بعد ہی جدید زبانوں میں امتیازی اختلافات پیدا ہوئے۔ پنجاب اور دلّی کی زبانوں میں یہ فرق اتنا نمایاں ہوگیا کہ ایک جگہ یہ پنجابی بن گئی، دوسری جگہ کھڑی بولی۔ اردو نہ پنجابی سے نکلی ہے نہ کھڑی بولی سے بلکہ ان دونوں کے مشترک ماخذ سے۔ اس لیے بعض خصوصیات میں یہ پنجابی سے مماثل ہے اور بعض میں کھڑی بولی سے۔"

ڈاکٹر زور نے یہی بات، انھیں الفاظ میں ہندوستانی لسانیات میں صـ۱۱۴ تا ۱۱۵ پر دہرائی ہے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر زور اردو کو کھڑی بولی سے الگ کر کے اس کی

Marfat.com

اصل تلاش کر رہے ہیں۔

عجیب تر یہ ہے کہ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی بھی ڈاکٹر زور کی جزوی تائید کرتے ہیں ہند آریائی اور ہندی میں لکھتے ہیں -

" وہ زبان جو اتھوں (مسلمانوں) نے سب سے پہلے اختیار کی قدرتی طور پر پنجاب کی مروّج زبان تھی۔ آج پنجاب کی بولیوں میں خاص طور پر مشرقی پنجاب اور اتّر پردیش کے انتہائی مغربی علاقوں کی بولیوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ آٹھ نو سو سال پہلے یہ فرق اور بھی کم ہوگا۔ امکان ہے کہ وسطی اور مشرقی پنجاب (اگر مغربی پنجاب اور ہندو افغانستان کو الگ کر دیا جائے) نیز مغربی اتر پردیش میں تقریباً یکساں بولی رائج ہوگی۔"[1]

مشرقی پنجاب سے ڈاکٹر چٹرجی کی مراد ہریانے کا علاقہ ہے اور وسطی پنجاب سے جالندھر، امرتسر اور لاہور کا۔ ہندو افغانستان سے مراد ہے غیر منقسم ہندوستان کا پٹھانوں والا حصّہ یعنی صوبۂ سرحد۔ چٹرجی نے لاہور سے مغربی یوپی تک کی زبان کی یکسانی قیاس کی ہے لیکن ڈاکٹر زور نے دونوں انتہاؤں کو بڑھا کر پشاور (پشتو یعنی ایرانی خاندان کی زبان) اور الہ آباد (اودھی) تک پہنچا دیا ہے۔ یہ ماضی کے لسانی نقشے سے چشم پوشی ہے۔ سنسکرت عہد ہی میں مغرب اور وسطی ہند میں مختلف بولیاں تھیں جنھیں اُدیچیہ اور مدھیہ دیشیہ کہا جاتا تھا۔ اشوکی پراکرتوں سے بھی بولیوں کے تنوع کا پتہ چلتا ہے۔ اس وسیع علاقے کی پراکرتیں اور اَپ بھرنشیں بھی مختلف تھیں۔ صوبۂ سرحد کا علاقہ ہند آریائی ہے ہی نہیں، یہ ایرانی ہے۔ اس کے مشرق میں کیکئی اَپ بھرنش (مغربی پنجاب)، ٹکّی اَپ بھرنش (مشرقی پنجاب)، شورسینی اَپ بھرنش (ہریانہ اور مغربی یوپی) اور اردھ ماگدھی اَپ بھرنش (کانپور، الہ آباد وغیرہ) رائج تھیں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ان سب اپ بھرنشوں پر بُل ڈوزر (bull dozer) چل کر گیارھویں، بارھویں صدی عیسوی میں یہ ایک ہی زبان بن گئی ہوں۔ اَپ بھرنشوں کے پیشِ نظر کہا

---

[1] ہند آریائی اور ہندی، اردو ترجمہ ص ۱۶۰

Marfat.com

جائے کہ جدید ہند آریائی دَور میں ان علاقوں کی زبانوں کا فرق نمایاں ہو گیا ہو گا۔

سیّد سلیمان ندوی کے خطبات کا مجموعہ نقوش سلیمانی کے نام سے شائع ہوا۔ انھوں نے سوچا کہ جب اردو نو وارد مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کی زبانوں کے میل کا نتیجہ ہے تو یہ اعزاز دہلی لاہور کو کیوں دیں ان سے بھی پہلے چل کر سندھ کو کیوں نہ دیں۔ سیّد صاحب لکھتے ہیں

"مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں۔ اس لیے قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اُردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہو گا۔" (ص ۳۱)

ہندو مسلمان کے میل کا نسخہ ایسا ہے کہ یہ کہیں بھی، کسی بھی زمانے میں ہوا ہو۔ اس ملاوٹ کا نتیجہ اردو ہی رہا ہو گا۔ سید صاحب کو اس سے غرض نہیں کہ سندھ میں آنے والے مسلمانوں کی زبان عربی تھی اور سندھ کے ہندوؤں کی زبان براچڑ اپ بھرنش۔ ان کے میل سے سندھی زبان بن سکتی تھی اُردو نہیں۔

نصیر الدین ہاشمی کی کتاب 'دکن میں اُردو' کے پہلے ایڈیشن میں مقدمے پر ۷ صفر ۱۳۴۲ھ (ستمبر ۱۹۲۳ء) کی تاریخ پڑی ہے۔ کتاب پر سنہ اشاعت نہیں دیا۔ لیکن 'ہماری زبان' میں ہاشمی صاحب کے ایک مراسلے کی بنا پر یہ معلوم ہے کہ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ پہلے ایڈیشن میں اردو کے آغاز کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ طبع اول کے علاوہ میرے سامنے اس کا تیسرا ایڈیشن (۱۹۲۶ء) ہے۔ اس میں انھوں نے محمود شیرانی، ڈاکٹر چٹرجی اور ڈاکٹر زور وغیرہ کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا۔ لکھتے ہیں کہ اُردو کی ابتدا چار مقامات سے منسوب کی جاتی ہے۔

۱۔ پنجاب ۲۔ سندھ ۳۔ دکن ۴۔ دوآبۂ گنگا جمنا

چوں کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی اس لیے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی وہ ابتدا [illegible] غلط نہیں ہو سکتا (طبع سوم ص ۱۲) پھر وہ سندھ کو اس لیے رد کرتے ہیں [illegible] کے عربی فاتحوں کی زبان عربی تھی، فارسی نہیں۔ وہاں عربی اور شورسینی کے میل سے کوئی زبان بن سکتی تھی جو اردو نہ ہوتی۔ یہی دقت انھیں دکن کے [illegible] باشندوں کی زبان کے پیش نظر محسوس ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

Marfat.com

"جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے کے مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع نظر آتے ہیں اس لیے ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے"، ص۱۹

لیکن یہ تضاد بیانی دیکھیے کہ آگے چل کر وہ اردو کے آغاز کا سہرا دکن کے سر باندھتے ہیں۔ 'دکھنی نثر کی ابتدا' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں،

"اس امر کا ابھی کوئی قطعی ثبوت نہیں ملا کہ شمالی ہند میں اُردو احاطۂ تحریر میں کب آئی مگر بلا خوفِ تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دکن میں اس کی ابتدا پہلے ہوئی اور یہاں بھی وہ بول چال کے ابتدائی مدارج سے گزر کر تحریری صورت میں بھی آئی"، ص۲۶

شاید وہ یہاں اردو کے تحریری روپ کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بیان ان کے پہلے عقیدے کو پیش کرتا ہو اور ص۱۹ کا بیان ترمیم شدہ فیصلے کو جو دوسروں کی تحقیقات کے مطالعے کے بعد طے ہوا۔

اب تین ماہرین لسانیات کے نظریات پر غور کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ انھوں نے "مقدمۂ تاریخِ زبان اردو" میں اپنا مخصوص نظریہ پیش کیا کہ محمود شیرانی نے دکن پر جن پنجابی اثرات کی نشان دہی کی تھی ان کی توجیہ نواحِ دہلی کی بولیوں ہریانی، میواتی، برج اور کھڑی بولی سے کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے یہ صرف دکنی تک محدود نہ رکھا بلکہ کچھ ایسا تاثر دیا جیسے وہ اردو کو ہریانی، میواتی، برج اور کھڑی کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں ان کی کتاب کا نیا ایڈیشن آیا ہے جس میں انھوں نے مختلف مباحث کو بہت عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن کے بدلے سابقہ ایڈیشنوں کو نظر انداز کر کے نئے ایڈیشن تک محدود و مرکوز رہنا مناسب ہے۔

نئے ایڈیشن میں انھوں نے میواتی کو یک قلم خارج کر دیا ہے، برج کا بھی ذکر نہیں چنانچہ آخری باب میں وہ صرف ہریانی اور کھڑی بولی تک محدود رہے ہیں۔ وہ دکنی کے مبینہ پنجابی عناصر کی تاویل کرنا چاہتے ہیں لیکن عنوان دیتے ہیں۔

اردو اور ہریانوی۔

Marfat.com

اردو اور کھڑی بولی۔

اگر وہ دکنی اور ہریانوی۔ دکنی اور کھڑی بولی عنوان دیتے تو میرا ان سے کوئی اختلاف نہ ہوتا لیکن وہ اردو کی ابتدا بھی ان دو بولیوں میں کھوجتے ہیں۔ کتاب کے نئے ایڈیشن کے آخری پیراگراف میں لکھتے ہیں۔

"اردو کی ابتدا کے سلسلے میں تحقیق کی جو سمت اس تصنیف میں مقرر کی گئی ہے تمام تر نئے مواد سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ نواحِ دہلی کی بولیوں کے قدیم نمونے جوں جوں روشنی میں آتے جائیں گے یہ بات بھی واضح ہوتی جائے گی کہ اردو کا ماخذ یہی بولیاں ہیں" (صفحہ ۲۶۲-۶۲)

پہلے لیجیے ہریانی کو۔ ان کے سامنے ہریانی کی قواعد اور دیگر خصوصیات سے متعلق ڈاکٹر جگدیو سنگھ کی انگریزی کتاب 'بانگرو کی توضیحی قواعد' (۱۹۷۰ء) اور ڈاکٹر رام بلاس شرما اور ڈاکٹر امیا پرشاد سمن وغیرہ کی عالمانہ ہندی کتابیں ہیں۔ اس کے باوجود حیرت ہوتی ہے کہ وہ شیرانی کی تقلید میں شیخ عبداللہ انصاری، شیخ محبوب عالم وغیرہ کو ہریانی کے مصنفین سمجھتے ہیں (صفحہ ۲۳۹) یہ ہریانہ علاقے کے اردو مصنفین ہیں۔ ہریانی کے نہیں۔ جس طرح پنجاب میں لکھنے والے اردو شاعر شاہ مراد کا نام مراد پنجابی کی اور گولکنڈے سے وجہی کی قطب مشتری تیلگو کی کتابیں نہیں، اردو کی ہیں، اسی طرح ہریانے کے ان اردو شعرا کی زبان کو ہریانی سمجھنے کا کوئی جواز نہیں۔ محبوب عالم کے محشر نامے کی زبان یہ ہے۔

ہوئے پھر مقابل قریشوں کے تب — نبی اور اصحابہ ایک بارسب
عکاسہ طرف دایں کوں کھڑا — ابو سلمہ بانویں طرف پر پڑا

چونکہ یہ شعرا ہریانہ علاقے کے رہنے والے ہیں، اس لیے اس سے نہیں کہ ان کی اردو شاعری میں کہیں کہیں ہریانی الفاظ یا روپ آگئے ہیں۔ ڈاکٹر ہردیو باہری کی ہندی کتاب 'گرامین ہندی بولیاں' ڈاکٹر مسعود حسین خان کے ماخذات میں ہے۔ اس سے ہریانی کے کچھ نمونے درج کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ ہریانی دراصل کیا ہے۔ اسے اردو رسم الخط میں صحیح لکھنا مشکل ہے لیکن اعراب کی مدد سے کوشش کرتا ہوں۔

Marfat.com

مَنّے کَرا (میں نے کہا)
کونْ جاوَے سَے (کون جاتا ہے)
بیٹھانی جانْدا (بیٹھا نہیں جاتا)
ہُور کے چاوَے سُو۔ ایب تھارِے تے اُنّے بھٹّا دوں گا (اور کیا چاہتے ہو۔ اب تم سے اسے ملوا دوں گا)
تھیلی بیں تے پسنّا لِگڑن لاگ رہیا۔ (ہتھیلی میں سے پسینہ نکلنے لگا)[1]

کیا اردو اس بانگرو سے نکلی ہے؟

مسعود حسین خاں لکھتے ہیں۔

"گریرسن موجودہ ہریانی کو کھڑی بولی (ہندوستانی) ہی کی ایک شکل مانتا ہے جس میں راجستھانی اور پنجابی بولیوں کی آمیزش پائی جاتی ہے"[2]
گویا گریرسن ہریانی کو کھڑی بولی سے بعد کی مانتا ہے۔

اب آئیے کھڑی بولی پر۔ پچھلے کے اوراق میں کھڑی بولی کے مختلف مفاہیم کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ گریرسن نے اسے ورناکیولر ہندوستانی کہا۔ چٹرجی نے جس ہندی کی پانچ قسمیں کیں وہ ہندوستانی کھڑی بولی ہی کی قسمیں ہیں۔ عام طور سے اسٹنڈرڈ ہندی اور ہندوستانی کھڑی بولی سے جدا نہیں۔ دیہاتی بول چال اس کا ایک مخصوص اور محدود روپ ہے۔ نہ جانے کیوں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کھڑی بولی کو محض اس کے دیہاتی روپ کے معنی ہی میں لیتے ہیں۔ اگر وہ اسے بول چال کی ہندوستانی کے معنی میں لیں تو اردو اس کی ایک فصیح ادبی شکل ٹھہرتی ہے۔ کسی زبان کے مہذب روپ اور اس کے تقریری روپ کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کھڑی بولی کے سلسلے میں اس موضوع پر بالاستیعاب لکھا جا چکا ہے۔

وہ گریرسن کا یہ نظریہ بھی درج کرتے ہیں کہ وہ کھڑی بولی کو برج بھاشا کا

---

[1] گرامین ہندی بولیاں (کتاب محل الہ آباد، ۱۹۶۲ء) صفحہ ۴۵
[2] لسانیاتی جائزۂ ہند حصہ اوّل جلد نہم صفحہ ۳۵۲ بحوالہ مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو صفحہ ۳۳

Marfat.com

ایساروپ مانتا ہے جو پنجابی میں بتدریج ضم ہوتا چلا گیا ہے (ص ۶۸) دراصل کسی زبان یا بولی کو دوسری زبانوں یا بولیوں کا مجموعہ قرار دینا ہی غلط ہے۔ گریرسن پنجابی کو ہندی اور لہندا کا آمیزہ مانتا ہے۔ اس طرح ہر زبان یا بولی کو مخلوط قرار دیا جا سکتا ہے۔ اودھی کو کھڑی بولی اور بہاری کا، بہاری کو اودھی اور بنگالی کا، راجستھانی کو ہندی اور گجراتی کا، گجراتی کو برج اور راجستھانی کا، ملیالم کو سنسکرت اور تامل کا ملغوبہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

انگریزی جرمن الاصل زبان ہے لیکن اس میں لاطینی خاندان (فرنچ) کے الفاظ بکثرت، شاید نصف سے زیادہ ہیں۔ کیا انگریزی کو برطانیہ کے دیہاتی strong جرمن اور فرنچ کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ فارسی میں عربی کے الفاظ بھر گئے ہیں۔ کیا اسے اوستانی یا قدیم فارسی اور عربی کے اختلاط کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ ملائی! بھاشا انڈونیشیا میں اصل پولی نیشین خاندان کے الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی، سنسکرت اور ڈچ زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں۔ کیا بھاشا انڈونیشیا کو ان چار زبانوں سے پیدا کیا جائے گا۔ ٹکر کا قول پیچھے درج کیا جا چکا ہے۔

"زبان دوسری زبان کے الفاظ جتنے چاہے مستعار لے کر اپنا لے، ایک زندہ بولی جانے والی زبان غیر زبان کے صرفی، نحوی قاعدے اور تعمیری اصول کبھی نہیں اپناتی"

دخیل سرمایۂ الفاظ کو نظر انداز کر کے کھوجنا یہ چاہیے کہ کسی زبان کا بنیادی ڈھانچا کس قدیم زبان کا ارتقا یافتہ روپ ہے۔ اس میں متفرق الفاظ دوسری زبانوں یا بولیوں سے لیے گئے تو ان کی اہمیت نہیں۔ اردو کھڑی بولی ہی کا ایک روپ ہے۔ ہریانی اور برج کی کچھ خصوصیات کے شمول کے باوجود یہ بولیاں اس کے شجرۂ نسب میں نہیں آتیں۔ یہ اردو کی آس پاس یا دور کی رشتے دار ہیں، آبا و اجداد نہیں۔

ہر زندہ اور فعال زبان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف خواص بلکہ عوام، نہ صرف شہروں اور قصبوں بلکہ کسی نہ کسی علاقے کے دیہاتوں میں بھی بولی جاتی ہو۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ وہ اردو کو کھڑی بولی

Marfat.com

سے جدا کر کے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اردو محض شہروں اور قصبوں یعنی محض اشراف کی زبان ہے جب کہ دیہاتی عوام کی زبان کھڑی بولی ہے۔ یہ ایسا ہی موقف ہے جیسا فیض احمد فیض کا تھا۔ انھوں نے ایک مشہور انٹرویو میں کہا تھا

"اردو جو ہے وہ شہری زبان ہے، وہ گاؤں میں بولی ہی نہیں جاتی۔ کسی بھی علاقے کے دیہات میں اردو نہیں بولی جاتی۔ آپ دہلی سے چند میل باہر چلے جائیں، وہاں لوگ اردو نہیں بولتے۔ لکھنؤ سے تین چار میل باہر چلے جائیں وہاں بھی اردو نہیں بولی جاتی۔ وہاں کی زبان اگر ہے تو کہیں کھڑی بولی تو کہیں برج۔ آپ انھیں عوامی بولی کہہ سکتے ہیں مگر اردو نہیں۔"[1]

اگر ڈاکٹر مسعود حسین خاں کھڑی بولی کو اردو کا تقریری روپ مانتے تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اردو کھڑی بولی اور ہریانی سے مل کر بنی ہے۔ وہ کھڑی بولی کو ایک دیہاتی بولی مان کر تحقیر سے دیکھتے ہیں۔ میری رائے میں اردو محض کھڑی بولی کا شستہ روپ ہے، اس سے جدا نہیں۔

دکنی کھڑی بولی کی ایک ذیلی علاقائی بولی ہے۔ دکنی کا راست سلسلۂ نسب کھڑی بولی ہی سے ملتا ہے۔ ہریانی اور دوسری زبانوں سے اس میں جو الفاظ آئے ہیں ان کی حیثیت دخیل الفاظ کی ہے۔ شیرانی نے دکنی کے بعض الفاظ کو پنجابی کی دین قرار دیا تھا۔ مسعود صاحب نے مناسب کیا کہ ان میں سے کچھ الفاظ کو دکنی کی مادر کھڑی بولی کی دین ثابت کیا، بعض دوسروں کو ہریانی سے مستعار قرار دیا۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ انھوں نے اپنا نظریہ مختصراً اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے 'اردو زبان کا ارتقا' میں پیش کیا۔ یہ مقالہ ۱۹۵۲ء میں یونیورسٹی میں داخل کیا گیا اور ۱۹۵۶ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ انھوں نے اپنے نظریے کو مزید تفصیل سے داستانِ زبان اردو کے نام سے رسالہ اردو میں ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ یہ بعد میں ۱۹۶۱ء میں کتابی صورت میں آیا۔ ان کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے۔

---

[1] ڈاکٹر نصرت چودھری: فیض کی شاعری (ایک مطالعہ) (شان پبلشنگ ہاؤس، امیرا کدل، سری نگر) ص ۱۹۵

Marfat.com

مغربی ہندی اہلِ لسانیات کا ایک مفروضہ ہے جس کا کبھی وجود نہ تھا۔ برج بھاشا یقیناً شورسینی اَپ بھرنش اور شورسینی پراکرت سے نکلی ہے لیکن اردو یا ہندوستانی ان سے نہیں پیدا ہوئی۔ شورسینی میں اُو کا لہجہ ہے ہندوستانی میں آ کا۔ انھوں نے اردو کے شورسینی اپ بھرنش اور شورسینی پراکرت سے اختلافات دکھا کر طے کیا کہ یہ دونوں، اردو کے راست سلسلۂ نسب میں نہیں آتیں۔ ہندوستانی اس بول چال کی اَپ بھرنش سے ماخوذ ہے جو میرٹھ اور دلّی میں رائج تھی، ادبی نمونوں سے ماخذ کی بول چال کی زبان کی آئینہ داری نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر شوکت لکھتے ہیں۔

"اردو ہندوستانی یا کھڑی، قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیے کہ اَدلتے بدلتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ ان سے لیتے اس حالت کو پہنچی جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ پالی اس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔ اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔ پالی، ادب فن اور فلسفے کی زبان ہے اور ہندوستانی روزمرہ بول چال، لین دین اور کاروبار کی۔ پالی ادبی درجہ پاکر ٹھہر گئی لیکن ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے اور بازار ہاٹ میں بولے جانے کے باعث برابر ترشتی، ترشاتی اور چھلتی چھلاتی رہی" [1]

اس کے بعد وہ اُردو اور پالی کی مشابہتوں کو دکھاتے ہیں۔ پھر داستانِ زبانِ اردو کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر احتشام حسین فرماتے ہیں کہ میں پالی کو اُردو زبان کی اصل قرار دیتا ہوں۔ یہ درست نہیں ..... اُردو نے جس زبان سے ارتقا پائی ہے وہ کبھی بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی۔ سنسکرت، پالی، شورسینی پراکرت، مغربی

---

[1] اردو زبان کا ارتقا۔ (چمن بک ڈپو دلّی) ص ۱۰۵

Marfat.com

اَپ بھرنش بالائی دوآبے کی اس بول چال کی زبان کے مختلف العہد ادبی روپ ہیں۔ کھڑی یا ہندوستانی (اردو) اس کا فطری ترقی یافتہ (یا بدلی ہوئی) صورت ہے۔ یہ زبانیں اردو کے راست سلسلۂ نسب میں نہیں آتیں"۔[1]

ڈاکٹر اختر اورینوی اور انتشام حسین کے اعتراض سے متنبہ ہو کر ڈاکٹر شوکت سبزواری نے داستانِ زبانِ اردو میں پالی پر زور نہیں دیا۔ بارہویں تیرھویں صدی عیسوی کے عہد کی کھڑی بولی اور قبل مسیح کی پالی کو ایک دوسرے کے برابر رکھنا نامناسب تھا۔ ان کے اس نظریے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ کھڑی بولی اس اَپ بھرنش سے ماخوذ ہے جو دلّی اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی لیکن ان کے دو فیصلوں سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ "اس علاقے کی زبانوں کو عہد بہ عہد (سنسکرت سے شورسینی اَپ بھرنش تک) جو تحریری نمونے ملتے ہیں وہ مصنوعی زبانوں کو پیش کرتے ہیں۔ بول چال کی زبان مختلف تھی"۔

یہ مسلّم کہ تحریری اور تقریری زبان میں سطح کا فرق ہوتا ہے لیکن اس سے زبان کی نوعیت نہیں بدل جاتی۔ عام تحریر میں تقریر کی زبان ہی کو صحت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ پالی، شورسینی پراکرت اور شورسینی اَپ بھرنش اپنے اپنے علاقے کی بول چال کی زبان کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ناٹکوں کے کرداروں میں پراکرت اور اپ بھرنش کا استعمال کسی پُراسرار مصنوعی زبان میں نہیں ہوتا بلکہ اس عہد اور علاقے کی واقعی زبان میں ہوتا ہے۔

۲۔ دلّی، میرٹھ کے علاقے کی ہندوستانی ویدوں کے زمانے سے موجود تھی۔ اس میں زمانے کے ساتھ بہت کم اختلافات ہوئے جب کہ تحریری ادبی زبان میں زیادہ ہوئے اور وہ ویدک بھاشا، سنسکرت، پالی، شورسینی پراکرت اور مغربی اَپ بھرنش کی منزلوں میں ظاہر ہوئی۔

---

[1] پیشِ لفظ داستانِ زبانِ اردو صہ

Marfat.com

بات الٹی ہے۔ ادبی زبان میں تبدیلی کی رفتار سست ہوتی ہے۔ بول چال کی زبان میں کہیں زیادہ۔ اگر ادبی روپ ہر پانچ سو سال کے بعد بدلتے رہے ہیں تو تقریری روپ بھی اس قدر بدلا ہوگا کہ اسے ایک نئی زبان کہا جائے گا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کو یہ کہاں سے الہام ہوا کہ "اردو، ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے"، بغیر کسی ثبوت یا مثالوں کے کچھ بھی آئیں بائیں شائیں دعوا کر دینا غیر علمی طریقِ کار ہے۔ سہیل بخاری۔ پاکستان کے دوسرے ماہر لسانیات ڈاکٹر سہیل بخاری ہیں جو شوکت سبزواری کی طرح سنسکرت جاننے کے مدّعی ہیں۔ ان کے بہت سے مفروضات ایجادِ بندہ قسم کے ہوتے ہیں مثلاً

۱۔ "اس برِّ صغیر کی تمام زبانیں دراوڑی یعنی ہندوستانی ہیں۔ ان کا اپنا ایک خاندان ہے ..... جن میں مجھے تین اہم گروہ نظر آتے ہیں: مشرقی یا ماگدھی، مغربی یا شورسینی، جنوبی یا مہاراشٹری" [1]

۲۔ "اردو اور دکنی دونوں دراوڑی ہونے کے علاوہ مہاراشٹری گروہ سے بھی تعلّق رکھتی ہیں" [2]

وہ دکنی کو بیجاپوری کہتے ہیں۔ ان کی اصطلاحی بوالعجبیوں کو نظر انداز کر کے ان کے نظریے کے مغز کو دیکھیے۔

"پاک و بھارت کی زبانوں میں سے کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو دو زبانوں کے میل جول سے وجود میں آئی ہو بلکہ دو زبانوں کے میل سے تو اس برِّ صغیر کیا، دنیا میں کوئی زبان آج تک پیدا نہیں ہوئی" [3]

انھوں نے اس نکتے پر توجہ کی کہ شمالی ہند میں خسرو کے بعد اردو ادبیات کے نمونوں میں کئی سال کا وقفہ ہے جسے دکنی سے پُر کیا جاتا ہے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اہلِ اردو صرف اسے اردو سمجھتے ہیں جو ایرانی خط میں لکھی گئی ہو حالانکہ رسم الخط بالکل خارجی

---

[1] سہیل بخاری: قدیم دکنی اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ اردو نامہ کراچی۔ شمارہ ۱۸۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۴ء۔ ص ۵۷

[2] " " " " " ص ۵۹

[3] " " " " " ص ۵۸

Marfat.com

شے ہے۔ اردو کے ساتھ دیوناگری رسم خط کے نمونوں کو بھی لیجیے تو کھڑی بولی کی ایک مسلسل روایت بن جائے گی۔

ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دکنی قدیم اردو نہیں بلکہ یہ ایک علاحدہ زبان ہے۔ اردو اور ہندی کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں۔

"دراصل اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں جسے ماہرینِ علم زبان نے کھڑی بولی کا نام دیا ہے۔ ان کے موجودہ روپوں میں دو فرق واضح ہیں: ایک پلی اور دوسرا دخیل لفظ۔ ہندی دیوناگری میں لکھی جاتی ہے اس لیے اس میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار ہوگئی ہے اور اردو نے ایرانی لپی میں تحریر ہونے کے باعث بے شمار عربی فارسی الفاظ مستعار لے لیے ہیں لیکن علم زبان کے لحاظ سے دونوں کے یہ اختلافات قابلِ التفات نہیں کیوں کہ ان سے زبان کی بنیادی خصوصیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس نقطۂ نظر سے ہندی اور اردو کی تاریخ ایک ہی ہے، خاص کر کھڑی بولی کی قدیم تاریخ اردو زبان کا بھی ایسا ہی اہم حصّہ ہے جیسا ہندی زبان کا، اور اس کے قدیم ادب میں سنسکرت یا دوسری معاصر بولیوں کی مستعار الفاظ کی موجودگی کے باوجود اسے اردو نے قدیم مانے بغیر چارہ نہیں"[1]

اور اس کے بعد انھوں نے ہندی شعرا کے یہاں سے نمونے تلاش کر کے خسرو کے بعد شمالی ہند میں واقعی کھڑی بولی کی ایک مسلسل روایت دریافت کر لی اور یہی اصل حقیقت ہے۔ جو کچھ کسر رہی ہوگی ان سے تحریک پاکر ڈاکٹر پرکاش مونس نے پوری کر دی۔ انھوں نے ہندی سے نظم کے علاوہ قدیم کھڑی بولی نثر کے نمونے بھی پیش کیے[2] اس طرح کھڑی کی روایت اور استوار ہوگئی۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اوپر بڑی پتے کی بات کہی تھی۔ اردو کا آغاز کب

---

[1] ڈاکٹر سہیل بخاری: اردو کا قدیم ترین ادب۔ نقوش ص ۸۴-۸۳ شمارہ ۱۰۲۔ مئی ۱۹۶۵ء

[2] اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر ص ۳۱ تا ۳۵۔

Marfat.com

ہوا اس معاملے کو لے کر وہ پھر بہک گئے۔ کہتے ہیں۔

"عوام الناس کا یہ خیال کہ زبان (اردو) یوں ہی خود بخود پیدا ہو گئی ہے محض ناواقفیت پر مبنی ہے کیوں کہ مجھے اپنی زبان کی بناوٹ میں کچھ ایسے اصول نظر آتے ہیں جن سے کبھی انحراف نہیں کیا جاتا۔ اس لیے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہماری زبان انسانی ایجاد ضرور ہے لیکن یہ ایجاد اتنے پرانے زمانے میں ہوئی ہے کہ اس کے متعلق ہم تک کوئی معلومات نہیں پہنچ سکیں .....

اردو زبان کی عمر کچھ نہیں تو کم از کم چند ہزار سال تو ضرور ہی مانی جا سکتی ہے کیوں کہ اس کے الفاظ اس برِصغیر کی قدیم ترین کتاب رِگ وید میں آج بھی ملتے ہیں لیکن اردو والوں سے میرا کہنا صرف اتنا ہے کہ سنسکرت یا پراکرت سے اردو کا جوڑ ملانے کے بجائے خود اس کے الفاظ کا مطالعہ کیجیے کیوں کہ ان میں ایک ایسا جہان آباد ہے جس کا کاروبار مسلمہ اصولوں کے تحت چل رہا ہے" [1]

افسوس یہ ہے کہ فاضل مضمون نگار نے رِگ وید میں اردو کے ایک لفظ کی مثال بھی درج نہیں کی۔ زبان متفرق الفاظ کا نام نہیں بلکہ صرفی و نحوی اصولوں کے مطابق فقروں اور جملوں کی ساخت کا ہے۔ کیا رِگ وید یا سنسکرت، پالی، پراکرت، اَپ بھرنش میں اردو یا کھڑی بولی کا ایک بھی جملہ ملتا ہے۔ کھوکھلے بلند بانگ دعووں سے اردو کے ناواقف قارئین کو مرعوب کرنا مقصد ہو تو دوسری بات ہے۔ انھیں ڈاکٹر صاحب نے ایک کتاب 'اردو کی کہانی' تصنیف کی جو ۱۹۷۵ء میں لاہور سے شائع ہوئی اور جسے انھوں نے ہندی آمیز زبان میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"رِگ وید میں دیسی بولیوں کی بہت بھاری گنتی دیکھ کر یہ بات پورے بھروسے سے کہی جا سکتی ہے کہ جب آریا آج کل کے روسی ترکستان سے چل کر ہندوستان پہنچے تھے، اس گھڑی بھی یہاں یہی سب بولیاں

---

[1] سہیل بخاری: کوڑی۔ نقوش ص ۱۳۹ شمارہ ۱۰۶ جنوری تا دسمبر ۱۹۶۶ء

Marfat.com

بولی جاتی تھیں جو آج ہم اپنے کانوں سے سن رہے ہیں اور انھیں میں اردو بھی تھی۔ رِگ وید میں جن شاعروں کے بھجن ملتے ہیں ان میں کچھ ایسے شاعر بھی تھے جو اردو کے دیس میں بستے تھے یا اردو بول سکتے تھے کیوں کہ انھوں نے اپنے بھجنوں میں آریائی بولوں کے ساتھ ساتھ اردو کے بول بھی باندھ دیے ہیں۔ پر رِگ وید میں ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں مل پائی ہے جس سے یہ کھلتا کہ اُردو ان دنوں ہندوستان کے کس حصّے میں بولی جا رہی تھی"۔[1]

'رِگ وید میں ایسے شاعر بھی ہیں جو اردو بول سکتے تھے'، قارئین سے معذرت خواہ ہوں کہ ایسے لسانی مالیخولیا سے ان کی طبیعت منغّض کی۔

اردو کے مولد کے بارے میں ڈاکٹر بخاری کا انوکھا نظریہ درج کر کے ان کے انکشافات تمام کرتا ہوں۔ معلوم نہیں انھوں نے کہاں سے کھوج لگائی کہ مشرقی سی پی کو کھڑ دیس کہتے ہیں۔ اس علاقے کے مشرق میں اڑیسہ، شمال میں چھتیس گڑھ اور دکن میں تلنگانہ ہے گویا یہ موجودہ مدھیہ پردیش کا قبائلی ضلع بستر ہوا۔ لکھتے ہیں

"تیسری بات یہ ہے کہ اسی حصّے کی بولیوں میں ایک بولی کھڑیا نام کی بولی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہی اردو ہو۔ یہ تینوں باتیں مل کر میرے اس سوچ کو پکّا کرتی ہیں کہ اردو، جسے کھڑی بولی کہتے ہیں کھڑ دیس میں سدا سے بولی جا رہی ہے، جہاں سے نکل کر یہ پہلے اُتری ہندوستان پہنچی اور پھر وہاں سے پورے ہندوستان کی لمبائی چوڑائی میں پھیل گئی"۔ (صـ ۱۵۶)

واللہ اعلم انھیں کھڑ دیس اور کھڑیا بولی کی بھنک کہاں سے پڑ گئی..... ہوئے بس است۔ انھوں نے کھڑی بولی اور اُردو کو وہاں سے برآمد کر دیا۔

اس تمام لسانی مجذوبیت کے بیچ کام کی بات صرف ایک کہی گئی ہے کہ کھڑی بولی کا ارتقا اُردو اور ہندی دونوں لکھاوٹوں میں تلاش کیا جائے تو شمالی ہند میں اس کی مسلسل روایت مل جاتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کھڑی بولی، اردو اور ہندی ایک

---

[1] اردو کی کہانی صـ ۱۵۶-۱۵۵۔ مکتبۂ عالیہ لاہور ۱۹۷۵ء

Marfat.com

ہی زبان کے نام ہیں۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے لسانیات پڑھ کر کج فہمی کے سبب عجیب عجیب مفروضات قائم کیے۔ انھیں کے ہم صفیروں میں بنگلور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی ریڈر ڈاکٹر آمنہ خاتون تھیں جنھوں نے لسانیات کو جانے بغیر یہ دعویٰ کیا کہ دکنی نہ صرف شمالی اردو سے الگ زبان ہے بلکہ آزادانہ طور پر اس سے پہلے تشکیل پذیر ہوئی۔ ان کا کتابچہ 'دکنی کی ابتدا' ۱۹۷۰ء میں بنگلور سے شائع ہوا۔ مجھے کہیں سے نہ مل سکا اس لیے اس کا ماحصل ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کی کتاب اردو کی لسانی تشکیل کے حسب ذیل طویل اقتباس کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔

"چند سال قبل بنگلور کی ڈاکٹر آمنہ خاتون نے دکنی کی ابتدا (۱۹۷۰ء) کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں انھوں نے دکنی کو اردو سے ایک علاحدہ زبان قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں دکنی نہ تو دہلی میں بولی جانے والی زبان سے ماخوذ ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسری جگہ سے چل کر دکن پہنچی ہے بلکہ اس کی ابتدا سرزمینِ دکن سے ہوئی ہے اور وہ یہیں نشوونما پاکر پروان چڑھی ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون کے خیال کے مطابق مسلمانوں کے دہلی پہنچنے سے کم از کم ساڑھے پانچ سو سال پہلے سے دکن میں مرہٹی زبان میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش سے دکنی کی داغ بیل پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ دکنی کی ابتدا سے متعلق ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے:

"تاریخ شاہد ہے کہ بندرگاہ تھانہ پر قبضے (سنہ ۶۳۰ء) کے زمانے سے دولت آباد کے پایۂ تخت قرار پانے (۱۳۰۰ء) کے زمانے تک مہاراشٹر کے مسلمانوں کی زبان پہلے بلاشبہ شورسینی اپ بھرنش اور بلاشبہ اس کی مقامی پیداوار مراٹھی تھی اور اس کے شواہد موجود ہیں کہ شورسینی اپ بھرنش اور مراٹھی میں عربی اور فارسی کی سات سو سال کے عرصے میں بتدریج آمیزش اور پڑوس کی جدید آریائی زبانوں سے لین دین اور راہ رسم کی وجہ سے مرہٹی کے دوش بدوش دکنی کی نشوونما ہوئی"[1]

---

[1] دکنی کی ابتدا ص ۳۴ بحوالہ اردو کی لسانی تشکیل (علی محمد خسرو ص ۲۳)

Marfat.com

اردو کے آغاز وارتقا کے بارے میں سنیتی کمار چٹرجی، محمود شیرانی، ڈاکٹر زور، پروفیسر مسعود حسین خاں اور دیگر عالموں کے تحقیقی نظریات کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے وہ دکنی کی ابتدا میں ایک جگہ یہ بات لکھتی ہیں:

"یہ فرض کرنا کہ دکن میں ان پورے پونے سات سو سال کے عرصے میں مرہٹی میں عربی اور فارسی کے شمول اور راجستھانی، گجراتی اور برج بھاکا کے ماحول کے اثر سے دکنی وجود میں نہیں آئی بلکہ دفعتہً ۱۳۲۷ء میں دلّی کی آبادی کے دولت آباد میں منتقل ہو جانے سے موجود ہو گئی، کسی زبان کے وجود میں آنے اور اس کی نشوونما پانے کے مسلّمہ نیاتی اصولوں کے سراسر خلاف ہے، اور اس حقیقت سے چشم پوشی ہے کہ دولت آباد، گلبرگہ اور بیدر جو سلطنتِ دہلی کے مرکزِ حکومت تھے مرہٹواڑی میں واقع تھے اور یہاں کے باشندوں کی زبان مرہٹی تھی۔"[1]

ڈاکٹر خلیل بیگ کی کتاب سے اقتباس ختم ہوا۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر آمنہ خاتوں کو وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی سے کوئی واقفیت نہیں۔ مراٹھی کو شورسینی اَپ بھرنش کے بجائے مہاراشٹری اَپ بھرنش سے ماخوذ کرنا صحیح تر ہے۔ انھیں یہ اندازہ نہیں کہ جدید ہند آریائی زبانیں بارھویں تیرھویں اور بعض صورتوں میں چودھویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوئیں۔ ساتویں صدی سے بارھویں صدی تک راجستھانی، گجراتی، مرہٹی اور برج دکنی کی تعمیر کے لیے کہاں سے آگئیں۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون گلبرگہ اور بیدر جیسے کنڑ علاقوں کی زبان مرہٹی قرار دیتی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ دکنی کا بنیادی ڈھانچہ مغربی ہندی کی کھڑی بولی پر قائم کیا گیا ہے۔ گجراتی، مرہٹی وغیرہ سے دخیل الفاظ ملے۔

اردو کے آغاز کے بارے میں ان تمام سنجیدہ وغیر سنجیدہ نظریات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں ذیل کے نتائج پر پہنچا ہوں۔

۱۔ اردو اور ہندی، کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے

---

[1] دکن کی ابتدا ص۱۵ بحوالہ اردو کی لسانی تشکیل ص۲۴

Marfat.com

ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اور ہندی میں کئی مصنفین اور کتابیں مشترک ہیں۔ اردو والے کبیر اور نانک کے کلام کو اپناتے ہیں۔ ہندی والے انشا کی داستان کو۔ فورٹ ولیم کالج کی بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی دونوں زبانوں کا مال ہیں۔

۲۔ اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں تلاش کرنا چاہیے ۱۔ کھڑی بولی کا آغاز، ۲۔ کھڑی بولی کے اردو روپ دھارنے کا زمانہ۔ ڈاکٹر زور، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری نے بنیادی زبان کھڑی بولی کے آغاز کی جستجو کی ہے جب کہ میر امّن، سر سیّد، محمد حسین آزاد، محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کھڑی بولی کے اردو روپ کی تشکیل پر توجہ مرکوز کی ہے۔

۳۔ اردو کا آغاز کھڑی بولی کا آغاز ہے۔ کھڑی بولی گیارھویں بارھویں صدی میں اس اپ بھرنش سے اُبھری جو دلّی، میرٹھ، مراد آباد وغیرہ کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ نہیں کہہ سکتے کہ اس کا نام کیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ شور سینی اَپ بھرنش سے مختلف ہو۔

۴۔ کھڑی بولی میں عربی فارسی الفاظ کے شامل ہونے سے اردو روپ متشکل ہوا یہ عمل اوّل اوّل مدھیہ دیش یعنی دلّی اور مغربی یوپی میں ہوا ہوگا لیکن اردو رسم الخط میں اس کے نمونے محفوظ نہیں۔ دیوناگری کھڑی بولی میں اس کا پتہ چلتا ہے لیکن شمال میں یہ روایت ضعیف رہی۔ جب شاہ جہاں اپنا پایۂ تخت آگرے سے دلّی لے آیا تو کھڑی بولی رنگ پر غالب ہوگئی اور اردو روپ شمال میں بالیدہ ہونے لگا۔

۵۔ جہاں تک اردو ادب کا سوال ہے یہ پہلے دکن میں ظاہر ہوتا ہے شمال میں ابتدائی نمونے مشکوک ہیں۔

دکنی

مختلف زمانوں میں دکن کے معنی مختلف رہے ہیں، کبھی نربدا کے جنوب کے پورے

Marfat.com

علاقے کو دکن کہہ دیا جاتا تھا کبھی اس میں سے مراٹھی علاقوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اکبر نے مالوہ، برار، خاندیس اور گجرات کو ملا کر دکن کا صوبہ بنایا۔ بعد میں احمد نگر بھی اس صوبے میں شامل ہو گیا۔ ان میں سے مالوہ راجستھانی کا، گجرات گجراتی کا اور برار، خاندیس اور احمد نگر مراٹھی کے علاقے ہیں۔ اس عہد کے دکن میں کوئی دراوڑی علاقہ نہیں تھا، جہاں گیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں مالوہ اور گجرات کو چھوڑ کر برار، خاندیس اور احمد نگر کے مراٹھی علاقے دکن میں شامل رہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں گولکنڈہ اور بیجاپور بھی مغلوں کے زیرِ نگیں آ گئے۔ اس طرح اورنگ زیب نے چھے صوبوں کو ملا کر دکن بنایا جو یہ تھے۔

۱۔ برار ۲۔ خاندیس ۳۔ اورنگ آباد ۴۔ حیدر آباد (گولکنڈہ) ۵، بیدر ۶، بیجاپور

مغلوں کے عہد میں دراوڑی علاقے دکن میں شامل رہے ہوں کہ نہ ہوں ان کا وجود ضرور تھا۔ دکن اور دکنی کا صحیح لسانی تصور انیسویں صدی میں پیدا ہوا۔ ۱۸۷۵ء میں رابرٹ کالڈویل (Robert Caldwell) نے لندن سے A comparative Grammer of Dravidian Languages شائع کی جس کے بعد سے دراوڑی زبانوں کا یک نسبی احساس مضبوط ہوا۔ دراوڑی زبانوں کے اشتراک و مماثلت کے باوجود کسی اصل آبائی دراوڑی زبان (Proto Dravidian) کی تشکیل نہیں کی جا سکی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں لسانی ریاستوں کی تقسیم و تشکیل نے سب کچھ آئینہ کر دیا۔ آندھرا، کرناٹک، تامل ناڈ اور کیرلا کی ریاستیں دراوڑی زبانوں کی نمایندگی کرتی ہیں۔

دکنی اردو کے ارتقا کے سلسلے میں چند تاریخیں یاد رکھنا اہم ہوگا۔ یہ زیادہ تر شری رام شرما کی کتاب "دکنی زبان کا آغاز اور ارتقا" سے لی گئی ہیں۔

علاء الدین خلجی کا دولت آباد پر حملہ ۱۲۹۴ء

علاء الدین خلجی کا گجرات کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینا ۱۲۹۷ء م ۶۹۶ھ

علاء الدین کے سپہ سالار ملکِ کافور کا دولت آباد پر حملہ ۱۳۰۷-۱۳۰۸ء

محمد تغلق کا دلی سے دارالسلطنت دولت آباد لے جانا ۱۳۲۷ء

اسمٰعیل مخ پہلا حکمراں (۱۳۴۶ تا ۱۳۴۷ء)

Marfat.com

علاء الدین بہمن شاہ کا بہمنی حکومت قائم کرنا۔ ۱۳۴۷ء
گجرات کا سلطنتِ دہلی سے آزاد ہو کر خود مختار ہونا۔ ۱۴۰۱ء
بہمنی حکومت سے آزاد ہو کر بیدر میں برید شاہی حکومت کا قیام ۱۴۸۷ء
بہمن حکومت سے آزاد ہو کر احمد نگر میں نظام شاہی کا قیام ۱۴۹۰ء
بہمنی حکومت سے آزاد ہو کر بیجاپور میں عادل شاہی کا قیام ۱۴۹۰ء
بہمنی حکومت سے آزاد ہو کر گولکنڈے میں قطب شاہی حکومت کا قیام ۱۵۱۲ء
اکبر کا گجرات کو مغل حکومت میں ملا لینا ۱۵۷۲ء
جہانگیر کے زمانے میں دکن پر چڑھائی ۱۶۰۸ء
بیدر کا بیجاپور میں شامل ہو جانا ۱۶۱۹ء
شاہ جہاں نے احمد نگر کو دوبارہ تسخیر کیا ۱۶۳۳ء
شاہ جہاں کے عہد میں مغلوں کا بیجاپور پر حملہ ۱۶۳۳ء
اورنگ زیب کا گولکنڈے پر حملہ ۱۶۵۵ء
اورنگ زیب کا بیدر، کلیانی اور گلبرگ پر قبضہ ۱۶۵۶ء
بیجاپور پر مغلوں کا حملہ ۱۶۷۹ء
اورنگ زیب کا بیجاپور کا محاصرہ ۱۶۸۵ء
بیجاپور کا مغل سلطنت میں مل جانا ۱۶۸۶ء
گولکنڈہ کا مغل سلطنت میں مل جانا ۱۶۸۷ء
نظام الملک آصف جاہ کا آصف جاہی حکومت قائم کرنا ۱۷۲۴ء

مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ تیرھویں صدی کے آخر سے شمال سے جنوب کی طرف فوجی حملے شروع ہوئے اور سترھویں صدی کے آخر تک جاری رہے۔ مغل فوجوں میں مختلف مقامات کے سپاہی ہوتے تھے، ایران و عرب سے آئے ہوئے بھی، پنجابی اور ہریانی بھی اور یوپی وغیرہ کے بھی۔ جب فوجیں جنوب کو جاتی تھیں تو ان کے ساتھ جانے والے بعض خاندان جنوب ہی میں رہ جاتے تھے اور واپس شمال نہیں آتے تھے۔ چوں کہ فوجیں مختلف مقامات پر دیر تک ٹھہر کر آگے بڑھتی ہیں اس لیے فوجیوں کی مادری زبان مختلف منزلوں کی زبان سے متاثر

Marfat.com

ہو جاتی تھی ۔ فوجیوں کے علاوہ کچھ علماء، شرفاء اور درویش بھی دکن جاتے رہتے تھے۔ مغل فوجیں جب صوبائی مسلم حکومتوں پر فوج کشی کرتی تھیں تو وہاں سے بھی کچھ اردو بولنے والے خاندان پہلے گجرات اور پھر دکن چلے جاتے تھے۔ گجرات، خاندیس، برار وغیرہ جب مغلوں کی قلم رو میں آئے تو وہاں کے کچھ خاندان بیجاپور اور گولکنڈہ چلے گئے۔

ان مہاجرین کے ساتھ شمالی ہند کی کھڑی بولی دکن پہنچی۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس پر متعدد اثرات ہوتے رہے۔ اس کا ارتقا شمال سے مختلف طور پر ہوا۔ شاید یہ شمالی ہند کی تیرھویں چودھویں صدی کی ہندوستانی کو پیش کرتی ہے۔ شمال کی کھڑی بولی عوام کی بولی تھی۔ وہ آس پاس کی بولیوں سے متاثر ہوتی رہی اور اس کا فطری ارتقا ہوتا رہا۔ دکن میں کھڑی بولی نے جو شکل اختیار کی اسے دکھنی یا دکنی کہتے ہیں۔ مقامی خصوصیات کے باعث اس کی پانچ بولیاں ہیں۔

۱۔ گجرات میں بولی جانے والی گجری جس کا مرکز احمد آباد تھا۔
۲۔ مراٹھواڑے کی دکنی جس کا مرکز اورنگ آباد تھا۔
۳۔ تلنگانہ کی دکنی جس کا مرکز شہر گولکنڈہ تھا۔
۴۔ کرناٹک کی دکنی جس کا مرکز بیجاپور تھا۔
۵۔ تامل ناڈ کے علاقے کی دکنی جس کا مرکز ارکاٹ تھا۔

دکنی کی یہ بولیاں اب بھی ہیں لیکن ان کی امتیازی خصوصیات پر کام نہیں ہوا۔ ڈاکٹر زور نے پیرس میں ڈی لٹ کی ڈگری کے لیے گجری پر تحقیقی کام شروع کیا۔ لیکن اسے نامکمل چھوڑ کر واپس آگئے۔ اس کے چند آثار ان کی کتاب ہندوستانی لسانیات میں ملتے ہیں۔ واضح ہو کہ گجری گجراتی نہیں ہے۔ گجراتی ایک علاحدہ زبان ہے جو راجستھانی اور برج سے مماثل ہے۔ اگر دکنی کو کھڑی بولی کی ایک بولی کہا جائے تو گجری کو دکنی کی ذیلی بولی کہنا چاہیے۔ گجراتی سے ممیز کرنے کے لیے اسے گجری یا گوجری کہا گیا۔ نجیب اشرف ندوی نے اپنی کتاب کا نام لغاتِ گجری رکھا ہے۔ شمال و دکن کے قدیم اردو ادیب اپنی زبان کو عام طور سے ہندی کہتے ہیں لیکن گجرات کے چند شعرا نے اپنی زبان کو گجری یا گجراتی بھی کہا ہے۔

Marfat.com

خوب محمد چشتی نے مثنوی خوب ترنگ میں اسے 'بولی گجرات' کہا۔

جیوں دل عرب عجم کی بات سُن بولی، بولی گجرات

محمد امین گجراتی نے مثنوی یوسف زلیخا ۱۰۹۰ھ میں کہا۔

لکھی گجری متے یوسف زلیخا

ہر اک جاگے ہے قصّہ فارسی میں امیں اس کو اتارے گوجری میں

شاہ علی محمد جیو گام دھنی کی جواہر اسرار اللہ کو اس کا مرتب گوجری کہتا ہے۔

در بیانِ توحیدِ اسرارِ بہ الفاظ گوجری بہ طریق نظم فرمودہ، دریں مختصر آوردہ وجمع کردہ، دلچسپ بات یہ ہے کہ بیجاپور کے شاہ برہان الدین جانم نے بھی اپنی زبان کو گجری کہا۔ مثنوی حجتہ البقا میں کہتے ہیں۔

جے ہووپں گیان پجاری نہ دیکھیں بھاکا گجری

اور نثری تصنیف کلمتہ الحقائق میں لکھتے ہیں:۔

سبب یو زبان گجری، نامِ ایں کتاب کلمتہ الحقایق بعد کے زمانے میں تذکرہ مخزنِ شعرا کا مرتب قاضی نورالدین فائق ذاکر کے بیان میں لکھتا ہے۔

ایں یک دو شعر کہ یہ موجبِ زبانِ جدید گجرات ص ۴۱

ڈاکٹر زور نے ہندوستانی لسانیات (ص ۱۰۷ تا ۱۰۹) گجری اور دکنی کے اختلافات شمار کرائے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ قدیم ہند آریائی میں حروف جار کا استعمال کم ہوتا تھا۔ یہی خصوصیت گجری میں ہے۔ دکنی میں حروف جار کا حذف کم ہے۔ خوب محمد چشتی کی خوب ترنگ سے کچھ مثالیں۔

لیلیٰ مُنھ بات (لیلیٰ کے منھ میں بات)

ان بولوں شروع کیا (ان بولوں سے شروع کیا)

کسی کام نہ ہووے (کسی سے کام نہ ہووے)

۲۔ بعض حروف گجری میں مستعمل ہیں لیکن دکنی میں نہیں مثلاً مانہ۔ مُنھ۔ مھیں (میں) استعمال کی مثال: گنتی مانہ، قیدوں مانہ، جگ مُنھ، چتے مانی، برس مھیں، محل مھیں۔

Marfat.com

۳۔ سے کے لیے دکنی میں سوں، تھیں، تھے وغیرہ مستعمل تھے۔ گجری میں ایک مزید شکل 'سوے' بھی رائج تھی مثلاً پہلوں سوے (پہلے سے)، نہایت سوے (کثرت سے)۔

۴۔ دکنی کے مقابلے میں گجری میں لفظوں کے آخر میں عموماً اور افعال کے آخر میں خصوصاً مصوتے غنائی ہو جاتے ہیں مثلاً۔

گجری	دکنی	گجری	دکنی
میرا کناں	میرا کہنا	ہلنیں جلنیں باج	ہلنے جلنے باج
منیں	منے	چلنیں	چھلنی
خوبیں	خوبی		

۵۔ گجری کے بعض مخصوص الفاظ یا بعض لفظوں کے مخصوص تلفظ ہیں جو دکنی میں نہیں ملتے مثلاً۔

سوے (سب)، دوہوں (دونوں)، داون (دامن)، چھاں (چھانوں) بروپا (بہروپیا)، آدو (آدھا)، کھونا (کونا)، کُلف (قفل)، الکی (الگ) واضح ہو کہ چھاں مغربی یوپی میں عموماً بولا جاتا ہے۔

مالے گاؤں کے حفیظ انصاری صاحب نے ایک مضمون میں گجری کی چند مزید خصوصیات گنائیں[1] ان میں سے بعض کسی حد تک دکنی میں بھی مل جاتی ہیں۔

۱۔ بعض الفاظ کا مخصوص تلفظ مثلاً تَم (تم)۔ گام (گاؤں)۔ ہموں نے، تموں نے (ہم نے، تم نے)۔ ان کا (ان میں)۔ آٹھ ماہ (آٹھوں) ستاویش میں (ستائیسویں) اے (یہ)۔ سنے (سے)۔ آگل پچھل (آگے پیچھے)۔ دکھو (دیکھو)۔ بھار (باہر) بھشت (بشت)۔ بار (باہر)۔

۲۔ بعض اکہرے الفاظ کو مشدّد کرنا مثلاً درّس۔ برکّت۔
یہ عمل دکنی میں بھی ہوتا ہے۔

۳۔ مرکّب الفاظ کے دو اجزا کو ملا کر ایک لفظ کر دیا جاتا ہے مثلاً سیونا (سیوا کرنا)

---

[1] حفیظ انصاری مالیگاؤں: گوجری، گجری یا بولی گجرات۔ شاعر مئی جون ۱۹۸۱ء۔ ص ۷۸ تا ۸۱

Marfat.com

پر گٹانا (پرگٹ ہونا)۔ دھوکنا (دھوکا کھانا)۔

۴۔ قدیم زمانے میں 'والا' کے معنی میں ہار یا ہار کا لاحقہ استعمال ہوتا تھا مثلاً کرن ہار، سرجن ہار۔ گجری میں محض ار کا لاحقہ یہ کام کرتا ہے مثلاً ملانار (ملانے والا) گلنار (پگھلانے والا)

۵۔ گجراتی زبان کے بعض الفاظ اور لب و لہجے کو آزادی سے گجری میں استعمال کر لیا جاتا ہے مثلاً پوٹ (توتا)۔ ہوں (میں)۔ لونا (فصل کاٹنا)۔ آگل، اُگل (آگے) گھنو (بہت)۔ دھاونا (بھاگنا)۔ چاسنا (ہل چلانا)۔ گیلا، گھیلا (سادہ لوح) جوینا (دیکھنا)۔ سگلا (سب)۔ اونڈا (گہرا)۔ ڈوسی (بڑھیا)۔ ناھنا (ڈالنا)۔ مگنا (پسند آنا)۔

۱۵۷۲ء میں اکبر نے گجرات کی سلطنت ختم کر کے اسے مغل حکومت میں ملا لیا۔ ڈاکٹر زور کے بقول وہاں کے علما اور اہلِ قلم دکن بالخصوص بیجاپور چلے گئے جس کے بعد سے گجری بولی کا علاحدہ و آزاد ارتقا رک گیا۔

ڈاکٹر شری رام شرما نے اپنی کتاب میں دکنی پر کئی زبانوں اور بولیوں کے اثرات گنائے ہیں[1] میں نے اپنے ایک مضمون میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے[2]۔ یہاں ڈاکٹر شری رام شرما کی ترتیب کو بدل کر مجموعی طور پر لکھتا ہوں۔

۱۔ دکنی پر سب سے زیادہ اثر مراٹھی کا ہے۔ محمد تغلق کے زمانے میں مہاراشٹر کا پایۂ تخت دیوگیری (دولت آباد) تھا۔ جب تغلق وہاں دارالسلطنت لے گیا تو زبان کا مراٹھی سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ دولت آباد کے نزدیک اورنگ آباد مراٹھواڑے کا اہم شہر ہے۔ دولت آباد کے بعد کچھ لوگ گلبرگہ گئے۔ بیجاپور کی مسلم حکومت میں کئی بڑے عہدوں پر مراٹھی بولنے والے فائز تھے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کے مطابق بیجاپور کی دکنی پر مراٹھی کی شاخ کونکنی کا شدید اثر ہے[3]

---

[1] دکنی زبان کا آغاز اور ارتقا۔ دکنی ترجمہ از غلام رسول۔ ۱۹۶۷ء۔ حیدرآباد

[2] دکنی کے لسانی رشتے۔ سب رس حیدرآباد۔ جنوری ۸۳ء

[3] قدیم دکنی اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ۔ اردو نامہ۔ شمارہ ۱۸۔ اکتوبر تا دسمبر ۶۴ء

Marfat.com

۲- مراٹھی کے بعد دکنی پر گجراتی کا قابلِ لحاظ اثر ہے۔ مغلوں کے گجرات پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے بہت سے علماٗ و شرفا بیجاپور چلے گئے اور انھوں نے دکنی کو متاثر کیا۔ پندرھویں صدی عیسوی میں احمد آباد صوفیوں کا مرکز تھا۔ وہاں سے فکر کا دھارا پہلے بیجاپور اور پھر گولکنڈہ پہنچا جس کی وجہ سے گولکنڈہ کی دکنی میں بھی گجری کے بعض الفاظ استعمال ہونے لگے۔

۳- ادبی دکنی میں برج کا اثر بھی پایا جاتا ہے، بالخصوص ابتدائی دور میں۔

۴- چوتھا اثر پنجابی کا ہے جس کی تفصیل محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں دی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اسے ہریانی کا اثر بتاتے ہیں لیکن ہریانی میں یہ عناصر پنجابی ہی سے آئے ہوں گے۔

۵- پانچواں اثر راجستھانی کا ہے۔ شری رام شرما لکھتے ہیں کہ راجستھانی کے جو روپ نیپال اور ہمالیہ کی ترائی میں ملتے ہیں ان کی جھلک دکنی میں بھی ملتی ہے۔ نیپالی اور گولکنڈہ کی دکنی کے بعض لفظی روپوں کی یک رنگی حیرت کی بات ہے [1]

۶- کھڑی بولی پر پوربی کا اثر نہیں لیکن دکنی پر کسی قدر ہے۔ سولھویں صدی کے ابتدائی نصف میں اودھی شمالی ہند کی ادبی اور فکری زبان تھی۔ ہندی میں مَلِک محمد جائسی، کبیر اور تلسی داس جیسے اودھی کے علماٗ ہوئے ہیں۔ جون پور اور دوسرے مسلم مرکزوں کے سقوط کے بعد وہاں کے کچھ عمائد اور فوجی افسر وغیرہ دکن چلے گئے ہوں گے۔ دکن کے صوفیائے کرام اودھی کے مسلمان صوفیوں کی نظموں سے واقف تھے۔ دکنی میں پدماوت، چندائن اور منوہر و مدھ مالتی کے ترجمے ملتے ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ تصنیفی دکنی پر تیلگو یا کنڑ کا اثر نہیں۔ وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ بالکل ہی دوسرے خاندان کی زبانیں تھیں۔ ہاں بول چال کی دکنی میں تیلگو کے کچھ الفاظ اور لہجہ پر ضرور اثر ملتا ہے۔ دکنی اردو بولنے والوں کے دو گروہ ہیں۔

۱- بڑا گروہ ان افراد کا ہے جن کے اجداد شمالی ہند سے آکر یہاں بس گئے تھے اور جو مقامی دراوڑی زبانوں سے آشنا نہیں۔ ان میں معدودے چند ہندو

---

[1] شری رام شرما ص ۴۹-۴۸

Marfat.com

ہیں۔ کوئی ۹۹ فی صدی مسلمان ہوں گے۔

۲۔ بہت چھوٹا گروہ ان دراوڑی مادری زبان والے افراد کا ہے جو ثانوی زبان کی حیثیت سے دکنی جانتے ہیں اور دکنی بولنے والے افراد سے ان کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہ حضرات صرف بات چیت میں دکنی کا استعمال کرتے ہیں تحریر میں نہیں۔ یہ لوگ خاص طور سے تلنگانہ کے شہروں میں پائے جاتے ہیں۔

قدیم مصنف زبان کے نام کے بارے میں یک رنگی کے قائل نہیں۔ وہ اسے ہندی، ہندوی، زبانِ دہلوی، زبانِ ہندوستان، گجری، گوجری، دکھنی کچھ بھی لکھ دیتے ہیں لطف یہ ہے کہ ایک ہی مصنف اپنی دو تحریروں میں اپنی زبان کا نام مختلف لکھ دیتا ہے مثلاً برہان الدین جانم اپنی زبان کو اکثر گجری لکھتے ہیں لیکن ارشاد نامے میں 'ہندی' کہا ہے

عیب نہ راکھیں ہندی بول

ان کے والد شاہ میراں جی شمس العشّاق نے بھی 'ہندی' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثنوی شہادت الحقیقت میں کہتے ہیں۔

یہ ہندی بولوں سب
یو دیکھت ہندی بول

یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی علاقے کے دو مصنف اپنی زبان کے دو الگ نام لیتے ہیں۔ بیجاپور میں میراں جی اور جانم نے اپنی زبان کو ہندی اور گجری کہا لیکن شاہ اشرف بیابانی نے نوسرہار (۹۰۹ھ) میں ہندوی کہا ہے۔

بازاں کیا ہندوی میں قصۂ مقتلِ شاہ حسین

اور عبدل نے ابراہیم نامہ (۱۰۱۲ھ) میں بھی ہندوی کہا۔

زبان ہندوی مج سوں ہوں دہلوی نہ جانوں عرب ہور عجم مثنوی

گجرات کے مصنف اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں لیکن بہاء الدین باجن متوفی ۹۱۲ھ کی ایک نظم کا عنوان ہے صفتِ دنیا بہ زبانِ دہلوی گفتہ۔

دکن کے ابتدائی غزل گویوں میں محمود کا نام مشہور ہے۔ اس نے اپنی زبان کو دکھنی کہا ہے:

Marfat.com

شعرِ شیریں کا تیرا ہے رواج دکھنی منے ظوطیاں اپنے پراں کے ہند میں دفتر کیے

ہو سکتا ہے کہ زبان کی حیثیت سے لفظ 'دکھنی' کے استعمال کی یہ قدیم ترین مثال ہو۔ وجہی نے "سب رس" کی ابتدا میں لکھا ہے" آغاز داستان، زبان ہندوستان"، اسی میں آگے چل کر کہتا ہے۔

' آج لگن اس جہان میں، ہندوستان میں، ہندی زبان سوں، اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر، گلا کر نہیں بولیا،

یہی وجہی اس سے پہلے مثنوی قطب مشتری میں اپنی زبان کو دکھنی کہہ کر اس کی تعریف کرتا ہے۔

دکھن میں جوں دکھنی میٹھی بات کا ادا نہیں کیا کوئی اس دھات کا

چند دوسرے شعرا اور نثار جنھوں نے اپنی زبان کو دکھنی کہا ہے یہ ہیں

رسالہ اتھا فارسی یو اول کیا نظم دکھنی سیتی بے بدل

(غوّاصی: مینا ستونتی)

اسے ہر کس کے تئیں سمجھا کوں توں بول دکھنی کے باتاں ساریاں کوں کھول (کذا)

(ابنِ نشاطی: پھول بن)

کیا ترجمہ اس کوں دکھنی زباں وے ہر کسے زیب ہوئے عیاں

(عبداللطیف: وفات نامہ ۱۰۷۴ھ)

کیا ترجمہ دکھنی زبان ہوا دل پذیر بولیا معجزہ یو کمال خاں دبیر

(رُستمی: خادر نامہ)

خادر نامہ دکنی کیتا ہوں نام[1] (رُستمی: خادر نامہ)

---

[1] بحوالہ داستانِ زبانِ اردو ص ۲۲۔ شروع میں ایک لفظ مثلاً 'یو' کم ہے

Marfat.com

صفائی کی صورت کی ہے آرسی دکھنی کا کیا شعر ہوں فارسی
(نصرتی: گلشن عشق)

کتیک فارسی کو بھی دکنی کرے او لوگاں قیامت تلک نیں مرے
(فائز: مثنوی رضوان شاہ و روح افزا ۱۰۹۴ھ)

یوں مسلیاں کو دکھنی کیا اس سبب فہم کرکے دل میں کریں یاد سب
(شاہ مالک بیجاپوری: رسالہ احکام الصلوٰۃ ۱۰۷۷ھ)

ہے دکھنی میں مجکوں مہارت یتی کہ النصر منکم کہے نصرتی
(باقر آگاہ)

دکن کے مغلیہ حکومت میں الحاق کے بعد دکنی کا زوال ہوگیا اور اس کی جگہ شمالی ہند کی اردو لینے لگی۔ قدرت کے مطابق شاہ سعد اللہ گلشن نے ولی کو مشورہ دیا تھا

"شما زبانِ دکنی را گزاشتہ ریختہ را موافقِ اردوئے معلیٰ شاہ جہاں آباد موزوں بکنید"

مثنوی گلزارِ عشق کے دیباچے میں باقر آگاہ دکنی کی صفائی پیش کرتے ہیں

"مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلانِ بے معنی و ہرزہ دوایانِ لایعنی زبانِ دکنی پر اعتراض اور گلشنِ عشق و علی نامہ پر اعتراض کرتے ہیں، اور جہلِ مرکب سے نہیں جانتے کہ جب الگ ریاست سلاطین دکن کی قائم تھی زبان ان کی درمیان اُن کے خوب رائج اور طعن و شماتت سے سالم تھی..... جب شاہانِ ہند اس گل زمینِ جنت نظیر کو تسخیر کیے طرز روزمرّہ دکنی نہج محاورۂ ہند سے تبدیل پائے تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی،[2]

---

[1] بحوالہ پنجاب میں اردو صفحہ ۵

[2] بحوالہ جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو حصہ اوّل ص ۵۴۳

Marfat.com

نوبت یہاں تک پہنچی کہ دکن کے رہنے والے اہلِ قلم بھی خالص دکنی میں لکھنے میں دقت محسوس کرنے لگے۔ دکنی انوار سہیلی کے مترجم منشی محمد ابراہیم دیباچے میں لکھتے ہیں کہ کسی انگریز نے ان سے فارسی انوار سہیلی کا زبانِ دکھنی میں ترجمہ کرنے کو کہا کہ اس سے

"زبان مذکور بھی از سرِ نو زندگی پاوے گی ..... توقع ہے کہ اس کتاب کو زبانِ دکھنی میں کہ عوام الناس اس ملک کے ہزاری اور بزاری، عورت اور مرد، چھوٹے اور بڑے بولتے اور چالتے ہیں، زیبِ تسطیر فرماویں،

لیکن چوں کہ اب یہ صرف بول چال کی زبان رہ گئی تھی اور ادبیات میں شمالی اردو کا رواج ہوگیا تھا اس لیے ابراہیم کہتے ہیں:

"اس کا ترجمہ زبانِ دکھنی میں دشوار ترینِ امورات کہنا چاہیے اور مجھ سے، زبانِ عوام ترک ہو کر مدتِ مدید گزرے، اب اس کا اعادہ بہت مشکل" [1]

شمال کی کھڑی بولی اور اس کے دکنی روپ میں نہ صرف مکاں کا بلکہ صدیوں کا فاصلہ حائل ہے۔ دور دراز کے مراکز اور مختلف ماحول میں ارتقا کی وجہ سے دونوں میں کافی فرق ہوگیا جس کی وجہ سے ہمارے دو اہلِ قلم نے انھیں دو زبانیں قرار دیا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنے ایک مضمون میں تفصیل سے دکنی اور شمالی اردو کے اختلاف شمار کرائے اور اس کے بعد نتیجہ نکالا۔

"مدعا کہنے کا یہ ہے کہ دکنی یا بیجاپوری اردو ہی کی طرح لیکن اردو سے الگ ایک آزاد اور مستقل زبان ہے جو آج بھی بیجاپور میں سنی جاسکتی ہے۔ یہ زبان اپنی پڑوسن کونکنی سے بہت زیادہ ملتی ہے" [2]

اس کے بعد ایک دوسرے مضمون میں تفصیل سے لکھتے ہیں۔

---

[1] بحوالہ جالبی ص ۵۲۵

[2] قدیم دکنی اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ۔ اردو نامہ شمارہ ۱۸۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۴ء۔ ص ۶۹

Marfat.com

"یہاں اس مسئلے کا یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ مورخینِ ادب بیجاپوری شعرا کے جس کلام کو تاریخ ادب میں شامل کر رہے ہیں وہ اردو نہیں، بیجاپوری زبان میں ہے۔ یہ بات بعض طبائع پر گراں ضرور گزرے گی اور وہ محض سخن پروری یا دوسری مصلحتوں کی خاطر اس کو تسلیم کرنے سے انکاری ہوں گے لیکن کیا کیا جائے کہ حقیقت یہی ہے . . . . . .

اس مقام پر جس عام غلط فہمی کا اظہار کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ بیجاپوری جس زبان کی قدیم شکل ہے ہماری بول چال اس کا جدید روپ ہے یعنی ہماری زبان اور بیجاپوری میں جدید و قدیم کا رشتہ ہے لیکن بیجاپوری کو قدیم کہنے والے شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ بیجاپور میں آج بھی وہی زبان بولی جا رہی ہے جس میں قدیم دکنی شعرا، وادبا نے آج سے چار سو سال پہلے اظہار خیال کیا تھا اور جسے ہمارے مورخین اردوئے قدیم کا نام دے رہے ہیں اور آج اسی زبان میں وہاں لوک گیت گائے جا رہے ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں اور بازاروں میں اسی بولی سے کام چلا رہے ہیں"[1]

سہیل بخاری دلیل دیتے ہیں باقر آگاہ سے۔ انھوں نے ہشت بہشت نام کے مجموعے میں آٹھ منظوم رسالے لکھے جن میں ساتواں من درپن (معجزاتِ نبی کریمؐ) ہے یہ رسالہ ۱۲۰۶ھ کی تصنیف ہے۔ آگاہ اس میں لکھتے ہیں

اگر بھاکے میں اردو کے میں کہتا کوئی اس کو یہاں کے لوگوں سے نہ جہتا[2]

ہشت بہشت میں نثر میں کہتے ہیں۔

"ان سب رسالوں میں شاعری نہیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں اور اردو کے بھاکے میں نہیں کہا۔ کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں۔

---

[1] سہیل بخاری: اردو کا قدیم ترین ادب۔ نقوش شمارہ ۱۰۲۔ مئی ۱۹۶۵ء۔ ص ۸۲

[2] ایضاً ص ۸۲ نیز افسر امروہوی: گنج ہائے گراں مایہ۔ قومی زبان کراچی جنوری ۱۹۶۴ء ص ۲۹

Marfat.com

آیئے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہیں" [1]

گویا دکنی، اردو سے مختلف زبان ہے۔ شاید انھوں نے بولی یا لہجے کے فرق کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کی طرح بنگلور کی ڈاکٹر آمنہ خاتون بھی دکنی کو شمالی اردو سے الگ زبان مانتی تھیں۔

دکنی کی خصوصیات کا بیان متعدّد کتابوں اور مضامین میں ملتا ہے جن میں سب سے زیادہ مفصّل ڈاکٹر شری رام شرما کی ہندی کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ دکنی زبان کا آغاز اور ارتقا کے نام سے ساہتیہ اکیڈمی آندھرا پردیش نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر حبیب ضیا کی کتاب "دکنی زبان کی قواعد" (کراچی ۱۹۶۹ء) اردو کی ایسی قواعد ہے جس میں ہر صیغے کی مثالیں دکنی سے دی ہیں۔ تیسری قابلِ ذکر کتاب ڈاکٹر مہر النساء کا غیر مطبوعہ مقالہ، دکھنی زبان کی قواعد کا مطالعہ، ہے۔ اس پر عثمانیہ یونیورسٹی نے ۱۹۶۷ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔ ان تین کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر زور کی ہندوستانی لسانیات میں بھی دکنی کی خصوصیات دی ہیں ڈاکٹر سہیل بخاری کا مضمون رسالہ اردو نامہ کے ۴۶ صفحات پر محیط ہے۔ ذیل میں چند اہم اور نمایاں خصوصیات کے بیان پر اکتفا کی جاتی ہے۔

صوتیات: مصوّتے

۱۔ دکنی میں ایک مصوّتہ مختصر اُو ہے جو عام ضمّے (مثلاً گل) کے مقابلے میں زیادہ کھلا ہوتا ہے۔ معیاری اردو میں یہ صرف ہ (ہائے ہوّز) سے پہلے ملتا ہے مثلاً شہرت، کہرام۔ چہلیں۔ یہ سمجھیے کہ جس طرح 'پیش، مختصر واؤ معروف ہے زیرِ نظر مصوّتہ مختصر واؤ مجہول ہے۔ دکنی میں یہ تیلگو سے آیا ہے اور عام طور سے ان الفاظ میں پایا جاتا ہے جو تیلگو الاصل ہیں۔ اس کا وجود بول چال کی

---

[1] بحوالہ نصیر الدین ہاشمی: مضمون دکھنی میں سیرۃ النبی کا ذخیرہ۔ مشمولہ، دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین۔ ۱۹۶۳ء۔ ص ۳۳

Marfat.com

زبان میں نمایاں ہے مثلاً پٹّا (لڑکا)۔ ڈوپّا (ٹوپی)۔ گُپّا (ڈھیر)۔ کُنڈا (ٹیلہ جیسے گولکنڈہ میں)۔

شمالی اردو کے مقابلے میں ذیل کی مصوّتی تبدیلیاں ملاحظہ ہوں۔

۲۔ کسی لفظ میں دو طویل صوت رکن (syllable) ہوں تو پہلے رکن کے طویل مصوّتے کو خفیف کرنے کا رجحان ہے مثلاً[1] آدمی ے ادمی۔ آسمان ے اسمان۔ بھیگنا ے بھگنا۔ بھیتر ے بھتر۔ سوکھا ے سکھا۔ سورج ے سُرج

بعض اوقات ایک طویل مصوّتے کے لفظ کا مصوتہ خفیف کر دیا جاتا ہے مثلاً مانگ ے منگ۔ پھول ے پھُل

کبھی کبھی اختصار کا عمل جڑواں مصوّتے پر بھی ہوتا ہے مثلاً صفائی ے صفئی۔

۳۔ ہ کی جگہ ہمزہ کر کے بعض اوقات اسے بھی حذف کر دیا جاتا ہے مثلاً کہے گی ، کئے گی ے کے گی۔ نہیں ، نئیں ، نیں۔ گئے ، گے

۴۔ خفیف مصوتے کو طویل کر دینا۔ یہ مختصر الفاظ میں زیادہ عام ہے۔

عطارد ے عطارید۔ بجلی ے بیجلی۔ چکھ ے چاکھ۔ رکھ ے راکھ۔ مُکھ ے موکھ۔ کچھ ے کوچ

واضح ہو کہ دکنی کتابت میں اعراب بالحروف یعنی پیش کو واؤ سے اور زیر کو ی، سے لکھنے کا بہت رواج ہے اس لیے جب تک شعر کے وزن سے تائید نہ ہو یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ مثلاً 'موکھ' لکھنے سے طویل مصوتہ مراد ہے یا خفیف مصوتے کے ساتھ 'مکھ'

۵۔ ابتدائی اِکوی میں اور ابتدائی اُکو واو میں بدلنا۔ یہ کونکنی کا اثر ہے۔ اتنا ے اِتا ، یتا۔ اِکس ، یکس۔ اوٹ (پردہ) ے ووٹ۔ ایم اے ، یم اے

یہ مشرقی یوپی میں بھی رائج ہے جہاں اردو کو وَردو اور انیس کو ونیس بول

---

[1] ے کے نشان سے ظاہر کیا گیا ہے کہ اوّل الذکر سے ثانی الذکر مشتق ہے۔ د کے نشان سے ظاہر کیا جاتا ہے کہ اوّل الذکر مشتق ہے ثانی الذکر سے۔ انگریزی تحریر میں یہ علامتیں الٹ جاتی ہیں۔ مندرجہ بالا مثالوں میں 'ے' کے بعد کا مشتق روپ دکنی ہے۔

Marfat.com

دیتے ہیں۔

۶ - عربی فارسی الفاظ کے درمیان ساکن حرف کو متحرک کرلیا جاتا ہے بالفاظِ دیگر ایک مختصر مصوّتے کا اضافہ کردیا جاتا ہے مثلاً زُلف۔ عشق۔ عقل، اخل پنجاب اور یوپی میں بھی بول چال میں متعدد الفاظ میں یہ عمل ہوتا ہے لیکن ادبیات میں ایسا نہیں ہوتا۔ دکن میں ادب میں بھی اس کی بہ کثرت مثالیں ملتی ہیں مثلاً۔

عَشَق کا لذت دو جو معشوق منگتیا	عبداللہ قطب شاہ
عقل ہے بازوے باز ہے بلند پرواز	سب رس
عقل کے نورتے سب جگ نے نور پایا ہے	〃
عقل دل کوں دیا ہے بادشاہی	〃
عقل دل کوں دیا عالم پناہی	〃

۷۔ دکنی میں وسطی اِے یا اَے کو بعض اوقات آیں بدل دیا جاتا ہے۔ سہیل بخاری کے مطابق یہ کونکنی کی خصوصیت ہے جو دکنی نے مستعار لی ہے[1]۔

لٹیرا، لٹارا۔ اندھیرا، اندھارا۔ کسیلا، کسالا

مصمّتے

۸ - طویل مصوّتے کو مختصر کرکے مصمّتے کو مشدّد کردینا۔ یہ عمل پنجابی سے مماثل ہے

میٹھا، مِٹّھا۔ چونا، چُنّا۔ پھیکا، پھکّا

بعض اوقات مختصر مصوّتوں والے الفاظ میں بھی مصمّتے کو مشدّد کردیا جاتا ہے۔ مثلاً نمک۔ ڈلی۔ پھلی۔ کلی۔ توا۔

۹ - تشدید کو سہل کردینا

اوّل، اَوَل۔ قصّہ، قِصَہ۔ غصّہ، غُصہ۔ پتّھر، پَتَر۔ لذّت، لذت۔

عشق کا لَذَت، دو جو معشوق منگتیا۔ عبداللہ قطب شاہ

---

[1] قدیم دکنی اور اردو کا تقابلی مطالعہ۔ ص ۶۱۔ اردو نامہ اکتوبر تا دسمبر ۶۴ء

Marfat.com

اے روپ ترا رتّی رتّی ہے پربت بربت پتّی پتّی ہے

بحری: من لگن

۱۰- م یان کے بعد آنے والے ب، بھ کا حذف مثلاً گنبد ، گمّر۔ کمیل ، کمّل ۔ سنبھالنا ، سمالنا۔

۱۱- ہم مخرج ن کے بعد د، دھ کا حذف مثلاً چاندنی ، چاننی ۔ گوندھنا ، گنا ۔ باندھنا ، باننا۔

۱۲- ایک لفظ کے شروع میں ایک معکوسی مصمتہ ہو اور بعد میں ایک اور معکوسی مصمتہ تو پہلے معکوسی کو دندانی مصمتے میں بدل دیا جاتا ہے مثلاً ٹوٹ ، توٹ ۔ ڈانٹ ، دانٹ۔ ٹنڈا ، دنڈا ۔ ڈھونڈھ ، دھونڈھ ۔ ٹھنڈا ، تھنڈا

۱۳- ق کو خ میں بدلنا۔ مدّت الایّام سے یہ سارے وسیع تر دکن کے تلفظ کی خصوصیت ہے ۔ تحریر میں بھی بعض اوقات عقل کو اَخل لکھا مل جاتا ہے ۔

۱۴- حشوی نون غنّہ کی کثرت ۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ یہ کونکنی کا اثر ہے۔ مثالیں

توں ۔ کوں ۔ کرناں ۔ کبھیں ۔ کونچہ ۔ کرنے ، کرنیں ۔

۱۵- بعض اوقات شمالی اردو کی نون غنّہ دکنی میں حذف کر دی جاتی ہے مثلاً کنواں ، کُوا ۔ نیند ، نید ۔ اونٹ ، اُوٹ

ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں مخرج ن کو اس طرح خالص نون غنّہ میں بدل دیا جاتا ہے کہ یہ مصمتے سے مصوّتہ بن جاتی ہے اور وزنِ شعر میں حذف ہو جاتی ہے مثلاً

چنچل بروزنِ فعل ع پڑی ایسی وی ہے چنچل اور چٹور

بندگی بروزنِ فعلن ۔ بدگی کی طرح ع مجھے غم کی بندگی تھے آزاد کر

۱۶- یا آخری ہائے ہوّز کو حذف کر کے اَے میں بدل دینا مثلاً

سَہہ ، سَے ۔ ٹہلا ، ٹیلا ۔ تہر ، تَیر ۔ پہلی ، پَیلی ۔

بعض اوقات ہ بالکل گرا دی جاتی ہے مثلاً کہنا ، کنا ۔ نہیں ، نیں

۱۷- شمالی ہند میں بھی ہائے ہوّز کو معصوّتوں سے بدلنے یا گرانے کا کسی قدر رجحان

Marfat.com

ہے لیکن یہ بول چال میں ہے تحریر میں نہیں

۱۸- ہائے مخلوط یعنی ہکاریت کا حذف مثلاً

میڑھی ، سٹری ۔ سیکھی ، سِکی ۔ سوکھ ، سوک ۔ گڑھا ، گڑا ۔ بندھن ، بندن ۔ مجھ ، منج ۔

۱۹- دوسری طرف بعض الفاظ میں شمالی ہند کی اردو کے برخلاف حشوی ہکاریت ہے یعنی ہائے مخلوط کا اضافہ ہے مثلاً لٹو ، لٹھو ۔ الٹانا ، الٹھانا ۔ مور ، مھور ۔ پسلیاں ، پھنسلیا ۔ ع اگن دھک کے جلتی تھی پھنسلیا ہو چور (نصرتی)

۲۰- وسطی ہائے ہوّز یا ہائے مخلوط کا پہلے مصمتے پر منتقل ہو جانا مثلاً بہت ، بھوت ۔ لوہا ، لھوا ۔ باہر ، بھار ۔ رہتا ، رھتیا ۔ پتھر ، پھتر ۔ بہنا ، بھینا ۔ گہرا ، گھیرا ۔ اوپر کی شق کے مصرع میں دہک ، دھک ۔

۲۱- بعض حروف کی جگہ دوسرے حروف کا تبادلہ مثلاً

کر ، کو ۔ پر ، پو ۔ بلبلے ، بُر بُرے ۔ تڑپنا ، تلپنا ۔

۲۲- قدیم دکنی ادب میں عربی فارسی الفاظ کا تلفظ بعض اوقات بول چال کے مطابق لکھا اور باندھا جاتا ہے مثلاً صفے (صفحے) وضا (وضع) ملا ذا (ملاحظہ) ۔ وَخَت (وقت) ۔ اَخل (عقل) ۔ مستید (مستعد) ۔ نگہواں (نگہبان) ۔ صحی ۔ تسبی

۲۳- دکنی میں شعر کا وزن پورا کرنے کے لیے حروف کا من مانے طور پر حذف کر دیا جاتا ہے ۔

صَرف

۲۴- جمع بنانے کے لیے ان یا یاں کا اضافہ ۔ اس میں مذکّر اور مؤنث کی تخصیص نہیں مثلاً لوگاں ۔ کتاباں ۔ آنکھیاں ۔ کپڑیاں (کپڑے) پرندیاں (پرندے) فاعلی اور غیر فاعلی حالت کی بھی تخصیص نہیں ۔ معیاری اردو میں جہاں جمع مذکّر کو واحد کے طور پر لکھا جاتا ہے دکن میں اس کی بھی جمع بنا دی جاتی ہے ۔

ع سنے سب پہلواناں پہلوانی

Marfat.com

ع یوں دوستاں کے ہجر میں سینے پہ داغاں ہیں ولی

شمال میں کہیں گے۔ آج کل ڈاکٹر لالچی ہیں ؛ دکن میں کہیں گے' آج کل ڈاکٹراں لالچی ہیں'' اں' سے جمع بنانے کا یہ زور ہے کہ صفت اور فعل تک پر یہ عمل کیا جاتا ہے مثلاً

بڑیاں شِدّتاں۔ لٹکتیاں چلیاں۔ نعمتاں تھیاں

سُہاویں کلیاں یوں کنوں کیاں سُرنگ کوپیاں چین کیاں سے بھریاں رنگ رنگ

شیرانی کا کہنا ہے کہ یہ پنجابی کی دین ہے (نصرتی)

معیاری اردو میں حرفِ جار سے پہلے اسم کی جمع میں وں ہوتا ہے مثلاً لڑکوں سے، کرسیوں سے، لڑکیوں نے، پتھروں نے۔ دکنی میں یہاں بھی ناں' رہتا ہے یعنی لڑکاں سے

لیکن شاذ دکنی میں شمالی انداز سے ہزاروں، غریبوں، لڑکے، گھوڑے جیسی جمع بھی مل جاتی ہے۔

۲۵۔ فعل سے اسمِ کیفیت بناتے وقت بعض اوقات اہٹ کے بجائے محض اٹ کا لاحقہ لگاتے ہیں مثلاً گھبراٹ، جھنجھلاٹ

۲۶۔ شمال کے نقطۂ نظر سے دکنی میں جنس بہت بے قاعدہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ دکنی دور میں زبان ساخت کے عالم میں تھی۔ اس کے بہت سے روپ اور صیغے غیر متعیّن تھے۔ شمال میں جو کچھ متعیّن ہوا دکنی میں بعض اوقات اس کے خلاف صیغے موجود تھے۔ مثلاً دکنی میں لذّت، محنت، رَین کو مذکر باندھا گیا ہے

عِشَق کا لذّت دو جو معشوق منگتیا وگرنہ عِشق نیں، بو محنت ہے سارا

عبداللہ قطب شاہ

یکایک رَین آشکارا ہوا۔

۲۷۔ دکنی میں ضمیروں کے متعدد روپ ملتے ہیں جن میں سے چند ابتدائی شمالی شعرا کے یہاں بھی ہیں لیکن بیشتر نہیں ملتے۔ مثلاً

Marfat.com

منجہ۔مو۔مج (بہ معنی میں)۔ہمن۔ہمنا۔توں۔تُنہیں۔(توہی)۔تمن۔تمنا۔تما را۔
آپن۔آپنا۔آپنی۔اپس۔اپے۔آپی۔اپی۔تِس۔تِسے (اس کو) تِن۔تِنیں (ان کو)
اے۔یو۔یے (یہ)۔وو۔او۔اُن۔(وہ)۔اُنو (وہ۔انھوں نے) وغیرہ

۲۸۔ ماضی مطلق میں آخری الف سے پہلے یائے مخلوط کا اضافہ۔ یہ دکنی کی خاص پہچان ہے مثلاً کہیا۔چلیا۔

۲۹۔ فعلی مادّوں کے دُہرے روپ ملتے ہیں مثلاً رکھ، راکھ۔دِسنا، دِسیانا۔لگ لاگ۔

۳۰۔ بعض اوقات مادّے میں واؤ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے مثلاً ہووونا۔

۳۱۔ مستقبل کے لیے 'گا' کے علاوہ سی کا استعمال جو پنجابی میں عام ہے مثلاً
ڈال سی (ڈالے گا) سِک سی (سیکھے گا)۔ہلا سی (ہلائے گا)
آخرالذکر لفظ سب اس میں ملتا ہے۔ وہاں 'سی' کی اور بھی مثالیں ہیں لیکن سی کا استعمال دکنی میں عام نہیں شاذ ہے۔

۳۲۔ معاون افعال کی کئی شکلیں مثلاً ہے، اَہے، ہے گا، چھے، اَچھے، تھا، اتھا۔

۳۳۔ فعل تمنائی بعض اوقات اِے کے بجائے اُو پر ختم ہوتا ہے مثلاً
سو کچ شہہ کو یہ بن مبارک اہو

۳۴۔ حروف اور تمیزِ فعل کے متعدد روپ ہیں مثلاً
'کو' کے لیے کو، کوں، نوں، نیں، نے
'سے' کے لیے ستی، سیتی، سوں، تے، تھے، تیں، تو، توں
جو، جب = تو، تب۔تمن، تمنے۔ سار، سار کا، سریکا۔
لیکن کے لیے پہ، پر، پن وغیرہ

۳۵۔ کئی الفاظ کو مخفّف کر کے ملا دینا دکنی کی خصوصیت ہے مثلاً
لے جائے گی، لجا گی۔جوکچھ، جکچھ۔جوکوئی، جکوئی۔دوتین، دُتِن

نحو

۳۶۔ دکنی کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں 'نے' کو حذف کر کے فعل

Marfat.com

کی مطابقت تعداد اور جنس کے اعتبار سے فاعل سے ہوتی ہے مثلاً
لڑکا روٹی کھایا، لڑکا روٹیاں کھایا، لڑکے روٹی کھائے، لڑکی لڈو کھائی۔
لڑکی لڈواں کھائی۔ لڑکیاں لڈواں کھائیں۔

۳۷۔ کثرت ظاہر کرنے کے لیے دو لفظوں کو یائے مجہول سے ملاتے ہیں مثلاً گھڑے گھر۔ بالے بال۔

۳۸۔ حذف کرنا 'نے' تک محدود نہیں۔ حسبِ خواہش کا، کی، کے، کو، کو بھی حذف کر دیا جاتا ہے مثلاً

ع بہت مہوشاں اس نے پیدا کیا — مہوشاں کو
ع بلند تر ہے افلاک تے جس نشاں — جس کا نشاں
ع کیا حق نے دن کو اس با مراد — اس کے دن کو

۳۹۔ مرکبات بنانے میں بہت آزادی ہے۔ عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کو عطف، اضافت اور دوسری طرح ملانے میں کوئی باک نہیں مثلاً
وقتِ پوجا۔ روزِ نہان۔ نقشِ چرن۔ طعامِ باسی۔ گیانِ عالی۔ چوما وچاٹی
چھند و ناز۔ پہاڑاں و پربت۔ شاہ مارگ۔ پھُل افشانی۔ پَوَن بیز۔ پَوَن باس۔
باغ مہکار (فکِّ اضافت)

مصنیات

۴۰۔ تاکید کے لیے لفظ کے آخر میں چ کا اضافہ۔ یہ گجراتی سے آیا ہے اور حیدرآباد وغیرہ میں آج بھی عام طور سے بولا جاتا ہے۔ مثال
دل ہی، دیچ۔ توہی، توچ

لفظیات

۴۱۔ دکن میں شمالی ہند کی اردو کے مقابلے میں بہت سے مزید الفاظ ملتے ہیں مثلاً
اسنسکرت ان ظ۔ نرتا (مردُمی)۔ سہس (ہزار)۔ مہبلی (مہابلی) ہتو

Marfat.com

(بہی خواہ) سوباس (خوشبو)۔ رکت (خون) وغیرہ

ب۔ ایسے متعدد فعلی مادّے ہیں جو شمال میں مستعمل نہیں مثلاً
اچھنا (ہونا)۔ اپڑنا (پہنچنا)۔ سٹنا (پھینکنا)۔ منگنا (چاہنا)۔ سنپڑنا (ہاتھ آنا)۔
نسنا (بھاگنا)۔ دِسنا (دکھائی دینا) وغیرہ

ج۔ متعدّد مقامی الفاظ ہیں جو معلوم نہیں کس کس زبان سے لیے ہیں مثلاً
ابلوج (مصری)۔ بھگدی (فوراً)۔ تگبگی (بے چینی)۔ رُج (جذبہ) کبل (شکل)۔
لانڈگا (بھیڑیا)۔ کاھوت (حرص)۔
مراٹھی، گجراتی اور دوسری زبانوں سے بھی بہت سے الفاظ لیے گئے ہیں
مثلاً بسلانا بمعنی بیٹھنا مراٹھی سے۔ ایلاڑ، پیلاڑ مراٹھی سے

د۔ بول چال کی دکنی میں کنڑ اور تیلگو کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں مثلاً
ڈپّا (ٹوپی)، کپّا (مٹّی کا ڈھیر)

دکن کی حکومتوں کے سقوط کے بعد حکومت کی طرح زبان میں بھی یکسانی آنے لگی۔ یعنی دکنی اپنا مخصوص رنگ چھوڑ کر فارسی اور شمالی ہند کی اردو سے متاثر ہونے لگی۔ یہ دونوں دھارے ولی کے کلام میں واضح دکھائی دیتے ہیں۔
شاہ سعد اللہ گلشن نے ولی کو دو مشورے دیے۔ پہلا زبان سے متعلق ہے

'شما زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافقِ اردوئے معلّٰی شاہ جہان آباد موزوں بکنید'

دوسرا مضامین کے بارے میں ہے

'ایں ہمہ مضامینِ فارسی کہ بے کار افتادہ اند در ریختہ خود بہ کار ببر۔ از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت'، [1]

دکن اور شمال کی اردو کے یہی دو فرق ہیں: زبان اور مضامین۔ ولی نے دونوں کا رخ شمال کی طرف موڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکنی اردو کا دور ختم ہو گیا۔ شمال میں اردو زبان اور اردو نظم کو ریختہ کہا گیا۔

---

[1] نکات الشعرا۔ طبعِ اوّل۔ ص ۹۴

Marfat.com

ایک بار پھر باقر آگاہ کے دیباچۂ مثنوی گلزارِ عشق کا اقتباس درج کیا جاتا ہے

" شمال میں زبانِ ہندی، برج بھاکا رائج تھی۔ اس میں عربی فارسی الفاظ داخل ہوئے تو اس زبان کو زبانِ ریختہ کہا گیا"

ریختے کے معانی اور ارتقا کے بارے میں آیندہ ابواب میں غور کیا جائے گا۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں ولی کے سلسلے میں لکھا ہے

" بنائے ریختہ را چنیں مستحکم نمود ..... ابتدائے ریختہ از دست ..... اوّل استادیِ ایں فن بنامِ اوست"

تاریخِ ادبِ اردو کی اس جلد میں دکنی اور ریختہ دونوں کا جائزہ لیا جائے گا

Marfat.com

دوسرا باب :

دکن میں اردو کا تاریخی و تہذیبی پس منظر

بہمنی سلطنت

ہندوستانی تہذیب پر بیرونی ثقافت کے اثرات اس وقت پوری طرح اجاگر ہوئے جب مسلمان شمال مغرب سے اپنے مخصوص تصوّرات اور تمدنی روایات کے ساتھ وارد ہندوستان ہوئے۔ برج موہن دتاتریہ کیفی کا خیال ہے کہ ہندوستانی تہذیب کی تاریخ میں تین عظیم الشان "تصادم یا اتصال" ظہور پذیر ہوئے ہیں پہلا اتصال آریوں اور ہندوستان کے قدیم باشندوں کے ربط سے ہوا تھا اور دوسرا مسلمانوں کے ہندوستان کو اپنا وطن بنانے سے واقع ہوا[1] ہندوستان کی سرزمین پر جہاں اس نووارد قوم نے قدم رکھا وہاں اس کے نئے تصورِ حیات، تہذیب۔ زبان اور فلسفۂ زندگی کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے تہذیبی اور لسانی سطح پر یہ ردعمل واضح طور پر نمایاں ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ ہندوستانی تہذیب اور مقامی تصوّرات کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیا جو مقامی میلانات اور بیرونی اثرات کے اشتراک و اختلاط کا مظہر تھا۔ تاراچند لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں دو قوموں کے اتحاد نے "ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جو نہ خالص ہندو تھی اور نہ خالص مسلم یقیناً یہ ایک ہندو مسلم

---

[1] برج موہن دتاتریہ کیفی۔ ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات (مضمون) مشمولہ خمسہ کیفی۔ ص ۱۱۔

Marfat.com

تہذیب تھی"،[1] تہذیبی لین دین دوطرفہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے مقامی رجحانات کو اپنے تہذیبی افکار میں اس طرح سمویا کہ ایک نئی گنگا جمنی تہذیب کا ہیولا تیار ہوگیا جسے سلیمان ندوی نے "ہندلمانی" تہذیب سے موسوم کیا ہے۔ "کیمرج ہسٹری آف انڈیا"، میں سرجان مارشل معاشرہ کی تہذیبی نشوونما پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ہندوستان میں دو طاقتور اور ترقی یافتہ تمدن جو ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے آپس میں اس طرح ہم آمیز اور شیر وشکر ہوئے ہیں کہ اس کی مثال انسانی تاریخ میں کم ملتی ہے[2]۔ ہارون خاں شیروانی نے دو تمدنوں کے اتصال کے بارے میں لکھا ہے کہ اتحاد واختلاط کا یہ عمل تین مرحلوں میں تکمیل کی منزل تک پہنچتا ہے۔ پہلے باہمی تصادم واقع ہوتا ہے اس کے بعد ایک دوسرے کو سمجھنے کی سعی کا آغاز ہوتا ہے اور بالآخر تیسرے مرحلے پر دو تمدنوں کا امتزاج پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے[3]۔ "ہندوستانی قومیت کا تمدنی پہلو" کے مصنف کا خیال ہے کہ اسلام اور ہندومت کے امتزاج اور میل نے نہ صرف ایک امتزاجی کیفیت پیدا کی بلکہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بھی مدد دی اور اس طرح ذہنی اور جذباتی طور پر دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوگئے اور اس طرح سرزمین ہند پر دو تہذیبوں کے اشتراک نے نئے طرز فکر، نئی ہیئت اجتماعی اور نئے لسانی رشتوں اور ابلاغ و ترسیل کے نئے تقاضوں کو پروان چڑھایا[4]۔ اس صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے ایس کے سنہا نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے ہندو دھرم سے بہت سے میلانات مستعار لیے ہیں۔ ویدانت اور بھگتی میں قلب و احساس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے اور اسی طرح تصوّف میں بھی عشق و جذب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے[5]۔ جہاں ہندو سماج کو اسلام نے مختلف زاویوں سے

---

[1] تاراچند (مترجم چودھری رحم علی الہاشمی) اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر۔ صـ۱۷۳

[2] سرجان مارشل۔ کیمرج ہسٹری آف انڈیا۔ جلد سوم۔ صـ۵۱۸

[3] ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈس اِن میڈیویل انڈیا۔ صـ۴

[4] ایشور ٹوپا۔ ہندوستانی قومیت کا تمدنی پہلو۔ صـ۴۶

[5] ایس کے سنہا۔ میڈیویل ہسٹری آف دی دکن۔ صـ۱۴۷۔

Marfat.com

متاثر کیا ہے وہیں مسلمانوں کے طرز معاشرت پر مقامی روایات کا اثر نمایاں ہے۔ اور اس طرح باہمی رفاقت، خلوص و محبت کے رشتوں اور یکجائی و موانست نے ایک مخلوط تمدن کی تشکیل کی ہے اور اس تاریخی و ثقافتی عمل کو "تہذیبی امتزاج" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس مشترک تمدن اور مخلوط تہذیبی اکائی کی نشو و نما اور صورت گری میں جو تاریخی محرکات کارفرما رہے ہیں انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جنوب میں علاء الدین خلجی کی فتح دکن و گجرات نے ان دونوں علاقوں کو تہذیبی و لسانی اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب کر دیا۔ ایک اجنبی معاشرت اور غیر نسل کے ساتھ دکن والوں کا پہلا ربط ۱۲۹۴ء میں قائم ہوا جب کہ علاء الدین خلجی دیوگری پر حملہ آور ہوا اور پھر ۱۳۰۸ء میں ملک کافور نے جنوبی ہند پر حملہ کر دیا۔ علاء الدین خلجی نے مفتوحہ علاقوں میں اپنے تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے ترک سردار مقرر کر دیے تھے۔ یہ سردار امور سلطنت کی دیکھ بھال اور انتظام کے ذمہ دار تھے انھیں "امیران صدہ" کہا جاتا تھا۔ نظم و نسق کو زیادہ موثر بنانے کے لیے سو سو گاؤں پر مشتمل حلقے بنا دیئے گئے تھے۔ امیران صدہ اپنے متعلقین اور متوسلین کے ساتھ یہاں سکونت پذیر ہوتے تھے ان امیروں کے لیے وہی زبان ذریعہ ابلاغ تھی جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ مقامی باشندے اپنے مطالب کو ظاہر کرنے کے لیے مقامی لغات کے ساتھ اس نئی زبان کے ضروری لفظ بھی شامل کر لیتے۔

خلجیوں کے زوال کے بعد تغلقوں کی حکومت قایم ہوئی اور جب ۷۲۸ھ/۱۳۲۷ھ میں محمد تغلق نے دہلی کے بجائے دولت آباد (دیوگیری) کو اپنا پایہ تخت بنایا تو لوگ جوق در جوق جنوب کی سمت منتقل ہونے لگے۔ اہلِ حرف علماء شعراء، صوفیا، سپاہی پیشہ اور دوسرے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد راستہ کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے دولت آباد پہنچے۔ سلطان نے معاوضہ دے دے کر ان لوگوں کو دولت آباد روانہ کیا تھا جو اپنے وطن عزیز کو خیر باد کہنا نہیں چاہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت علماء اور زہاد کی چودہ سو پالکیاں دلی سے دیوگیری پہنچی تھیں۔ شمال سے جنوب آنے والے صوفیاء اور علماء میں شاہ برہان الدین غریب، خواجہ بندہ نواز کے والد شاہ راجو قتال، امیر خسرو کے دوست میر حسن سجزی اور شیخ

Marfat.com

زین الدین وغیرہ شامل تھے۔ محمد تغلق کے پایۂ تخت منتقل کرنے کے بعد دلّی ایسی سنسان ہوگئی کہ بقول محمد قاسم فرشتہ "آوازِ پیچ متنفس بجز شغال درو با ہ و جانوران صحرائی بگوش نمی رسید"[1] ابن بطوط لکھتا ہے کہ شہر میں صرف ایک اندھا باقی رہ گیا تھا اسے بھی دولت آباد پہنچا دیا گیا[2] محمد تغلق نے دیوگیری کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا تو اس کا نام دولت آباد رکھا۔ چنانچہ "تاریخ منظوم سلاطین بہمنہ" کا شاعر کہتا ہے کہ محمد تغلق نے اپنے نئے پایۂ تخت میں قلعہ تعمیر کروایا اور ایلورہ کے اطراف باغات لگائے۔ حوض تعمیر کیے۔ نہریں بنوائیں۔ سرائیں تعمیر کیں اور سڑک پر دونوں جانب سایہ دار درخت لگوائے تاکہ دہلی سے دکن آنے والے مسافر آرام سے اپنی منزل تک پہنچ جائیں"[3]

جنوبی ہند کے چار اہم قطعے دیوگیری، تلنگانہ، کرناٹک اور معبر تھے۔ دیوگیری یادو خاندان کی راجدھانی تھا، تلنگانہ کاکیتہ خاندان کے زیر نگیں تھا اور کرناٹک پر ہوسل راجاؤں کی حکمرانی تھی۔ ملیبار جسے مسلمان مورخین نے معبر کے نام سے یاد کیا ہے موجودہ تامل، ملیالم اور کیرالا کے بعض علاقوں پر محیط تھا اور یہاں چولا خاندان کا راج تھا۔ دریائے تنگبھدرا کے جنوب میں وجیانگر کی سلطنت تھی جو ۱۳۳۶ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس نے معبر کو زیر کر لیا اور اپنے حدود راس کماری تک وسیع کر دیے تھے دیوگیری کے خطے میں ہند آریائی زبان کا ایک روپ مہاراشٹری یا قدیم مراہٹی رائج تھی اور تلنگانہ تلگو زبان کا مرکز تھا۔ علاء الدین اور ملک کافور کی دکن اور جنوب پر فوج کشی اور پھر باقاعدہ اثر و رسوخ نے مرہٹی اور تلگو علاقوں میں شمال کی ایک نوخیز زبان کی اشاعت اور نشو و نما کے امکانات روشن کر دیے۔ شمال سے جو تازہ دم فوجیں آتی تھیں وہ افغانوں، ترکوں اور شمالی ہند کے باشندوں پر مشتمل ہوتیں اور یہ لوگ نواح دہلی میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے اس زبان کو

---

[1] محمد قاسم فرشتہ۔ تاریخ فرشتہ۔ مقالہ دوم۔ ص ۱۳۶

[2] عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ ص ۶۵

[3] ضیاء الدین محمد سہیل (مترجم) تاریخ منظوم سلاطین بہمنہ۔ ص ۱۱، ۱۲۰

Marfat.com

اختیار کر چکے تھے جوان علاقوں میں تشکیل پا رہی تھی۔ جب وہ جنوبی ہند آئے تو اپنی زبان ساتھ لائے۔ ملک کافور نے جنوب میں جگہ جگہ مستحکم فوجی چھاونیاں قائم کر دی تھیں[1] تاکہ جنوب پر حکومت کی گرفت مضبوط رہے۔

فرشتہ لکھتا ہے کہ ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں جمعہ کے دن ۳ ربیع الثانی کو حسن کے سر پر تاج شاہی رکھا گیا[2] اور چتر سیاہ جو خلفائے عباسی کا قومی نشان تھا برکت کے لیے حسن کے سر پر سایہ فگن ہوا۔ حسن گانگو کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری ہوا اور بادشاہ علاءالدین حسن گانگوئے بہمنی کے نام سے مشہور ہوا۔ امیروں نے گلبرگہ کو مناسب جگہ تصور کر کے اسے حسن آباد کے نام سے موسوم کیا اور بہمنی سلطنت کا دارالحکومت قرار دیا۔

عصامی کی "فتوح السلاطین"..... ایک منظوم تاریخ ہے۔ تاریخ فتوح السلاطین" میں جو "شاہنامہ ہند" بھی کہلاتی ہے عصامی نے بانی سلطنت بہمنہ علاءالدین حسن بہمنی کی تخت نشینی اور اس کی، فتوحات کا مفصل حال درج کیا ہے۔ عصامی کہتا ہے کہ حسن کو تخت نشین کرنے کے لیے ایک قیمتی تخت جو مرصع اور بیش قیمت تھا تیار کیا گیا تھا۔ دربار منعقد کر کے امرائے عظام اور اہم شخصیتوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ دربار کیا تھا گلاب کے پھولوں کی کیاری تھی۔ بادشاہ کے سر پر جو چتر شاہی تانا گیا تھا اس میں قیمتی لعل آویزاں تھے۔ حسن کو علاءالدین کا خطاب دیا گیا۔ عصامی کہتا ہے کہ اس بادشاہ کی سیرت فریدوں کی سی ہے اور اس کا نام بہمن ہے اور اس کی کنیت۔ ابوالظفر ہے ماضی میں اس کا خطاب ظفر خان تھا جو تخت نشین ہونے کے بعد اس نے اپنے فرزند محمد کو عطا کیا تھا۔ تخت کے سامنے ایک قیمتی مسند بچھائی گئی جس پر ولی عہد محمد کو بحیثیت وزیر اعظم سلطنت بہمنہ بٹھایا گیا۔ وزیر اعظم خواجہ جہان کہلاتا تھا تخت

---

[1] عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ ص ۶۲

[2] (ا) محمد قاسم فرشتہ (مترجم محمد فدا علی طالب) جلد سوم۔ ص ۱

(ب) عصامی نے فتوح السلاطین میں حسن کی تخت نشینی کی تاریخ ۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ مطابق یکم اگست ۱۳۴۸ء بتائی ہے۔ فتوح السلاطین (ایڈیٹر اخا مہدی حسین) ص ۸۲

Marfat.com

نشینی کے اس مبارک موقع پر امراء کو خطابات سے نوازا گیا[1] تغلق سلطنت سے علاحدگی اختیار کر کے حسن گنگو بہمنی نے بہمنہ سلطنت، کی بنیاد ڈالی۔

تغلق فوج کے سپہ سالار جوہر اور سرتیز تھے۔ ان سے ظفر خان (حسن بہمنی) کو مقابلہ کرنا تھا۔ اس نے ارک اور ساگر کا رخ کیا اور یہاں پہنچ کر ایک بڑی فوج تیار کر لی تھی۔ حسن گنگو کی فوج گوداوری پار کر کے دیوگیری قلعہ تک پہنچنا چاہتی تھی لیکن ان کو اطلاع ملی کہ خود سرتیز گوداوری کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے ظفر خان نے اپنے سپہ سالار حسین کو حکم دیا کہ وہ امن پر حدِ غنیم کی فوج پر حملہ کر دے[2] مبارک جو شاہی فوج کا سپہ سالار تھا بھاگ کھڑا ہوا اور اس کے سپاہی قیدی بنا لیے گئے ظفر خان (حسن بہمنی) نے بیڑ پر قبضہ کر لیا۔ سرتیز تیر سے زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ اس کے داماد قمر، سپہ سالار محمود اور سیف عرب کو یہ کہہ کر قتل کر دیا گیا کہ وہ اسلام کے خلاف کام کر رہے تھے۔ حسن دولت آباد پہنچا اور اس کی خبر پا کر جوہر بھاگ کھڑا ہوا۔

حسن چاہتا تھا کہ اس کی حکومت کے حدود جنوب میں رامیشورم اور ملابار شمال میں مالوہ گجرات اور دہلی تک پہنچ جائیں لیکن سیف الدین غوری نے حسن کو مشورہ دیا کہ وہ فی الحال اپنی توجہ دکن پر مرکوز رکھے اور حسن نے اسی پر عمل کیا تھا۔

حسن نے اپنی سلطنت کو استحکام عطا کرنے کے لیے گندھار، تلنگانہ، کوٹ گیر، اکل کوٹ، مرم کلیان۔ مالیکھار اور گلبرگ فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔ اس نے دولت آباد کا نام فتح آباد رکھا۔[3]

ملا داؤد بیدری کی تاریخ "تحفۃ السلاطین" کے حوالے سے محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد حسن نے صدر الشریف سمرقندی کو منصب صدارت پر فائز کیا اور محمد بدخشی کو قاضی لشکر مقرر کر دیا۔[4] حسن نے اپنی

---

[1] عصامی (ایڈیٹر آغا مہدی حسین)۔ فتوح السلاطین۔ صہ ۸۲۸ تا ۸۳۱

[2] " " " " صہ ۸۸۹

[3] " " " " صہ ۸۹۰، ۸۹۱

[4] محمد قاسم فرشتہ (مترجم محمد فدا علی طالب) جلد سوم۔ صہ ۱۰، ۱۱

Marfat.com

خود مختاری کا اعلان دولت آباد میں کیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد دارالسلطنت گلبرگہ منتقل ہوگیا۔

"کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا" میں ہارون خاں شیروانی لکھتے ہیں کہ بہمنی سلاطین نے گلبرگہ میں ۱۳۴۷ء میں اپنی خود مختار حکومت قائم کی تھی۔ بہمنی بادشاہوں نے ۱۳۴۷ء سے ۱۴۲۴ء تک گلبرگہ میں حکومت کی اور ۱۴۲۴ء سے سقوط سلطنت تک بیدر میں حکمرانی کی[1] علاء الدین حسن کا لقب بقول شیروانی بہمن تھا اور اس کا سلسلہ نسب ایران کے عظیم المرتبت شاہی خاندان بہمن واسفندیار اور ان سے آگے بہرام گور تک پہنچتا تھا[2] مورخ عصامی لکھتا ہے کہ سلاطین بہمنہ ایران کے مشہور بادشاہ بہمن ابن اسفندیار کی اولاد سے ہونے کے مدعی تھے عصامی کہتا ہے ؎

دو صد لشکر از قوت یک تن است
کہ ہم بہمنی است وہم بہمن است

ایشوری پرشاد "ہسٹری آف دی قراونا ترک اِن انڈیا" میں لکھتے ہیں کہ علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے نام کے جزو بہمنی عما "برہمن" سے کوئی تعلق نہیں تھا قلعہ گلبرگہ پر کندہ ایک تحریر سے جو ۷۵۴ھ کی ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بانی سلطنت بہمنی کا نام علاء الدین تھا قلعہ گلبرگہ پر کندہ عبارت "علاء الدین دنیا والدین" ہے اور اسی طرح سکوں پر "علاء دنیا ودین" کندہ کیا ہوا نظر آتا ہے[3]

"ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا" (History of South India) میں پی این چوپرا اور این سبرامنیم لکھتے ہیں کہ بانی سلطنت بہمنیہ حسن کا سلسلہ نسب ساسانی حکمران بہمن ابن اسفندیار سے ملتا تھا اسی لیے اس نے "بہمن شاہ" کا خطاب حاصل کیا تھا[4]

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا۔ ص ۱۲

[2] "مترجم رحیم علی الہاشمی ۔ دکن کے بہمنی سلاطین۔ ص ۴۷

[3] ایشوری پرشاد۔ ہسٹری آف دی قراونا ترک اِن انڈیا۔ جلد اوّل۔ ص ۴۳۸

[4] پی این چوپرا اور این سبرامنیم۔ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ جلد دوم ص ۶۳۔

Marfat.com

علاء الدین حسن کا ابتدائی دور حکومت اپنی سلطنت کی بقاء کے لیے معرکہ آرائیوں میں گزرا جب اس نے جنگ و جدال سے فرصت پائی تو علم و ہنر اور ذہنی ترقی کی طرف متوجہ ہوا۔ معین الدین عقیل رقمطراز ہیں کہ بانی سلطنت بہمنہ نظام الدین اولیاءؒ کا بڑا معتقد تھا اور تخت نشین ہونے کے بعد اس نے پانچ من سونا اور دس من چاندی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی روح کو ایصال ثواب کے لیے شیخ برہان الدین غریبؒ کے ذریعے سے فقراء اور مساکین میں تقسیم کروائی تھی[1]۔ حسن نے برہان الدین غریبؒ کے خلیفہ شیخ زین الدینؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور وہ شیخ سراج الدین جنیدیؒ کا بھی معتقد تھا۔ حسن گنگو کو شیخ ہی نے سلطان قطب الدین کی مسجد میں تخت نشین کیا تھا۔ عبدالمجید صدیقی نے اپنی کتاب "بہمنی سلطنت" میں اس کی تفصیل بیان کی ہے[2]۔

علاء الدین حسن نے تعلیم و تربیت کی طرف بطور خاص توجہ کی۔ بقول عبدالقادر سروری مشہور مورخ مولانا عصامی اس وقت گلبرگہ میں موجود تھے[3]۔ بہمنیوں کے دربار کی شان و شوکت کی روایات بھی اسی بانی سلطنت کی۔ ہیں منتخب تھیں دربار میں دبیز قالین کا فرش، زربفت کے شامیانے، ریشم اور زردوزی کے قیمتی پردے بہمنی سلاطین کے سلیقے اور نفیس ذوق کے آئینہ دار تھے۔ خدام، حاجب، نقیب اور دوسرے کارندوں کے لباس مخصوص اور ان کی نشست و برخاست کے آداب مقرر تھے۔ علاء الدین حسن بہمنی نے اپنے فرزند محمد شاہ کے لیے ایک پر امن اور مستحکم سلطنت چھوڑی تھی۔ اس نے تلنگانہ اور وجے نگر کے راجاؤں سے دوستانہ تعلقات استوار رکھے تھے۔ تلنگانہ کے رائے نے ہدیہ خلوص کے طور پر حسن کو ایک بیش قیمت عقیق نذر کیا تھا جسے محمد نے جڑوا کر شاہی چتر کے اوپر نصب کروایا تھا[4]۔ اس کے

---

[1] معین الدین عقیل۔ دکن اور ایران۔ ص ۲۲

[2] عبدالمجید صدیقی۔ بہمنی سلطنت۔ ص ۶۵، ۶۶

[3] عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ ص ۶۹

[4] ہارون خان شیروانی۔ دکن کے بہمنی سلاطین۔ ص ۶۷، ۶۸

Marfat.com

فارسی کلام کا نمونہ " کلام الملوک " میں میر سعادت علی رضوی نے محفوظ کر دیا ہے[1] تلنگانہ کے رائے نے مارچ ۱۳۶۳ء کو حسن کی خدمت میں تخت فیروزہ روانہ کیا تھا۔ یہ تخت آبنوس سے تیار کیا گیا تھا۔ تین گز لمبے اور دو گز چوڑے اس تخت پر فیروزہ رنگ کی مینا کاری کی گئی تھی۔ سید علی بلگرامی " تاریخ دکن " میں تحریر کرتے ہیں کہ اس تخت فیروزہ پر بادشاہ " نوروز کے موقع پر جلوس کرتا تھا "[2] علاء الدین حسن قیمتی لباس زیب تن کرتا تھا اور اسے شاہانہ سطوت و شکوہ کا بڑا خیال تھا اس کے دربار کا دبدبہ ایک طاقتور حکمران کے شایان شان تھا۔ ایشوری پرشاد لکھتے ہیں کہ حسن گنگو بہمنی نے سلطنت میں باضابطہ نظم و نسق قائم کیا تھا اور تمام سلطنت کو " طرف " میں تقسیم کر کے ان پر امیر متعین کر دیے تھے جو لگان وصول کرتے ان کے قبضے میں فوجی دستے ہوتے جو وقت ضرورت بادشاہ کے پاس فوجی خدمت کے لیے بھیجے جاتے تھے[3] بادشاہ دربار میں دن کا آٹھواں حصہ یعنی ایک پہر گزرنے کے بعد نمودار ہوتا اور ظہر کی اذان کے وقت تک سلطنت کے کاموں میں مصروف رہتا۔ علاء الدین حسن کی حکومت کے حدود مدورا سے رائچور اور بھونگیر سے والول اور گوا تک پھیلے ہوئے تھے کرشنا کے کنارے کے حکمران اور تلنگانہ کے رائے اس کے باجگزار تھے۔ اسی کے عہد میں جنگی سامان کی ایک نئی دریافت یعنی بارود دکن میں پہلی بار ادونی کے محاصرے میں استعمال ہوئی تھی[4] بہمنیوں کی فوج میں بہت سے ترک اور فرانسیسی شامل تھے۔ یہ باشندے توپیں سر کرنے کے کام سے بخوبی واقف تھے۔ سیف الدین غوری نے جو ایک دور کے رشتے سے حسن کا خسر ہوتا تھا اور اس کا رفیق بھی تھا، " نصائح الملوک " کے نام سے ایک کتابچہ تیار کیا تھا جس میں بادشاہ اور اس کے خانوادے کے لیے مفید و مناسب

---

[1] میر سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک۔ ص ۴-۶

[2] سید علی بلگرامی۔ تاریخ دکن حصہ اول۔ ص ۱۰۵

[3] ایشوری پرشاد، ہسٹری آف میڈیویل انڈیا۔ (دوار ایڈیشن) ص ۲۷۹، ۲۸۰۔

[4] ہارون خاں شیروانی مترجم رحم علی الہاشمی۔ دکن کے بہمنی سلاطین۔ ص ۷

Marfat.com

ہدایات درج تھیں۔ علاءالدین حسن کا انتقال ۱۹ ذیعقدہ ۷۴۷ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۳۴۷ء کو ہوا تھا[1] پروفیسر عبدالقادر لفظ "بہمنی" کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حسن کے نام کا یہ جزو اس کے بعد کے سلاطین کے ناموں کے ساتھ بھی باقی رہا[2]

بہمنیوں کی یہ کوشش رہی تھی کہ شمالی ہند سے سیاسی تعلقات کے ساتھ ساتھ معاشرتی، معاشی اور تہذیبی تعلقات بھی منقطع کرلیں لیکن ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہونے کی وجہ سے شمال کا مکمل مقاطع ممکن نہ تھا۔ شمال سے تہذیبی رشتے کمزور بنانے کے لیے بقول ابوالنصر محمد خالدی، مغربی ایشیا، عراق، عرب اور ایران سے تعلقات بڑھائے گئے تھے دوسرے بہمنی حکمران کے عہد سے معاشی اور سیاسی تعلقات فروغ پانے لگے اور ہر سال حج کا خصوصی انتظام ہونے لگا اور عراق و فارس سے بحری تجارت کی بھی غیر معمولی ہمت افزائی کی جانے لگی۔ حکومت کی اعلا سطح پر فارسی کا چلن ایرانیوں کو بہمنی سلطنت کی طرف کھینچنے لگا اور جب دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں ایران اور خراسان میں سیاسی اور معاشی پریشانی پھیل گئی تو وہاں کے باشندوں کی قابل لحاظ تعداد نے دکن میں پناہ لی[3]

"تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ" کا بیان ہے کہ حسن گنگو بہمنی کے انتقال کے تیسرے دن محمد شاہ بن سلطان علاؤالدین بہمنی نے ماتمی لباس ترک کیا اور اپنے والد کے تخت پر جلوہ افروز ہوا اس کے تاج میں جو "یاقوت احمر" سے مرصع تھا ایک ایسا بیش بہا جوہر تھا جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا[4] اس منظوم تاریخ کے مورخ کا بیان ہے کہ بہمنی سلاطین میں سب سے پہلے حسن

---

[1] ہارون خاں شیروانی مترجم رحیم علی الہاشمی۔ دکن کے بہمنی سلاطین۔ ص ۸۲

[2] پروفیسر عبدالقادر۔ بر لفظ بہمنی (مضمون) مشمولہ اسلامک کلچر۔ جنوری ۱۹۵۸ء۔ ص ۱۲۴

[3] ابوالنصر محمد خالدی۔ پچھ دکھنی کلام۔ (مضمون) مشمولہ نوائے ادب جولائی ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۸

[4] ضیاءالدین محمد سہیل (مترجم) تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ۔ ص ۲۵

Marfat.com

کے فرزند محمد شاہ کے عہد میں بہمنی سلطان کے نام کا سکّہ جاری کیا گیا۔ محمد شاہ کے دور کے خان صلابت جو "ترک اور قلی" تھے ٹکسال کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ ؎

تھے خان صلابت جو ترک و قلی　　وہ بانی ٹکسال تھے اک ولی
بنام گرامی اثنا عشر　　وجود زر و سیم تھا جلوہ گر
دگر سمت کندہ تھا شاہ نظام　　بعد زیب و زینت تھا یہ ارتسام

ابوالفتح ضیاء الدین محمد المعروف بہ سید امجد حسین کے اس خیال کی، پی ایل گپتا کے بیان سے تائید ہوتی ہے کہ محمد شاہ اول ابن علاء الدین حسن خان کے زمانے میں پہلی بار بہمنی سکہ دارالضرب میں ڈھالا گیا۔ محمد شاہ کے ایک سکّے پر "حضرت احسن آباد" پڑھا جا سکتا ہے[1] پی این چوپرا اور این سبرامنیم ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا (History of South India) میں لکھتے ہیں کہ جب محمد شاہ کو عباسی خلیفہ نے جمعہ کا خطبہ پڑھوانے کی اجازت دی تو اس کی شان و شوکت میں اضافہ ہوا اور اس نے اپنی حکومت میں سکّے ڈھالنے کا آغاز کیا۔[2] حقیقت یہ ہے کہ بہمنی سکے تین مختلف مقامات کے ٹکسالوں میں مضروب ہوتے رہے۔ محمد شاہ اول کے عہد میں بہمنیوں کا دارالضرب فتح آباد یعنی دولت آباد میں تھا۔ اس کے بعد فیروز شاہ کے دور کے سکّے گلبرگہ یعنی احسن آباد کے دارالضرب میں تیار کیے گئے اور احمد شاہ ولی کے زمانے میں جب بہمنی پایۂ تخت بیدر منتقل ہوا تو یہاں ٹکسال قائم ہوا اور سکّے ڈھالے جانے لگے محمد شاہ سوم کے دور کے جو سکّے دستیاب ہوئے ہیں وہ بیدر کے ٹکسال سے جاری کیے گئے تھے۔ راجا ریڈی اور سوریا نارائن لکھتے ہیں کہ ۷۶۶ھ تک فتح آباد کے دارالضرب میں سکے ڈھالے جاتے رہے[3] احسن آباد کے دارالضرب کا جو سب سے پہلا سکّہ دستیاب ہوا ہے۔ وہ ۷۶۰ھ کا ہے۔ احسن آباد یا گلبرگہ فیروز شاہ بہمنی

---

[1] پی، ایل گپتا۔ باب ہفتم۔ کاٹینج۔ میڈیول دکن۔ ص ۴۳۲

[2] پی این چوپڑا اور این سبرامنیم۔ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا حصّہ دوم۔ ص ۶۵

[3] راجا ریڈی سوریا نارائن۔ کاپر کائنس آف بہمنیز۔ ص ۱۸ تا ۲۲۔

Marfat.com

کے عہد تک دارالسلطنت رہا۔ یہاں ہر قسم کے سکّے تیار کیے جاتے تھے ۸۲۷ھ تک یہ دارالضرب کام کرتا رہا لیکن جب راجدھانی بیدر منتقل ہوگئی تو یہ دارالضرب بیکار ہوگیا۔ محمد آباد یا بیدر میں ۸۲۷ھ سے سکّے مضروب ہونے لگے۔ کلیم اللہ آخری بہمنی بادشاہ تھا اس کی تاج پوشی بقول راجاریڈی وسوریاریڈی ۹۳۰ھ میں ہوئی تھی اور اس کا سنہ رحلت ۹۴۲ھ ہے اس سنہ کے بعد بھی کلیم اللہ کے نام سے اسی ٹکسال میں سکّے ڈھالے جاتے رہے[1] "کاپر کائنس آف بہمنز" کے مصنفین نے سکّوں پر کندہ کیے جانے والے بہمنی بادشاہوں کے خطابات کی تعداد بائیس بتائی ہے[2]۔ جن میں ابوظفر، ابوالغازی، جہان پناہ، عبد معبود دارائے نگہبان، المغنی، ظل اللہ، دیندار، برگزیدہ اللہ اور برگزیدہ سلطان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

بہمنی سلاطین نے تینوں دھاتوں میں اپنے سکّے جاری کیے۔ تانبہ، چاندی اور سونے کے سکّے ڈھالے گئے۔ اس عہد کے سونے کے سکّے بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن تانبے کے سکّے خاصی تعداد میں دستیاب ہوئے ہیں صرف محمد شاہ اول، مجاہد شاہ، محمد شاہ دوم، فیروز شاہ، احمد شاہ دوم، ہمایوں شاہ، احمد شاہ سوم محمد شاہ سوم اور محمود شاہ کے دور کے سونے کے سکّے مل سکے ہیں[3] سوائے مجاہد شاہ اور فیروز شاہ کے دوسرے تمام بہمنی حکمرانوں نے سلاطین دہلی کے معیار کو پیش نظر رکھا تھا۔ تنکا ایک سو ستر گرین وزنی ہوتا تھا اسی کو برقرار رکھا گیا تھا۔ مجاہد شاہ فیروز شاہ اور ایک حکمران (جس کا نام "محمد حسن بہمنی" ہے) نے دینار کا وزن برقرار رکھا۔ دینار محمد تغلق کے عہد میں رائج تھا اور اس کا وزن ایک سو ستانوے (۱۹۷) گرین ہوتا تھا۔ یہ سونے کا سکّہ ہوتا تھا۔ آخری دو بہمنی بادشاہوں کے علاوہ سب ہی حکمرانوں نے چاندی کے سکّے جاری کیے۔ ان سب بادشاہوں نے تنکا کا وزن برقرار رکھا جو ایک سو ستر (۱۷۰) گرین تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں

---

[1] راجاریڈی سوریانارائن۔ کاپر کائنس آف بہمنیز۔ ص ۱۸ تا ۲۲

[2] " " " ص ۲۲

[3] پی ایل گپتا۔ باب ہفتم کاٹینج۔ میڈیویل دکن۔ ص ۴۳۳

Marfat.com

کم وزن کے سکّے جو قدر و قیمت میں نصف تنکا تصوّر کیے جاتے تھے اور جن کا وزن ایک سو دس گرین تھا مضروب ہوتے تھے لیکن درحقیقت ان کا وزن نصف نہیں دو تہائی تھا۔ تنکا کا ایک تہائی وزن چھپن (۵۶) گرین ہوتا ہے۔ یہ سکّہ مجاہد شاہ کے عہد میں جاری کیا گیا تھا۔ محمد شاہ دوم کے عہد میں سترہ (۱۷) اور ستائیس (۲۷) گرین کے چھوٹے سکّے جاری ہوئے۔ محمد شاہ اول کے دور میں تنکا کے $\frac{1}{4}$ اور $\frac{1}{10}$ وزن کے سکّے بھی ڈھالے گئے تھے[1]

بہمنی بادشاہوں نے جو تانبے کے سکّے جاری کیے تھے وہ مختلف قدر و قیمت کے تھے اور ان پر مختلف عبارتیں کندہ کی گئی تھیں۔ محمد شاہ اول نے تین قسم کے سکے جاری کیے تھے ستاون گرین کا سکّہ "چوبسوا" یعنی $\frac{1}{5}$ گنی کے مساوی ہوتا تھا ستہتر (۷۷) گرین کے سکّے سینتیس (۳۷) گرین کے سکّوں کے دوگنے ہوتے تھے یہ "پیکا" $\frac{1}{4}$ گنی سے وزنی ہوتا۔ پیکا خلجیوں کا سکّہ تھا جس کا وزن باون (۵۲) گرین ہوتا۔ ادھوا $\frac{1}{8}$ گنی وزنی ہوتا۔ ستاون گرین کے سکّوں کی دو قسمیں ہوتی تھیں اور ان پر کندہ کی ہوئی عبارتیں بھی مختلف ہوتیں۔ مجاہد شاہ کے سکّے چوبسوا ــــ اور محمد شاہ دوم کے عہد میں بھی چوبسوا جاری ہوئے۔

حسن گنگو بہمنی کا بیٹا محمد شاہ بقول ایشوری پرشاد طبعاً ایک جنگجو حکمران تھا۔ وہ جنوب کے راجاؤں سے ہمیشہ برسرپیکار رہا۔ وجیانگر اور تلنگانہ کے راجاؤں سے اس کا تصادم ہوتا رہا۔ تلنگانہ کے راجا ــــ سے جو نوعمر تھا محمد شاہ کی ان بن ہوگئی اس نے دہلی کے حکمران فیروز شاہ سے مدد طلب کی لیکن ناکام رہا۔ محمد شاہ کی فوجوں سے لڑائی کے بعد راجا کو تینتیس (۳۳) لاکھ تاوان جنگ ادا کرنا پڑا اور قلعہ گولکنڈہ محمد شاہ کے حوالے کر دیا گیا[2] اس کے بعد محمد شاہ کی وجیانگر کے راجا سے ٹھن گئی۔ وجیانگر کا راجا تیس ہزار سواروں دس ہزار پیدل سپاہیوں اور تین سو ہاتھیوں کی فوج لے کر آگے بڑھا اور بہمنی علاقے پر جو کرشنا

---

[1] پی ایل گپتا۔ باب ہفتم کاٹینج۔ میڈیویل دکن ص ۴۳۳

[2] ایشوری پرشاد۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن۔ ص ۳۸۲

Marfat.com

اور سنگبھدرا کے درمیان واقع تھا حملہ کر دیا۔ محمد شاہ کی فوج میں پندرہ ہزار سوار پچاس ہزار سپاہی اور ایک بھاری توپ خانہ تھا۔ وہ اس جنگ میں کامیاب و کامران رہا۔ اس جنگ کا مفصل حال ایشوری پرشاد نے ہسٹری آف میڈیویل دکن میں بیان کیا ہے [1] اور محمد قاسم فرشتہ نے بھی اس جنگ کے واقعات پر روشنی ڈالی ہے [2]

حسن بہمنی نے اپنے ولی عہد محمد شاہ کی ملکہ سیف الدین غوری کی لڑکی سے ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء میں شادی کی تھی اس کا ذکر دکن کی تاریخوں میں موجود ہے جس کی تفصیلات سے اس عہد کے کلچر اور رسوم و رواج پر روشنی پڑتی ہے اس دعوت میں تلنگا، شکر کھیڑا اور مدگل کے رائے بھی مدعو تھے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں ہندو مسلم ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں برابر کے شریک تھے۔ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں اس جشن کا مفصل حال درج کیا ہے [3] ہزاروں زربفت اور ریشم کے تھان، ایک ہزار عربی اور عراقی گھوڑے، بارہ قیمتی اور مرصع تلواریں اور جواہرات امراء میں تقسیم کیے گئے تھے۔ رعایا کو بادشاہ کی جانب سے پرتکلف کھانا کھلایا جاتا تھا۔ جشن کا یہ سلسلہ اور شاہی ضیافت ایک سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہی جس کا سبب محمد قاسم فرشتہ نے یہ بتایا ہے کہ شہزادے کی خالہ یعنی ملکہ جہان کی بہن کو جو ملتان میں مقیم تھی گلبرگہ لانے شاہی عہدیدار گئے ہوئے تھے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ بادشاہ عیش و عشرت کی نئی نئی محفلیں منعقد کرواتا تھا۔ شہر کے منتخب مقامات پر منجنیقیں نصب کر دی گئی تھیں اور ان سے ہمہ اقسام کی مٹھائیاں اور شیرینی کی گولیاں اہل شہر پر برسائی جاتی تھیں [4] اس شادی میں جو شاندار اور پرتکلف دعوتیں ہوتی تھیں ان کا ذکر بھی تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔ دسترخوان تیار ہونے کے بعد قرنا بجایا جاتا تھا ریشمی مشجر کپڑے کا دسترخوان اور روٹیاں تقسیم کی

---

[1] ایشوری پرشاد۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن۔ صـ۳۸۳

[2] محمد قاسم فرشتہ (مترجم محمد فدا علی طالب) تاریخ فرشتہ جلد سوم صـ۴۲۰، ۴۳۰

[3] 〃 〃 〃 صـ۱۲۰، ۱۳۰

[4] 〃 〃 〃

Marfat.com

جاتی تھیں اس کے بعد مختلف قسم کے بھنے ہوئے گوشت اور گرما گرم سالن کا شوربا تر کاریاں خام اجمود سلاد اور شکار کے جانوروں کا گوشت۔ یخنی اور مختلف قسم کے سالن پیش کیے جاتے۔ کھانے کے آخر میں خشک و تر میوے اور حلوے سے تواضع کی جاتی۔ شاہی مہمانوں اور امراء کے علاوہ غریب غربا بھی اس دسترخوان سے شکم سیر ہوتے تھے۔

محمد شاہ کے عہد میں کثرت سے ایران و عراق کے علماء اور اہل صرفہ نے بہمنی سلطنت کا رخ کیا۔ اس عہد کے فوجی اور غیر فوجی بہمنی عہدیداروں کے القاب سے اس کا اندازہ ہوتا ہے سیستانی، تبریزی، مازندرانی اور گرامانی القاب اس تمدن کی نمایندگی کرتے ہیں جس پر اسلامی اثرات، مقامی میلانات پر غالب آتے جارہے تھے یہ دراصل "دکنی" اور "آفاقی" رجحانات کے ایک دوسرے میں مدغم ہونے کا عہد تھا۔ بہمنیوں کے عہد میں روحانی پیشواؤں اور اہل اللہ سے سلطنت خالی نہ تھی۔ محمد شاہ نے حضرت زین الدین کے منع کرنے پر شراب نوشی ترک کر دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ حافظ کو بھی گلبرگہ آنے کی دعوت دی گئی تھی لیکن وہ بعض مجبوریوں کی بنا پر یہاں نہ آ سکے۔ حافظ نے بطور معذرت ایک غزل لکھ بھیجی تھی جس کا مطلع اور مقطع یہ ہیں ؎

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بہ مئے بفروش دلق ما کزین بہتر نمی ارزد
چو حافظ در قناعت کوش و از دنیائے دوں بگذر
کہ یکجو منت دوناں جہان یکسر نمی ارزد

حافظ کے معذرت نامہ بھیجنے پر اسے ایک ہزار سکہ طلائی بطور تحفہ روانہ کیے گئے تھے۔ محمد شاہ بڑی بڑی رقمیں دے کر عرب اور ایران سے شعراء اور ارباب علم و فن کو اپنے پایۂ تخت آنے کی دعوت دیتا تھا[2] سید علی بلگرامی "تاریخ دکن

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ دکنی کلچر۔ ص ۱۵۶

[2] میر سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک۔ ص ۵

Marfat.com

میں لکھتے ہیں کہ اہل ایران چونکہ "حساب کتاب میں بڑے ہوشیار" اور "کفایت شعار" اور "انتظام ملک داری اور سپہ گری" سے خوب واقف ہوتے تھے اس لیے تمام ایشیائی حکومتوں میں ایرانیوں کا بول بالا تھا۔ سلاطین بہمنیہ کے یہاں بھی بکثرت ایرانی، شاہی ملازمت سے منسلک تھے۔ دکن میں اہل ایران اس لیے بھی سکونت پذیر ہوئے تھے کہ بہمنی عملداری میں دابل اور گوا کی بندرگاہیں تھیں جہاں ایران سے تجارت کی جاتی اور مسافروں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا اور یہ راستہ خشکی کی رہگزر سے جو درہ شہر کی دشوار گزار منزلوں سے ہو کے گزرتی تھی نسبتاً آسان تھا[1] محمد شاہ نے بقول محمد قاسم فرشتہ ۹ ذیقعدہ ۷۷۴ھ کو اس دار فانی سے رحلت کی۔ مورخ تاریخ فرشتہ "سراج التواریخ" کے حوالے سے لکھتا ہے کہ کسی بہمنی بادشاہ کی سلطنت اتنی خوش حال نہیں تھی جتنی کہ محمد شاہ کی تھی اس کے یہاں نر اور مادہ خاصے کے ہاتھیوں کی تعداد تین ہزار تھی اور خزانہ، مال اور جواہرات سے پر تھا[2]

ایس نٹ راجن نے اپنی کتاب "پولٹیکل اینڈ کلچرل ہسٹری آف انڈیا" (Political and Cultural History of India) حصہ اول میں محمد شاہ کی ستائش کی ہے اور لکھا ہے کہ اس نے زمانہ قحط میں گجرات اور مالوہ سے عوام کے لیے اناج مہیا کیا تھا۔ رعایا اس کو "ارسطو ثانی" سے موسوم کرتی تھی[3]

سلطان محمد کے بعد اس کا بیٹا مجاہد شاہ تخت نشین ہوا وہ سیف الدین غوری کا نواسہ تھا۔ وہ ترکی اور فارسی زبان کا ماہر تھا۔ وہ فنون سپہ گری سے غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا مجاہد انیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد مجاہد نے دولت آباد کا رخ کیا اور برہان الدین غریب کے مزار کی زیارت کی اور شیخ زین الدین کا مرید ہوا۔ مجاہد نے بیجانگر کے راجا سے جنگ کی تھی۔ محمد قاسم

---

[1] سید علی اصغر بلگرامی۔ تاریخ دکن۔ حصہ اول۔ ص ۱۶۲

[2] محمد قاسم فرشتہ (مترجم محمد فدا علی طالب) تاریخ فرشتہ جلد سوم ص ۵۴

[3] ایس نٹ راجن۔ پولٹیکل اینڈ کلچرل ہسٹری آف انڈیا۔ حصہ اول۔ ص ۲۷۳

Marfat.com

فرشتہ مجاہد شاہ کو" شیر دل"، مجاہد تحریر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بیجانگر کے بعد مجاہد شاہ قلعہ ادھونی کی طرف متوجہ ہوا لیکن نو مہینے کی کوشش کے بعد بھی قلعہ فتح نہ ہو سکا اس اثنا میں بارش کا موسم آگیا اور مجاہد شاہ کی فوج میں وبا پھیل گئی۔ سپاہیوں نے گلبرگہ جانے کی درخواست کی جب یہ حال سیف الدین غوری کو معلوم ہوا تو وہ تازہ دم فوج کے ساتھ ادھونی پہنچا اور بادشاہ کو مشورہ دیا کہ اس "آسمان بنیاد" قلعہ کو فتح کرنا آسان نہیں اس کے بجائے مجاہد شاہ بنگام سے ہنکاپور تک پھیلے ہوئے قلعوں کے شہروں پر پہلے قبضہ کر کے اپنی دھاک بٹھادے، بادشاہ کو یہ رائے پسند آئی اور مختلف مقامات پر قیام کرتا ہوا مجاہد شاہ گلبرگہ روانہ ہوا۔ راستے میں مچھلیوں کا شکار کیا اور سرشام ہی سے سراپردہ شاہی میں آرام کیا۔ داؤد خاں اور مسعود خاں نے چوکیداری کے بہانے اپنی جگہ سنبھالی اور رات میں مجاہد کا کام تمام کر دیا[1] چونکہ مجاہد شاہ نے کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی تھی اس لیے اس کے قاتل کو بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ وہ رشتے میں بادشاہ کا چچا ہوتا تھا۔ مجاہد شاہ کا قتل سترہ ذی الحجہ ۷۹۷ھ کو ہوا تھا لیکن داؤد شاہ بہت جلد مجاہد شاہ کی بہن روح پرور کے اشارے پر قتل کر دیا گیا اس کی مدت حکومت صرف ایک مہینہ پچیس روز تھی۔ مسند عالی خاں محمد کی خواہش تھی کہ مقتول کا نو سالہ فرزند محمد سنجر تخت نشین ہو لیکن روح پرور آغا نے مخالفت کی بالآخر اس کو اندھا کر کے امراء کے مشورے سے محمود شاہ کو مجاہد کا صحیح جانشین تسلیم کروایا گیا فتوح السلاطین میں عصامی نے اس بادشاہ کا نام اپنے اشعار میں جا بجا محمد شاہ لکھا ہے جو درست نہیں[2] وہ ملک سیف الدین کے مشورے سے معاملات سلطنت کے فیصلے کیا کرتا جس سے اُسے بہت فائدہ ہوا کیوں کہ ملک سیف الدین ایک انتہائی دانشمند اور تجربہ کار انسان تھا۔ بیجانگر کے راجا نے محمود کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

---

[1] محمد قاسم فرشتہ۔ (مترجم محمد فدا علی طالب) تاریخ فرشتہ حصہ سوم ص ۶۶

[2] " " " " " ص ۷۰

Marfat.com

محمود ایک اچھا خوش نویس تھا اور تلاوت قرآن میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ طبیعت موزوں پائی تھی اس لیے شعر بھی کہتا تھا۔ فرشتہ محمود کو ایک رحم دل اور کم آزار فرمانروا کہتا ہے [1] تاریخ فرشتہ میں محمود شاہ کے چند شعر بطور نمونہ تحریر کیے گئے ہیں جو درج ذیل ہیں ؎

آں جا کہ لطف دوست دہد منصب مراد — بخت سیاہ و طالع میموں برابر است
عافیت سینہ کار خوں فاسد می کند — رخصتے اے دل کہ از الماس نشتر می خورم
خضر بد سوداست و ربیع متاع عافیت — می روم ایں جنس را از جائے دیگری خرم

محمود شاہ کو علوم متداولہ میں اچھی دستگاہ تھی۔ وہ عربی اور فارسی کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اس نے علماء اور معلمین کے لیے وظیفے مقرر کر دیے تھے اور معذوروں اور اندھوں کو تنخواہیں مقرر تھیں۔ محمود ایک امن پسند بادشاہ تھا اور اپنے بیس سالہ زمانہ حکومت میں اس نے کبھی لشکر کشی نہیں کی۔ ملک میں پھیلی ہوئی بغاوت کی آگ فرو کرنے محمود نے ضرور قدم اٹھایا تھا۔ جب بہاء الدین کے دونوں بیٹوں محمد اور خواجہ باغی ہو گئے اور ایک ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج جمع کر کے اپنے والد کے پاس ساگر پہنچ گئے۔ محمود شاہ نے ان کی سرکوبی کے لیے دو مرتبہ لشکر روانہ کیا اور باغیوں کو شکست ہوئی اور بہت سامان حرب و ضرب ہاتھ آیا۔ تیسری مرتبہ محمود کو اس وقت فوج کشی کرنا پڑی جب اس کا ترکی غلام یوسف آزور باغی ہو کر قلعہ بند ہو گیا تھا۔ شاہی فوج نے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا اور وہ کامیاب و کامران رہا۔ [2] محمد قاسم فرشتہ نے محمود کی تاریخ وفات یکم رجب ۷۹۹ھ تحریر کی ہے [3]۔ تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ کے مورخ ضیاء الدین محمد کا بیان ہے کہ محمود شاہ تپ محرقہ کے عارضے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے انیس سال نو مہینے اور بیس دن حکمرانی کی [4]

---

[1] محمد قاسم فرشتہ (مترجم محمد فدا علی طالب) تاریخ فرشتہ۔ جلد سوم۔ ص ۷۱

[2] " " " " ص ۷۶

[3] " " " " "

[4] ضیاء الدین محمد (مترجم سہیل)۔ تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ ص ۳۸

Marfat.com

محمود شاہ کی وفات کے بعد اس کا ولی عہد غیاث الدین شاہ تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر سترہ سال تھی۔ اس کے تخت نشین ہونے کے بعد صفدر خاں سیستانی نے وفات پائی تو غیاث الدین شاہ بہمنی نے اس کے بیٹے صلابت خاں کو "مجلس عالی" کا خطاب عطا کر کے صفدر خاں سیستانی کا جانشین مقرر کر دیا۔ اسی طرح احمد بیگ قزوینی کو عہدہ پیشوائی اور محمد خاں کو سرنوبتی کے عہدے پر فائز کیا۔ بادشاہ کی ان عنایات نے اس کے ترکی غلام تغلچین کے دل میں حسد کی آگ بھڑکا دی کیوں کہ وہ خود منصب وکالت پر فائز ہونا چاہتا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ اس کا بیٹا حسین خاں سرنوبت بنے۔ تغلچین کی بیٹی بڑی حسین و جمیل تھی اور علم موسیقی میں اس نے کمال پیدا کیا تھا۔ غیاث الدین اس لڑکی کے حُسن و جمال پر فریفتہ تھا۔ تغلچین نے بادشاہ سے بدلہ لینے کے لیے ایک منصوبہ بنایا اور اسے اپنے گھر دعوت میں بلوا کر شراب سے خوب تواضع کی۔ بادشاہ نے اپنے تمام ملازمین کو باہر بھیج دیا اور تغلچین اپنی بیٹی کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر کرنے کے بہانے حرم سرا میں داخل ہوا اور ہاتھ میں خنجر لیے ہوئے باہر آیا شراب سے بادشاہ کے ہوش و حواس جاتے رہے تھے وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکا تغلچین نے اس کی آنکھیں نکال دیں اور شمس الدین کو تخت فیروزہ پر بٹھا دیا۔ اس واقعے کو تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ کے مورخ اور تاریخ فرشتہ کے مورخ نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان کے بیانات میں اختلاف نظر نہیں آتا۔ اور دونوں مورخین نے اس واقعے کی تاریخ ۱۷ رمضان بتائی ہے لیکن ضیاء الدین[1] محمد نے ۷۹۰ھ بتایا ہے اور محمد قاسم فرشتہ نے ۷۹۹ھ تحریر کیا ہے[2]

غیاث الدین نے بقول معین الدین عقیل ہفت گنبد تعمیر کروایا تھا ان گنبدوں کی تعمیر میں مقامی ۱۱۱ ایرانی اثرات نمایاں ہیں۔ ان گنبدوں میں مجاہد شاہ اوّل سے شمس الدین تک سب ہی بہمنی سلاطین دفن ہیں[3]

---

[1] ضیاء الدین محمد (مترجم سہیل)۔ تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ۔ ص ۱۴۱

[2] محمد قاسم فرشتہ (مترجم محمد فدا علی طالب) تاریخ فرشتہ۔ جلد سوم۔ ص ۷۹

[3] معین الدین عقیل۔ دکن اور ایران۔ ص ۳۷

Marfat.com

ہارون خان شیروانی "کلچرل ٹرنڈس اِن میڈیویل انڈیا" میں تحریر کرتے ہیں کہ بہمنی دور کے صرف دو تصویر چوں (Minitures) کا پتہ چلا ہے جس میں ایک شیر ببر کی شکل ہے اور دوسری طلوع ہوتا ہوا سورج ہے جو بیدر میں تخت محل کے سامنے تیار کیا گیا تھا۔ ان کا فنکار شہاب الدین احمد (۱۴۲۲ء۔۱۴۳۶ء) تھا۔ مصوری میں "دکنی قلم" ایک منفرد طرز کا حامل تھا۔ مصوری کے دکنی قلم کو بعض وقت اورنگ زیب کی فتح دکن کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جو بقول ہارون خان شیروانی درست نہیں۔ پرسی براؤن (Percy Brown) نے "دکنی قلم" کو "مغل طرز" کا "دکنی اسلوب" قرار دیا ہے۔ جو حقیقت پر مبنی نہیں ہے [1]

شمس الدین پندرہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا وہ اپنے بھائی کا حشر دیکھ چکا تھا اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہتا تھا اس نے تغلچین کو ملک نائب کا خطاب دے کر اسے امیر جملہ بنا دیا سلطان شمس الدین کی ماں کو جو غیاث الدین کی والدہ کی لونڈی تھی "مخدومہ جہان" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ لیکن تغلچین کو فیروز اور اس کے بھائی احمد سے ہمیشہ ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ کہیں اسے معزول اور برطرف نہ کر دیں چنانچہ تغلچین نے مخدومہ جہان کو اکسایا کہ وہ شمس الدین کو یہ سمجھائے کہ ان دونوں بھائیوں کو راستے سے ہٹا دینا ضروری ہے جب اس سازش کی خبر ملی تو فیروز اور محمود جان بچا کر بھاگے حاکم ساگر سدھور نے جو سلطنت بہمنیہ کا وفادار تھا انھیں پناہ دی۔ یہاں ان دونوں نے اپنا اثر ورسوخ بڑھایا اور فوج جمع کی۔ ایک مقررہ منصوبے کے تحت فیروز اور احمد گلبرگہ پہنچے اور شمس الدین سے ملاقات کے بہانے شاہی ملازموں پر حملہ کر کے غلبہ حاصل کیا اور تغلچین اور شمس الدین کو پابۂ زنجیر کر کے تہہ خانے میں قید کر دیا۔ [2] اسی وقت ایک مجلس ترتیب دی گئی اور تخت فیروزہ پر جلوس کیا۔ کچھ عرصہ بعد مخدومہ جہاں اور شمس الدین نے بڑی منت و سماجت کر کے مکہ معظمہ جانے کی اجازت چاہی اور ۸۱۰ھ میں وہیں انتقال

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈس اِن میڈیویل انڈیا۔ صفحہ ۶۰۔

[2] محمد قاسم فرشتہ (مترجم محمد فدا علی طالب) تاریخ فرشتہ جلد سوم۔ صفحہ ۵۴

Marfat.com

کیا۔ اس نے صرف ایک ماہ ستائیس دن حکومت کی تھی۔

زیڈ اے دیسائی لکھتے ہیں کہ بہمنی سلاطین نے فنون لطیفہ کی طرف توجہ کی اور بہمنی طرز کی پہلی مثال گلبرگہ کا قلعہ ہے جس کی دیواریں دوہری ہیں اور جو نصف دائرے کی شکل میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس قلعہ کی علی عادل شاہ کے دور میں تعمیر و ترمیم ہوئی تھی ہفت گنبد کی سپاٹ چھتیں، تنگ دروازے اور نیچے سے اوپر کی طرف اپنی چوڑائی میں کم ہوتی ہوئی دیواریں بہمنی طرز تعمیر کا خاص وصف ہیں اور یہ طرز تعمیر تغلق اسٹائل سے اثر پذیری کا ترجمان ہے بہمنی دور کی عمارتوں میں آرمینیا، ایشیائے کوچک اور ترکی کی طرح اینٹوں سے مخصوص انداز میں کام لیا گیا ہے۔ مرکزی محراب میں کمان کی وضع بھی منفرد ہے۔ یہ انداز پندرہویں صدی کی تعمیر کردہ جامع مسجد ستی خانم واقع ترکی میں بھی موجود ہے[1]

ہفت گنبد کے طرز تعمیر پر تبصرہ کرتے ہوئے "کلچرل ٹرنڈس اِن میڈیویل انڈیا" میں ہارون خان شیروانی رقمطراز ہیں کہ اس میں تغلقی طرز تعمیر کا اثر نمایاں ہے۔ اس کی موٹی دیواریں، چاروں کونوں پر چھوٹے چھوٹے گلدستوں کی موجودگی اور چپٹا گنبد اسی کے غماز ہیں[2]

ابتدائی بہمنی دور کے سکوں کے بارے میں راجا ریڈی اور سوریا نارائن رقمطراز ہیں کہ بہمنی بادشاہوں نے مختلف قدر و قیمت کے سکے جاری کیے تھے ان سکوں پر آرائشی کام نظر نہیں آتا۔ اور ان سے تغلق دور کے سکوں کی یاد تازہ ہوتی ہے[3]

ایران سے بہمنیوں کے تہذیبی تعلقات استوار تھے اس لیے ان کی تہذیبی روایات سے متاثر ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں معلوم ہوتی لیکن بہمنی سلطنت کی جنوبی اور مشرقی سرحدوں پر طاقتور ہندو ریاستیں موجود تھیں۔ وہ ہندوستانی

---

[1] زیڈ اے دیسائی۔ باب چہارم۔ آرکیٹکچر۔ میڈیویل دکن۔ ص ۲۳۲

[2] ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈس اِن میڈیویل انڈیا۔ ص ۱۴

[3] راجا ریڈی۔ سوریا نارائن کاپر کائنس آف بہمنیز۔ ص ۲

Marfat.com

روایات کی امین تھیں اور مصوری کے فن میں بھی انھوں نے ہندوستانی اثرات کی ترجمانی کی تھی۔ بہمنی سلاطین کو فن مصوری سے کوئی غیر معمولی دلچسپی نہیں تھی لیکن شاعری، فن تعمیر اور دیگر فنون لطیفہ سے انھوں نے شغف کا اظہار کیا تھا۔ وہ اسلامی اصولوں پر سختی سے کاربند تھے اور اسلامی نقطۂ نظر سے ذی حیات مخلوق کی تصویر کشی ممنوع تصور کی جاتی ہے۔ بہمنی سلاطین نے اہل اللہ اور علماء و فضلاء کی بڑی سرپرستی کی۔ اسلام کی رو سے نقاشی اور عمارتوں کی آرائش قابل اعتراض نہیں۔ بہمنی سلاطین نے عمارتوں کی نقاشی اور تزئین کی طرف توجہ کی ان کے محلات میں بقول جگدیش متل جامٹری کی امور سے مختلف ڈزائن اور آرائشی خطوط تیار کیے گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ گل بوٹوں اور نقش و نگار سے بھی عمارتوں کی اچھی تزئین کی گئی ہے۔ لیکن ان میں انسانی پیکروں کی تصویریں نہیں ملتیں۔ بہمنی دور میں پندرھویں صدی سے قبل کی پینٹنگ اور مصوری کے نمونے بہت کم دستیاب ہو سکے ہیں [1]

بہمنیوں نے بیرونی ممالک سے اپنے سفارتی تعلقات قائم رکھے تھے۔ عزیز احمد اپنی کتاب "اسٹڈیز ان اسلامک کلچر ان انڈین انوائرمنٹ" میں رقمطراز ہیں کہ محمد شاہ نے عثمانی خلیفہ دوم کو ایک سفارت بھیجی تھی بعد میں محمود شاہ نے بایزید دوم کے پاس اپنا ایک سفیر روانہ کیا تھا [2]

بہمنی سلطنت کا آٹھواں حکمران فیروز شاہ بہمنی تھا جو ۷۹۷ھ/۱۳۹۷ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ نیل کنٹھ شاستری نے فیروز کو بہمنی سلطنت کا "عظیم ترین بادشاہ" لکھا ہے اور وہ اس بادشاہ کے عہد حکومت کو بہمنی سلطنت کا "دور زریں" کہتا ہے [3] علوم و فنون، صفت و حرفت، تجارت و ثقافت اور تہذیب و تمدن کی جو ترقی فیروز شاہ کے عہد میں ہوئی اس کی مثال بہمنی دور کے کسی اور

---

[1] جگدیش متل۔ پینٹنگس۔ باب سوم۔ میڈیویل دکن۔ ص ۲۰۳

[2] معین الدین عقیل۔ دکن اور ایران۔ ص ۲۱

[3] نیل کنٹھ شاستری۔ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ ص ۲۴۶

Marfat.com

بادشاہ کے زمانہ حکومت میں نہیں ملتی۔

پی این چوپرا اور سبرا منیم نے فیروز شاہ بہمنی کو مشترکہ تہذیب کے بانی اور دکنی کلچر کی داغ بیل ڈالنے والے بادشاہ کی حیثیت سے بہت سراہا ہے اور اس کی وسیع النظری کی تعریف کی ہے کہ اس نے تمام برہمن قیدیوں کو رہا کروادیا تھا اور کھیرا کے سنگھ راجا کو شکست دینے کے بعد اس سے بہت اچھا سلوک کیا تھا [1]

فیروز خود شاعر تھا۔ اور فیروزی اور عروجی تخلص کرتا تھا۔ راقمۃ الحروف نے فیروز شاہ بہمنی کی مندرجہ ذیل رباعی دریافت کی ہے جو تا حال فیروز شاہ کے دکنی کلام کا واحد نمونہ ہے ؎

تجھ مکھ چندا جوت دسے سا راجیوں
تجھ کان پہ موتی جھمکے تا را جیوں
فیروزی عاشق کوں ٹک یک چاکن دے
تجہ شوخ ادھر لب رہے شکر پا را جیوں [2]

"تاریخ رشید الدین خانی" میں فیروز کے علم وفضل کی بڑی تعریف کی گئی ہے اور مورخ نے لکھا ہے کہ وہ توریت اور انجیل بھی پڑھ سکتا تھا، "اصطلاحات صوفیہ سے باخبر" تھا۔ ہر روز پاؤ سپارہ کلام اللہ لکھا کرتا اور دو تین پہر علماء، مشائخ، شعراء اور قصہ خوان افسانہ اور خوش طبع تاریخ دانوں سے بے تکلف محبت رکھتا تھا" [3] سخنوران بلند فکر کے مصنف نے فیروز شاہ بہمنی کی شاعری اس کی دقت پسندی اور مضمون آفرینی کو سراہا ہے [4] فیروز کی علمیت کے سب ہی ہم عصر مورخین قائل ہیں اس کے دربار میں علماء وفضلاء اور شعراء جمع رہتے تھے اور وہ ہر سال گوا، دابل اور جنول وغیرہ سے جہاز بھیجا کرتا تھا کہ اہلِ

---

[1] پی این چوپرا اور این سبرا منیم۔ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ جلد۔ دوم صہ ۶۸-۶۹
[2] سیدہ جعفر۔ دکنی رباعیاں۔ صہ ۸۹
[3] غلام امام خان قرین ہجر۔ تاریخ رشید الدین خانی صہ ۱۷۴
[4] محمد منور بہادر۔ سخنوران بلند فکر۔ صہ ۷

Marfat.com

علم وفضل کو اپنے دربار میں بلائے [1] اس بادشاہ کے دور حکومت میں سید محمد حسینی خواجہ بندہ نوازؒ گلبرگہ تشریف لائے تھے۔ آپ کی تشریف آوری نے گلبرگہ کو علم وفضل اور معرفت کے فیضان سے مالا مال کر دیا تھا۔ "سیر محمدی" میں آپ کے ورود گلبرگہ کی تفصیلات تحریر کی گئی ہیں [2]

فیروز شاہ بہمنی کے بارے میں ہارون خان شیروانی لکھتے ہیں کہ وہ کئی زبانیں جانتا تھا اور اس کا ہندوستان کے فاضل ترین حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے [3] وہ عمدہ خوش نویس ہونے کے علاوہ حکمت وفلسفہ، اقلیدس، ریاضی اور صوفیانہ مصطلحات کا ماہر تھا اس نے ۸۱۰ھ/۱۴۰۷ء میں بالا گھاٹ کے نام سے ایک رصد گاہ تعمیر کروائی تھی جس کی نگرانی کے لیے سید محمود گرزونی اور حکیم حسن گیلانی کو مامور کیا گیا تھا [4]

اس رصد گاہ کا سنہ تعمیر "تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ" میں ۸۱۲ھ بتایا گیا ہے اور مورخ لکھتا ہے کہ حکیم حسن گیلانی کی بے وقت موت کی وجہ سے یہ رصد گاہ نامکمل رہ گئی تھی [5]

فیروز شاہ بہمنی کئی زبانوں جیسے عربی، فارسی، ترکی، تلگو، کنڑی، مراہٹی، بنگالی اور گجراتی وغیرہ پر عبور رکھتا تھا عبد المجید صدیقی نے اپنی کتاب "بہمنی سلطنت" میں فیروز کی علمیت اور علم دوستی کی بڑی تعریف کی ہے [6] اور لکھتے ہیں کہ اس کی علم پروری اور شائستگی کی وجہ سے اس کے عہد میں سلطنت بہمنی کو چار چاند لگ گئے اور "گلبرگہ ودکن" میں علم وفضل کے دریا بہنے لگے۔ اس کے علمی شغف کی وجہ سے دکن میں بیشمار علماء جمع ہو گئے علماء کے لیے دن رات شاہی محلات کھلے رہتے۔

---

[1] محمد قاسم فرشتہ۔ (مترجم محمد فدا علی طالب)۔ تاریخ فرشتہ۔ جلد سوم۔ ص ۸۸

[2] محمد علی ساماتی (مترجم سید شاہ نذیر احمد قادری۔) صفحہ ۴۱ تا ۴۴

[3] ہارون خاں شیروانی (مترجم رحم علی الہاشمی)۔ دکن کے بہمنی سلاطین۔ ص ۱۱۷

[4] 〃 〃 〃 〃 〃

[5] ابو الفتح ضیاء الدین محمد (مترجم سہیل)۔ تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ۔ ص ۴۸

[6] عبد المجید صدیقی۔ بہمنی سلطنت۔ ص ۹۸

Marfat.com

علمی محفلوں میں شرکت کرنے کے علاوہ فیروز شاہ بہمنی طلبا کو درس بھی دیا کرتا تھا۔ ہفتے میں تین روز یعنی شنبہ، سہ شنبہ اور چہار شنبہ اس کے لیے مقرر کر دیے گئے تھے۔ فیروز کے استاد فضل اللہ انجو شیرازی عالم بے بدل سمجھے جاتے تھے۔ فیروز نے انھیں وکیل السلطنت بنا کر ملک نائب خطاب عطا کیا تھا [1]

فیروز نے فضل اللہ انجو کے مشورے سے شیعہ طریقے کے مطابق متعہ کیے تھے فرشتہ نے اپنی تاریخ میں اس کی تفصیل بیان کی ہے [2] اس نے شہر فیروز آباد کی بنا ڈالی تھی جو بھیما ندی کے کنارے واقع تھا اس میں ہر قوم اور مذہب کی آٹھ سو عورتیں موجود تھیں جن کی زبان کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کی ہم وطن خدمت گار عورتوں کو محل میں مختلف کاموں پر مامور کیا گیا تھا جس کا مقصد بقول نیل کنٹھ شاستری یہ تھا کہ اس مخصوص زبان کا ماحول بنا رہے [3]

۱۳۹۸ء میں ہری ہر ادوم نے جب رائچور کے دوآبے پر حملہ کر دیا تو فیروز نے بڑی بہادری سے اس کا مقابلہ کر کے اسے شکست دی تھی [4]

ابوالفتح ضیاء الدین محمد "تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ" میں فیروز شاہ بہمنی کو فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے دیورائے سے جنگ کی تھی۔ وہ اپنے ساتھ اسی ہزار سواروں کے ساتھ رائچور تک چڑھ آیا تھا۔ لڑائی کے دوران نرسنگھ میدان سے بھاگ نکلا۔ دیورائے نے فیروز شاہ بہمنی کو بارہ لاکھ ہن بطور تاوان جنگ ادا کیے [5]

فیروز شاہ بہمنی نے لطف اللہ سبزواری کو جو گلبرگہ میں نائب سلطنت تھے تیمور کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اس کے ہمراہ سفارتی وفد میں مولانا محمد تقی الدین

---

[1] غلام امام خان ترین ہجر - تاریخ رشید الدین خانی - ص ۱۷۲

[2] محمد قاسم فرشتہ (مترجم محمد فدا علی طالب) - تاریخ فرشتہ - جلد سوم ص ۹۸ - ۹۰

[3] نیل کنٹھ شاستری - ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا - ص ۲۴۶

[4] " " " ص ۲۴۷

[5] ابوالفتح ضیاء الدین محمد (مترجم سہیل) تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ - ص ۴۸

Marfat.com

شیرازی بھی تھے جو چھ ماہ تک تیمور کے ساتھ رہے تھے۔ تیمور نے فیروز شاہ کو" فرزند خیر خواہ" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا اور فیروز کے نام ایک فرمان بھی روانہ کیا تھا ہندوستان کی تاریخ میں معین الدین عقیل کے بیان کے مطابق سفارت بھیجنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ بہمنیوں ہی نے پہلے پہل عثمانیوں سے سفارتی تعلقات قایم کیے تھے [1]

بہمنی کلچر میں ہندوستانی اثرات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جنوب کے مسلمانوں نے فنون لطیفہ اور موسیقی کی روایات میں ہندو اثرات کو بڑی تیزی کے ساتھ قبول کیا تھا۔ دیورائے کی لڑکی سے فیروز شاہ بہمنی کی شادی نے مشترکہ کلچر کے فروغ میں یقیناً مدد دی ہوگی [2]" تاریخ محبوب السلاطین"، میں محمد حسین لکھتے ہیں کہ فیروز نے ہندو راجاؤں سے خوشگوار تعلقات قائم رکھے تھے اور رائے بیجانگر کی لڑکی سے فیروز نے شادی رچا کر باہمی ربط و یگانگت کے جذبے کو پروان چڑھایا تھا [3] "تاریخ محبوب السلاطین" کے اس بیان کی "تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ" سے تصدیق ہوتی ہے [4] ہندو تاجر بہمنی حکمرانوں کے لیے ارمز کے گھوڑے، سیلون کے ہاتھی اور چین کی مشک اور سمبورلا یا کرتے تھے۔ فیروز نے ہارون خان شیروانی کے الفاظ میں "بیرونی اثرات کا توڑ کرنے" ہندوؤں کو نظم و نسق کے کاموں میں شریک کر لیا تھا۔ دکنی تہذیب میں مقامی اثرات کا نفوذ اسی کا رد عمل ہے۔ ایک اور مورخ رقمطراز ہے فیروز کے عہد میں برہمنوں کو اہم عہدوں پر فائز کیا گیا تھا [5]" میڈیول انڈیا" میں بہمنی سلاطین کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے برہمنوں کو جلیل القدر عہدوں پر فائز کیا تھا اور یہ برہمن سرکاری زبان فارسی پر عبور رکھتے

---

[1] معین الدین عقیل۔ دکن اور ایران۔ ص ۲۱

[2] ہارون خاں شیروانی۔ بہمنی سلطنت۔ ص ۱۱۹

[3] محمد حسین۔ تاریخ محبوب السلاطین ص ۳۲۵

[4] ضیاء الدین محمد (مترجم سہیل) تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ ص ۴۵

[5] نیل کنٹھ شاستری۔ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ ص ۲۴۶

Marfat.com

تھے[1] ایس کے سنہا نے "میڈیویل ہسٹری آف دی دکن" میں بہمنی سلاطین کی وسیع النظری اور رواداری کو سراہا ہے اور لکھتے ہیں کہ حکومت میں وزارت: سپہ سالاری اور دوسرے ذمہ دار عہدوں پر برہمن اور دوسرے ہندو کارگزار تھے[2]

بہمنی طرز تعمیر ایرانی، "ہندو" اور "دہلوی" اسالیب کا امتزاج تھا جس کی بہترین مثال خود فیروز شاہ بہمنی کا مقبرہ ہے۔ پرسی براؤن (Percy Brown) نے "انڈین آرکی ٹکچر" میں بہمنیوں کے قلعے کی جو آج بھی شکستہ حالت میں گلبرگہ میں موجود ہے بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ قلعہ زیادہ وسیع اور کشادہ نہیں لیکن فوجی اغراض کے لحاظ سے بہت مضبوط اور مستحکم ہے اس کی چوڑی دیواریں چاروں طرف سے اندرونی حصے کی بخوبی حفاظت کر سکتی ہیں۔ اس کے دو دروازے فوجی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں[3] علمی ترقی کے علاوہ فیروز نے دوسرے تمدنی شعبوں کے فروغ کی طرف بھی خاص توجہ کی تھی اور اس کے شائستہ ذوق کی بدولت تہذیبی زندگی کے تمام شعبوں میں نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ فیروز شاہ بہمنی نے لباس، وضع قطع، کھانے پینے کے طریقوں اور اس کے لوازمات اور دوسرے ثقافتی مظاہر میں ایک نئی دلکشی اور رنگینی پیدا کر دی۔ نت نئی پوشاکیں تیار کروائیں اور دکن کی دستار اس کے عہد کی یادگار ہے۔ فیروز نے خود اپنے لیے مرصع دستار تیار کروائی تھی۔ شاہی دربار کی سجاوٹ اور آرائش و تزئین میں اس نے بڑے سلیقے اور خوش ذوقی کا اظہار کیا تھا[4] وہ ملک کے مختلف فرقوں کو محبت کے رشتے میں منسلک کرنا چاہتا تھا اور اس کی لسانی حکمت عملی بھی ان ہی بنیادوں پر قائم تھی فرشتہ تحریر کرتا ہے کہ ۸۰۹ھ (مطابق ۱۴۰۶ء) میں جب فیروز وجیا نگر کے راجا بکا دوم سے ملاقات کرنے گیا تھا تو اس سے فصیح کنڑی میں گفتگو کی تھی۔ ملک کے نظم و نسق میں بھی

---

[1] ایڈیٹرز، اے نظامی "میڈیویل انڈیا۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۲۶

[2] ایس کے سنہا۔ میڈیویل ہسٹری آف دی دکن۔ صفحہ ۱۳۶

[3] پرسی براؤن۔ انڈین آرکی ٹکچر۔ صفحہ ۶۸

[4] عبدالمجید صدیقی۔ بہمنی سلطنت۔ صفحہ ۹۹۔

Marfat.com

مقامی باشندے برابر کے شریک تھے چنانچہ مال اور محاسبی کے تمام محکمے اہل ہنود کی نگرانی میں دے دیے گئے تھے۔ دکن میں سب سے پہلے بہمنیوں نے اپنی وسیع النظری رواداری اور جامع حکمت عملی کی بدولت ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہم شیر وشکر کردیا تھا اور بعد میں بھی اسی بہمنی مسلک کی دکن میں پیروی ہوتی رہی۔[1] بہمنی سلاطین اور وجیانگر کے راجاؤں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم رہے اور ان دونوں مملکتوں کا تمدن ایک دوسرے کی سماجی زندگی پر اثر انداز ہوتا رہا یہ تمدنی اثر پذیری ایک طرفہ نہیں تھی بلکہ یہ ایک معاشرتی لین دین تھا اور مذہبی تصورات ان کے درمیان حائل نہیں ہو سکے تھے وہ جذباتی طور پر ایک دوسرے سے قریب ہوگئے تھے۔ پرتھال، مدگل کے ایک سنار کی خوبصورت لڑکی تھی جس کے حسن کا اطراف واکناف کے علاقوں میں بڑا چرچا تھا اور وہ موسیقی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی دیورایا جو اپنے بھائی راجہ بکارام کے بعد تخت نشین ہوا تھا، اس کی محبت میں مبتلا ہوگیا تھا اور اُسے وجیانگر بلا بھیجا تھا جس پر اس نے آنے سے انکار کردیا تھا۔ دیورایا جوش محبت میں پرتھال کو حاصل کرنے تنگبھدرا پار کرکے فیروز شاہ کے علاقہ مدگل میں داخل ہوگیا تھا۔ فیروز شاہ نے اس کی پیشرفت روک دی تھی اور دیورائے نے مجبور ہوکر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ راجا نے اپنی لڑکی سے فیروز شاہ کا بیاہ کیا تھا۔ اور تین دن تک ہندو اور مسلمان مل جل کر جشن مناتے رہے تھے۔ ایس، کے سنہا فیروز شاہ کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ وہ جنوب میں سیکولر حکومت کا بانی تھا[2] قدیم مورخین میں فرشتہ لکھتا ہے کہ فیروز برہمن پنڈتوں سے مباحثہ کرکے تبادلہ خیال کرتا تھا اور وہ ایک فراخ دل اور روادار بادشاہ تھا[3] منتخب اللباب کے مورخ خافی خان کا بیان ہے کہ فیروز نے ویدوں کا غائر مطالعہ کیا تھا[4]

---

[1] عبدالمجید صدیقی۔ بہمنی سلطنت۔ ص ۱

[2] ایس، کے، سنہا۔ میڈیویل ہسٹری آف دی دکن۔ جلد اول۔ ص ۱۴۷

[3] محمد قاسم فرشتہ (مترجم محمد فدا علی طالب)۔ تاریخ فرشتہ۔ جلد سوم۔ ص ۳۰۷

[4] خافی خان۔ منتخب اللباب۔ ص ۵۰

Marfat.com

فیروز شاہ کے عہد میں مختلف قسم کے سکّے رائج تھے۔ تانبے کے سکّوں کے وزن میں یکسانیت نہیں تھی۔ چند سکّے ستاون گرین کے دستیاب ہوتے ہیں اور چند تانبے کے سکّوں کا وزن بتیس (۳۲) گرین ہے اور اس کے برخلاف چوراسی گرین کے سکّے بھی ملتے ہیں۔ وزن کے اس اختلاف پر تبصرہ کرتے ہوئے پی ایل گپتا لکھتے ہیں کہ اس کا ایک سبب دارالضرب کی لاپرواہی ہو سکتا ہے اور اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جنگ کے دوران فیروز شاہ نے سکّوں کے وزن میں کمی کا حکم صادر کیا ہو اور سرکاری اغراض کے تحت سکّوں کا وزن گھٹا دیا گیا ہو [1]

فیروز شاہ نے سکّے پر پہلی بار لفظ "بہمنی" کندہ کروایا تھا۔ بعد کے حکمرانوں نے اپنے تانبے کے سکّوں پر اس کی تقلید کی [2]

محمد قاسم فرشتہ نے فیروز کا سنہ رحلت ۵ر شوال ۸۲۵ھ تحریر کیا ہے [3]

ایس نٹ راجن رقمطراز ہے کہ ۱۴۱۹ء میں پنگل کی لڑائی میں ناکامی کا فیروز کے دل پر بہت اثر ہوا تھا اور اسی سے دل شکستہ ہو کر فیروز نے انتقال کیا تھا [4]

حیدرآباد کے میوزیم میں بہمنی دور کے بعض سکّے محفوظ ہیں۔ "میڈیویل ہسٹری آف دی دکن" کے مورخ کا بیان ہے کہ علاء الدین حسن کے بعض سکّوں پر "یمین السلطنت ناصر امیر المومنین" کے الفاظ کندہ ہیں اس کے علاوہ "حامیِ دینِ متین" اور "رسول اللہ" کے الفاظ بھی کندہ نظر آتے ہیں۔ بہمنیوں نے اپنے عہد میں کرنسی کو باقاعدہ بنانے کی کوشش کی۔ گلبرگہ اور بیدر کے دارالضرب میں تانبے، چاندی اور سونے کے سکّے ڈھالے جاتے تھے [5]

فیروز شاہ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے حسن کے بجائے احمد شاہ تخت نشین

---

[1] پی ایل گپتا۔ باب ہفتم۔ میڈیویل دکن۔ ص ۴۳۴

[2] " " " ص ۴۳۶

[3] محمد قاسم فرشتہ (مترجم فدا علی طالب) تاریخ فرشتہ جلد سوم۔ ص ۱۱۸

[4] ایس نٹ راجن۔ پولٹیکل اینڈ کلچرل ہسٹری آف انڈیا حصہ اول۔ ص ۲۷۳

[5] ایس کے سنہا۔ میڈیویل ہسٹری آف دی دکن۔ جلد اول۔ ص ۱۵۳

Marfat.com

ہوا۔ یادگار سلطانی المعروف بہ آئینہ بیدر کے مصنف محمد سلطان لکھتے ہیں کہ فیروز احمد خان کا دشمن بن گیا تھا اور اس کے قتل کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکا تھا[1] فیروز نے اپنے بیٹے حسن کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا اور اسے تاج پیٹی، چھتری، سیاہ مخملی پردہ، ہاتھی اور تخت کے شاہی نشانات استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن بادشاہت احمد خان کے مقدر میں لکھی تھی۔ جب فیروز شاہ نے خواجہ بندہ نواز سے ولی عہد کے لیے دعا کرنے کی خواہش کی تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ اللہ نے سلطان کے بھائی احمد خان کو اس کا جانشین مقرر کر دیا ہے اس لیے اب دعا کرنا بے معنی ہے فیروز شاہ نے ناراض ہو کر انھیں کہلا بھیجا کہ آپ کی خانقاہ میں ہر وقت ہو حق کی دھوم رہتی ہے آپ شہر کے باہر قیام کریں تو مناسب ہے خواجہ بندہ نوازؒ نے یہاں کی سکونت ترک کر دی تھی اور اس جگہ فروکش ہو گئے تھے جہاں اب ان کا مزار واقع ہے[2] خواجہ بندہ نواز کو فیروز شاہ اور اس کی اقتدار کی مطلق پرواہ نہیں تھی۔ بادشاہ نے احمد خان اور اس کے بیٹے علاء الدین کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا تھا تاکہ وہ بادشاہت سے محروم رہے۔ مورخ دکن عبدالمجید صدیقی اپنے مضمون میں تحریر کرتے ہیں:۔

"ایک شام احمد خان اور اس کا بیٹا علاء الدین حضرت بندہ نواز کے پاس بھاگے آئے۔ اس زمانے میں حضرت مخدوم شہر کے باہر کھلے میدان میں مقیم تھے جہاں اب آپ کا مزار واقع ہے۔ جب بادشاہ سے مخالفت ٹھن گئی تو آپ کو بادشاہ کے حکم کے بموجب اپنی پرانی قیام گاہ چھوڑنی پڑی تھی۔ آپ فوراً قلعے کی خانقاہ سے اٹھ گئے اور شہر کے باہر چلے گئے یہیں احمد خان اور اس کا بیٹا آکر ملے۔ چٹپٹے کا وقت تھا..... دسترخوان چنا جا رہا تھا۔ حضرت نے ان دونوں پریشان حال شہزادوں کو دلاسہ دیا اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا جب یہ

---

[1] محمد سلطان۔ یادگار سلطانی المعروف بہ آئینہ بیدر۔ ص ۴۰

[2] احمد حسین۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کا نظام تصوف و سلوک۔ ص ۱۷

Marfat.com

کھانے سے فارغ ہو گئے تو اپنے سر کا شملہ اتار کر اس کے دو حصّے کیے ایک ٹکڑا، احمد خان کے سر پر اور دوسرا علاء الدین کے سر پر باندھ دیا۔ . . . . . حضرت بندہ نوازؒ اور احمد خان کی یہ صحبت بہت معنی خیز تھی اس کو تاریخ دکن کا ایک اہم واقعہ سمجھنا چاہیے"۔[1]

احمد شاہ بہمنی کے دور میں بھی علمی و تہذیبی ترقی جاری رہی اور تمدن و شائستگی کا بول بالا رہا۔ احمد شاہ نے اپنا پایۂ تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل کر دیا[2] گلبرگہ میں زیادہ بارش نہیں ہوتی اور یہاں کی زمین پتھریلی ہے اس گرم آب و ہوا کے مقابلے میں بیدر کا موسم نسبتاً معتدل اور خوشگوار ہے۔ بہمنی پایہ تخت کے بیدر منتقل ہونے کے سلسلے میں ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ کس طرح لومڑی نے کتے کا مقابلہ کر کے اسے شکست دی تھی اور کس طرح احمد شاہ اس سرزمین کی تاثیر سے متاثر ہوا تھا لیکن غلام یزدانی اپنی کتاب "بیدر" میں رقمطراز ہیں کہ اس کی حیثیت ایک قصّے سے زیادہ نہیں خطّہ بیدر دکن کے تینوں علاقوں یعنی تلنگانہ، کرناٹک اور مہاراشٹر کے دوسرے مقامات کے مقابلے میں سیاسی اعتبار سے بہتر تھا اور جاء وقوع کے لحاظ سے بھی مناسب و موزوں تھا اس لیے احمد شاہ نے گلبرگہ پر اس مقام کو ترجیح دی تھی[3] بیدر سطح زمین سے دو سو فیٹ بلند ہے اور اس پر حملہ کرنا نسبتاً مشکل تھا۔ اس کے علاوہ یہاں کی فرحت بخش آب و ہوا اور ثمر دار درختوں کی کثرت نے اس مقام کو دلکش بنا دیا ہے۔ محمد قاسم فرشتہ اور سید علی طباطبا مورخ "برہان ماثر" نے اپنی تواریخ میں یہ اشعار جو سرزمین بیدر سے متعلق ہیں نقل کیے ہیں ؎

زہر سو چشمۂ جو آب حیواں　　چراغ لالہ ہر جانب فروزاں

---

[1] عبدالمجید صدیقی۔ حضرت بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی و سماجی خدمات (مضمون) مشمولہ۔ رسالہ شہباز (ماہ نداردہ) ۱۹۶۴ء صـ۱۲

[2] ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا۔ صـ۱۴

[3] غلام یزدانی۔ بیدر اٹس ہسٹری اینڈ مانومنٹس باب دوم۔ صـ۵

Marfat.com

بنفشہ رستہ وسبزہ دمیدہ　　نسیم صبح حبیب گل دریدہ
شقایق بر یکی پا ایستادہ　　چوں ہر شاخ زمرد جام بادہ

محمد قاسم فرشتہ سرزمین بیدر کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ جب احمد شاہ حصار بیدر کے نواح میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ شکار کے لیے نکلا تو اس نے ایک وسیع میدان دیکھا جو" وسعت اور سرسبزی میں آسمان آسا" اور سلاقت اور صفائی میں" آفتاب منظر" اور زمین کی نشوونما میں "بہشت بریں" تھا۔ میدان پھولوں کی خوشبو سے بسا ہوا تھا۔ یہاں احمد شاہ کو ایک لومڑی نظر آئی جو کسی شکاری کے دام فریب میں پھنستی نہ تھی۔ بادشاہ نے چند شکاری کتے اس کی طرف دوڑائے۔ لومڑی کتوں پر حملہ آور ہوئی اس کی ہمت وجرأت دیکھ کر احمد شاہ نے اسے اس سرزمین کی تاثیر تصور کیا۔ فرشتہ بیدر کی سرزمین کو" خاک شنجرفی" کہتا ہے [1]

پی این چوپرا اور این سبرامنیم اپنی تاریخ میں پایہ تخت کی تبدیلی کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خواجہ بندہ نواز کی وفات سے احمد شاہ بہمنی بہت متاثر ہوا تھا دوسرے یہ کہ وہ قلعے کی اندرونی سازشوں سے بیزار ہو گیا تھا، تیسرے یہ کہ بیدر کی آب وہوا نسبتاً خوشگوار تھی اور چوتھے یہ کہ بیدر بہمنی سلطنت کے عین وسط میں واقع تھا۔ ان تمام امور کے پیش نظر احمد شاہ نے گلبرگہ سے اپنا پایہ تخت بیدر منتقل کیا تھا [2]

تاریخ رشید الدین خانی کے مورخ کا خیال ہے کہ اس جگہ قدیم زمانے میں ایک راجا نے حکومت کی تھی جس کا نام بیدر تھا یہ شہر اسی کے نام پر آباد ہوا تھا۔ راجہ بیدر سکندر اعظم کا ہم عصر تھا [3] غلام یزدانی بیدر کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں یہ شہر بہت قدیم ہے روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بیدر کا قدیم دارالسلطنت

---

[1] محمد قاسم فرشتہ (مترجم قدا علی طالب) تاریخ فرشتہ جلد سوم۔ صہ ۱۳۲
[2] پی این چوپرا و این سبرامنیم۔ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا جلد دوم۔ صہ ۶۹
[3] غلام امام خان ترین ہجر۔ تاریخ رشید الدین خانی۔ صہ ۱۷۶

Marfat.com

ودربھا تھا۔ ودربھا کا ذکر قدیم تلگو ادب میں موجود ہے یہاں کے حکمراں آندھرا راجگان بتائے جاتے ہیں۔ نل اور دمینتی کی رومانی داستان کا بھی تعلق اسی سر زمین سے بتایا جاتا ہے۔ دمینتی راجا بھیما کی بیٹی تھی جو کہ ودربھا کا حکمران تھا[1]۔ قلعہ بیدر کی سیر کرنے والے سیاح کو آج بھی نل اور دمینتی سے منسوب مقام دکھایا جاتا ہے۔ یہ مقام قلعہ بیدر کے قریب واقع ہے ۱۳۲۲ء میں جب الغ خاں نے ورنگل کا محاصرہ کرلیا تو وہ بیدر پر بھی حملہ آور ہوا۔ بیدر اس زمانے میں تلنگانہ کی سرحد پر واقع تھا۔ ۱۳۴۱ء میں محمد تغلق نے شہاب الدین ملتانی کو نصرت خاں کے خطاب سے سرفراز کیا اور بیدر اس کے حوالے کردیا تھا اور یہ شرط لگادی تھی کہ وہ ہر سال ایک کروڑ روپیہ لگان اس کے معاوضے میں ادا کرتا رہے کچھ عرصہ بعد قتلغ خان نے نصرت خان کو بے دخل کردیا۔ بیدر کی تاریخ میں اس کے بعد اس وقت انقلاب آیا جب امیر علی نے جو گلبرگہ اور بیدر کے علاقوں کا لگان وصول کرتا تھا بغاوت کردی اور حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر گلبرگہ اور بیدر پر قبضہ کرلیا محمد بن تغلق نے قتلغ خان کو بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ کیا ۱۳۴۷ء میں ظفر خاں نے جو ایک اہم سپہ سالار اور ایک صنّدی امیر تھا جس کا اصلی نام حسن تھا، بیدر سے بیس[2] ہزار سواروں کے ساتھ آگے بڑھا۔ ورنگل کے راجا نے اس کے مقابلے کے لیے ایک لشکر جرار روانہ کیا۔ اس مقابلے میں محمد بن تغلق کا داماد عماد الملک مارا گیا۔ اس لڑائی کے بعد ظفر خان کو نصیر الدین اسمٰعیل کی ایماء پر بادشاہ منتخب کیا گیا[2] اس نے چار خطّوں میں اپنی سلطنت تقسیم کردی تھی ان میں سے ایک خطّ بیدر بھی تھا۔ یہاں کے گورنر کو "اعظم ہمایون" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ احمد شاہ اور اس کے بعد کے بہمنی سلاطین نے بیدر میں حکومت کی اور فیروز شاہ بہمنی وہ آخری بادشاہ تھا جس کی راجدھانی گلبرگہ تھا۔ احمد شاہ ولی نے بیدر کو اپنا پایہ تخت بنایا اور حدود سلطنت میں توسیع کی۔ شمال میں مالوہ، مشرق میں

---

[1] غلام یزدانی۔ بیدر رائلس ہسٹری اینڈ مانومنٹس۔ ص ۳

[2] " " " ص ۵

Marfat.com

ورنگل، جنوب میں وجیانگر، شمالی مغرب میں گجرات تک اس کے حدود سلطنت پھیل گئے تھے اس کے عہد میں ایران سے شاہ نعمت اللہ کرمانی بیدر آئے تھے۔ احمد شاہ کا انتقال ۱۴۳۶ء میں ہوا[1] جب ۱۴۲۴ء میں بیدر میں نئی بساط سیاست بچھی تو شہر کی تزئین اور حکومت کے استحکام کے لیے نئے نئے منصوبے بنائے گئے۔ محلات کی تعمیر میں جدت طرازی سے کام لیا جانے لگا۔ تخت محل میں تخت فیروزہ جو اپنے زمانے کا ایک عجوبہ تھا بڑے سلیقے کے ساتھ رکھا جاتا تھا[2] ایرانی شاعر شیخ آذری متوفی ۸۶۶ھ/۱۴۶۲ء جو بہمنی سلطنت کا ملک الشعراء تھا اس محل کی خوبصورتی اور زیب و زینت کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ "بہمن نامہ" ناپید ہے اگر یہ کتاب دستبرد زمانہ سے بچ جاتی تو سلاطین بہمنیہ کے عہد کا ایک باب ہمیشہ کے لیے روشن ہو جاتا۔ "شرح الکافیہ"، "الارشاد"، اور "صرف و نحو" کے مصنف قاضی شہاب الدین عمر بھی احمد شاہ کے دور حکومت میں دولت آباد سے بیدر آئے تھے اس زمانے میں مولانا شمس الدین کرمانی بیدر میں مقیم تھے اور ان کے کشف و کرامات کا بڑا چرچا تھا[3] احمد شاہ نے شیخ حبیب اللہ جنیدی کو ان کے پاس روانہ کیا تھا اور ان کے ذریعے سے بیعت کا شرف حاصل کیا تھا۔ مولانا نے اپنے مکتوب میں احمد شاہ بہمنی کو "اعظم الشہان، شہاب الدین احمد شاہ ولی" تحریر کیا تھا اُس وقت سے احمد شاہ نے اپنے نام کے ساتھ "ولی" کا اضافہ کیا اور حکم دیا کہ سرکاری مراسلت میں اس کا یہی نام تحریر کیا جائے[4]

محمد ظہیر الدین اپنی کتاب "سلطان احمد شاہ بہمنی" میں لکھتے ہیں کہ تیرھویں اور چودھویں صدی میں بہمنیوں نے اہل حرفہ، فنکاروں اور معماروں کی بڑی قدردانی اور سرپرستی کی۔ اس عہد کے فن تعمیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس وقت

---

[1] غلام یزدانی۔ بیدر اٹس ہسٹری اینڈ مانومنٹس۔ ص ۶

[2] عبدالمجید صدیقی۔ بہمنی سلطنت۔ ص ۱۱۲

[3] عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ ص ۷۳

[4] معین الدین عقیل۔ دکن اور ایران۔ ص ۲۶

Marfat.com

ہندوستان میں جو فن تعمیر موجود تھا اسے بہمنیوں نے اپنے مخصوص فن میں شامل کر کے ایک ایسا نیا طرز پیدا کیا جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی [1] چوں کہ بیدر احمد شاہ ولی ہی نے آباد کیا تھا اس لیے بیدر کے فن تعمیر میں آرائشی اور جمالیاتی عنصر کے ساتھ ساتھ فاتحانہ شان بھی نمایاں ہے اور یہ طرز "بیدری فن تعمیر" کے نام سے موسوم ہوا [2] قلعہ بیدر کی تعمیر کو دیکھ کر یورپ کے قرون وسطیٰ کے فن تعمیر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں بادشاہ کی فنون لطیفہ سے غیر معمولی دلچسپی دیکھ کر ترکستان، قسطنطنیہ، بغداد اور عرب، روم اور شمالی ہند کے نامور کاریگر اس مرکز کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ فن تعمیر کے علاوہ احمد شاہ بہمنی نے فن نقاشی اور خوشنویسی کی بھی قدر دانی کی جس کی وجہ سے ان فنوں کو بھی اس زمانے میں غیر معمولی ترقی ہوئی بادشاہ کی خوش ذوقی اور حوصلہ افزائی کا شہرہ سن کر دور دراز ملکوں سے اہلِ فن بیدر پہنچ رہے تھے اس عہد میں ایسے نقاش بیدر میں موجود تھے جن کے کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں۔ مشہور نقاش شاکر اللہ قزوینی اور ممتاز خوش نویس ملا شرف الدین

احمد شاہ ولی بہمنی کی داد و دہش کے رہین منت تھے۔ بیدر میں بھی۔ بہمنی دور کی تعمیری یادگاریں موجود ہیں۔ عبدالمنان رقمطراز ہیں کہ احمد شاہ اول کے گنبد کے نقش و نگار اور کتبات بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ یہ خط نسخ، خط کوفی اور خط ثلث میں ہیں اس قسم کی نفیس نقاشی کی مثالیں مصر، عرب اور سمرقند کی عمارتوں ہی میں ملتی ہیں، ہندوستان میں یہ اس کا واحد نمونہ ہے احمد شاہ اول کے سمدھی شاہ خلیل اللہ کرمانی کے نام سے موسوم ایک عمارت جو تخت کرمانی کہلاتی ہے بیدر کی تاریخی عمارات میں سے ایک ہے [3] اس میں ایک بڑا ہال ہے جسے ستونوں کے ذریعے تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ غلام یزدانی نے "رپورٹ آن دی آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ حیدر آباد دکن" میں شاہ خلیل اللہ کرمانی کے مقبرے کی

---

[1] محمد ظہیر الدین۔ سلطان احمد شاہ بہمنی۔ ص ۱۵۳

[2] " " " " ص ۱۵۷

[3] عبدالمنان۔ فارسی ادب اور تمدن میں بہمنیوں کا حصہ (مضمون) مشمولہ معارف اعظم گڈھ۔ نمبر ۱۵۔ جلد ۱۰۲۔ ص ۳۶۷

Marfat.com

پچکاری اور سنگ موسٰی میں تراشے ہوئے بیل بوٹوں کی خوبصورتی اور تناسب کی بڑی تعریف کی ہے اس مقبرے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر گنبد نہیں اور اس پر مغیث شیرازی کی لکھی ہوئی خط ثلث کی تحریریں خطاطی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ [1]

احمد شاہ نے دوسرے ملکوں سے فنکاروں کو دکن آنے کی دعوت دی تھی اور بیدر میں ان کی بڑی قدر افزائی ہوتی تھی۔ بیرون ملک سے نامور خطاط بیدر چلے آئے تھے۔ اس کا ثبوت احمد شاہ ولی بہمنی کی گنبد کی تعمیر اور آرائش سے بھی ملتا ہے۔ گنبد کے اندرونی حصّے میں خطاطی (Calligraphy) کے بے نظیر نمونے موجود ہیں ان میں جہاں جامٹری کی مدد سے ڈزائن تیار کیے گئے ہیں وہیں بیل بوٹوں اور پھول پتوں کے ڈزائن بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ اتارے گئے ہیں گنبد کی اندرونی سمت کی نچلی دیواروں پر مشہور خوش نویس شاہ نعمت اللہ کا خط اپنی ساری دلفریبی کے ساتھ موجود ہے۔ متضاد رنگوں کے استعمال نے حیرت انگیز دلکشی اور خوبصورتی پیدا کردی ہے۔ رنگوں کا انتخاب اور ان کا برمحل استعمال بھی قابل تعریف ہے۔ فن کار کا احساس تناسب اور لکھت کو نمایاں کرنے پس منظر کا مناسب انداز میں استعمال قابل تعریف ہے۔ احمد شاہ کی گنبد میں خط طغرا کے بھی اعلا نمونے موجود ہیں۔ شکر اللہ قزوینی کا نام، ان میں تحریر کیا گیا ہے۔ شکر اللہ ایک بے مثل فنکار نظر آتا ہے۔ اس نے سنہری، سیاہ، سفید، ہلکے اور گہرے سبز رنگوں سے بڑی خوش اسلوبی اور سلیقے کے ساتھ کام لیا ہے۔ ایرانی فنکار کاشی کاری اینٹوں سے عمارتوں کی آرائش کا فن اپنے ساتھ بیدر لائے تھے [2] رنگین اور نظر فریب اینٹوں کا بیدر کی عمارتوں میں بہت زیادہ استعمال ہوا ہے۔ ان پر عبارتیں بھی کندہ کی جاتی تھیں جن سے اس عہد کی خطاطی کے طرز کا اندازہ ہوتا ہے۔ پرسی براؤن (Percy Brown) بیدر کی شاہی گنبدوں کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ان میں "تاتاری طرز تعمیر"

---

[1] غلام یزدانی۔ رپورٹ آن دی آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ حیدرآباد دکن۔ صہ ۵

[2] خواجہ محمد احمد۔ باب ششم۔ میڈیویل انڈیا۔ صہ ۴۱۵ اور ۴۱۶۔

Marfat.com

کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے [1]

پندرھویں صدی کے تیسری دہائی تک دکن میں تغلق طرز تعمیر کا اثر زائل ہونے لگا تھا اور مقامی و ایرانی اثرات اس کی جگہ لے چکے تھے۔ احمد شاہ ولی نے بقول محمد قاسم فرشتہ نو سال میں قلعہ بیدر کی تعمیر مکمل کروائی تھی اس کے بعد ایک بہت بڑے عوامی جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چودھویں صدی کے آخر اور پندرھویں صدی کی ابتدا میں دکن میں بارود کے استعمال کا آغاز ہوا تھا جس کی وجہ سے جنگ میں عمارتیں نیست و نابود ہو گئیں۔ قلعہ بیدر کی تہری خندق اور اس کے درمیان پہاڑی سلسلہ ایک غیر معمولی تعمیر معلوم ہوتی ہے۔ قلعہ کے باب الداخلہ پر جو "شیر دروازہ" کہلاتا ہے دو شیر اور ایک طلوع ہوتا ہوا سورج ہے جو کہ ایران کا "شاہی نشان" ہے۔ لیکن مقامی کاریگروں نے ببر کو شیر میں تبدیل کر دیا ہے۔ کیوں کہ دکن میں شیر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ زیڈ اے دیسائی لکھتے ہیں کہ یہ پتھروں کو تراش کر ایک ایسے طرز میں بنایا گیا ہے جو ہندو اور ایرانی طرز کا امتزاج ہے [2]

ہارون خان شیروانی "کلچرل ٹرنڈس اِن میڈیویل انڈیا" میں تحریر کرتے ہیں کہ بہمنی دور کے صرف دو تصویر چوں (Miniatures) کا پتہ چلا ہے جس میں ایک شیر ببر کی شکل ہے اور دوسری طلوع ہوتا ہوا سورج ہے جو بیدر میں تخت محل کے سامنے تیار کیا گیا تھا ان کا فنکار شہاب الدین احمد (۱۴۲۲ء-۱۴۳۶ء) تھا۔ مصوری میں "دکنی قلم" ایک طرز کا حامل تھا۔ مصوری کے دکنی قلم کو بعض وقت اورنگ زیب کی فتح دکن کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جو بقول ہارون خان شیروانی درست نہیں پرسی براؤن (Percy Brown) نے دکنی قلم کو "مغل طرز" کا "دکنی اسلوب" قرار دیا ہے جو حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ دکن کا پہلا تصویر چہ ایک مخطوطے میں محفوظ ہے اس کا نام "تعریف حسین شاہ پاشا دکن" ہے۔ یہ مخطوط پچاس (۴۹) صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں چودہ تصویر چے ہیں۔ یہ مخطوط "بھارت

---

[1] پرسی براؤن۔ انڈین آرکی ٹیکچر۔ ص ۷۰، ۷۱

[2] زیڈ اے دیسائی۔ باب چہارم۔ آرکی ٹیکچر۔ میڈیویل دکن۔ ص ۲۴۷

Marfat.com

اتہاس سمس ہودھایک منڈل" پونے کا مخزونہ ہے اس میں ۲۳ر جنوری ۱۵۶۵ء میں کرشنا کے شمال میں ہونے والی جنگ تالی کوٹہ کا ذکر کیا گیا ہے اس مخطوطے میں رزمیہ مرقعوں کے علاوہ گاؤں کے مناظر اور دربار حسین نظام شاہ کی تصویر کشی کی گئی ہے حسین نظام شاہ کو اس کے تخت پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ اس تصویر سے اس عہد کی تہذیبی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے[1]

دکن کی بہمنی حکومت چوں کہ دہلی کی سلطنت کے علی الرغم قائم ہوئی تھی اس لیے یہاں کے حکمرانوں نے دہلی کے بجائے ایران سے جذباتی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ دکنی عمارتوں پر شمالی ہند کے طرز تعمیر سے زیادہ ایران کے طرز تعمیر کا اثر ہے اس کی عمدہ مثال محمود گاوان کا مدرسہ ہے جو بقول غلام یزدانی ایران کی کسی دانش گاہ کا خاکہ معلوم ہوتا ہے[2]

"کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" میں مارشل کہتا ہے کہ "شرقی ایران کے طرز تعمیر میں روشنی اور سایہ (Light and Shade) کا جو لحاظ رکھا جاتا ہے وہ بھی اس میں موجود ہے اور یہ بہمنی دور کی دوسری عمارتوں کی طرح بہت بلند، وسیع اور مرعوب کن ہے[3] ہارون خان شیروانی" کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا" میں رقمطراز ہیں کہ ۱۴۷۲ء میں تعمیر کیے ہوئے اس بہمنی مدرسے کا طرز تعمیر منفرد ہے اور غلام یزدانی نے بھی اسے بہمنی طرز تعمیر کا نادر نمونہ تحریر کیا ہے۔ تخت محل، رنگین محل اور مدرسہ محمود گاوان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بہمنیوں نے جن ایرانی معماروں سے کام لیا تھا وہ اپنے وطن کے طرز تعمیر کی بیدر میں نقل کرتے رہے اور اس کی سب سے اچھی مثال مدرسہ محمود گاوان ہے۔ محمود گاوان خود جیلان سے آیا تھا۔ اور اپنے قیام دکن کے دوران میں بھی اس کا ربط ایران کی اہم شخصیتوں سے قائم تھا۔ اسلامی ممالک میں اس قسم کی درسگاہیں جن میں طلباء کے قیام اور رہائش

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا۔ صفحہ ۶

[2] غلام یزدانی۔ بیدر انس ہسٹری اینڈ مانوئمنٹس صفحہ ۲۴

[3] "

Marfat.com

کا بھی انتظام ہوتا تعمیر کی جاتی تھیں جیسے مراکش میں فیض رباط اور شمالی مغربی افریقہ میں بھی اسی قسم کی عمارتیں تیار کی گئی ہیں جن میں مدرسے قائم تھے مشہد کے قریب ۱۴۴۴ء میں ابو مظفر خان کے حکم سے اسی قسم کا رہائشی مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ دوسرا مشہور مدرسہ الغ بیگ کا تعمیر کیا ہوا ہے جو سمرقند میں ۸۲۸ھ میں بنایا گیا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ محمود گاوان بڑا عالم تھا اور ریاضی کا بے مثل ماہر تھا۔ وہ الغ بیگ کے مدرسے سے بخوبی واقف تھا اور ہر سال اپنے ان دوستوں وغیرہ کو تحائف بھیجا کرتا تھا جو خراسان میں مقیم تھے۔ مدرسہ محمود گاوان کی دیواریں مشرق سے مغرب تک دو سو بیالیس (۲۴۲) فیٹ لمبی ہیں اور شمال سے جنوب تک دو سو بیس ۲۲۰ فیٹ ہیں۔ محمود گاوان کا مدرسہ ۸۷۷ھ (مطابق ۱۴۷۲ء) میں تعمیر کیا گیا تھا حسب ذیل قطعہ تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے ؎

این مدرسہ رفیع و محمود نیا　　تعمیر شدہ است بہ اہل صفا
آثار قبول بین کہ تاریخش　　از آیت ابنا تقبل منّا

۸۷۷

۱۱۰۷ھ / ۱۶۹۶ء میں اس مدرسے کے سامنے کے آدھے حصے پر اور اسی طرح جنوبی حصے کی نصف عمارت پر بجلی گری تھی جس کی وجہ سے محمود گاوان کے اس تاریخی مدرسے کو بہت نقصان پہنچا تھا۔

مدرسہ محمود گاوان میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے لیے ایران و عراق کے علماء کو مدعو کیا گیا تھا۔ نورالدین جامی، جلال الدین دروانی، شیخ بدرالدین اور عبدالرحمٰن رواسی کے نام یہاں بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اتھانی سیس نیکبتن جو ۱۴۶۹ء سے ۱۴۷۴ء تک خواجہ یوسف خراسانی کے فرضی نام سے دکن میں سکونت پذیر تھا اس مدرسے کی بڑی تعریف کرتا ہے۔

ایس نٹ راجن میڈوٹیلر (Meadow Taylor) کے حوالے سے رقمطراز ہے کہ بہمنی دور کے قلعے فوجی نقطہ نظر سے اہم اور انتہائی مضبوط ہیں بہمنی دور کی فوجی عمارتیں یورپ کے قلعوں کی اور غیر فوجی عمارتیں ہندو اور ایرانی اثر کی ترجمان ہیں [1]

---

[1] ایس نٹ راجن۔ پولیٹیکل اینڈ کلچرل ہسٹری آف انڈیا حصہ اول ص ۲۷۵

Marfat.com

۱۴۲۴ء میں جب شہر بیدر بہمنی سلطنت کا پایہ تخت بنا تو احمد شاہ ولی بہمنی نے بیدر کے قدیم قلعہ کی طرف بطور خاص توجہ کی اور یہاں اس نے بقول فرشتہ "دارالامارہ" بنوایا۔ فرشتہ کے الفاظ "درجائے کہ قدیم الایام حصار بیدر بود دارالامارہ ساختند" سے پتہ چلتا ہے کہ قلعے کے اندر ہی احمد شاہ نے یہ عمارت تعمیر کروائی تھی اب اس کو تخت محل سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جنگی نقطہ نظر سے بیدر کا قلعہ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ کیوں کہ اس کی تین خندقیں ہیں جن کو عبور کرنا آسان نہیں۔ قلعہ بیدر کی اس خندقوں کے بارے میں غلام یزدانی رقمطراز ہیں کہ یہ بہت قدیم ہیں اور ان معماروں کی تیار کردہ ہیں جو پہاڑوں کو تراشنے کے فن سے واقف تھے یہی کام ایلورا میں کیا گیا تھا لیکن حصار کی دیوار اُن ترکی اور ایرانی کاریگروں نے بنائی تھی جنھیں بادشاہ نے باہر سے بلوایا تھا[1]

قلعہ بیدر کو سلطان محمد خلجی نے فوج کشی میں بہت نقصان پہنچایا تھا۔ بہمنی بادشاہوں نے اس کی دوبارہ تعمیر کی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ بارود اور توپ کے استعمال سے قلعہ بیدر تباہ ہوگیا تھا محمد شاہ بہمنی کے عہد میں اس کی تعمیر کی طرف بطور خاص توجہ کی گئی۔ غلام یزدانی کا خیال ہے کہ علی برید (۱۵۴۲ تا ۱۵۸۰) کے عہد میں قلعہ بیدر میں توپیں نصب کی گئی تھیں[2] توپوں کے استعمال نے قلعہ کی دیواروں کو مسمار کر دیا تھا۔ ۱۶۱۸ء میں ملک مرجان نے جو بیجاپور کا گورنر تھا قلعہ کی دیواروں اور ان کی بنیادوں کی از سرِ نو تعمیر کی اور تمام دروازوں پر لوہا چڑھا دیا تاکہ ان کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے اس نے ایک دروازے پر اپنا نام بھی کندہ کروایا تھا جو آج بھی باقی ہے۔ مختار خان الحسینی نے بھی قلعہ کی تعمیر سے دلچسپی لی تھی ۱۶۵۶ء میں اورنگ زیب نے گورنر دکن کی حیثیت سے جب بیدر کو مغل سلطنت میں ضم کر دیا تو قلعہ بیدر کی طرف کسی نے خاص توجہ نہیں کی اور محمد شاہ بہمنی کے عہد کی تعمیر برقرار رہی۔ وزیر محمود گاوان نے

---

[1] غلام یزدانی۔ بیدر اٹس ہسٹری اینڈ مانومنٹس ص ۲۸

[2] " " " " ص ۳۰

Marfat.com

اپنی نگرانی میں قلعہ کی تعمیر کا کام کروایا تھا اور جو دیواریں یا فصیل کے جو حصے کمزور ہو گئے تھے انھیں درست کر دیا تھا۔ یہ قلعہ ایک پہاڑ پر واقع ہے جو شمال مغرب کی طرف جھکا ہوا ہے۔ قلعہ میں جملہ سات دروازے ہیں جن میں سے دو کے نام تاریخ کے صفحات سے محو ہو چکے ہیں۔ یہ دروازے ماتنڈ دروازہ، کل مدمی دولزہ دہلی دروازہ، کلیلانی دروازہ اور کرناٹک دروازہ ہیں۔ ڈھائی سو گز کے فاصلے پر جنوب میں پٹیلا برج واقع ہے جس پر محمد قاسم کی توپ جو خاصی لمبی ہے رکھی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس پر ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) تحریر کیا ہوا ملتا ہے۔

علی بریدہ (۱۵۴۲ء - ۱۵۸۰ء) نے گنبد دروازے کے قریب رنگین محل تعمیر کروایا تھا اس محل کو علی بریدہ نے لکڑی کے نقشی کام سے آراستہ کیا تھا۔ چوبی نقش و نگار سے آراستہ کھمبے آج بھی موجود ہیں۔ دیواروں پر سیپیوں سے خوشنما گل بوٹے اور ڈزائن تیار کیے گئے ہیں۔ گہرے رنگ کے پس منظر پر سیپی یا صدف کا کام بہت خوشنما نظر آتا ہے۔ احمد شاہ ولی نے جب ۱۴۲۹ء میں قلعہ بیدر کی تعمیر کا کام شروع کیا تو رنگین محل کی بھی مرمت کروائی۔ محل کی اندرونی دیواروں پر رنگین چینی کا خوبصورت کام کیا گیا ہے گہرے نیلے رنگ پر سفید کام کے چند نمونے اب بھی باقی رہ گئے ہیں۔ رنگین محل میں جنوبی سمت کا ہال اور شہ نشین علی بریدہ کا تعمیر کردہ ہے۔ دیواروں پر دلکش بیل بوٹے اور دو بڑی کمانیں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔ اونچے باب الداخلہ پر یہ فارسی شعر خوبصورت خط میں تحریر کیا گیا جو گل کاری کے درمیان بہت دلکش نظر آتا ہے ؎

شاہ نشین چشم ما تکیہ گاہ خیال تو
جائے دعاست شاہِ من بی پہ مباد جائے تو

منذروں کی طرح کھڑکیوں کے چھجے تاروں کی شکل کے ہیں قصر اور ایوان میں رنگین ٹائیلوں یا اینٹوں کی گل کاری قابلِ دید ہے اور متضاد رنگوں کے استعمال سے فنکاروں نے بڑا اچھا تاثر پیدا کیا ہے۔ ان کے علاوہ بیل بوٹوں کے ڈزائن میں خطاطی کے نایاب نمونے موجود ہیں۔ غلام یزدانی نے رنگین محل کی تعمیر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس خوبصورت اور یادگار محل کو زیادہ

Marfat.com

وسیع اور کشادہ ہونا چاہیے تھا[1] رنگین محل سے متصل شاہی مطبخ ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ بھی محل یا اس کا ایک حصّہ ہوگا۔ ۱۶۱۹ء میں جب بیدر سلطنت عادل شاہیہ میں ضم ہوگیا تو ملک مرجان کو جو ابی سینا کا باشندہ تھا بیدر کا گورنر بنا دیا گیا وہ غالباً اسی محل میں قیام پذیر تھا۔ اندرونی باب الداخلہ پر ملک مرجان کا نام کندہ کیا گیا ہے۔

پرسی براؤن (Percy Brown) قلعہ بیدر کے بارے میں رقمطراز ہے کہ یہ ۱۴۲۵ء میں تعمیر کیا گیا تھا یہ پایہ تخت کے بدلے ہوئے طرز تعمیر کا ترجمان ہے[2] یہاں آب رسانی کا خاص انتظام تھا۔

عبدالمجید صدیقی "بہمنی سلطنت" میں بیدر کے قلعے کی تعریف کرتے ہوئے اس کو احمد شاہ بہمنی کی ذہانت کا آئینہ دار بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ قلعہ ۱۴۳۲ء میں شہر کے مغربی گوشے میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس کے اندرونی احاطے میں محلات تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ محلات بہت بلند اور بارونق تھے[3] بہمنیوں نے تعلقی روایات کو خیرباد کہہ کر نئے طرز تعمیر کی بنیاد ڈالی تھی جو "دکھنی طرز" کہلاتا تھا اس کا خاص معمار اور فنکار رفیع شمس قزوینی تھا۔ گلبرگہ کی جامع مسجد میں ایرانی طرزِ تعمیر کا عکس نظر آتا ہے اس کا کتبہ مولا رفیع شمس قزوین نے تیار کیا تھا اور یہ مسجد محمد اوّل کے زمانے میں ۱۳۶۷ء میں مکمل ہوئی تھی اس مسجد کا ڈزائن اسپین اور ترکی کی مسجدوں سے خاصی مشابہت رکھتا ہے خواجہ بندہ نواز کی گنبد ہند ایرانی طرز (Indo-Iran) کا نمونہ ہے۔ بہمنی طرز تعمیر کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ہارون خان شیروانی "کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا" میں لکھتے ہیں کہ کھڑکیاں کواڑ اور دوسری آرائشی تعمیر کے نقش ونگار سے ہند واثرات تعمیر نمایاں ہیں۔ بہمنی طرزِ تعمیر میں جہاں مقامی رجحانات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے وہیں محرابوں، طاقچوں اور دیگر تعمیری نمونوں

---

[1] غلام یزدانی۔ بیدر اٹس ہسٹری اینڈ مانومنٹس۔ ص ۶۸

[2] پرسی براؤن۔ انڈین آرکی کلچر۔ اسلامک پیریڈ چوتھا ایڈیشن ص ۶۸

[3] عبدالمجید صدیقی۔ بہمنی سلطنت۔ ص ۱۱

Marfat.com

میں ایرانی طرز کا پرتو موجود ہے[1] غلام یزدانی بیدر کے محلات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی بلند محرابیں بہت شاندار اور مرغوب کن ہیں و کار کی خوبصورت کھپریلوں سے آرائش کی گئی ہے اس کے "پاسنگ" میں منقش سیاہ دھاریاں" ہیں یہ کام اعلا ترین مذاق سلیم کی نشان دہی کرتا ہے[2] ترکش محل کی چھت پر فوارہ تھا۔

بہمنی دور کے فن تعمیر کے متعلق محمد عبدالمنان لکھتے ہیں کہ بہمنیوں کا عہد گلبرگہ تغلقی روایات کا پابند تھا جب بیدر پایہ تخت قرار دیا گیا تو ایک صدی کی مدت میں تغلقی روایات اور کاریگری، ایرانی تصورات، اشکال اور مقامی کاریگروں کی صناعی کی بناء پر اس میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔ "تغلقی طرز کے بھدے پن" سے "نجات" ملی اور "خاکون" میں حسن اور نفاست پیدا ہونے لگی۔ رنگین اور چمکدار کار کاشی نے جو ایرانیوں کا پسندیدہ طریقہ آرائش تھا، بیدر کی عمارتوں کو تجمل اور خوبصورتی عطا کی۔ مختلف شکلوں کی کمانیں تعمیر میں رائج ہوئیں بیضوی گنبدیں بنائی جانے لگیں اور رنگوں کے استعمال میں کثرت، تنوع اور تضاد کا خیال رکھا جانے لگا جس سے ڈزائن کے حسن اور نفاست میں اضافہ ہوا اس کے علاوہ رنگین اور منقش ٹائلوں سے عمارتوں کی تزئین و آرائش میں چار چاند لگ گئے۔ مینا کاری بھی اس دور کے طرز تعمیر کا خاص وصف ہے۔ علاوہ ازیں مقامی رنگ بھی عمارتوں اور فن تعمیر میں اپنی بہار دکھانے لگا۔ عمارت کے کونے، دروازوں کی چوکھٹیں اور بغلی دیواریں سنگ تراشی اور نفیس و نازک منبت کاری کی بہترین مثالیں پیش کرتی ہیں[3]

قلعہ کے اندر رنگین محل کے بعد ترکش محل اور اس کے سامنے شاہی حمام ہیں۔ اب یہاں آرکیالوجیکل سروے کا دفتر ہے۔ ترکش محل کے قریب سولہ کھم کی مسجد واقع ہے جو اس لیے زنانہ مسجد کہلاتی تھی کہ وہ ترکش محل کے زنانہ حصے سے متصل تھی۔

---

[1] ہارون خان شیروانی - کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا - ص ۱۴۲

[2] غلام یزدانی - بیدر - انشینٹ ہسٹری اینڈ مانومینٹس ص ۲۲۱

[3] محمد عبدالمنان - عہد بہمنیہ کا فن تعمیر - (مضمون) مشمولہ سب دس جون - ۱۹۷۰ء ص ۳ تا ۵

Marfat.com

ابتدا میں یہی بیدر کی مرکزی مسجد تصور کی جاتی تھی گویا وہ جامع مسجد بیدر تھی اور شاہی افراد خاندان یہیں نماز جمعہ ادا کرتے تھے جب ۱۶۵۶ء میں بیدر فتح ہوا تو اورنگ زیب نے اس مسجد میں خطبہ پڑھنے کا ارادہ کیا تھا تاکہ اس نو تسخیر شہر میں شاہ جہاں کے نام کا خطبہ پڑھ کر مغل سلطنت کے قبضے کا اعلان کیا جا سکے اور نئے مقبوضہ علاقے میں سلاطین مغلیہ کے نام کا سکہ بیٹھ جائے۔ اس وقت مورخ محمد صالح اورنگ زیب کے ساتھ تھا[1] وہ اپنی تصنیف "عمل صالح" میں رقمطراز ہے کہ مسجد سولہ کھم دو سو سال قدیم ہے اور بہمنی سلاطین کی تعمیری یادگار ہے۔ خافی خان لکھتا ہے کہ یہ مسجد "خان جہان" کے دور میں تعمیر کی گئی تھی۔ خان جہاں کا خطاب بہمنی دور میں ایک سے زائد وزراء کو دیا گیا تھا اس لیے خافی خان کا بیان مبہم محسوس ہوتا ہے۔ حیدرآباد کے آثار قدیمہ کے کارکنوں کو مسجد کی صفائی کے دوران ایک منہدمہ حصے سے ایک کتبہ دستیاب ہوا تھا جس پر سے

اندر زمنِ خلیفہ یزدانی سلطان محمد کہ ندارد ثانی
روز ہشتصد و بیست و ہفت این مسجد را شد بانی خیر قبلۂ سلطانی

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کا شہزادہ محمد دارالسلطنت کے بیدر منتقل ہونے سے قبل بیدر کا گورنر تھا اس لیے یہ مسجد بقول غلام یزدانی بیدر کی قدیم ترین اسلامی عمارتوں میں سے ہے[2] نماز کا دالان دو سو چورانوے فیٹ طویل اور اسی فیٹ ۹ راپخ چوڑا ہے۔ اس مسجد کے پلان کو سولہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور اس کا ڈزائن جیامٹری پر مبنی ہے۔ یہ مسجد یورپ کے گوتھک کلیساؤں کی یاد دلاتی ہے۔ چھت میں جو کھڑکیاں ہیں وہ اندرونی حصے کی روشنی میں اضافہ کرتی ہیں اور ان سے مسجد کے اندرونی حصے میں ہوا بھی آتی رہتی ہے۔ اس مسجد میں فیتہ جیسے ڈزائن سے سجاوٹ کی زیڈ اے دیسائی نے بہت تعریف کی ہے۔ مسجد کی محرابوں کو دو ہاتھیوں کی اٹھی ہوئی سونڈوں سے سہارا دیا گیا ہے جو مقامی طرز فکر

---

[1] غلام یزدانی۔ بیدر انشنٹ ہسٹری اینڈ مانومنٹس۔ ص ۵۳

[2] " " " ص ۵۵

Marfat.com

اور طرزِ تعمیر کا ترجمان ہے [1]۔

گگن محل بہمنی بادشاہوں کا تعمیر کردہ تھا اور اسی بنیادوں پر ترکش محل بنایا گیا تھا۔ دیوان عام پر اوپری منزل میں جالی لگائی گئی تھی جو امتدادِ زمانہ کے باوجود آج بھی باقی ہے۔ اس کی وجہ سے اسے جالی محل سے بھی موسوم کیا جاتا تھا۔ ایک صدی بعد بیجاپور کا آثار محل اسی طرز پر تعمیر کیا گیا تھا۔ کھمبوں اور چھتوں کا انداز بھی وہی ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ تخت فیروزہ تخت محل میں نہیں بلکہ اس محل میں رکھا جاتا تھا [2] اور یہیں بہمنی بادشاہوں کی تخت نشینی اور تاجپوشی کی جاتی تھی۔ اس دالان سے متصل بادشاہ کی نشست کا خاص کمرہ تھا جس کا فرش نہایت عمدہ موزاک سے جو حاشیہ دار ہے تیار کیا گیا ہے۔ باڈر یا حاشیہ سنگ سیاہ سے بڑی نفاست کے ساتھ تیار کیا گیا ہے۔ زیڈ اے دیسائی نے اس قسم کی تزئین کو بہت سراہا ہے [3]۔

تخت محل دوسرے بہمنی محلات کے مقابلے میں بعد کی تعمیر ہے۔ "برہان مائر" میں احمد شاہ ولی کے عہد کی مختلف عمارتوں کا ذکر ہے لیکن اس کا ذکر نہیں ہے۔ ایک وسیع و عریض چبوترے پر تخت کی جگہ بنائی گئی ہے اور نیچے درباریوں کی نشست کے لیے صاف اور مسطح فرش آج بھی اچھی حالت میں موجود ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تخت محل کی تعمیر کرتے وقت حفاظت کے مقصد کو بطور خاص پیش نظر رکھا گیا تھا یہ ایسی جگہ ہے کہ جس پر کسی سمت سے براہِ راست گولہ باری نہیں کی جا سکتی اطراف میں مضبوط دیواریں ہیں۔ آذری نے اس کی مضبوطی کی بڑی تعریف کی تھی۔ دیواروں پر رنگین چینی کا کام انتہائی دیدہ زیب اور خوبصورت نظر آتا ہے۔ یہ دربار شمالاً جنوباً دو سو چھ فیٹ اور شرقاً غرباً ایک سو پینتالیس فیٹ ہے۔ جہاں دکھایا جاتا ہے کہ تخت رکھا جاتا تھا وہ حصّہ اب مکمل طور پر منہدم ہو چکا ہے اس کے پیچھے دونوں جانب رہائش کے کمرے بنے ہوئے ہیں اب صرف ان کے آثار باقی رہ

---

[1] زیڈ اے دیسائی۔ باب چہارم دی آرکی ٹیکچر میڈیویل دکن۔ صـ ۲۸۔

[2] غلام یزدانی۔ بیدر اٹس ہسٹری اینڈ مانومنٹس صـ ۶۴

[3] " " " صـ ۲۴

Marfat.com

گئے ہیں۔ پیچھے کے دالان میں وسیع حوض تعمیر کیا گیا تھا جو تیرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور بادشاہ کی بیگمات جھروکوں سے یہ نظارہ دیکھتی تھیں۔ زیڈاے دیسائی نے بہمنی دور کی عمارتوں میں ہندو طرزِ تعمیر کے اثر و نفوذ کا ذکر کیا ہے [1] اور بقول غلام یزدانی تخت محل کے بعض کمروں اور دالانوں میں "ہندو ڈزائین" بنے ہوئے ہیں پھول پتیوں اور زنجیر کے پٹرن اور کمل کے پھولوں کے ڈزائن اور نقش اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ تخت محل کے دیواروں پر جو رنگین چینی کا کام کیا گیا ہے اس میں نیلا رنگ سب سے غالب رنگ نظر آتا ہے جس کے ہلکے اور گہرے شیڈ دکھائی دیتے ہیں اور ان سے فنکارانہ انداز میں کام لیا گیا ہے۔ سبز رنگ سے بھی گل بوٹے تیار کیے گئے ہیں ان کے علاوہ سفید، زرد، سُرخ اور سیاہ رنگ بھی ڈزائن میں بڑی خوبی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ سرخ رنگ کا بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔ پلاسٹر پر جو رنگ آمیزی کی گئی ہے یا جو نمونے اتارے گئے ہیں ان میں سنہری رنگ با افراط استعمال ہوا ہے۔ انھیں ایرانی معماروں اور انجنیروں نے تیار کیا تھا۔

تخت محل (۸۳۶ھ/۱۴۳۲ء) میں کارکاشی کے نمونے اب بھی کھنڈرات میں جا بجا اپنی جھلک دکھاتے رہتے ہیں۔ یہ عمارت پوقلموں رنگوں کی روغن دار اینٹوں سے تیار کی گئی تھی۔ روغن کی چمک اور جلا امتدادِ زمانہ کے باوجود اب بھی باقی ہے۔ یہاں سے کٹورے مشقاب مرتبان اور دوسرے برتنوں کے جو ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ بہمنی دور میں چینی کے برتنوں کی بڑی قدر و قیمت اور مانگ تھی۔ غلام یزدانی لکھتے ہیں کہ یہ برتن ایرانی تاجروں کے ذریعہ سے دکن پہنچے تھے۔ اس کے علاوہ سمندری راستے سے براہِ راست بھی یہ سامان درآمد کیا جاتا تھا۔ محمود گاوان نے محمد شاہ سوم کو جو گرانقدر تحائف پیش کیے تھے ان میں کئی قیمتی اور نایاب ڈشیں بھی تھیں جو چین کے پورسلین سے تیار کی گئی تھیں [2]

---

[1] زیڈ۔ اے دیسائی۔ باب چہارم۔ دی آرکی ٹکچر۔ میڈیویل دکن۔ ص ۲۴۵

[2] غلام یزدانی۔ بیدر اٹس ہسٹری اینڈ مانومنٹس۔ ص ۲۰

Marfat.com

شہر بیدر کے پانچ دروازے شاہ گنج دروازہ، فتح دروازہ، منکلا بیٹ دروازہ دلہن دروازہ اور تغلق دروازہ آج بھی موجود ہیں چوکھنڈی حضرت خلیل اللہ نوبت خانہ تخت کرمانی اور بہمنی بادشاہوں کے گنبد بھی بہمنی دور کی نشانیاں ہیں۔ خلیل اللہ کرمانی احمد شاہ ولی بہمنی کی دعوت پر ۸۳۰ھ/۱۴۳۱ء میں بیدر آئے تھے تخت کرمانی انھیں سے منسوب ہے۔ درمیان میں ایک خوبصورت کمان ہے جس کی آرائش وزیبائش پر خاص توجہ کی گئی ہے اس کی وضع عہد وسطیٰ کے دکنی مزاروں سے مشابہت رکھتی ہے۔ کمان کے اوپری حصّے پر جو تزئین وآرائش کی گئی ہے وہ بقول غلام یزدانی ہندو طرز کی سجاوٹ ہے[1] اس قسم کی تعمیراتی تزئین کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کے آرکیٹکٹ ایرانی ہونے کے باوجود معمار چوں کہ مقامی تھے اس لیے انھوں نے اس طرز کو فطرتاً اپنایا ہے۔ کمان بیل بوٹوں کے نمونوں سے سجائی گئی ہے اور ان کے درمیان آیات لکھی گئی ہیں جو خط طغرا میں ہیں۔ درمیانی دالان میں تخت کرمانی یعنی خلیل اللہ کرمانی کی گدی رکھی گئی ہے۔

بہمنی سلاطین کے مقبرے اشٹور میں ہیں جو شہر بیدر سے ایک میل چھ فرنگ دور واقع ہے۔ یہ آٹھ قبریں ہیں احمد شاہ ولی بہمنی کا گنبد بہت شاندار اور با رونق ہے[2] اس میں لفظ "علی" کو چار مرتبہ مختلف انداز میں لکھ کر جو ڈزائن بنایا گیا ہے، وہ بے مثل خطاطی کی یادگار ہے۔

زیڈ اے دیسائی رقمطراز ہیں کہ گلبرگہ کی عمارتوں میں تغلقی طرز کا اثر نظر آتا ہے[3] لیکن بیدر کی عمارتوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ ان عمارتوں کی کمانوں کا مخصوص انداز جن کا اوپری حصّہ نصف دائر نہیں بلکہ نصف مثلث نما ہے اور نکونے ڈھلوان چھجّے بیدر کی عمارتوں کے طرز تعمیر کی ایسی خصوصیات ہیں جو ایرانی طرز تعمیر سے اثر پذیری کی غماز ہیں۔ فیروز شاہ کے دور ہی سے تعمیر کا تغلقی اسٹائل

---

[1] غلام یزدانی۔ بیدر اٹس ہسٹری اینڈ مانومنٹس۔ ص ۱۰۱

[2] " " " " ص ۱۱۵

[3] زیڈ اے دیسائی۔ باب چہارم۔ آرکی ٹکچر۔ میڈیویل دکن ص ۲۴۵

Marfat.com

بیرونی محرکات کے زیر اثر تبدیلی کی زد میں آچکا تھا۔ سرجان مارشل کا خیال ہے کہ یہ طرزِ تعمیر بلند کمانیں اور وسیع گنبدیں عہد وسطیٰ کی قدیم دنیا میں بے نظیر اور بے مثل نظر آتی ہیں ہندو طرز کی منبت کاری دروازوں کی چوکٹوں اور چھجوں پر نمایاں ہے[1] رنگوں کے امتزاج اور کلر اسکیم نے احمد شاہ ولی کی گنبد کے آرائشی کام کو بے حد نظر فریب اور خوبصورت بنا دیا ہے۔ درمیان میں چھوٹا سا باب الداخلہ بقول زیڈ اے دیسائی ایرانی اثرات کا رہین منت معلوم ہوتا ہے۔ یہ پوری گنبد ایرانی طرز تعمیر کی یاد دلاتی ہے اس میں استعمال ہونے والے رنگ بہت شوخ اور گہرے ہیں۔ سنہری کام ایرانی طرز میں سیاہ حاشیے یا پس منظر کے ساتھ یا ہلکے رنگ کو گہرے رنگ کے پس منظر میں ابھارنے کا رجحان بھی ایرانی اثرات کو ظاہر کرتا ہے[2] اگر احمد شاہ ولی کی گنبد خط ثلث، خط کوفی، خط نسخ اور خط طغرا کے خوبصورت نمونوں سے آراستہ ہے تو محمود گاوان کا مدرسہ خط ثلث کی بے مثل یادگاریں پیش کرتا ہے۔ رنگین چینی کے ٹکڑوں سے بڑے فنکارانہ انداز میں کام لیا گیا ہے۔ اس سہ منزلہ عمارت کو رنگین چینی کے دیدہ زیب کام نے دلفریب بنایا ہے۔ عمارت کی پیشانی پر افقی طور پر خط ثلث لکھا گیا ہے زرد حروف کے ٹکڑے جو چینی کے ہیں نیلے پس منظر میں جڑ دیے گئے ہیں۔ یہ حروف خاصے بڑے ہیں اور دور سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ اس پر قرآن کی ایک آیت لکھی گئی ہے۔ اس دور کی خطاطی کے دو خوبصورت نمونے جو کاغذ پر موجود ہیں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان کا ذکر ہارون خان شیروانی نے اپنی کتاب "محمود گاوان دی گریٹ بہمنی وزیر" میں کیا ہے۔ یہ دستاویز خط ثلث میں ہے۔ اور اس پر محمود گاوان کی مہر بھی ثبت ہے۔ دوسری دستاویز بھی خط ثلث ہی میں ہے۔ بیدر کے دارالضرب میں جو سکے ڈھالے گئے ہیں ان پر کندہ کیا ہوا خط خاصا ترقی یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ فیروز شاہ بہمنی نے ایک مستطیل وضع کا سکہ جاری کیا تھا لیکن بقول راجا ریڈی وسوریا نارائن ریڈی

---

[1] زیڈ اے دیسائی۔ باب چہارم۔ آرکی ٹیکچر۔ میڈیویل دکن۔ ص ۲۴۵

[2] " " ص ۲۴۹

Marfat.com

دور مابعد کے سکّوں پر جو بیدر میں ڈھالے گئے تھے سنہ اجرا رکندہ کیا گیا ہے جو سکّے کے چہرے (obverse) پر ہے۔ صرف محمد شاہ کے سکّوں پر عربی اعداد میں سنہ لکھا گیا ہے۔ بہمنی سکّوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان پر بادشاہ کے نام کے ساتھ اس کے باپ کا نام بھی کندہ کیا ہوا ملتا ہے۔ ان کی مدد سے بہمنی بادشاہوں کے شجرے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بہمنی سکّوں کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان پر بادشاہ کے نام کے علاوہ اس کے شاہی خطابات بھی کندہ کیے ہوئے ملتے ہیں۔ چند بہمنی سکّے اس سے عاری نظر آتے ہیں [1]

احمد شاہ کے جانشین علاء الدین ثانی کے عہد میں سلطنت میں کچھ توسیع ضروری ہوئی۔ اس نے عماد الملک غوری کو جو خاندان بہمنیہ کا قدیم نمک خوار تھا امیر الامراء مقرر کیا اور بقول محمد قاسم فرشتہ محمد خان اور خواجہ جہان کو بیجانگر کے راجا سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔ کیوں کہ اس نے پانچ سال سے خراج ادا نہیں کیا تھا [2]۔ بیجانگر کا راجا اس غیر متوقع حملے سے پریشان ہو گیا اور بیس ہاتھی اور آٹھ لاکھ ہون اور دو سو رقاصہ کنیزیں اور قیمتی تحائف شاہزادہ محمد خان کی خدمت میں روانہ کیے ۸۴۷ھ میں راجا دیو رائے نے دریائے تہمندرا کو عبور کر کے قلعہ مدگل فتح کر لیا اور اپنے بیٹوں کو رائچور اور نیکا پور روانہ کر دیا۔ جب یہ خبر علاء الدین ثانی نے سنی تو اس نے تلنگانہ، دولت آباد اور بیجاپور کی افواج کو بیدر پہنچنے کا حکم دیا اور پچاس ہزار سواروں اور ساٹھ ہزار پیادوں کا لشکر تیار کیا دیو رائے مدگل کے قلعہ میں محصور ہو گیا گھمسان کی لڑائی کے بعد راجا کا بڑا بیٹا حسن بصری کے تیر سے مارا گیا اور فخر الملک دہلوی اور اس کا بھائی گرفتار ہو کر دیو رائے کے سامنے پیش کیے گئے بالآخر اس شرط پر کہ بہمنی بادشاہ بیجانگر کے علاقوں پر حملہ نہیں کرے گا انھیں رہا کر دیا گیا [3] فرشتہ علاء الدین ثانی کی تعریف کرتے

---

[1] راجا ریڈی سوریا نارائن ریڈی۔ کاپر کائنس آف دی بہمنیز۔ ص ۳

[2] محمد قاسم فرشتہ (مترجم محمد فدا علی طالب) تاریخ فرشتہ۔ جلد سوم ص ۱۴۲

[3] 〃 〃 〃 ص ۱۴۹

Marfat.com

ہوئے کہتا ہے کہ اس نے ملک میں منشیات اور شراب نوشی کو ممنوع قرار دیا تھا۔ اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں لیکن کچھ عرصہ بعد وہ عیش و عشرت میں مشغول رہنے لگا تھا ۸۵۵ھ میں شیخ آذری نے بادشاہ کو ایک نصیحت آمیز خط لکھا۔ وہ زمانۂ شہزادگی میں علاء الدین کا خیر خواہ اور اس کا مرشد تھا بادشاہ نے مئے نوشی سے توبہ کر لی اور راہ راست پر آگیا۔ ۸۶۰ھ میں جب جلال خان نے بغاوت کی تو خواجہ محمود گاوان کو اس کی سرکوبی کے لیے ایک ہزاری منصبدار بنا کر روانہ کیا گیا۔ اور خود پالکی میں بیٹھ کر بیجاپور روانہ ہوا اور سلطان محمد خلجی سے جنگ کے لیے ماہور کے جنگل میں قیام پذیر ہوا۔ جب سلطان محمود خلجی کو یہ اطلاع ملی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

"تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ" کا مورخ کہتا ہے کہ علاء الدین نے ۸۶۲ھ میں وفات پائی تھی[1] فرشتہ عارضہ درد پا کو موت کا سبب قرار دیتا ہے۔ ضیاء الدین محمد کا بیان ہے کہ علاء الدین نے تئیس سال حکومت کی اور اس کے بعد سلطنت میں زوال کے آثار پیدا ہونے لگے۔

محمود گاوان کے زمانہ وزارت میں ایران سے بہمنی سلطنت کے سفارتی تعلقات قایم تھے ایران کے علاوہ مصر اور ترکی سے بھی بہمنی بادشاہوں کے سفارتی تعلقات تھے۔ ابو سعید گورگان اور سلطان محمد مراد سے محمود گاوان کی راست مراسلت تھی اور قاصد آتے جاتے رہتے تھے۔ محمود گاوان بہمنی سلطنت کے ایک معتمد وزیر کی حیثیت سے مراسلے بھیجا کرتا تھا چنانچہ "ریاض الانشاء" میں شاہ گیلان، وزیر گیلان اور دوسرے عمائدین گیلان کے نام بھی محمود گاوان کے خطوط محفوظ ہیں۔

اس وقت بیدر علماء اور شعراء کا مرکز بنا ہوا تھا عبدالکریم ہمدانی ایک عرصہ تک محمود گاوان کے ساتھ رہا مشہور شاعر سامعی محمود گاوان کے مصاحبوں میں سے تھا۔ جب محمود گاوان نے بیدر میں اپنا مدرسہ بنوایا تو سامعی نے تاریخی

---

[1] ضیاء الدین محمد۔ تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ۔ ص۔

Marfat.com

قطعہ کہا تھا۔ ملا نظیری کو محمود گاوان ہی نے ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ مشہور علماء سلامت اللہ اوحدی اور شمس الدین سامی ان کے خاص مصاحب تھے۔ محمود گاوان کے آخری زمانے میں عبدالعزیز بن محمود طوسی دکن تشریف لائے تھے۔ محمود گاوان نے مولانا جامی کو بھی دکن آنے کی دعوت دی تھی۔

مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والے نو واردوں میں کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا جس کی وجہ سے سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔

ہمایوں ایک ظالم و جابر بادشاہ تھا۔ "تاریخ رشید الدین خانی" میں اس کے نت نئے مظالم کی تفصیل پیش کرتے ہوئے مورخ نے لکھا ہے کہ "سلطان کمال مردم آزار تھا۔ اقسام کی ایذائیں بندگانِ خدا کو دیتا تھا لکھا ہے کہ ستم اس کا اس درجے کو پہنچا تھا کہ حجاج ظالم اس کی نسبت نوشیرواں عادل تھا"[1] اس کے عہد میں محمود گاوان جو تجارت کی غرض سے بیدر آیا تھا سرلشکر مقرر ہوا تھا۔ محمد فرشتہ کا بیان ہے کہ ہمایوں نے اپنے والد کی وصیت کے مطابق محمود گاوان کو جو خاندان سلاطین سے تھا ملک التجار کے خطاب سے سرفراز کیا تھا اس کے علاوہ وکیل شاہی اور طرفدار بیجاپور مقرر کیا تھا[2] عماد الملک غوری کے بھتیجے کو نظام الملک کے خطاب سے نوازا تھا اور اسے ایک ہزاری منصب عطا کر کے تلنگانہ کے علاقے بطور جاگیر عطا کیے تھے۔ جلال خان کا بیٹا سکندر خان جو تلنگانہ کا جاگیردار بننا چاہتا تھا بہت رنجیدہ ہوگیا اور اپنے باپ کے پاس نلگنڈہ چلا گیا اپنے باپ کی مدد سے فوج جمع کی ہمایوں نے حاکم برار کو جو مبارکباد دینے حاضر ہوا تھا یہ بغاوت فرو کرنے پر مامور کیا۔ کچھ عرصہ بعد خود ہمایوں نلگنڈہ کی طرف روانہ ہوا۔ ایک رات سکندر خان کے لشکر نے شبخون مارا اور شاہی لشکر کو زبردست نقصان پہنچایا۔ جب سکندر خان اور ہمایوں بہمنی کے درمیان میدان جنگ میں لڑائی شروع ہوئی تو دونوں طرف سے برابر

---

[1] غلام امام خان ترین ہجر۔ تاریخ رشید الدین خانی۔ ص ۱۷۹

[2] محمد قاسم فرشتہ (مترجم محمد فدا علی طالب)۔ تاریخ فرشتہ جلد سوم ص ۱۶۱

Marfat.com

کے حملے ہونے لگے۔ ملک التجار محمود گاوان نے غیر متوقع طور پر بیجاپور کے لشکر کے ساتھ بیمتہ پر حملہ کر دیا اور اسی طرح خواجہ جہان نے تلنگانہ کی فوج کے ساتھ میسرہ پر ہلہ بول دیا جس سے سکندر خان سراسیمہ ہو گیا۔ ہمایون کے مست ہاتھی نے سکندر خان کو اپنی سونڈ میں لپیٹ کر زمین پر پٹک دیا اور وہ ہلاک ہو گیا محمود گاوان نے قلعہ نلگنڈہ کا محاصرہ کر کے جلال خان کو شکست دی۔

ہمایون کے عہد میں دوسری جنگیں بھی ہوئیں۔ دیورکنڈہ پر بہمنی افواج نے حملہ کیا۔ تو تلنگانہ والوں نے اڑیسہ کے راجا سے مدد طلب کی جس نے جنگی ہاتھی اور فوج روانہ کی۔ اور بہمنی لشکر پسپا ہونے لگا۔ خواجہ جہان ترک اور نظام الملک غوری جان بچا کر نکلے اور ہمایوں سے سارا واقعہ بیان کیا خواجہ جہان نے دروغ گوئی سے کام لے کر شکست کا ذمہ دار نظام الملک کو قرار دیا جس سے ہمایوں بہت ناراض ہوا۔ نظام الملک نے محمود مالوی کے یہاں پناہ لی۔ ہمایوں نے دیورکنڈہ پر فوج کشی کر دی تھی کہ دفعتاً احمد آباد سے خبر آئی کہ یوسف ترک کچل نے شہزادہ حسن اور شاہ حبیب اللہ کو زندان سے باہر نکالا ہے اور سب بیدر پہنچ گئے ہیں ملک التجار محمود گاوان کو وہیں چھوڑ کر ہمایوں نے بیدر کا رخ کیا اور جمادی الآخر ۸۶۴ھ کو بیدر روانہ ہو گیا۔ بیدر پہنچ کر اس نے نئے مظالم ڈھائے اور بالآخر حبیب اللہ ہمایون کے حکم سے تہ تیغ ہوئے ہمایون کے ظلم و جور کے قصے آج بھی بیدر میں مشہور ہیں۔ بادشاہ کی وفات پر نظیری نے جو قطعہ کہا تھا اس سے اس کے کردار پر روشنی پڑتی ہے ؎

ہمایوں شاہ مُردود رست عالم　　تعالیٰ اللہ زہے مرگ ہمایوں
جہان پر ذوق شد تاریخ مرگش　　؎ از ذوق جہان آرید بیروں

محمد قاسم فرشتہ تحریر کرتا ہے کہ ہمایوں ظالم اپنے ملازمین اور خدمت گاروں کو بھی بہت ستاتا تھا اور ان سے بدسلوکی کرتا رہتا تھا۔ شہاب الدین خواجہ سرا نے جو حرم سرا کا داروغہ تھا حبشی کنیز کے ذریعے سے سازش کر کے ایک دن جب ہمایوں حالت نشہ میں تھا لکڑی سے اس کے سر پر ایسی کاری ضرب لگائی

Marfat.com

کے وہ انتقال کرگیا[1] ایشوری پرشاد فرشتہ کے اس بیان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہمایوں حالت نشہ میں اپنے غلام کے ہاتھوں قتل نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی موت فطری تھی اور اس نے اکتوبر ۱۴۶۱ء میں وفات پائی تھی[2]

محمود گاوان اس دور کی ایک عہد آفریں شخصیت ہے۔ "بہمنی سلطنت" میں عبدالمجید صدیقی رقمطراز ہیں کہ "مخدوم جہانیاں" معتمد درگاہ شاہاں "امیرالامرا" ملک نائب مخدوم" "ملک التجار" اور "خواجہ جہاں" ایسے عظیم الشان خطابات تھے جو دکن کی تاریخ میں کسی شخص واحد کو نصیب نہیں ہوتے تھے اور بہ اک وقت کسی امیر نے اتنے اعزازات حاصل نہیں کیے تھے[3] محمود گاوان کی ولادت ۱۴۰۵ء میں قریہ قادان علاقہ گیلان میں ہوئی تھی ان کے والد کا نام خواجہ محمد تھا۔ محمود کے چچا خواجہ شمس الدین امیر محمد ولی گیلان کے وزیر تھے بعض تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ محمود گاوان امور سلطنت میں اپنے چچا کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ محمد ظہیر الدین اپنی کتاب "محمود گاوان" میں رقمطراز ہیں کہ اوائل زندگی ہی سے محمود کو انتظامی امور سے شغف تھا[4] محمود کو نہ صرف علوم وفنون سے دلچسپی تھی بلکہ وہ اچھی انتظامی صلاحیتوں کا مالک بھی تھا اور فن حرب وضرب کا ماہر بھی سمجھا جاتا تھا۔ جلال خان کی مہم میں محمود گاوان نے جس تدبر اور فوجی دانش مندی کا ثبوت دیا تھا اس سے خوش ہوکر بادشاہ نے اسے منصب ہزاری سے سرفراز کیا تھا۔ بادشاہ کے دل میں محمود گاوان کی بڑی عزت وتوقیر تھی اور وہ اس کو اہم ذمہ داریوں کا اہل سمجھتا تھا۔ ابتداہی سے محمود گاوان سلطنت بہمنی کا وفادار اور خیرخواہ رہا تھا۔ چنانچہ محمود گاوان کی وفاداری سے خوش ہوکر سلطان علاءالدین نے شہزادہ ہمایوں کو وصیت کی تھی کہ وہ محمود گاوان کا خاص خیال رکھے اور

---

[1] محمد قاسم فرشتہ۔ (مترجم محمد قدا علی طالب) تاریخ فرشتہ جلد سوم۔ ص۱۷

[2] ایشوری پرشاد۔ ہسٹری آف میڈیویل انڈیا۔ ص۳۹۹

[3] عبدالمجید صدیقی۔ بہمنی سلطنت۔ ص۱۴۰

[4] محمد ظہیرالدین۔ محمود گاوان ۔ ص۴

Marfat.com

ان کی مستعدی، حسن انتظام اور دانشمندی و وفاشعاری سے خاطر خواہ استفادہ کرے۔ چنانچہ جب ۱۴۵۷ء (۸۶۲ھ) میں ہمایوں تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے والد کی وصیت پر عمل کیا اور "ملک التجار" اور "وکیل شاہی" کے خطابات عطا کرنے کے علاوہ سمت بیجاپور میں اپنا "نائب" مقرر کیا۔ ہمایوں نے جب اس دار فانی سے کوچ کیا تو اس کے بیٹے نظام شاہ کو جس کی عمر بمشکل آٹھ برس تھی تخت نشین کر دیا گیا۔ اور اس کی ماں مخدومہ جہاں نے جو بہت معاملہ فہم اور ذہین تھی سلطنت کے انتظامات کی باگ ڈور سنبھالی اس نے محمود گاوان کو "جمعیۃ الملک و وزیر کل" کا خطاب عطا کیا اور بیجاپور میں دوبارہ بادشاہ کا نائب مقرر کیا۔ اس کے علاوہ خواجہ جہاں ترک کو وکیل شاہی مقرر کر کے تلنگانہ کی نیابت عطا کی۔ یہ دونوں ہر صبح مخدومہ جہان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مفید مشوروں سے کاروبار سلطنت انجام دینے میں مدد دیتے تھے۔ مخدومہ جہاں کے دربار میں باریاب ہونے والی یہ دونوں شخصیتیں بہمنی سلطنت کے ثبت و کشاد کی ذمہ دار تھیں مخدومہ جہاں کی ملازمہ ماہ بانو کے ذریعے سے مخدومہ جہاں ان دونوں اراکین سے گفت و شنید کرتی تھی۔

اڑیسہ کے راجا نے جب $\frac{۸۶۶ھ}{۱۴۶۱ء}$ میں سلطنت بہمنیہ پر حملہ کر دیا تو مخدومہ جہاں کو بڑی تشویش دامن گیر ہوئی اور اس نے محمود گاوان اور خواجہ جہاں کے مشورے سے چالیس ہزار فوج جمع کر لی۔ محمود گاوان نے نظام شاہ والی گجرات سے مدد طلب کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محمود شاہ والی گجرات اسّی ہزار فوج کے ساتھ بہ نفسِ نفیس چلا آیا۔ مخدومہ جہاں کی فوج کے سپہ سالار محمود گاوان مقرر ہوئے۔ جب مخدومہ جہاں کو محمود شاہ والی گجرات کے آنے کی خبر ملی تو اس نے محمود گاوان کو استقبال کے لیے روانہ کیا لیکن اس فوجِ کثیر کی آمد کی خبر نے دشمنوں کے ارادوں کو متزلزل کر دیا۔ نظام شاہ کے انتقال کے بعد جب اس کا حقیقی بھائی محمد شاہ بہمنی نو سال کی عمر میں ۸۶۷ھ میں تخت نشین ہوا تو کاروبار سلطنت مخدومہ جہاں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن خواجہ جہاں کا اقتدار بہت مستحکم ہو چکا تھا اور اس کی طرف سے مخدومہ جہاں خطرہ محسوس کر رہی تھی۔ اس لیے اس کا کام تمام کر دیا گیا۔ اور $\frac{۸۷۰ھ}{۱۴۶۵ء}$ میں خواجہ جہاں نے رحلت کی۔[1] ایشوری پرشاد

---

[1] محمد ظہیر الدین۔ محمود گاوان۔ ص ۱۹۔

Marfat.com

لکھتے ہیں کہ محمود گاوان کے اثر ورسوخ اور اس کے تدبیر سے دوسرے بہمنی امراء حسد کرنے لگے تھے انھوں نے محمود گاوان کو قتل کرنے کا ایک منصوبہ تیار کیا۔ اور ان کے غلام کو سازش میں شریک کرلیا ایک سادہ کاغذ پر محمود گاوان کی مہر حاصل کرلی گئی اور اس کاغذ پر انھوں نے وجیا نگر کے راجا نرسنگ کے نام ایک خط محمود گاوان کی طرف سے لکھا جس سے بادشاہ وقت کے خلاف بغاوت اور سازش کا اظہار ہوتا تھا۔ جب سلطان کو یہ کاغذ دکھایا گیا تو وہ غصّے سے بے قابو ہوگیا اور محمود گاوان کو محل میں طلب کر کے حالت نشہ میں اس کے قتل کا حکم سنایا اور ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو وہ قتل کردیے گئے۔ ایشوری پرشاد لکھتے ہیں کہ جب اس سازش کا بادشاہ کو پتہ چلا تو وہ پشیمان ہوا۔ اور بارہ ماہ کے اندر اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ اور اس طرح بہمنی سلطنت کے زوال کا آغاز ہوا[1]

مخدومہ جہاں نے ۸۷۷ھ میں انتقال کیا تو محمود گاوان کو انتہائی عروج حاصل ہوگیا تھا وہ محمد شاہ کے نام پر پورے ملک میں حکومت کر رہا تھا اسی زمانے میں اس نے مدرسہ قایم کیا اس کے بلند مینار ایک سو نوّے فیٹ اونچے ہیں اور دور سے نظر آتے ہیں۔ سر رچرڈ ٹمپل اپنے روزنامچے میں جس کو اس نے کشمیر اور حیدرآباد کی سیاحت کے بعد لکھا تھا مدرسہ محمود گاوان کو "عمدہ" اور "بے مثل" عمارت لکھتا ہے۔ یہاں طلباء میں کھانا اور کپڑا مفت تقسیم کیا جاتا تھا اور تعلیم حاصل کرنے پر ہر طرح کی سہولت موجود تھی[2] سلطنت بہمنی میں عبدالمجید صدیقی رقمطراز ہیں کہ یہ زمانہ محمود گاوان کے عروج کا دور تھا اس نے سر لشکر کے عہدے تک ترقی کی تھی" جلال الدین محمد شاہ لشکری" کے عہد میں محمود گاوان وزارت عظمیٰ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ حضرت مجلس کریم سید عظیم، ہمایوں اعظم، صاحب السیف وقلم جیسے خطابات سے مشرّف ہوا تھا[3] صاحب السیف وقلم سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمود گاوان ایک انشاپرداز اور ادیب ہی نہیں ایک قابل سپہ سالار بھی تھا۔ محمود گاوان کی علم دوستی کا اس عہد کے مورخین نے ذکر کیا ہے اور اس کے مدرسے کی تعریف کی ہے۔ ہندوستان

---

[1] ایشوری پرشاد۔ ہسٹری آف میڈیویل۔ انڈیا۔ ص ۲۰۵، ۲۰۶۔

[2] محمد ظہیر الدین۔ محمود گاوان۔ ص ۲۹

[3] عبدالمجید صدیقی۔ سلطنت بہمنی۔ ص ۱۴۰

Marfat.com

میں اقامتی جامعات قایم کرنے کی روایت بہت قدیم ہے۔ نلن را، وکرم شیلا، اجین اور امراوتی کی دانش گاہیں شہرہ آفاق ہیں۔ معین الدین عقیل "حدیقۃ الاقائم" کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ مدرسہ محمود گاوان کا کتب خانہ بہت وسیع تھا اور اس میں پینتیس ۳۵ ہزار نایاب مخطوطات محفوظ تھے[1]۔ یہ مدرسہ اپنی عظمت شکوہ اور جلال و دبدبے کی وجہ سے دیکھنے والے کے دل پر ایک ان مٹ نقش ثبت کر دیتا ہے اس میں طالب علموں کے علاوہ اساتذہ کی رہائش کا بھی انتظام تھا اس دارالاقامہ کے اخراجات کی پابجائی کے لیے بقول مبارزالدین رفعت محمود گاوان نے اپنی ذاتی جائیداد وقف کر دی تھی[2]۔ بارون خان شیروانی "محمود گاوان دی گریٹ بہمنی وزیر" میں لکھتے ہیں کہ محمود گاوان علوم متداولہ کا ماہر تھے اور ریاضی، طب اور علوم متداولہ کے بے مثل عالم تھے۔ سید محمد بیدری اپنی کتاب "مدرسہ محمود گاوان بیدر" میں محمود گاوان کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "وہ برصغیر کی عظیم ہستیوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے"[3]۔

۱۴۸۱ء میں جب دکھنیوں اور آفاقیوں کے تصادم نے زور پکڑا تو اس جھگڑے میں محمود گاوان کو ۵ صفر ۸۸۶ھ مطابق ۵ اپریل ۱۴۸۱ء میں قتل کر دیا گیا، اور اس واقعے نے سلطنت بہمنیہ کی بنیادیں متزلزل کر دیں محمود گاوان نے مرتے وقت سلطان محمود سوم سے کہا تھا "ایک بوڑھے آدمی کی موت غیر معمولی واقعہ نہیں ہوتی ہے لیکن بادشاہ کے لیے اس کا مطلب ہوگا اس کے کردار کا زیاں اور اس کی" سلطنت کے کھنڈر"۔ بقول ایم اے نعیم محمود گاوان کے یہ الفاظ صحیح ثابت ہوئے اور ایک دھائی کے اندر بہمنی سلطنت کا حال دگرگوں ہوگیا۔ بہت جلد سلطان محمد کو اس کا احساس ہوگیا کہ اس نے محمود گاوان کو قتل کرا کے حماقت کی تھی۔ سلطان کی مجنونانہ حرکتوں سے امراء بددل ہو گئے اور یوسف عادل شاہ سے ان کی ساری امیدیں وابستہ ہوگئیں۔ "سلطان بہمنیہ کی باقیات" میں محمود گاوان کی وفات کو ایک المیہ قرار دیتے

---

[1] معین الدین عقیل۔ دکن اور ایران۔ ص ۱۵

[2] مبارزالدین رفعت۔ مدرسہ محمود گاوان بیدر (مضمون) مشمولہ آجکل جنوری ۱۹۶۲ء ص ۹ تا ۱۲

[3] سید محمد بیدری مورخ دکن۔ مدرسہ محمود گاوان بیدر۔ ص ۱۵

Marfat.com

ہوئے اسے زوال حکومت کا سبب بتایا گیا ہے[1] اس کے خطوط "ریاض الانشاء" سے ان کی علمیت اور ذہانت و تدبّر کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے فارسی دیوان بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے[2]

بہمنی سلاطین نے مقامی زبان کی ترویج و نشوونما سے دلچسپی لی اور اس زبان کے بولنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ بہمنی دور میں فخرالدین نظامی نے "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" لکھی تھی۔

سلطنت بہمنی کا دورِ آخر افراتفری اور انتشار کا عہد تھا محمد شاہ، احمد شاہ رابع، علاء الدین، شاہ ولی اللہ اور کلیم اللہ کا زمانہ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ بقول مورخ مقدمہ تاریخ دکن کلیم اللہ حالات سے تنگ آکر بیدر سے بھاگ نکلا تو سلطنت بہمنی کا خاتمہ ہوگیا[3] محمد سلطان نے یادگار سلطانی المعروف بہ آئینہ بیدر میں کلیم اللہ کو آخری بہمنی بادشاہ تحریر کیا ہے اور لکھتا ہے کہ امیر برید نے اس کو قید کر دیا تھا[4] اس دور میں ایک روسی سیاح نکیتن دکن آیا تھا اس کے بعض بیانات سے بھی بہمنی سلطنت کے دور آخر کے حالات کا پتہ چلتا ہے وہ لکھتا ہے کہ تمام اہم علمی مراکز میں کتب خانے قائم تھے۔ درسگاہوں کے اخراجات کے لیے سلاطین کی طرف سے جاگیریں عطا کی جاتی تھیں ان سلاطین نے اپنی روشن خیالی، بیدار مغزی اور علم دوستی سے ہندوستان کی تاریخ کو گرانقدر علمی، ادبی اور تہذیبی ورثہ عطا کیا، علمی سطح کو بلند کر کے ایک خاص علمی مزاج کی پرداخت کی[5] فیروز شاہ نے دکن میں ایک ایسے مخلوط کلچرل کو فروغ دینے کی کوشش کی جو آفاقی اور دکنی عناصر سے مرکب تھا اور جو اسلامی اور مقامی دونوں رجحانات کا

---

[1] عبدالمجید صدیقی۔ سلطنت بہمنیہ کی باقیات (مضمون) مشمولہ سب رس ۱۹۶۴ء ص ۱۸ تا ۲۴

[2] ہارون خان شیروانی۔ محمود گاوان دی گریٹ بہمنی وزیر۔ ص ۱۹۵

[3] عبدالمجید صدیقی۔ مقدمہ تاریخ دکن۔ ص ۵۵

[4] محمد سلطان یادگار سلطانی المعروف بہ آئینہ بیدر۔ ص ۵۰

[5] عبدالمنان۔ فارسی ادب اور تمدن میں بہمنیوں کا حصہ" (مضمون) مشمولہ۔ معارف اعظم گڈھ نمبر ۱۵۔ جلد ۱۰۲۔ ص ۳۶۴، ۳۶۵۔

Marfat.com

اچھا امتزاج تھا۔ فیروز شاہ کے بعد احمد شاہ کے دور میں بھی اسی تمدن نے ترقی کی منزلیں طے کیں" تاریخ محبوب السلاطین" میں محمد حسین لکھتے ہیں کہ اس نے ہندو راجاؤں کے گھرانے میں شادی رچا کر بھی باہمی ربط و یگانگت کے جذبے کو پروان چڑھایا تھا[1] اس کی ایک مثال وہ رسوم ہیں جن کا بادشاہ کے سالانہ عرس کے موقعے پر مظاہرہ ہوتا ہے کہ عرس ہجری مہینوں کے حساب سے نہیں بلکہ ہندو تقویم کے لحاظ سے ہولی کے تہوار کے زمانے میں منعقد کیا جاتا ہے۔ گلبرگہ کے ضلع مدھیال کے پولیس پٹیل تین سو آدمیوں اور متعدد اونٹوں اور گھوڑوں کے ساتھ بیدر آتے ہیں اور باجے اور شنکھ بجاتے ہوئے مقبرے کی عمارت میں داخل ہوتے ہیں اور پوجا کی رسم کے مطابق ناریل توڑنے اور مزار پر پھول چڑھاتے ہیں۔ ظہیر الدین احمد اپنی تصنیف "احمد شاہ ولی بہمنی" میں لکھتے ہیں کہ اس عرس کے موقع پر وہ تمام لوگ بلا تفریق مذہب و ملت شریک ہوتے ہیں جو احمد شاہ بہمنی کو ولی سمجھتے ہیں[2] ظہیر الدین احمد نے اس بادشاہ کی شخصیت و سیرت پر روشنی ڈالی ہے فرشتہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ ملک میں قحط پڑا اور خشک سالی کی وجہ سے کئی جانور ہلاک ہو گئے۔ دوسرے سال بھی بارش کے آثار نہیں تھے بادشاہ نے علماء اور مشائخین سے استدعا کی کہ وہ نماز استسقاء پڑھیں لیکن اس سے بھی بارش نہ ہوئی اور لوگ احمد شاہ بہمنی کو منحوس بادشاہ تصور کرنے لگے کہ اس کے عہد میں حکومت میں قہرِ خداوندی نازل ہوا ہے احمد شاہ پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ وہ جنگل میں ایک ٹیلہ پر پہنچا۔ چند رکعت نمازیں ادا کیں اور اس تفرع و زاری سے بارانِ رحمت کے لیے دعا کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے شدید بارش شروع ہو گئی اس واقعہ کے بعد سے وہ احمد شاہ ولی بہمنی کے نام سے مشہور ہو گیا[3] نیل کنٹھ شاستری نے خشک سالی کے دو برسوں کا سنہ ۱۴۲۳ء اور ۱۴۲۴ء بتایا ہے[4]

---

[1] محمد حسین۔ تاریخ محبوب السلاطین۔ ص ۲۳۵

[2] ظہیر الدین احمد۔ احمد شاہ ولی بہمنی۔ ص ۱۶۶

[3] محمد قاسم فرشتہ۔ (مترجم محمد فدا علی طالب) تاریخ فرشتہ۔ جلد سوم۔ ص ۱۲۶

[4] نیل کنٹھ شاستری۔ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ ص ۲۴۹

Marfat.com

احمد شاہ تخلیقی مزاج کا آدمی تھا اور اس نے توپ خانے کی ترتیب و ساخت میں کئی ایجادیں کی تھیں۔ مردانہ ورزشیں کھیل کی روایات اور پہلوانوں کے اکھاڑے بیدر میں آج بھی موجود ہیں [1] "برہان ماثر" میں لکھا ہے کہ احمد شاہ فنِ موسیقی کا بھی ماہر تھا۔ احمد کے جانشین ظفر خان کی تخت نشینی کے بعد علاء الدین احمد کا لقب اختیار کیا وہ ایک کمزور بادشاہ تھا اور اسی کے دور میں دکھنیوں اور آفاقیوں کی باہمی کشاکش نے شدت اختیار کی تھی۔ اس نے اپنی لڑکی کی شادی شاہ قلی چنگیزی کے ساتھ کر دی تھی اور یہ حکم دیا تھا کہ بادشاہ کے جلوس کی روانگی اور دوسرے مواقع پر نووارد بادشاہ کے داہنے جانب رہیں اور دکنی بائیں جانب۔ اس حکم کو دکھنیوں نے اپنی سبکی تصور کیا اور باہمی مخالفت انتہا کو پہنچ گئی۔ علاء الدین کے عہد میں بعض خوبصورت اور نظر فریب عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ محل باغ اس کی ایک حسین یادگار ہے۔ اس زمانے میں ایک اطالوی سیاح نیکولو کونٹی دارالسلطنت آیا تھا اس نے یہاں کی بندرگاہوں اور جہازوں کی بڑی ستائش کی ہے وہ بہمنیوں کی جہاز سازی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں کے تیار کردہ جہاز اٹلی کے کارخانوں کے تیار کیے ہوئے جہازوں سے زیادہ مضبوط ہیں اور بڑی کامیابی کے ساتھ طوفان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ نیکولو کونٹی لکھتا ہے کہ یہاں اچھا اسلحہ تیار کیا جاتا ہے۔ نیزہ، تلوار، بازو بند، ڈھال اور کمانیں مضبوط اور کارگر ہوتی ہیں۔

بہمنی بادشاہوں نے صنعت و حرفت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ ریشم اور ململ کے کے بہمنی سلطنت میں کئی کارخانے موجود تھے اور گلبرگہ ریشمی پارچات کے لیے شہرت رکھتا تھا اس کے علاوہ گلبرگہ میں ڈوریا، مشرو اور ہمرو بھی تیار کیا جاتا تھا جس کی بیرون ملک میں بڑی قدر کی جاتی تھی۔ رائچور اور ناندیڑ کی پگڑیاں شمالی ہند میں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ بیجاپور پارچہ بافی کا بڑا مرکز تھا اور بقول ایس کے سنہا یہاں کے تیار کردہ کپڑے ایران، عرب اور مشرقی افریقہ بھیجے جاتے تھے [2] مخمل، ساٹن اور اونی کپڑا گوا کی بندرگاہ سے دوسرے ممالک کو برآمد کیا جاتا تھا۔ ایران،

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ بہمنی سلاطین۔ ص ۱۵۲

[2] ایس، کے سنہا۔ میڈیویل ہسٹری آف دی دکن۔ جلد اول ص ۱۵۲

Marfat.com

عرب، افریقہ، مشرق بعید اور یورپ سے بہمنیوں کے تجارتی تعلقات تھے۔ ملک کا تیار کردہ مال و اسباب مشہور بندرگاہوں، گوا، دابل، ماہم اور مولی پٹنم سے دوسرے ممالک کو بغرض تجارت روانہ کیا جاتا تھا۔ یہ بڑی عمدہ بندرگاہیں تھیں۔ نیکیتن نے دابل کی بندرگاہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ بہمنیوں کے پاس بہت سے اچھے جہاز تھے جو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال ہوتے تھے اور ان سے مختلف قسم کے کپڑے، بیدری کام کی اشیاء، ورنگل کے قالین اور دستکاری کی مختلف چیزیں دوسرے ممالک کو بھیجی جاتی تھیں اور ان کے بجائے گرم مسالہ، سونا، چینی کے برتن، عطریات، ادویات، گھوڑے، موتی اور غلام درآمد کیے جاتے تھے[1]۔ دارالسلطنت بیدر ظروف کی تیاری کے لیے شہرت رکھتا تھا اور یہاں کا بیدری کام بیرونی ممالک میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

دکن کی تانبے کی کانوں کا ذکر مارکوپولو نے کیا ہے اور نیکیتین (Nikitin) رائچور کے ہیرون کا بھی تذکرہ کرتا ہے[2]۔

دکنی تہذیب دو عناصر ترکیبی سے مرکب تھی۔ مقامی اثرات اور مسلم تہذیب اور ان ہی دو اجزاء سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔ اس لیے اس کا پرتو طرزِ تعمیر شعر و ادب رہن سہن کے طریقوں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں دکھائی دیتا ہے۔ مجاہد شاہ بہمنی کو اس کی رعایا "بلونت" کے لقب سے یاد کرتی تھی[3]۔ محمد شاہ بہمنی دوم کے داماد اور فیروز شاہ کے مقبرے میں ایرانی، ہندوی اور تغلق طرزِ تعمیر ایک دوسرے میں اس انداز سے سموئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ یہ ایک ہی طرز کے مختلف روپ نظر آتے ہیں اسی طرح وجیانگر کے راجاؤں کے مندروں اور محلات میں اسلامی طرزِ تعمیر کی جھلک نمایاں ہے۔ رانی کے اشنان محل دانایک کے احاطہ کنول محل اور ہاتھی خانہ بہمنی عمارتوں کی یاد دلاتے ہیں ان میں مسجد کی طرح محرابیں

---

[1] ایس، کے سنہا۔ میڈیویل ہسٹری آف دی دکن۔ جلد اول صـ ۱۵۳

[2] " " " " صـ ۱۵۱

[3] ہارون خان شیروانی۔ دکنی کلچر صـ ۲۲

Marfat.com

اور گنبد تعمیر کیے گئے ہیں۔ "دکنی کلچر" میں ہارون خاں شیروانی لکھتے ہیں" بہمنی سلاطین اور وجیانگر راج خواہ کیسے ہی ایک دوسرے کے حریف کیوں نہ ہوں وہ نہ صرف ایک دوسرے کے کلچر کے روادار تھے بلکہ اس کو اپنانے میں مضائقہ نہیں سمجھتے تھے"۔[1] مختصر یہ کہ ہندو مسلم اتحاد کا مظاہرہ دکنی کلچر کی پہچان بن گیا تھا۔

لنگایت تحریک بارھویں صدی میں شروع ہو چکی تھی اور بہمنیوں کے دور میں تیزی سے پھیل رہی تھی اس کے علاوہ تکارام رامانند اور نام دیو کے خیالات مہاراشٹرا کے باشندوں کے ذہنوں پر اپنا اثر ڈال رہے تھے اور ان میں انسان دوستی بھائی چارگی کا جذبہ اور سماجی بیداری پیدا ہو رہی تھی اس کے بارے میں ایس کے سنہا" میڈیویل ہسٹری آف دی دکن" میں لکھتے ہیں کہ رام اور رحیم کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کا رجحان پیدا ہو رہا تھا[2] وہ لکھتے ہیں کہ دتاتریہ کے معتقدین اپنے دیوتاؤں کو اکثر مسلم فقراء کے لباس سے سجایا کرتے اور مبلغین مذہب رام اور رحیم کے تصور کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔

بہمنی دور میں رعایا چار گروہوں میں تقسیم تھی (۱) فوجی اور سیول عہدیدار (۲) تاجر (۳) غلام (۴) مذہبی رہنما، علماء شعراء ادیب اور فنکار۔ مسلمانوں کے مذہبی پیشے قاضی، محتسب خطیب، شیخ الاسلام، فقہہ اور امام تھے۔ بہمنی سلاطین تغلقوں کی طرح علماء کے قدرداں تھے اور ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ علماء سے برابری کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ احمد شاہ بہمنی کی لڑکی شاہ حبیب اللہ سے بیاہی گئی تھی۔ فضل اللہ انجو، شیخ سراج الدین، ملک سیف الدین غوری اور محمود گاوان جیسے علماء کاروبارِ سلطنت میں دخیل تھے۔ حدودِ سلطنت میں فیروز شاہ بہمنی سے زیادہ خواجہ بندہ نواز مقبول خاص و عام اور ہر دل عزیز تھے۔ عوام الناس ان کے گرویدہ اور پرستار تھے۔ ایس، کے سنہا کا خیال ہے کہ احمد شاہ ولی بہمنی نے گلبرگہ سے اپنا پایۂ تخت بیدر محض اس لیے منتقل کیا تھا کہ بادشاہ کو وہ ہر دل عزیزی حاصل نہیں

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ دکنی کلچر صـ۲۸

[2] ایس کے سنہا۔ میڈیویل ہسٹری آف دی دکن۔ صـ۱۳۹

Marfat.com

ہوسکتی تھی تو جواس گدالو میسر تھی [1]

بہمنی سلطنت میں چار نسلی گروہ موجود تھے (۱) ہندوآبادی جو ذات پات میں بٹی ہوئی تھی (۲) وہ افراد جو خلجی اور تغلق افواج کے ساتھ شمال سے آکر اس علاقے میں رہ بس گئے تھے ان کی نوآبادیاں دولت آباد، گلبرگہ اور بیدر میں زیادہ تھیں (۳) حبشی نسل کے وہ غیر ملکی جو براہِ راست افریقہ سے حجاز کے راستے دکن چلے آئے تھے ان کی تعداد کم تھی اس لیے وہ سماج میں اپنی اہمیت منوا نہ سکے تھے (۴) وہ آفاقی جو ایران عراق اور ماوراءالہز وغیرہ کے علاقوں سے دکن میں آکر بس گئے تھے ان کی زبان بود و باش اور ان کا طرزِ فکر دوسروں سے مختلف تھا دکنی اور حبشی زیادہ تر سنّی المذہب تھے اور آفاقیوں کی اکثریت کا مذہب امامیہ تھا [2] آفاقی دانش وآگہی اور علم وہنر میں دوسروں پر فوقیت رکھتے تھے اس لیے بہت جلد امورِ سلطنت میں دخیل ہو گئے اور ان کی یہ برتری دوسروں کی نظر میں کھٹکنے لگی۔ محمود گاوان بھی آفاقی تھا اور اس نے اپنی فہم و فراست اور تدبر سے بہمنی سلطنت کے ڈانڈے خلیج بنگال سے بحیرہ عرب اور گوا تک ملا دیے تھے اس نے آفاقی اور دکنی جھگڑے کو مٹانے کے لیے سلطنت کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا ان میں سے چار کے طرفدار یا گورنر دکنی اور چار کے آفاقی مقرر کیے گئے تھے۔ تاکہ مملکت میں ان دونوں فرقوں کا توازن برقرار رہ سکے۔ محمود گاوان کے قتل کے بعد یہ طرفدار آہستہ آہستہ بہمنی سلطنت سے روگردانی کرنے لگے کیوں کہ اب حکومت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور کمزور حکمرانوں میں حکومت کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ آٹھ طرفداروں میں سے صرف چار طاقتور گورنر باقی رہے اور رفتہ رفتہ خود مختار ہوتے گئے۔ احمد نگر کے نظامِ شاہی، بیجاپور کے عادل شاہی، برار کے عماد شاہی اور خود پایۂ تخت محمد آباد یعنی بیدر کے برید شاہی اور گولکنڈے کے قطب شاہی گورنر اپنے حدود میں آزاد اور خود مختار سیاسی حکمران بن گئے۔ بہمنیوں کے آخری بادشاہ محمود کی بے بسی کا اندازہ اس کے اس شعر سے

---

[1] ایس، کے سنہا۔ میڈیویل ہسٹری آف دی دکن۔ ص ۱۴۶

[2] ہارون خان شیروانی۔ دکنی کلچر۔ ص ۳۲

Marfat.com

لگایا جا سکتا ہے ؎

دربحرِ غم فتادم وامواج بے عدد
تاچند دست وپا زنم و یا علی مدد [1]

بقول ابوالنصر محمد خالدی سلطان محمود سوم نے ۵ رصفر ۸۸۷ھ مطابق ۲۶ رمارچ ۱۴۸۲ء کو محمود گاوان کے ٹھیک ایک سال بعد رحلت کی [2] اس کے بعد اس کے آٹھ برس کے شہزادے محمد شاہ کو تخت نشین کیا گیا۔ محمد شاہ چوں کہ دوسروں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنا ہوا تھا اس لیے محمود کو بعض مورخین بہمنی سلطنت کا آخری بادشاہ تصور کرتے ہیں۔ جس نے سینتیس ۳۷ سال حکومت کی نہ تو وہ شخصی طور پر باصلاحیت انسان تھا اور نہ اسے لائق وزیر ملے تھے جو امورِ سلطنت کی خاطر خواہ دیکھ بھال کرتے اس لیے بہمنی سلطنت خانہ جنگیوں اور انتشار کی نذر ہوگئی [3] وی سی ورما "ہسٹری آف بیجاپور" میں بہمنی سلطنت کے زوال کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پہلے تو بہمنی سلطنت کے حدود بہت وسیع ہو گئے تھے دوسرے اچھے اور مدبر حکمرانوں کی کمی تھی اور تیسرے سلطنت میں آفاقیوں اور دکھنیوں کے تصادم نے حکومت کی بنیادوں کو کمزور کر دیا تھا [4]

عبدالمجید صدیقی "بہمنی سلطنت" میں تحریر کرتے ہیں کہ اس عظیم الشان سلطنت کے منفرد طرزِ معماری کی یادگاریں اب بھی دیکھنے والے کو ششدر کر دیتی ہے۔

اتھانی سیس نیکیتن نے بہمنی دارالسلطنت کے گھوڑوں، ریشم، سیاہ مرچ اور دوسرے تجارتی سامان کی اعلا اقسام کو بہت سراہا ہے۔ اس سیاح نے بہمنیوں کے تمدن پر روشنی ڈالی ہے وہ لکھتا ہے کہ جب امراء کبار محل میں داخل ہوتے ہیں تو پانچ سو پیادے، دس مشعلچی اور دیگر ملازمین کا پہرہ ساتھ ہوتا ہے اور سو محرر موجود ہوتے

---

[1] ابوالنصر محمد خالدی۔ کچھ دکنی کلام (مضمون) مشمولہ نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۶۴ء ص ۲۹
[2] 〃 〃 〃 〃
[3] ام اے نعیم۔ اکسٹرنل ریلشنس آف بیجاپور۔ ص ۱۹
[4] دی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور ص ۶

Marfat.com

ہیں جو محل میں داخل ہونے اور باہر نکلنے والوں کے نام قلم بند کر لیتے ہیں۔ مجلس عدالت قلعہ کے اندر منعقد ہوتی ہے۔ قلعے کے در و دیوار دلکش اور منقش ہیں[1] نیکیتن کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان زردوزی لباس میں ملبوس ہوتا تھا اور اس کے سر پر نوکدار تاج رکھا ہوتا تھا جس میں بیش قیمت ہیرا جگمگاتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس سیاح نے محمود گاوان کی مہمان نوازی اور جود و سخا کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھتا ہے کہ اس کے دسترخوان پر روزانہ پانچ سو آدمی شکم سیر ہو کر کھاتے ہیں۔

محمود گاوان کی ہمہ گیر شخصیت اور اس کی ذکاوت کی بدولت اس عہد میں بہمنی سلطنت کے تعلقات بیرونی ممالک سے استوار ہو گئے اور ان سے تمدنی ربط بڑھا۔ شہاب الدین محمود کے زمانے ہی میں بہمنی سلطنت کے مغربی ساحل پر یورپین باشندوں کا اثر بڑھنے لگا تھا۔ پرتگالی وہ پہلے یورپی تھے جنھوں نے سرزمین ہند پر قدم رکھا تھا واسکوڈی گاما کیپ آف گڈ ہوپ کا چکر کاٹ کر مسلم سیاح عبدالماجد کی رہنمائی میں ہندوستان کے ساحل پر ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو کالی کٹ پہنچا تھا۔ رفتہ رفتہ پرتگالیوں نے کالی کٹ کے زموزین یا کوچین کے راجا کے علاقوں میں کارخانے قائم کر لیے جو بعد میں قلعوں میں تبدیل ہو گئے ۱۵۱۰ء میں پرتگالیوں نے گوا فتح کر لیا۔

صباح الدین عبدالرحمٰن اپنی کتاب "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے" میں لکھتے ہیں کہ برصغیر میں عیدالفطر اور عیدالضحیٰ کے علاوہ نوروز میلادالنبی اور شب برأت وغیرہ باہمی میل ملاپ اور یگانگت کا جذبہ پیدا کرتے تھے ان کی مذہبی اہمیت تو مسلمہ ہے لیکن ان کی معاشرتی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا یہ عیدین مختلف مکاتیب خیال اور معاشی حیثیت کے افراد کو ایک مرکز پر جمع ہونے کا موقعہ عطا کرتی ہیں[2] اسی طرح ہولی اور دیوالی وغیرہ تہواروں میں بھی ایک دوسرے سے قریب ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اور بھائی چارگی اور اخوت کے جذبات

---

[1] ایس کے سنہا۔ اکاؤنٹ آف دی ٹرادیلس آف ایتھانی سیس نیکیتن۔ ص۔

میڈیویل ہسٹری آف دی دکن۔ جلد اول۔ ص۔

[2] صباح الدین عبدالرحمٰن۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے۔ ص۔

Marfat.com

بیدار ہوتے ہیں۔ محرم میں شہدائے کربلا کی مجالس عزا، تعزیہ داری کی رسموں اور عزاداری کی محفلوں میں بھی مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگ یکجا ہوتے تھے اس لیے ان محفلوں کی تہذیبی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت اور افادیت تھی۔ فیروز شاہ کے بارے میں مورخ کے اس بیان سے کہ اسے کربلا نجف اور مدینے کے مساکین اور سادات سے بڑی ہمدردی تھی[1]، دکن میں ایرانی اثرات اور شیعی عقائد کے اثر و نفوذ کا پتہ چلتا ہے۔ بہمنی دور میں مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں یا نہیں؟ اس کے بارے میں تاریخیں خاموش ہیں "بہمن نامہ" کے شاعر آذری کے بارے میں "ہفت اقلیم" کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت کو خواب میں دیکھا جو یہ فرما رہے ہیں کہ میں آذری کی اس بیت کے صلے میں اس کی طرف جا رہا ہوں جو اس نے اپنے مرثیے میں میرے فرزند کے لیے لکھی ہے ؎

سوراخ می شود دل ما چوں گل حسین
ہر جا کہ ذکر واقعۂ کربلا بود[2]

ہرات کا سفیر عبدالرزاق ۸۴۶ھ کے آخر میں دکن آیا تھا وہ اپنے وطن واپس ہونے کا حال قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بہمنی دربار اور وجیانگر کے راجہ کا سفیر بھی اس کے ہمراہ تھے۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے ان کا جہاز سمندر میں کچھ عرصے تک رکا رہا۔ اس اثنا میں محرم کا چاند نظر آیا اور رسم عزاداری ادا کی گئی، اور مرثیہ خوانی سید الشہداء ہوئی۔[3] اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ دکن میں عزاداری کی ابتدا بہمنی سلطنت کے زمانے ہی سے ہو چکی تھی۔ محمود گاوان دکن آکر اپنی قابلیت کی بنا پر وزیر کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔ "محمود گاوان دی گریٹ بہمنی وزیر" میں ہارون خان شیروانی لکھتے ہیں کہ عزاداری محمود گاوان کے عقائد کا جزو تھی۔ سلطنت بہمنی کے حدود میں کثیر تعداد میں ایرانی موجود تھے[4] ان تمام امور کے پیش نظر عزاداری

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ بہمنیز آف دکن۔ ص ۱۴۶

[2] عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الزمن تذکرے شعرائے دکن۔ حصہ اول۔ ص ۱۶۱، ۱۶۲

[3] محمد حسین۔ محبوب الوطن۔ ص ۲۱۹

[4] ہارون خان شیروانی۔ محمود گاوان دی گریٹ بہمنی وزیر۔ ص ۱۹۵

Marfat.com

کوئی غیر متوقعہ بات نہیں معلوم ہوتی۔ سلاطین صفویہ سے بہمنیوں کے سفارتی تعلقات قائم تھے۔

برہمن نجومی، جوتشی اور بیت دان بہمنی دربار میں موجود رہتے اور زمانہ جنگ اور ایام امن میں آغاز کار سے متعلق نیک ساعت بنا کر رہبری کرتے تھے۔ دکنی مثنویاں اس قسم کے تذکروں سے بھری پڑی ہیں۔ بہمنی دور کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں مچھندر کے بیٹے رگھوناتھ کا ذکر ہے جو بہت بڑا جوگی تھا۔ اہلِ دربار کا یہ کہنا کہ وہ بہت سے علوم جانتا ہے اور نامور جوگی ہے اس لیے اسے دربار میں جگہ دی جائے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس زمانے میں دربار میں ایسے لوگوں کی بڑی قدر و منزلت تھی ؎

مچھندر کرا پوت آ گھور نات — اُمت بدیّا جانتا اوتھ نات
بڑا سِدّھ جوگی سبھا راؤ جوگ — ملے راؤ کوں آج سنجوگ جوگ

آر این چوپرا اور بی این پوری "سوشیل کلچرل اینڈ اکنامک ہسٹری آف انڈیا" میں رقمطراز ہیں کہ اس زمانے میں مسلمان عورتوں کے علاوہ ہندو مستورات بھی پردہ کرتی تھیں[1] اس زمانے کا سماجی دستور اور نظام اخلاق ایسا تھا کہ عورت مردوں سے بالکل الگ تھلگ رہا کرتی تھی۔ عام زندگی میں خواتین مردوں کی دست نگر تھیں بچپن میں باپ اور جوانی میں شوہر اور بڑھاپے میں لڑکے اس کی کفالت کا بار اٹھاتے تھے[2]

بہمنی دور کی موسیقی پر اس عہد کی ادبی تخلیقات سے زیادہ روشنی نہیں پڑتی خواجہ بندہ نواز سے منسوب گیتوں، حقیقت، اور اشعار بعض جگہ "در مقام رام کلی" تحریر کیا ہوا ملتا ہے۔ خواجہ بندہ نواز کی سوانح حیات "تاریخ حبیبی" کا نواں باب "سماع" سے متعلق ہے اس میں لکھا ہے کہ ایک "مقام محفوظ و مرغوب" کو پسند کیا جاتا اور ہر جانب طاقوں میں مٹی کی پیالیاں سجا کر ان میں بکثرت عود جلاتے اور "پاکیزہ لطیف فرش" بچھایا جاتا۔ "شوقین احباب" اور "تماشائیوں" کو کھانا

---

[1] آر این چوپرا، بی این پوری۔ سوشیل، کلچرل اینڈ اکنامک ہسٹری آف انڈیا" جلد سوم صفحہ ۸۲، ۸۳۔
[2] " " " "

Marfat.com

کھانے کے بعد واپس ہونے کی اجازت تھی۔ لیکن "چند اشخاص" کو روک لیا کرتے تھے انھیں سماع میں شرکت کی اجازت تھی[1] گانے میں صرف بول "ہو" اور "دستک" (تالیوں) سے کام لیا جاتا تھا۔ مطربوں کے پاس سوائے دف (چنگ) کے اور کچھ نہ ہوتا اگر وہ مزمار ساتھ لاتے تو ان کے استعمال سے منع کر دیا جاتا تھا۔ خواجہ بندہ نواز کے سماع سننے کا معمول اس طرح تھا کہ وہ کسی عربی قول (شعر) یا عربی غزل اور ابیات یا فارسی اشعار "سماع فرماتے"۔ خواجہ بندہ نواز سماع کے دلدادہ تھے اور کہا کرتے تھے کہ کلام اللہ کی تلاوت اور سماع سے مجھے روحانی مرتبہ حاصل ہوا ہے[2]

متقدمین میں بہت سے "صاحبان ذوق واحوال" کو سماع کی حالت میں مشاہدے کے وقت "بذل روح کی نوبت پیش آئی تھی" اور وہ رحلت کر گئے تھے چنانچہ افضل مشائخ برہان چشتیاں مخدوم شیخ قطب الدین بختیار کے بخت نے یاوری فرمائی اور حالت سماع میں ان پر "بذل روح کی صورت پیش آئی"

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است[3]

بہمنی دور کی ایک ہی بیانیہ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کا پتہ چلا ہے جس سے ہندوی روایات و افکار کی پذیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ راقم الحروف نے فیروز شاہ بہمنی کی جو رباعی دریافت کی ہے اسے اپنی کتاب "دکنی رباعیاں" میں متعارف کروایا ہے۔

محمود شیرانی کو احمد گجراتی کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں"[4] کے جو چند چیدہ چیدہ اجزا دستیاب ہوئے تھے ان کے مطالعے سے انھوں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ یہ دکن میں مثنوی کا ابتدائی نمونہ نہیں بلکہ ایک ایسے وقت کا ادبی کارنامہ ہے جب نظم نے معتد بہ حد تک ترقی کر لی تھی اس لیے ضروری ہے کہ سلاطین بہمنیہ کے دور میں بھی دکنی شعراء موجود

---

[1] معشوق یار جنگ (مترجم) تاریخ حبیبی۔ ص ۷۹

[2] معشوق یار جنگ (مترجم) " ص ۸۱

[3] " " " " ص ۸۱

[4] یہ مثنوی احمد گجراتی نے مثنوی "یوسف زلیخا" کے بعد لکھی تھی مثنوی یوسف زلیخا کو راقم الحروف نے مدون کر کے شائع کر دیا ہے۔

Marfat.com

رہے ہوں گے[1]

بہمنی دور کے بہت سے فارسی شاعروں کا ذکر تاریخوں میں محفوظ ہے لیکن دکنی شعراء کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ مشتاق اور لطفی کو بہمنی دور کے شعراء بتایا گیا ہے[2] مشتاق اپنی ایک غزل میں بہمنی تزک و احتشام اور دربار کی شان و شوکت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے[3]

اے بہمنی تجہ دار کھٹاں آتے ہور جاتے جیون دار کے پوجن کو بھٹاں آتے ہور جاتے

خلجی اور تغلق حکمرانوں کے سیاسی تسلط اور اثر نے بھی سرزمین دکن میں فارسی زبان کی جڑوں کو مضبوط کر دیا تھا اور آفاقیوں کے ساتھ ساتھ مقامی باشندے بھی فارسی زبان سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ اس عہد میں فارسی کی بہت سی اہم اور دستاویزی حیثیت کی حامل تصانیف منصۂ شہود پر آئیں علاء الدین حسن بہمنی کے مورخ عصامی نے "فتوح السلاطین"، لکھی اور عین الدین نے "طبقاتِ ناصری" مرتب کی، مفتی احمد ہردی، نصیر الدین تبریزی، میر محمد بدخشی، سیف الدین غوری اور میر فضل اللہ انجو نے فارسی میں اپنی بلند پایہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ خود بہمنی سلاطین اس زبان کے سچے قدردان تھے محمد دوم نے فضل اللہ انجو سے فارسی پڑھی تھی اور فیروز شاہ فارسی میں شعر کہتا تھا۔ آذری کا "بہمن نامہ"، اور محمود گاوان کی انشا پردازی کا نمونہ "ریاض الانشاء"، بطور خاص قابل ذکر ہیں اس عہد میں جو مقامی زبان رائج تھی اس کو ہارون خان شیروانی نے بہمنی سلاطین[4]، میں اور آر، سی مجمدار[5] نے "دی مغل ایمپائر" دور کے اے نظامی[6] نے "میڈیویل انڈیا"، میں "پروٹو اردو" (Proto-Urdu) کہے

---

[1] حافظ محمود شیرانی۔ مقالات حافظ شیرانی۔ جلد اول۔ صـ۲۱۶

[2] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ صـ۴۴ تا ۴۹

[3] سخاوت مرزا کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو کراچی جنوری اپریل ۱۹۵۹ء صـ۱۷۹

[4] ہارون خان شیروانی۔ بہمنی سلاطین۔ صـ۳۲

[5] آر، سی مجمدار۔ دی مغل ایمپائر۔ صـ۶۲۹

[6] کے اے نظامی۔ میڈیویل انڈیا۔ جلد سوم۔ صـ۲۳۱

Marfat.com

تعبیر کیا ہے۔ بہمنی دور میں دکنی بول چال کی زبان کے مرحلے سے گزر کر تحریر و تقریر کی زبان بن چکی تھی چنانچہ اس دور کے صوفیاء نے اپنے واعظوں اور تحریروں میں اس کو ذریعہ ابلاغ بنایا ہے نذیر احمد لکھتے ہیں کہ پندرھویں سولھویں صدی میں دکنی زبان ہندوؤں اور مسلمانوں میں برابر رائج ہو چکی تھی[1] دکنی زبان کی سرکاری حیثیت بھی اس کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں اہم محرک ثابت ہوئی۔ بقول جمیل جالبی "بہمنی دور حکومت میں شاہی دفتر ہندوی زبان میں کر دیے گئے تھے"[2] اس دور میں ادبی اور تخلیقی سطح پر اس زبان کا استعمال شروع ہو چکا تھا۔ دکنی تہذیب کو فروغ دینے والے دکنی سلاطین دکنی زبان و ادب کی سرپرستی میں مصروف تھے۔ اور درباروں میں دکنی شعراء کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا[3] اس سلسلے میں دستیاب ہونے والا مواد تحقیق طلب ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کا بیان کہ آذری نے "بہمن نامہ" دکنی میں[4] نظم کیا تھا غیر محقق ہے۔ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں بہمن نامہ کے دو شعر نقل کیے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس منظوم تاریخ کی زبان فارسی تھی بہمن نامہ بحر متقارب مثمن مقصود میں کہا گیا ہے[5]

---

[1] نذیر احمد۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں علماء و فضلاء کی خدمات (مضمون) مشمولہ نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۸ء نمبر ۱۲

[2] جمیل جالبی تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص ۱۸۵۔

[3] 〃 〃 〃 〃 ص ۱۸۴

[4] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۵۴

[5] نذیر احمد۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں علماء و فضلاء کی خدمات (مضمون) مشمولہ نوائے ادب جولائی ۱۹۵۸ء ص ۱۲

Marfat.com

عادل شاہی سلطنت

۱۴۹۰ء/۸۹۵ھ میں جب بہمنی سلطنت کا چراغ گل ہوگیا تو دکن میں پانچ شمعیں روشن ہوگئیں۔ یوسف عادل شاہ نے بیجاپور میں ۸۹۵ھ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کرایا[1] یوسف عادل شاہ، آغامراد کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ آغامراد قسطنطنیہ کے علاقے روم کا باشندہ تھا ۱۴۵۱ء میں آغامراد کا انتقال ہوگیا تو اُس کی بیوی نے اپنے بیٹے کو اس خوف سے کہ کہیں اس کا بڑا بھائی محمود قتل نہ کردے، بیرون ملک بھیج دیا۔ سفر کرتے ہوئے وہ بیجاپور پہنچا اور محمود گاوان کے ہاتھ فروخت ہوا۔ اس بیان میں مورخ تاریخ رشید الدین خانی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ نظام شاہ بہمنی کی والدہ مخدومہ جہاں نے یوسف کو خرید کر عزیز خاں امیر آخور کے حوالے کیا تھا وہ خانوادہ بہمنیہ کا غلام تھا[2] چوں کہ وہ بہت بوڑھا ہوگیا تھا اس لیے نوعمر یوسف سے تمام کام لیتا اس طرح شاہی محل میں اس کا اثر ورسوخ بڑھا۔ سترہ سال کی عمر میں وہ پہلے شاہی پہرہ دار اور پھر محاسب مقرر ہوا اور اس کے بعد نظام الملک ترک کی ملازمت اختیار کی۔ ان سے اسے عادل شاہ کا خطاب ملا تھا جو بعد میں اس کے خاندان کا لقب بن گیا۔ محمود گاوان کی سرپرستی میں یوسف نے غیر معمولی ترقی کی محمود گاوان

---

[1] علی بن طیفور بسطامی۔ مخطوط حدائق السلاطین۔ مخطوط نمبر ۵۳۷ تذکرہ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۱۰۹

[2] غلام امام خان ترین ہجر۔ تاریخ رشید الدین خانی ص ۱۰۲

Marfat.com

کے قتل کے بعد یوسف آفاقیوں کا سردار تصور کیا جانے لگا ۱۴۸۹ء میں یوسف بیدر چلا آیا[1] ایشوری پرشاد نے فرشتہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یوسف کا تعلق شاہی خاندان سے تھا اور یہ خیال غلط ہے کہ وہ محمود گاوان کا زر خرید غلام تھا۔ جب ۱۴۵۱ء میں یوسف کے والد سلطان مراد دوم کا انتقال ہوا تو اس کی ماں نے بعض مصلحتوں کی بناء پر اُسے ترکی میں رہنے نہ دیا اور اس طرح وہ ہندوستان چلا آیا تھا[2]

یوسف عادل شاہ بانی سلطنت بیجاپور، سلطنت بہمنی کے مشہور وزیر محمود گاوان کا تربیت یافتہ تھا اس لیے امور سلطنت پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور وہ سیاسی داؤ پیچ سے خوب واقف تھا جب اس نے بیجاپور میں اپنی مطلق العنانی کا اعلان کر دیا تو وہ تمام امراء اور فوجی عہدے دار جو محمود گاوان کے اطراف جمع تھے اور اس کے زیر اثر تھے یوسف عادل شاہ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تذکرۃ الملوک" میں رفیع الدین شیرازی یوسف کے بارے میں رقمطراز ہے کہ اس کے والد کا نام محمود بیگ ساوجی تھا۔ سلطان محمد بہمنی کے لیے جو چند غلام بیرون ملک سے جہاز میں لائے گئے تھے۔ وہ ان میں سے ایک تھا۔ چند غلاموں کو آبدار خانہ کے اور چند کو مطبخ کے کام پر متعین کر دیا گیا۔ یوسف کے ذمے مطبخ کا کام کیا گیا تھا۔ وہ کشتی لڑنے میں ماہر تھا اور اس نے اپنی ذاتی قابلیت سے بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کر لیں[3]

"گلدستہ بیجاپور" میں خواجہ میر احمد علی یوسف عادل شاہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ترک غلام نہیں تھا بلکہ اس کا ایک اونچے گھرانے سے تعلق تھا اس کا سلسلہ نسب شاہ روم سلطان مراد سے ملتا ہے[4] یوسف کو علی بن طیفور بسطامی نے

---

[1] دی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور۔ ص۱۶

[2] ایشوری پرشاد۔ ہسٹری آف میڈیویل انڈیا (انگریزی) ص۴۱۲

[3] رفیع الدین شیرازی۔ مخطوطہ تذکرۃ الملوک۔ مخطوط نمبر ۱۴۲ ـ تاریخ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص۳۰۔۳۴

[4] خواجہ میر احمد علی (مرتب سید حمید شطاری)۔ ص۹

Marfat.com

"حدائق السلاطین فی کلام الخواقین" میں محمد قاسم فرشتہ کی تاریخ کے حوالے سے "اولاد سلاطین رومیہ المشہور بآل عثمان" اور دوسری روایت کے مطابق "از بزرگ زادگان بلدہ ساوہ" تحریر کیا ہے[1] یہ مورخ لکھتا ہے کہ ایک اور روایت کے مطابق یوسف نے سلاطین بہمنیہ کے یہاں ملازمت اختیار کی تھی اور اپنے حسن سیرت و نیک نامی اور علم موسیقی میں کمال کی بدولت آخری بہمنی بادشاہ محمود کے عہد میں ترقی کی معراج پر پہنچا تھا۔

"رائز آف دی محمڈن پاورز اِن انڈیا" میں جان برگس رقمطراز ہے کہ بہمنی سلطنت کے آخری بادشاہ کے خاتمے کے بعد اکثر و بیشتر غیر ملکی عہدے دار جو اہم خدمات پر فائز تھے یوسف کے پرچم تلے جمع ہونے لگے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس افراتفری میں سب کی نگاہیں یوسف پر پڑ رہی تھیں جو اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک تھا اور جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں[2] اس سیاسی تاریکی میں یوسف ایک روشن چراغ تھا جس کے گرد پروانے جمع ہو رہے تھے۔

یوسف نے بیجاپور میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اب اس کا مقابلہ قاسم برید سے تھا جو بہمنی دربار میں بہت طاقتور سیاسی شخصیت بن گیا تھا۔ محمود، قاسم برید کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ یوسف نے بہمنی سلطنت سے ایک وسیع اور زرخیز علاقہ چھین لیا تھا لیکن بہمنی سلطنت سے اس کا رویہ معاندانہ نہ تھا۔ جب بہادر جیلانی پر فتح پانے کے بعد بہمنی بادشاہ واپس ہونے لگا تو اس نے یوسف کے دارالسلطنت میں اس سے ملاقات کی جہاں اس کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا یوسف عادل شاہ نے محمود کو بیس ہاتھی پچاس گھوڑے چار جواہر جڑے ہوئے کنگن اور دوسری قیمتی اشیاء بطور تحفہ دیں۔ ۱۴۹۷ء میں بہمنی بادشاہ محمود نے یوسف عادل شاہ کی بیٹی بی بی ستی کی شادی اپنے ولی عہد سے کی اور گلبرگہ میں شادی کی رسومات انجام دی گئیں[3]

---

[1] علی بن طیفور بسطامی حدائق السلاطین (بہ تصحیح شریف النساء) صہ ۹۶

[2] جان برگس۔ رائز آف دی محمڈن پاورز اِن انڈیا (انگریزی) جلد سوم صہ ۴

[3] ڈی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور (انگریزی)، باب سوم۔ صہ ۳۳

Marfat.com

یوسف نے اعلان خود مختاری کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ محمد شاہ کے گورنر سے بہت سے مضبوط قلعے چھین لیے اور دریائے بیما سے بیجاپور تک کا تمام علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا [1]

بقول ایشوری پرشاد قاسم برید یوسف عادل شاہ کو اپنا دشمن تصور کرتا تھا۔ اور اسی نے وجیانگر کے راجا کو عادل شاہی حکومت پر حملہ کرنے پر اکسایا تھا۔ اس کشمکش میں راجا نے ہزیمت اٹھائی۔ میدانِ جنگ میں وجیانگر کے راجا کو شکست ہوئی اور سلطنت وجیانگر کے بعض سرحدی علاقے یوسف عادل شاہ کے قبضے میں آگئے [2]

تاریخ دکن میں سید علی بلگرامی لکھتے ہیں کہ یوسف عادل شاہ نے محمود گاوان کی محبت میں مذہب اثنا عشری اختیار کر لیا تھا [3] مرزا جہانگیر بیگ قمی حیدر بیگ اور سید احمد، یوسف عادل شاہ کے سیاسی اعتبار سے اہم حمایتی تھے۔ جب امیر برید کا انتقال ہو گیا تو یوسف عادل شاہ کے لیے کوئی بڑی سیاسی مزاحمت باقی نہ رہی۔ جان برگس لکھتا ہے کہ ایک عرصہ قبل یوسف عادل شاہ نے اپنے دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اگر وہ خود مختار سلطنت کا سربراہ مقرر ہو جائے تو ایک مذہبی رسم بجالائے گا اس نے مرزا جہانگیر اور حیدر بیگ کو جو امامیہ عقائد کے حامل تھے طلب کیا۔ سید احمد ہروی اور دوسرے لائق امراء کو مخاطب کر کے انھیں بتایا کہ وہ عالم رویا میں آنحضرتؐ کے دیدار سے مشرف ہوا تھا اور اسی وقت اس نے اپنے دل میں عہد کر لیا تھا کہ بادشاہ بنے گا تو مذہب اثنا عشری اختیار کرے گا کیونکہ انھیں آئمہ کی برکت سے اُسے سرفرازی اور کامرانی نصیب ہوئی تھی۔ جب تمراج اور بہادر جیلانی نے اس کے علاقے پر حملہ کر کے ہراساں کر دیا تھا تو اس نے اپنے اس عہد کی تجدید کی تھی۔ یوسف نے مملکت کے ان اہم امراء سے مشورہ طلب

---

[1] جان برگس۔ رائز آف دی محمڈن پاور ان انڈیا (انگریزی) جلد سوم ص ۵

[2] ایشور پرشاد۔ ہسٹری آف میڈیویل انڈیا (انگریزی)۔ ص ۴۱۳

[3] سید علی بلگرامی۔ تاریخ دکن حصہ اول۔ ص ۲۶۹

Marfat.com

کیا کہ اب حالات قابو میں ہیں اور میرے نام کا سکّہ چل رہا ہے اس لیے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ میں اب اپنی منت پوری کر لوں اور خطبے میں آئمہ اثنا عشر کے نام شامل کیے جائیں [1] جب یوسف کو خبر ملی کہ شاہ اسمٰعیل صفوی نے ایران میں خطبہ اثنا عشری پڑھوایا ہے تو یوسف عادل شاہ کا حوصلہ بلند ہوا اور اس نے ذی الحجہ ۹۱۰ھ میں روز جمعہ بیجاپور کی مسجد قلعہ ارک میں نماز پڑھی اور نصیب خان سے جو سادات مدینہ سے تھا اذان دلوائی جس میں حضرت علی کا نام لیا گیا تھا۔ خطبہ میں آئمہ معصومین کے نام شامل کیے گئے۔ ڈی، سی، ورما "ہسٹری آف بیجاپور" میں لکھتے ہیں کہ دوسرے حکمرانوں نے یوسف کو اس سے باز رکھنا چاہا تھا۔ لیکن وہ اپنے ارادے کا پکا تھا [2] بقول ابوالنصر محمد خالدی "ہندوستان کی تاریخ میں بیجاپور پہلا مقام ہے جہاں سے شیعیت کے سرکاری مذہب ہونے کا اعلان ہوا [3] معین الدین عقیل رقمطراز ہیں کہ اس وقت تک دکن تو کیا برصغیر کے کسی خطے میں شیعہ مذہب کو سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہوئی تھی [4] "حدائق السلاطین" سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہندوستان میں بیجاپور ہی میں پہلی بار یہ مذہبی رویہ اختیار کیا گیا تھا [5] پی این چوپرا اور این سبرامنیم "ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا" میں لکھتے ہیں کہ تخت نشین ہونے کے بعد ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر بادشاہ نے ایران کے شاہ اسماعیل کی طرح شیعیت کو عادل شاہی حکومت میں سرکاری مذہب قرار دیا۔ مذہبی خیالات کی بنا پر قطب الملک بانی سلطنت گولکنڈہ اس کا خیر خواہ اور ہمدرد بن گیا تھا [6]

---

[1] جان برگس۔ رائز آف دی محمڈن پاور اِن انڈیا (انگریزی)۔ جلد سوم صـ۱۳

[2] ڈی، سی، ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور (انگریزی) باب چہارم۔ صـ۵۲

[3] ابوالنصر محمد خالدی۔ کچھ دکھنی کلام۔ (مضمون) مشمولہ نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۶۴ء۔ صـ۲۹

[4] معین الدین عقیل۔ دکن اور ایران۔ صـ۳۹

[5] علی بن طیفور بسطامی مخطوطہ حدائق السلاطین نمبر ۵۲، کتب خانہ سالار جنگ۔ صـ الف ۱۰۹

[6] پی این چوپرا اور این سبرامنیم۔ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ جلد دوم۔ صـ۱۰۱۔

Marfat.com

دکن کی پانچوں سلطنتوں کا عہد بہمنی سلطنت کی خاکستر سے تیار ہوا تھا اور ان ریاستوں نے اُن ہی روایات کی پیروی کی تھی جو بہمنی سلطنت میں مروج تھیں۔ یہاں اہلبیت اطہار سے مروّت بھی عقائد کا ایک جزو بن گئی تھی۔

بیجاپور تاریخی اعتبار سے ایک قدیم شہر ہے ۷۳-۱۶ کے ایک کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ چالوکیہ خاندان کے چھٹے حکمران راجہ بکرمادتیا نے بھی بیجاپور کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا[1] اس وقت اس شہر کا نام "بجن پلی" تھا یادو خاندان کے زمانے میں ۱۱۶۶ء میں دیوگری کے راجہ جیتگی کے عہد حکومت میں بیجاپور یادو خاندان کی راجدھانی تھا علاء الدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور کے دیوگیری (دولت آباد) پر حملے کے دوران یادو خاندان کا آخری حکمراں شنکر دیو مارا گیا تھا ملک کافور کے بعد اس کے بیٹے کریم الدین نے اس علاقے پر اپنا تسلط برقرار رکھا۔ بہمنی دور میں یہ علاقہ بہمنی حکومت کے تحت رہا۔ محمود گاواں اسی علاقے کا حاکم اعلا تھا اور جب بہمنی سلطنت کا زوال ہوا تو یوسف عادل شاہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بیجاپور کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ یوسف عادل شاہ نے شہر کے گرد مضبوط فصیل تعمیر کروائی تھی۔ اعلیٰ پور دروازہ، بادشاہ پور دروازہ، بہمنی دروازہ، شہ پور دروازہ، ملکہ دروازہ، سارواڑ، ڈوبی اور فتح دروازہ کے درمیان شہر بیجاپور بسایا گیا تھا۔[2] بیجاپور میں بولی گنبد کے قریب نقارخانہ واقع ہے اور اس میں اب حکومت کرناٹک نے میوزیم قایم کر دیا ہے۔ اس میوزیم میں شہر بیجاپور کا ایک قدیم نقشہ موجود ہے جس میں ان تمام دروازوں اور قدیم مقامات کے ناموں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

یوسف عادل شاہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نہایت وجیہہ اور اچھے ڈیل ڈول کا بادشاہ تھا۔ خوش نویسی اور علم عروض سے اُسے بڑا شغف تھا اور فن موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ موسیقی کے جلسوں میں بقول علی بن طیفور بسطامی

---

[1] قاسم قادری بانگی بیجاپور۔ سیر بیجاپور۔ ص ۱

[2] ڈی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور (انگریزی) باب چہارم۔ ص ۵۲

Marfat.com

فی البدیہ شعر سُنایا کرتا تھا۔ یوسف عادل شاہ جہاں تدبر اور دانشمندی میں شہرت رکھتا تھا وہیں وہ ایک عالم، شاعر اور ماہر موسیقی بھی تصور کیا جاتا تھا[1] طنبور اور عود بجانے میں اُسے کمال حاصل تھا[2] اس نے روم، ایران، توران اور عرب سے بہت سے فنکار بیجاپور بلوائے تھے۔ پی ایم جوشی لکھتے ہیں کہ اس نے کئی شعراء کی سرپرستی کی۔ یوسف کو مصوری کے علاوہ فن حرب وضرب اور مرصع سازی (Jewel Setting) میں کمال حاصل تھا۔ یوسف انتہائی شائستہ انسان تھا اور کبھی کوئی غیر شائستہ کلمہ اس کی زبان سے ادا نہیں ہوتا تھا[3] فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ یوسف نے فن موسیقی میں ایسی دستگاہ بہم پہنچائی تھی کہ وہ اپنے عہد کے ممتاز موسیقاروں میں شمار کیا جاتا تھا اس کے عہد میں ایرانی فنکار زمان گیلانی اور حسین قزوینی سازندہ بیجاپور بلوائے گئے تھے۔

ایشوری پرشاد نے یوسف عادل کی سیرت کو بہت سراہا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ انتہائی وسیع النظر بادشاہ تھا اور بلا لحاظ مذہب اپنی تمام رعایا کی فلاح و بہبودی کا متمنی تھا۔ مذہبی رواداری کے اعتبار سے اس مورخ نے یوسف عادل شاہ کو ایک بے مثل حکمران تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یوسف نے سکندر راؤ کی راجکماری سے جو ایک مرہٹہ خاتون تھی شادی کی تھی[4] یوسف عادل شاہ کا بچپن بقول محمد قاسم فرشتہ ایران میں گزرا تھا اور وہ "رومی نژاد" تھا اس لیے فارسی اور ترکی زبانوں سے اس کی شخصی دلچسپی ایک فطری بات معلوم ہوتی ہے[5]

یوسف عادل شاہ نے آزاد سلطنت کی بنا ڈالی اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا لیکن روایت کے مطابق اپنے نام کا سکہ جاری نہیں کروایا۔ ڈاکٹر

---

[1] علی بن طیفور بسطامی۔ مخطوطہ حدائق السلاطین مخطوطہ نمبر ۵۲۷ کتب خانہ سالار جنگ ص ۱۹ ب۔

[2] سید علی بلگرامی۔ تاریخ دکن۔ حصہ اول۔ ص ۲۹۹

[3] پی ایم جوشی۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن۔ جلد اول۔ ص ۲۹۵

[4] ایشور پرشاد۔ ہسٹری آف میڈیویل انڈیا۔ ص ۴۱۴

[5] محمد قاسم فرشتہ (مترجم فدا علی طالب)۔ تاریخ فرشتہ جلد سوم ص ۲۴۷

Marfat.com

پی۔ ایل گپتا لکھتے ہیں کہ پہلے تین عادل شاہی بادشاہوں کے نام کے سکّے دستیاب نہیں ہوتے کیونکہ یوسف نے بیجاپور میں نئی حکومت قائم کرنے کے بعد اپنے نام کا سکّہ جاری نہیں کیا تھا اور قدیم سکّوں کا چلن برقرار رکھا تھا[1]

ڈاکٹر پی ایم جوشی نے یوسف عادل شاہ کو ایک اچھا شاعر اور مصنّف بتاتے ہوئے اس کا تخلص وفائی تحریر کیا ہے[2] لیکن "کلام الملوک" کے مصنف کا بیان اس سلسلے میں صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یوسف عادل شاہ کا تخلص یوسف تھا[3] وہ شعراء کا سچا سرپرست اور قدر شناس تھا بچپن میں اس کی تربیت دلشاد آغا کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ اَنکا اور اَنکا اس کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ یہ دونوں خواتین ترکی تھیں اور یوسف اسی زبان میں ان سے گفتگو کرتا تھا اس لیے ابتدا ہی سے ترکی اور فارسی زبانوں پر یوسف کو عبور حاصل ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں بقول مورخ جوشی بیجاپور کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی[4] لیکن عبدالحق "ہندوی" کو اس کی ثانوی زبان لکھتے ہیں۔ یوسف عادل شاہ بانی مملکت بیجاپور نے شعراء کے علاوہ اہل حرفہ اور اہل علم کی خدمت اور سرپرستی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ اسی زمانے میں حاجی رومی، شیخ نصیرالدین، نصراللہ ولی، پیر جمنا اور حضرت پیر مقصود بیجاپور تشریف لائے تھے[5] سلاطین بیجاپور کی علم دوستی نے اس دارالسلطنت کو علماء و فضلاء کا مسکن و مامن بنا دیا تھا[6]

یوسف کے عہد میں بچوں کو جن ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا ان سے بھی ہندوستانی رنگ جھلکتا ہے۔ خود یوسف کی بیٹی کا نام بی بی ستی تھا۔ اس

---

[1] ڈاکٹر پی ایل گپتا۔ کائنج۔ باب ہفتم۔ صـ۴۴۲

[2] پی ایم جوشی۔ ہسٹری آف میڈیویل انڈیا۔ جلد اول۔ صـ۲۹۵

[3] میر سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک۔ صـ۱۸، ۱۹

[4] پی ایم جوشی۔ ہسٹری آف میڈیویل انڈیا۔ جلد اول۔ صـ۲۹۵

[5] عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ صـ۸۲

[6] نصیرالدین ہاشمی۔ شاہان دکن کی اردو شاعری (مضمون) مشمولہ نوائے ادب۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء۔ صـ۶۲

Marfat.com

زمانے میں ملک کی حفاظت کی خاطر جن نوجوانوں کو فوجی تربیت دی جاتی تھی وہ "چیلے" کہلاتے تھے۔

ایران کے بادشاہوں سے یوسف عادل شاہ کے خوشگوار تعلقات تھے۔ عقائد کی ہم آہنگی اور سیاسی مصلحتوں سے قطع نظر بقول مورخ "ہسٹری آف بیجاپور" یوسف عادل شاہ کو ایران سے خاص موانست تھی جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایران اس کے آبائی وطن روم کی سرحد پر واقع تھا۔ ۱۵۰۴ء تک یوسف نے اپنی سلطنت کو سیاسی اور فوجی اعتبار سے مستحکم بنا لیا تھا اس نے سیّد احمد کو اپنا سفیر بنا کر شاہ اسماعیل صفوی کے دربار میں روانہ کیا تھا تاکہ بقول ڈی سی ورما ایران سے اپنی حکومت کے انسلاک کا اعلان کرے [1] یوسف نے بندرگاہ دابل تک محافظتی دستہ سفیر کے ساتھ بھیجا

یوسف عادل شاہ نے ایم اے نعیم کے بیان کے مطابق پچیس سال حکومت کی اور ۹۱۵ھ/۱۵۱۰ء میں انتقال کیا۔ اس وقت سلطنت بیجاپور کے حدود شمال میں دابل سے گوا تک اور جنوب میں دریائے بھیما سے کرشنا تک پھیل گئے تھے [2] علی بن طیفور بسطامی لکھتا ہے کہ ستاون سال کی عمر میں یوسف نے انتقال کیا تھا [3]

جیسا کہ کہا جا چکا ہے یوسف عادل شاہ فنون لطیفہ کا اچھا ذوق رکھتا تھا اور فارسی میں شعر کہتا تھا اور یوسف تخلص اختیار کیا تھا اس کی چند غزلیں اور رباعیات "کلام الملوک" میں محفوظ ہیں [4] ایک غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے ؎

مرا بہ بادہ بہ جامی فراغ یعنی چہ
سبو سبو و خم خم ایاغ یعنی چہ
ہوائے تازہ گلے در سراست یوسف را
وگرنہ عاشقی و گشت باغ یعنی چہ

---

[1] ڈی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور۔ باب چہارم۔ ص ۵۳

[2] ایم اے نعیم۔ اکسٹرنل ریلیشنس آف بیجاپور (انگریزی)۔ ص ۲۱

[3] علی بن طیفور بسطامی مخطوطہ حدائق السلاطین۔ نمبر ۵۲۷۔ کتب خانہ سالار جنگ ص ۱۰۹ ب

[4] میر سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک۔ ص ۱۸ تا ۲۰

Marfat.com

۱۵۰۵ء تک المیڈا (Almeida) نے جو پرتگالی تھا کوچین اور کنانور میں قلعہ تعمیر کر لیا تھا اور سرحد ملابار پر قابض ہوگیا تھا جس سے جنوبی ہند کی سلطنتیں پریشان ہوگئیں۔ بیجاپور اور دوسری سلطنتوں نے متحدہ ہوکر پرتگالی بیڑے کے سردار چاول (Chaul) کو شکست دی۔ ۱۵۱۰ء میں پرتگالیوں نے بنجم کا قلعہ فتح کر لیا لیکن یوسف عادل شاہ نے تین ہزار سپاہیوں کی مدد سے قلعہ واپس لے لیا[1]

یوسف عادل شاہ کے بعد اس کا خرد سال شہزادہ اسماعیل تخت نشین ہوا اور کمال خاں دکھنی سرنوبت، متولی مقرر ہوا۔ پرتگالی باشندہ اسبوکرک اس وقت کنانور میں مقیم تھا اور اپنے جہازوں کی مرمت کروا رہا تھا وہ جانتا تھا کہ گوا کی فوج نئے بادشاہ کی تخت نشینی کا جشن منانے بیجاپور گئی ہوئی ہے اور یہاں میدان خالی ہے۔ اس نے موقعہ کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گوا پر قبضہ کر لیا۔ گوا کے گرد ایک نئی فصیل پہلے ہی بنا دی گئی تھی اور خندق بھی تیار تھی اور اس کے گرد لکڑیوں کا حصار تھا جس کے نیچے جہاز بحفاظت تمام لنگر انداز ہو سکتے تھے۔ اس نے اہل قلعہ کو رشوت دی اور توپ گولوں کی مدد سے قلعے پر قبضہ کر لیا کمال خاں نے جو بیجاپوری قلعہ دار تھا اسی میں مصلحت سمجھی کہ پرتگالیوں کے ساتھ صلح کر لی جائے لیکن اس نے یہ شرط رکھی کہ قلعے کے معاملات پر پرتگالی دخل نہ دیں[2]

اسماعیل نے فوج کی تنظیم کی طرف بطور خاص توجہ کی۔ اس نے دس ہزار کا ایک لشکر جرار تیار کیا جس میں عرب، ایران، ترک کرد اور ازبکستان کے سپاہی شامل تھے[3] سب سے پہلے اسمٰعیل عادل شاہ نے ۱۵۱۴ء میں بہمنی سلطنت کے آخری بادشاہ محمود اور اس کے ولی عہد احمد کو شکست دی اور انھیں قید کر لیا لیکن اسمٰعیل نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی بہن

---

[1] ڈی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور۔ ص ۵۵

[2] سید علی بلگرامی۔ تاریخ دکن حصہ اول۔ ص ۲۹۱

[3] ایم اے نعیم۔ اکسٹرنل ریلیشنس آف بیجاپور۔ ص ۵۲

Marfat.com

بی بی ستی کی رسمِ رخصتی ادا کی۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی [1]

اسمٰعیل کے عہد میں اسمٰعیل صفوی کا سفیر محمود شاہ بہمنی کے دربار میں آیا تھا۔ جس کو وہ قیمتی تحائف سے سرفراز کرنا چاہتا تھا لیکن امیر برید نے اس کی ایک نہ مانی بالآخر محمود بہمنی نے اسمٰعیل سے مدد طلب کی۔ جب ایرانی سفیر بیجاپور آیا تو اس کے خیر مقدم کے لیے خود بادشاہ اعلیٰ پور تک گیا تھا۔ شاہ ایران نے ابراہیم بیگ ترکمان کو قیمتی تحائف کے ساتھ بیجاپور روانہ کیا تھا۔ شاہ ایران نے اسمٰعیل کو اپنے مکتوب میں ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے مخاطب کیا تھا جس کی وجہ سے دکن کے دوسرے حکمرانوں کی نظر میں اسمٰعیل عادل شاہ کی عزت و توقیر بڑھ گئی۔ شاہ ایران کے سرنامے کے الفاظ "مجد السلطنۃ والحشمۃ والشوکۃ والا اقبال اسمٰعیل عادل شاہ" اسمٰعیل عادل شاہ کے لیے باعث فخر تھے [2] بقول ڈی سی ورما اسمٰعیل نے جمعہ کے خطبے میں شاہ ایران کا نام شامل کیا اور عہدے داروں کو حکم دیا کہ وہ بارہ گوشوں والی سُرخ ٹوپی پہنیں۔ امیر برید کے قید ہونے کے بعد جو بہمنی خزانہ اسمٰعیل کو ہاتھ لگا تھا اس میں سے اس نے پچاس ہزار ہن نجف کربلا اور مشہد میں بطور خیرات تقسیم کروا دیے تھے [3]

۹۲۰ھ میں سر احمد ہروی کی کوششوں سے سیاسی مصلحت کے پیش نظر شولاپور میں برہان نظام شاہ والی احمد نگر اور اسمٰعیل عادل شاہ نے ملاقات کی۔ اس موقعے پر برہان نظام شاہ نے اسمٰعیل کی بہن شہزادی مریم سے شادی کی درخواست کی جسے اسمٰعیل نے بخوشی منظور کر لیا اور جہیز میں قیمتی اشیاء کے علاوہ کثیر تعداد میں ہاتھی اور گھوڑے بھی دیے اور اس طرح نظام شاہی سلطنت سے اسمٰعیل عادل شاہ کو کوئی خطرہ باقی نہیں رہا بقول جان برگس یہ شادی مئی ۱۵۲۴ء میں ہوئی تھی [4]

---

[1] ڈی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور۔ باب سوم۔ ص ۲۴

[2] سید علی بلگرامی۔ تاریخ دکن۔ جلد اول۔ ص ۳۰۴

[3] ڈی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور۔ باب چہارم۔ ص ۵۲

[4] جان برگس۔ رائز آف دی محمڈن پاور اِن انڈیا۔ ص ۳۰، ۳۱۔

Marfat.com

رفیع الدین شیرازی نے "تذکرۃ الملوک" میں اسمٰعیل کے عہد کی جنگوں کی تفصیل بیان کی ہے [1]

"گلدستہ بیجاپور" میں میر احمد علی لکھتے ہیں کہ اسمٰعیل کی فتوحات میں قلعہ مدگل کی تسخیر اور دیو ورک کی فتح خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اسمٰعیل نے ۱۵۱۹ء میں چندا پور آباد کیا جس کی تاریخ "ابتدائے چندا پور از اسمٰعیل بہ یاد" ہے۔ قلعہ مدگل کا بالا حصار تعمیر کرنے کی تاریخ "کہ قائم بستن بالا قلعہ" ہے [2]

اسمٰعیل کے زمانے میں عورتیں پردے کی سختی سے پابندی کرتی تھیں پان اور پان کا بیڑا عطا ہونا عزت و توقیر اور خوش بختی کی علامت تصور کی جاتی تھی [3] اسمٰعیل کے عہد میں دو افراد کی دو بدو لڑائی (Single Combat) کا طریقہ بھی رائج تھا عماد شاہ کے برادر نسبتی نے اسمٰعیل کو دعوت مبارزت دی تھی جس میں اسمٰعیل کامیاب رہا تھا۔ سواریوں میں گھوڑے اور ہاتھی کے علاوہ پالکیوں کا رواج تھا۔ خواتین کی پالکیوں پر پردے پڑے ہوتے۔ اسمٰعیل نے اپنے عہد حکومت میں تمدنی ترقی کی طرف بھی خاص توجہ کی تھی اور نئے شہر بسائے تھے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے چندا پور کے نام سے بادشاہ نے ایک بارونق شہر آباد کیا تھا جس میں شہری ضروریات کی تکمیل کا خیال رکھا گیا تھا۔ اسمٰعیل نے ایک شاہی محل بھی تعمیر کروایا تھا جسے اس نے چمپا محل کے نام سے موسوم کیا تھا [4]

۹۲۰ھ میں اسمٰعیل نے امیر برید کا بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ مقابلہ کر کے جب اسے شکست دی تو اسمٰعیل کی طاقت کا دکنی سلاطین کے دل میں سکہ بیٹھ گیا۔ امیر برید نے اسمٰعیل کو پیغام بھجوایا کہ اگر اس کی جاں بخشی کر دی جائے تو وہ شہر احمد نگر اور قلعہ بیدر بادشاہ کی نذر کرے گا۔ اسد خان نے اپنے چند مستعد ساتھیوں کے

---

[1] رفیع الدین شیرازی۔ مخطوطہ تذکرۃ الملوک، کتب خانہ سالار جنگ۔ نمبر ۱۴۲ صہ ۴۵ تا ۴۶

[2] خواجہ میر احمد علی (مرتب سید حمید شطاری)۔ گلدستہ بیجاپور۔ صہ ۱۹

[3] عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ صہ ۸۳

[4] " " " " صہ ۸۴

Marfat.com

ساتھ خزانے کی فہرست تیار کی۔ جب اسمٰعیل بہمنیوں کے وسیع و عریض اور شاندار دربار میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور علاء الدین عماد شاہ کے سامنے بہمنی خزانہ تقسیم کرنے اُسے بلوایا۔ اپنے حصّے سے اسمٰعیل نے نہ صرف نجف، کربلا اور مشہد کے فقراء کے لیے زرکثیر محفوظ کیا بلکہ بہمنی خزانے سے حاصل کی ہوئی دولت کا بڑا حصّہ شہر کے غرباء اور معززین میں تقسیم کر دیا[1] اسمٰعیل ۹۲۷ھ میں بیجانگر کے تمراج پر فوج کشی کے ارادے سے روانہ ہوا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ اسمٰعیل کی چڑھائی کی خبر سن کر تمراج رایچور کی طرف سے چلا آیا اور دریائے کرشنا کے کنارے ڈیرے ڈال دیے۔ دریا پار کروانے کے لیے چرمی ٹوکرے استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا تاکہ سپاہی آسانی کے ساتھ دریائے کرشنا کے دوسرے کنارے پر پہنچ جائیں لیکن ابھی تمام فوجیوں کے لیے چرمی ٹوکرے تیار بھی نہیں ہوئے تھے کہ اسمٰعیل نے حالت نشہ میں اپنا ہاتھی کرشنا میں ڈال دیا تقریباً دو ہزار سپاہی ٹوکروں کے ذریعے سے کنارے پر پہنچ گئے لیکن تمراج کے مقابلے میں اسمٰعیل کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور ڈیڑھ ہزار سپاہی مارے گئے یا دریا میں غرق ہو گئے اور اسمٰعیل جان بچا کر بیجاپور لوٹ آیا[2]

برہان نظام شاہ نے ۹۲۱ھ میں اسمٰعیل پر اس بہانے حملہ کر دیا کہ اس نے اس کی خانگی زندگی پر اعتراض کیا تھا کہ آمنہ طوائف کو شہزادیوں اور بیگمات شاہی کے برابر عزت دی جا رہی تھی۔ برہان نظام شاہ تیس[۳۰] ہزار سواروں اور توپ خانے کے ساتھ مقابلے کو آیا تھا۔ دکن کی ان دونوں سلطنتوں کے مابین یہ پہلی جنگ تھی۔ اسمٰعیل کامیاب و کامران رہا۔ اور بیجاپور میں ایک یادگار جشن اس فتح کی خوشی میں منعقد ہوا[3]

بقول ایم اے نعیم نسلی مناسبت کی وجہ سے بھی عادل شاہی حکمرانوں کے تعلقات شاہان ایران سے استوار رہے۔ حکومت ایران اور عادل شاہی حکومت کے مابین

---

[1] جان برگس۔ رائز آف دی محمڈن پاور اِن انڈیا۔ ص ۳۹

[2] سید علی بلگرامی۔ تاریخ دکن۔ جلد اول۔ ص ۲۰۴

[3] " " " " ص ۲۰۴

Marfat.com

تجارتی تعلقات بھی قایم تھے۔ بیجاپور اشیاء تجارت روانہ کرکے ایران سے گھوڑے حاصل کرتا جو فوج کے لیے ضروری تھی۔ بندرگاہ دابل سے ایران کی تجارت ہوتی تھی۔[1]

اسمٰعیل عادل شاہ فارسی کا ایک کہنہ مشق شاعر تھا اور وفائی تخلص کرتا تھا[2] اس کے اشعار سے اس کی علمیت اور دانشمندی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسمٰعیل کے کلام کا نمونہ "کلام الملوک" میں میر سعادت علی رضوی نے پیش کردیا ہے[3] "حدائق السلاطین" میں اسمٰعیل کی چند غزلیں نقل کی گئی ہیں ان کے دو مقطعے ملاحظہ ہوں[4]

ازاں با غمش خو گرفتہ وفائی
کہ غیر از غمش غم گساری ندارم

دل ریش وفائی آنچناں کرد با تیرش
کہ پیکانش بجائے مرہم افتاد ست پنداری

علی بن طیفور نے اسمٰعیل کی سیرت اور اس کے کردار کی بڑی تعریف کی ہے۔ اور اس کی مدت حکومت پچیس[25] سال بتائی ہے[5]

اسمٰعیل کا جانشین ابراہیم ایک بلند حوصلہ اور جری حکمران تھا علماء اور فضلاء کی قدردانی اور رعایا اور فوج کے ساتھ حسن سلوک کی وجہ سے وہ ممتاز اور مقبول بادشاہ ثابت ہوا تھا۔ بقول ایم اے نعیم وہ پہلا عادل شاہی حکمراں ہے جس نے "شاہ" کا لقب باقاعدہ طور پر اختیار کیا تھا[6] اس کے دور حکومت میں دارالسلطنت میں بعض اچھی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ ان میں سے ایک قصر شانزدہ ستون ہے جو اپنے منفرد طرز تعمیر کی وجہ سے اس دور کی ایک اہم تعمیراتی یادگار تصور کیا جاتا ہے اسمٰعیل اور پھر ابراہیم کے دور میں بیرون ملک کے تاجر قیمتی مال و اسباب لے کر بیجاپور آتے اور یہاں

---

[1] ایم اے نعیم۔ دی اکسٹرنل ریلشنس آف بیجاپور۔ ص۵۳

[2] نصیرالدین ہاشمی۔ شاہان دکن کی اردو شاعری۔ (مضمون) مشمولہ نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۴ء۔ ص۵۸

[3] میر سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک۔ ص۲۷۔

[4] علی بن طیفور بسطامی۔ مخطوطہ حدائق السلاطین۔ تذکرہ نمبر ۵۳۷ کتب خانہ سالار جنگ ص۱۱۰ ب

[5] ایم اے نعیم۔ اکسٹرنل ریلیشنس آف بیجاپور (انگریزی) ص۲۲

Marfat.com

کے بازاروں میں انھیں فروخت کر کے نفع کماتے تھے[1] جے این چودھری لکھتے ہیں کہ ابراہیم کے عہد کا سب سے اہم کارنامہ فارسی کے بجائے "ہندوی" کو دفتری زبان قرار دینا ہے اس نے مقامی روایات کی بڑی پاسداری کی اور آفاقیوں کو فوج سے خارج کر کے ان کی جگہ "دکھنیوں" کو سرفراز کیا تھا اس طرح ایک غیر ملکی زبان فارسی کی جگہ مقامی زبان یعنی دکنی کو مل گئی۔ شاہی دفاتر میں جو حسابات فارسی میں درج ہوتے تھے وہ اب ہندوی میں تحریر کیے جانے لگے اور سلطنت میں برہمنوں کا بول بالا ہو گیا[2] وی سی ورما رقمطراز ہیں کہ شاہی دفتروں میں فارسی کی جگہ "مرہٹی" نے لی تھی[3] "تاریخ فرشتہ" میں "امرائے غریب" کے "معزول" ہونے کا ذکر موجود ہے "دفتر فارسی را بر طرف ساختہ "ہندوی" کردو بہانہ را صاحب دخل گردانیدہ" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ بالکل یہی بیان خافی خان کا بھی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "ہندوی" سے کون سی زبان مراد ہے۔ جنوبی ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتیں قایم تھیں مقامی زبانوں میں مراہٹی، تلگو یا کنڑی بولنے والوں کی خاصی تعداد تھی لیکن ان میں سے کسی زبان کے لیے بھی لفظ "ہندوی" استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف ابتدا ہی سے دکنی کے لیے "ہندوی" یا "ہندی" نام مختلف ادبی کاوشوں میں ملتا ہے۔ مثلاً میراں جی شمس العشاق کہتے ہیں ؎

ہیں عربی بول کیرے ـــــ اور فارسی بہترے
یہ ہندی بولوں سب ـــــ ان ارتوں کے سبب

اشرف "نوسرہار" میں کہتے ہیں ؎

نوسرہار اس دھریا نانوں ـــــ جائے رکھا نواب پرٹھاوں
نظم لکھی سب موزوں آں ـــــ یو سب ہندوی کر آساں

---

[1] عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ ص ۸۴

[2] جے این چودھری۔ دی مغل ایمپائر۔ چودھواں باب۔ ص ۴۴۹

[3] وی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور ص ۲۰

Marfat.com

برہان الدین جانم نے کہا تھا ؎

عیب نہ راکھیں ہندی بول　　معنیٰ تو چک دیکھ دھنڈول
ہندی بولوں کیا بکھان　　جے گربر سایا تھا منج گیان[1]

"بساتین السلاطین" میں علی عادل شاہ ثانی کے دور کی زبان کو "ہندی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مورخ لکھتا ہے :-

"اما چوں طبع ہمایوں پاشاہ اکثر میل بجانب لغت خاص خویش یعنی زبان دکنی داشت ..... شعرائے ہندی گو بسیار از خاک بیجاپور برخاستہ اند"[2] ؎

عہد عادل شاہی کے مورخ کے اس بیان سے واضح طور پر یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ دکنی اور ہندی ایک ہی زبان کے دو نام تھے اور دکنی کو لفظ "ہندی" سے موسوم کیا جاتا تھا۔ باقر آگاہ کے کلام سے (جو جنوبی ہند میں دکنی کے آخری بڑے شاعر تھے) ایک اور مرتبہ قطعی طور پر اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ باقر آگاہ کہتے ہیں ؎

ولے بعض یاراں کا ایماں ہوا
سو ہندی زباں یہ رسالہ ہوا
ہے دکنی میں مجکو مہارت تی
کہ النصر منکم کہے نصرتی[3] ؎

مختصر یہ کہ عادل شاہی دربار میں جب مقامی زبان نے فارسی کی جگہ لے لی اور شاہی حسابات کی ذمہ داری برہمنوں نے سنبھالی، تو دربار میں ان کا اثر ورسوخ بڑھنے لگا۔ برہمن، شہزادہ یا شہزادی کی پیدائش پر جنم پتری اور علم نجوم کے ماہر زائچہ تیار کرتے تھے۔ دکنی مثنویوں میں اہل تنجیم کی خدمات کا ذکر بار بار ہماری نظر سے

---

[1] عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ ص ۵۶، ۵۷
[2] محمد ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ ص ۲۳۰
[3] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۱۷

Marfat.com

گزرتا ہے۔ گلشن عشق کی ایک منظوم سرخی ؎

بیان شہزادہ پہنچا سو ہو راس کا نانو مہتر رکھ
جم کا لکھ پتر دیتے جو طالع کھول کر گیانی
ہے جس کے تحت اخبر تی کہتا ہے ؎
سہلیاں جو جتنیاں اتھیاں دھر جرس
سمجھنے منجم گھڑی وہ سرس
لیے لکھ نجومی اسی پل کو تب
بجایاں جرس جلد اسی وقت سب
بلایا انگے سب نجومیاں کی صف
پچھیں شاہ پھر آ کے مجلس طرب
جسے حل اتھا وید و پستک پراں
جو سرتس میں جس نانو تھا ئن تدھاں
رکھیا نانو اس کا سو مہتر کنور
پچھیں خوب تقدیم پر دھر نظر
ہوا خوش سمج بخت میں بے مثال
پچھیں اس کے طالع دکھا کر خیال
قوی بخت کا تس ستارا دسیا
شہ یک چتر کا ہونہارا دسیا

ابراہیم کے عہد میں بقول ڈی سی ورما مصنف "ہسٹری آف بیجاپور" ایران سے تعلقات کمزور پڑ گئے تھے کیوں کہ ابراہیم نے اپنے آبا و اجداد کے عقائد قبول نہیں کیے تھے[1] اس نے بارہ اماموں کے نام خطبے سے خارج کر دیے اور آفاقیوں کو معزول کر کے ان کی جگہ دکھنیوں کو دی۔ اس حکمتِ عملی کو ایم اے نعیم نے "انٹی آفاقی پالیسی" تحریر کیا ہے[2]

برہان نظام شاہ نے قلعہ کلیان واپس لینے کا منصوبہ بنا کر رام راج کے پاس اپنا سفیر روانہ کیا تھا۔ رائچور میں ان دونوں نے ملاقات کی اور یہ طے پایا کہ مدگل اور رائچور رام راج کے لیے حاصل کیے جائیں گے اور شولاپور برہان نظام شاہ کے لیے وقف کر دیا جائے گا۔ یہ منصوبہ کامیاب رہا۔ ابراہیم عادل شاہ نے بیجاپور سے بھاری لشکر کے ساتھ کوچ کیا اور شہزادہ علی کی کمک کے لیے روانہ ہو گیا دونوں فوجوں میں شولاپور کے مقام پر تصادم ہوا۔ ابراہیم نے

---

[1] ڈی، سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور۔ ص ۵۴

[2] ایم اے نعیم۔ دی اکسٹرنل ریلیشنس آف بیجاپور۔ ص ۲۲

Marfat.com

سیف الملک جیلانی اور آنکس خاں کو میمنہ پر مقرر کیا اور میسرے کے لیے نور خاں اور عماد الملک کو منتخب کیا اور خود قلب لشکر میں سواروں کے ساتھ جگہ سنبھالی۔ نظام شاہی فوجوں نے سیف الملک جیلانی کو گھیر لیا اور عادل شاہی فوج میں ہراسانی پھیل گئی۔ ابراہیم نے میدان جنگ سے راہِ فرار اختیار کی اور بیجاپور پہنچ گیا۔ وہ سیف الملک جیلانی سے یہ سمجھ کر ناراض تھا کہ اس کی وجہ سے عادل شاہی فوج کو ہزیمت اٹھانی پڑی تھی اس لیے جب سیف الملک جیلانی نے مدد طلب کی تو ابراہیم نے انکار کر دیا بالآخر مجبوراً سیف الملک جیلانی کو شاہی افواج کے خلاف صف آرا ہونا پڑا۔ ابراہیم نے رام راج سے مدد طلب کی اور اُسے تحفتاً بارہ لاکھ ہون بھیجے اس نے اپنے بھائی کو ایک لشکر جرار کے ساتھ عادل شاہی فوجوں کی مدد کے لیے روانہ کیا اور سیف الملک اور صلابت خاں کو چاروں طرف سے گھیر کر پسپا کر دیا۔ سیف الملک میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا اور حسین نظام شاہ کے یہاں پناہ لی[1]

ابراہیم عادل شاہ کثرتِ شراب نوشی اور اپنی بُری عادتوں کی وجہ سے ایسا بیمار ہوا کہ پھر صحت یاب نہ ہو سکا۔ اطباء طلب کیے گئے لیکن دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ دیکھ کر مشہور اطباء و حکماء اپنی جان بچا کر بیجاپور کے حدود سے باہر جانے لگے۔ ایشوری پرشاد نے ابراہیم کا سنہ وفات ۱۵۵۸ء بتایا ہے[2] لیکن جان برگس نے ۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء تحریر کیا ہے[3] "تذکرۃ الملوک" میں رفیع الدین شیرازی لکھتا ہے کہ ابراہیم کا انتقال مرض بواسیر سے ہوا تھا[4]۔

ابراہیم کی وفات کے بعد علی عادل شاہ خلاف توقع تخت نشین ہوا خود ابراہیم نے اپنے دوسرے بیٹے طہماسپ کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ احمد نگر کی شہزادی

---

[1] جان برگس۔ رائز آف دی محمڈن پاور اِن انڈیا۔ (انگریزی) جلد سوم۔ صـ ۶۷، ۶۸

[2] ایشوری پرشاد۔ ہسٹری آف میڈیویل انڈیا۔ صـ ۴۱۶

[3] جان برگس۔ رائز آف دی محمڈن پاور اِن انڈیا۔ (انگریزی) جلد سوم۔ صـ ۶۸

[4] رفیع الدین شیرازی مخطوطہ تذکرۃ الملوک۔ نمبر ۱۴۲۔ کتب خانہ سالار جنگ صـ ۵۸

Marfat.com

چاند بی بی علی سے بیاہی گئی تھی۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھا اور خود کو "علی شیر" کہا کرتا تھا۔ رفیع الدین شیرازی نے "تذکرۃ الملوک" میں اس کی سیرت پر روشنی ڈالی ہے۔ مورخ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ چند ککڑیاں بادشاہ کے سامنے پیش کی گئیں ان میں سے ایک کے اس نے چار ٹکڑے کر دیے اور ایک ٹکڑا رفیع الدین شیرازی کو دیا۔ رفیع الدین اس ٹکڑے کو جو انتہائی کڑوا تھا منھ میں بھی نہ رکھ سکا لیکن علی نے بڑی رغبت سے اسے کھا لیا [1]

علی ایک امن پسند بادشاہ تھا وہ صلح کل کا قائل تھا اس نے وجیا نگر کے راجا رام راج سے خوشگوار تعلقات قایم کر لیے تھے۔ وہ اس کی رانی کو "ماں" کہا کرتا تھا اور اس کے راجکمار کے انتقال پر پرسہ دینے خود بہ نفس نفیس وجیا نگر گیا تھا۔ اس کے عہد حکومت میں سلطنت وسیع ہو کر مغربی ساحل ہونا وار تک جا پہنچی تھی اور جنوب میں وردا اور دریائے تنگبھدرا تک پھیل گئی تھی اسی زمانے میں مغل دربار سے سفارتی تعلقات بھی قایم ہوئے [2] علی نے خاندانی روایات کو برقرار رکھا اور موسیقی کی سرپرستی کی علی کے عہد حکومت میں عراق، عرب، ایران اور دوسرے مقامات سے علماء آکر بیجاپور میں مقیم ہو گئے تھے یہ لوگ درس و تدریس اور تبلیغ و اشاعت کے کاموں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ خود بادشاہ کو مطالعے کا بڑا شوق تھا اور اس کے محل میں ایک عمدہ کتب خانہ موجود تھا کہا جاتا ہے کہ علی کتب بینی کا اتنا دلدادہ تھا کہ سفر پر جاتا تو کتابوں کے صندوق بھی ساتھ لے جاتا تھا۔

علی عادل شاہ نے دو نہروں کے درمیان ایک خوبصورت باغ تیار کروایا تھا اور ایک دلکشا مسجد بھی تعمیر کی تھی جس کا نام حضرت علی کے نام پر "مسجد غالب" رکھا گیا تھا اس مسجد میں ایک ہزار تینتیس [1033] چراغ دان تھے اور یہ اعداد لفظ "غالب" سے برآمد ہوتے ہیں بیجاپور کی فصیل اور ہریا محل اسی کے دور کی نشانیاں ہیں۔

---

[1] رفیع الدین شیرازی۔ مخطوطہ تذکرۃ الملوک۔ نمبر ۱۴۲۔ کتب خانہ سالار جنگ صـ۹۰

[2] ایم اے نعیم دی اکسٹرنل ریلیشنس آف بیجاپور۔ صـ۲۳

Marfat.com

علی عادل شاہ اول کے عہد میں جامع مسجد کی بنیاد ڈالی گئی تھی یہ مسجد بیجاپور شہر کے مشرقی حصّے میں واقع ہے اور ۱۱۶۳۰۰ مربع فیٹ کے وسیع رقبے پر محیط ہے۔ علی نے دارالسلطنت کی شان دوبالا کرنے خدا کا یہ گھر تعمیر کروایا تھا اس کے دور میں مسجد مکمل ہو چکی تھی لیکن بعد کے عادل شاہی سلاطین اور اورنگ زیب نے اس میں اضافے کیے ہیں یہی وجہ ہے کہ اندرونی حصّے میں جہاں اس کا صحن واقع ہے سیاح کو اس کا شدید احساس ہوتا ہے کہ یہ اصل پلان کا حصّہ نہیں بلکہ بعد کا اضافہ ہے۔ صحن میں وسیع وکشادہ حوض تعمیر کیا گیا ہے۔ اس مسجد کی اصل خوبی اس کا مرکزی محراب ہے۔ جس پر سبز، لاجوردی سنہری اور دیگر رنگوں سے ایسے خوبصورت نقش ونگار بنائے گئے ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں بالخصوص سنہری رنگ پگھلتا ہوا سونا دکھائی دیتا ہے۔ بیل بوٹوں اور نقش ونگار کے درمیان آیات قرآنی درج ہیں۔ یہ بیجاپور میں منبت کاری کا اعلا ترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ محمد عادل شاہ نے ۱۶۳۶ء میں ملک یاقوت مصور وخوش نویس سے اس محراب کے نقش ونگار کی تکمیل کروائی تھی[1] جامع مسجد کا فرش آج بھی انتہائی صاف، چمک دار اور چکنا نظر آتا ہے جس پر سیاہی سے مصلیٰ کے نشان بنا دیے گئے ہیں اور اس طرح سوا دو سو نمازیوں کے لیے گنجائش فراہم کی گئی ہے۔ یہ مسجد اپنے خوبصورت اور بلند گنبد کی وجہ سے دکنی تعمیر کا ایک اعلا نمونہ تصور کی جاتی ہے اس کی تمام محرابوں کی سائز ایک ہی ہے سوائے درمیانی محراب کے جس پر بکثرت نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔ پیپل کا درخت جو ہندوؤں میں متبرک تصور کیا جاتا ہے بڑے اہتمام کے ساتھ منقش ہے۔ اور یہ منبت کاری کا نایاب نمونہ ہے۔" کلچرل ٹرنڈس اِن میڈیویل انڈیا" میں ہارون خان شیروانی رقمطراز ہیں کہ چوں کہ سلاطین بیجاپور کا تعلق ترکی سے تھا اس لیے ان کی عمارتوں پر" ہلال" کا نشان کندہ کیا جاتا تھا[2]

پرسی براؤن نے اس مسجد کو بیجاپور کی بہترین عمارت قرار دیا ہے اور وہ اس

---

[1] قاسم قادری بانگی بیجاپوری سیر بیجاپور ص ۱۳

[2] ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈس اِن میڈیویل انڈیا۔ ص ۲۳

Marfat.com

کے طرز تعمیر کی دلکشی اور تناسب کی بڑی ستائش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ مسجد بیجاپور کے آرکٹکچر کا اعلا ترین نمونہ ہے۔ مسجد کی بیرونی ساخت کے علاوہ اندرونی حصہ بھی انتہائی خوبصورت اور متاثر کن ہے [1]

"گلدستہ بیجاپور" کا مورخ لکھتا ہے کہ علی نے ۹۸۸ھ میں "نوطاس رات" کو رحلت کی [2] علی عادل شاہ نے سلطنت کی بقاء اور ترقی کے مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ گوا یورپی باشندوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ علی عادل شاہ نے ۹۷۶ھ/۱۵۶۸ء میں گوا پر چڑھائی کی لیکن ناکام رہا تو وہ ادونی کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ قلعہ اس وقت رام راج کے ایک اعلا فوجی عہدیدار کے قبضے میں تھا اور رام راج کے انتقال کے بعد وہ اس پر قابض و متصرف ہو گیا تھا آنکس خان نے آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ حملہ کر دیا۔ یہ راجا خاطر خواہ رسد جمع کر چکا تھا اس لیے قلعہ میں محصور ہو گیا لیکن آنکس خان کے سخت اور طویل محاصرے نے اس کے دانت کھٹے کر دیے اور بالآخر وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا اور اس طرح قلعہ ادونی علی عادل شاہ کے قبضے میں آگیا [3] اسی طرح ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء میں تورکل کے قلعے کی طرف پیش قدمی کی۔ یہ قلعہ وینکٹ رائے کے قبضے میں تھا۔ سات ماہ کے محاصرے کے بعد وینکٹ رائے نے خود کو علی عادل شاہ کے حوالے کر دیا [4] علی عادل شاہ کے عہد کے سکّے عادل شاہی دور کے پہلے سکّے ہیں۔ علی اور اس کے جانشینوں نے تین قسم کے تانبے کے سکّے جاری کیے تھے ان کا وزن ساٹھ، ایک سو بیس اور ایک سو اسّی گرین تھا یہ سکّے گول اور چوکور دونوں وضع کے ہوتے تھے۔ علی عادل شاہ اول کے سکّوں پر "علی ابن ابی طالب" کندہ ہے دوسری جانب "اسد اللہ الغالب" کے الفاظ کندہ کیے گئے ہیں [5] پی ایل گپتا لکھتے ہیں

---

[1] پرسی براؤن۔ انڈین آرکٹکچر (اسلامک پیریڈ)۔ ص ۷۴

[2] خواجہ میر احمد علی (مرتب سید حمید شطاری) ص ۲۹

[3] جان برگس۔ رائز آف محمڈن پاورز ان انڈیا (انگریزی) جلد سوم۔ ص ۸۱، ۸۲

[4] " " " " ص ۸۲

[5] پی ایل گپتا۔ میڈیویل دکن۔ باب ہفتم۔ ص ۴۳۲

Marfat.com

کہ ان سکوں سے بادشاہ کے عقائد کا اظہار ہوتا ہے [1]

ڈاکٹر ایم اے نعیم عادل شاہی بادشاہوں کے مواصلاتی نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علی عادل شاہ اول نے تین سو برہمن ہرکارے، سات سو جاسوس اور متعدد خطوط رساں ملازم رکھے تھے ان کا کام خطوط رسانی اور خبر رسانی تھا۔ یہ جاسوس اور ہرکارے براہ راست وزیر اعلیٰ کے تحت ہوتے جو ان کی نگرانی کرتا رہتا تھا۔ یہ شاہی ملازم براہ راست بادشاہ سے بھی اہم خبریں فوری ارسال کرنے کے لیے ملاقات کر سکتے تھے۔ جاسوس سلطنت کے تمام مقامات کی خبریں بادشاہ تک پہنچاتے۔ خطوط رساں پایہ تخت سے مختلف قصبات کو مراسلے اور مکتوب لے جاتے تھے [2]

"بساتین السلاطین" میں ابراہیم زبیری لکھتا ہے کہ بادشاہ مخبروں اور جاسوسوں کی لائی ہوئی خبریں روزانہ دربار عام میں سنا یا کرتا ان رپورٹوں کی روشنی میں مخصوص احکام صادر کیے جاتے سوائے جمعہ کے ہر روز اس پر عمل ہوتا تھا۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی نو سال کی عمر میں اپنے چچا علی عادل شاہ اوّل کے انتقال پر ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا اس نو عمر بادشاہ کو امورِ سلطنت میں مدد دینے کے لیے متولی مقرر کر دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے کامل خان پھر شکور خان، اخلاص خاں اور آخر میں دلاور خان متولی کی حیثیت سے انتظامِ سلطنت کی نگرانی کرتے رہے ابراہیم کی تربیت اس کی چچی احمد نگر کی مشہور شہزادی اور علی عادل شاہ اول کی ملکہ چاند سلطانہ نے کی تھی۔ ابراہیم کو چاند بی بی سے والہانہ الفت و عقیدت تھی۔ اپنی ایک نظم میں اس نے اپنے جذباتِ خلوص کو الفاظ کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔ متولیوں کے زمانے میں ابراہیم کی خود اعتمادی اور اس کی عملی صلاحیتیں بروئے کار نہ آ سکی تھیں۔ دلاور خاں کے زوال (۱۵۹۰، ۹۱ء) کے بعد زمام حکومت اس کے ہاتھ میں آئی۔ فضنر اللہ انجو کو جو عالم بے بدل تصور کیے جاتے تھے وکیل السلطنت

---

[1] پی۔ ایل گپتا۔ میڈیویل دکن۔ باب ہفتم۔ ص ۴۴۲

[2] ایم اے نعیم۔ پوسٹل کمیونیکشن۔ باب ہشتم۔ میڈیویل دکن۔ ص ۴۷۰

Marfat.com

مقرر کیا اور ملک نائب خطاب عطا کیا۔ ابراہیم نے اپنی ذاتی قابلیت، دانشمندانہ حکمت عملی اور معرکہ آرائی کے ذریعے سے سلطنت کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا۔

ابراہیم کے عہد میں عادل شاہی سلطنت کے حدود ملابار کی سرحد تک پہنچ گئے تھے اور کرناٹک اور میسور کے نائک اسے خراج ادا کرتے تھے۔ ابراہیم عادل شاہ نے صیغہ محاسبی کی طرف بطور خاص توجہ کی اور حسابات کی جانچ پڑتال اور اندراجات کے طریقوں کو بہتر بنایا۔ علی بن طیفور بسطامی لکھتا ہے کہ ابراہیم کے دور میں حسابات کے لیے مرہٹی زبان استعمال کی جاتی تھی[1] ابراہیم نے اس زبان کی ترقی سے بھی دلچسپی لی اور حسابات میں باقاعدگی پیدا کی۔ اہم دستاویزات فارسی میں تحریر کیے جاتے تھے اور حسابات مرہٹی میں اور اس طرح کی دولسانی سرکاری دستاویزات کی پیشانی پر جو دعائیہ کلمات تحریر کیے جاتے تھے ان میں سرسوتی کا نام ہوتا جو علم کی دیوی تصور کی جاتی ہے[2] پی۔ جی لالے نے "پرسنالٹی آف ابراہیم علی شاہ ایز رفلکٹیڈ ان نورس منجری" میں ابراہیم عادل شاہ کی وسیع النظری اور رواداری کو بہت سراہا ہے[3] ایم اے نعیم لکھتے ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ نے آفاقیوں اور دکنیوں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی اور سیاسی ہم آہنگی برقرار رکھنے کے ابراہیم نے نظام شاہی اور قطب شاہی خاندانوں سے شادی بیاہ کرکے اچھے تعلقات قایم کر لیے۔ بیجاپور کی شہزادی خدیجہ ۱۵۸۰ء میں احمد نگر کے شہزادے سے بیاہی گئی تھی اور خود ابراہیم نے ۱۵۸۶ء میں قطب شاہ کی بہن سے شادی کی اور مغل شہزادہ دانیال سے اپنی بیٹی کا بیاہ کیا[4]

---

[1] علی بن طیفور بسطامی مخطوطہ حدائق السلاطین تذکرہ نمبر ۵۲۷۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۱۱۱ الف۔

[2] پی جی لالے۔ پرسنالٹی آف ابراہیم علی شاہ ایز رفلکٹیڈ ان نورس منجری (مقالہ) مشمولہ جنانم پرتم ۱۹۸۵ء ص ۵۳

[3] ایم اے نعیم دی اکسٹرنل ریلیشنس آف بیجاپور۔ ص ۲۴

Marfat.com

۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں ابراہیم نے دارالسلطنت بیجاپور کا نام تبدیل کرکے بیدیا پور رکھا تھا[1] چنانچہ اس کے عہد کا ایک شاعر عبدل کہتا ہے ؎

سنوں اب صفت شہہ رہن تخت ٹھاؤں
بدیا پور نگر ہے بھی اس کا جوناؤں

تاریخ گلدستہ بیجاپور سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ محمد عادل شاہ کی تخت نشینی کا ذکر کرتے ہوئے مورخ لکھتا ہے کہ دارالسلطنت بدیاپور میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کی وصیت کے مطابق محمد عادل شاہ کی تاج پوشی کی گئی تھی[2] جس سے پتہ چلتا ہے یہ نام بانی شہر کی وفات کے بعد بھی برقرار رہا۔ نجومیوں کی ہدایت کے مطابق پایۂ تخت یہاں منتقل نہیں کیا گیا تھا لیکن بادشاہ کا زیادہ وقت یہاں کے تو تعمیر محلات میں گزرتا تھا "تذکرۃ الملوک" میں رفیع الدین شیرازی لکھتا ہے کہ ۱۰۰۸ھ میں نورسپور کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور بیجاپور سے ایک فرسخ پر یہ شہر آباد کیا گیا تھا ہر روز بیس ہزار گل کار اور سنگ تراش اور مزدور یہاں کام کرتے تھے۔ بدیا پور اور نورس پور بڑے اہتمام کے ساتھ بسائے گئے تھے[3] ابراہیم نے ایک مستحکم حکومت چھوڑی اس کی فوج میں اسّی ہزار پیادے اور بیس ہزار توپیں تھیں۔ ابراہیم نے دکنی کلچر کو فروغ دینے کی ان تھک کوشش کی اور دوسرے تمدن کے بہترین عناصر اس میں سموئے اس نے بقول ایم اے نعیم مصوری کے ایک نئے طرز "دکنی اسکول" کی سرپرستی کی[4]

"بساتین السلاطین" میں ابراہیم زبیری نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی شکل و صورت اور وضع قطع کی بڑی تعریف کی ہے ظہوری بادشاہ کے حسنِ سیرت کا مداح ہے۔ "سہ نثر ظہوری" میں ظہوری نے ابراہیم کی فہم و فراست اور نکتہ دانی کے کئی

---

[1] مسعود حسین خان۔ ابراہیم نامہ۔ ص ۱۷

[2] خواجہ میر احمد علی (مرتب سید حمید شطاری)۔ گلدستہ بیجاپور ص ۱۵

[3] رفیع الدین شیرازی۔ مخطوطہ۔ تذکرۃ الملوک۔ نمبر ۱۴۲۔ کتب خانہ سالار جنگ ص ۲۰۳۔

[4] ایم اے نعیم۔ دی اکسٹرنل ریلیشنس آف بیجاپور ص ۲۵

Marfat.com

واقعات قلمبند کیے ہیں ایک جگہ وہ کہتا ہے ؎

زرخالص سخن بدولت او
فکرمن کیمیاء طبیعت او طه

"حدائق السلاطین" میں علی بن طیفور نے ابراہیم کی مدح میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے اور اس کی "وفورِ عقل" "کمال فہم و فراست"۔ "کثرت دانائی و پرہیز گاری" اور "ہنر پروری" کی بے حد تعریف کی ہے[2]

۱۶۱۲ء تک دربار ابراہیم عادل شاہی ثانی کی ادبی محفلوں میں ظہوری اور ملک قمی کا طوطی بول رہا تھا لیکن دونوں ضعیف العمر ہو چکے تھے اس لیے ایک دکنی شاعر عبدل ابراہیم عادل شاہ کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اب بقول مسعود حسین خاں رفتہ رفتہ بیجاپور میں فارسی شعراء کی جگہ "ہندوی" شاعر لیتے جا رہے تھے عبدل کے الفاظ میں اب دربار میں نئے پھول کھل رہے تھے وہ کہتا ہے ؎

بیٹھے مجلسی لوگ ہر ئیک فن — کھلے پھول ہر جنس دولت چمن
ایکس ایک تھیں خوب بدیا ونت نگار — ہر یک بات بوجھک سو نونو ہزار
نظر شاہ پھر بھنور ہر پھول پر — بچن باس رس لے کلیاں مکھ اپر

مندرجہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کا دربار اہلِ علم اور ارباب نظر کا مرجع بنا ہوا تھا ابراہیم عادل شاہ کے دربار کی عبدل نے اس طرح تصویر کشی کی ہے ؎

سنو شاہ دربار کا اب سنگار — بجنتر بجے ہر جنس ٹھار ٹھار
اسے روپ دہلیز اونچا نمائے — کھڑے دو گگن جیو آپس سرملائے
لگے زیب سونے روپے کے کواڑ — کہ جیوں رات دن مل کھڑے ہیں دوار
کھڑے بہوت اسپست گجپت راؤ — کہ نرپت کھیتن نہ کچھ گنت آؤ

اگر ابراہیم اوّل نے بقول مورخ "گلدستہ بیجاپور" ۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ میں ابراہیم پور آباد کیا اور

---

[1] ظہوری۔ سہ نثر ظہوری۔ نثر سوم۔ ص ۶۰ — ۶۴

[2] علی بن طیفور بسطامی۔ مخطوطہ حدائق السلاطین۔ نمبر ۵۳۷۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۱۱ ب۔

Marfat.com

ایک نئے شہر کی بنا ڈالی تھی تو ابراہیم ثانی نے ۱۵۹۹ء یا ۱۶۰۰ء میں بیجاپور سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر ایک نیا شہر نورس پور آباد کیا تھا[1] یہ شہر بقول میر احمد علی ۱۰۲۶ھ میں ویران ہو گیا[2] اس شہر میں ابراہیم نے اپنے کے لیے ایک خاص محل تعمیر کروایا تھا جو سنہری اور لاجوردی رنگ آمیزی کا بے مثل نمونہ تھا۔ یہ "نورس محل" اپنی خوبصورتی اور کاریگری کے اعتبار سے ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ ظہوری نے بھی اس محل کو بہت سراہا ہے[3] "واقعات مملکتِ بیجاپور" میں بشیر الدین نے اس کا مفصل حال درج کیا ہے[4] ابراہیم کی سرپرستی میں اس دور کے علماء نے قابل قدر تصانیف پیش کیں۔ محمد قاسم فرشتہ نے "تاریخ فرشتہ" لکھی جو گلشن ابراہیمی یا بقول پی ایم جوشی اور ہارون خان شیروانی "نورس نامہ" سے موسوم کی گئی تھی[5] رفیع الدین شیرازی نے "تذکرۃ الملوک" لکھی فارسی کے ممتاز شعراء اور ادبی شخصیتوں میں ظہوری جو دربار سے وابستہ تھا بطور خاص قابلِ ذکر ہے۔ وہ بقول نذیر احمد ایران اور ہندوستان دونوں میں یکساں شہرت کا حامل تھا۔ ظہوری ۹۸۸ھ میں احمد نگر آکر نظام شاہی دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں اس کا قیام ۹۸۸ھ سے ۱۰۰۳ھ تک رہا۔ اور ۱۰۰۴ھ سے ۱۰۲۵ھ تک وہ عادل شاہی دربار سے متوسل رہا[6] ملک قمی، حیدر ذہنی، باقر کاشی، سنجر کاشی اور ابو طالب کلیم ابراہیم عادل شاہ کے دور کی اہم ادبی شخصیتیں تھیں ان کے علاوہ عبدالقادر نواسی، حسن عسکری کاشانی، نورس قزوینی اور محمد نامی تبریزی بیجاپور میں سکونت پذیر رہے اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔ دربار

---

[1] میر احمد علی۔ (مرتب سید حمید شطاری)۔ گلدستہ بیجاپور۔ ص ۲۷

[2] " " " " ص ۴۴

[3] ظہوری۔ سہ نثر ظہوری۔ نثر سوم۔ ص ۶۴

[4] بشیر الدین۔ واقعات مملکت بیجاپور۔ حصہ اول۔ ص ۲۰۸، ۲۰۹

[5] پی ایم جوشی و ہارون خان شیروانی۔ کانٹمپوریری سورسس آف میڈیویل انڈیا۔ باب دہم میڈیویل دکن ص ۵۷۸

[6] نذیر احمد۔ ظہوری لائف اینڈ ورکس۔ (انگریزی) ص ۴۲

Marfat.com

کے مشہور اطباء میں کاسی، اپاجی، زیراراؤ، موہن داس بہکاجی اور فرنا توپ.
تھے [1]

الیف برنیئر (F. Bernier) نے عادل شاہی پایہ تخت بیجاپور کو بہت "مضبوط اور مستحکم راجدھانی" بتایا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سلسلہ کوہ کی وجہ سے دارالسلطنت کے اندرونی علاقوں میں آبِ شیریں مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔

ابراہیم کے دربار میں فارسی اور دکنی شعراء کے علاوہ سنسکرت شاعروں کی بھی قدر افزائی اور سرپرستی کی جاتی تھی نرہری ابراہیم کے دربار کا سنسکرت شاعر تھا جس نے اپنی تصنیف "نورس منجری" پیش کی تھی "نورس منجری" میں نرہری لکھتا ہے کہ ابراہیم عوام میں تعلیم عام کرنے کا خواہاں تھا اور تعلیم تربیت حاصل کرنے کے لیے مختلف سہولتیں مہیا کی تھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ابراہیم بڑا سخی بادشاہ ہے اور اس نے تعلیم و تربیت پر بے دریغ روپیہ خرچ کر دیا ہے۔[2]

ابراہیم کے عہد کا مشہور خوش نویس اور ماہر خطاط خلیل اللہ بن شکن تھا۔ "سہ نثر ظہوری" سے پتہ چلتا ہے کہ خود ابراہیم اعلا درجے کا خوش نویس تھا، مصوری میں دستگاہ رکھتا تھا اور خط نسخ اور شکست لکھنے میں بے مثل تھا۔ ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں فرخ جبین نے مصوری میں بڑی شہرت حاصل کی تھی اور بقول نذیر احمد وہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کا درباری مصور تھا۔[3] اس دور میں فنون لطیفہ نے ترقی کی منزلیں تیزی کے ساتھ طے کیں اور بیجاپور علم و فن کا مرکز بن گیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے "نغمہ نورس" ایجاد کیا تھا جس کا ذکر ظہوری نے اپنی رباعیوں میں کیا ہے وہ شطرنج کا ماہر تھا اور اس پر ایک کتاب بھی سپرد قلم کی تھی۔ ظہوری نے اس پر اٹھارہ رباعیاں کہی تھیں[4] کتاب نورس سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ابراہیم

---

[1] میر احمد علی۔ (مرتب سید حمید شطاری) گلدستہ بیجاپور۔ ص ۴۴

[2] پی جی لالے۔ پرسنالٹی آف ابراہیم علی شاہ ایز ر فلکٹیڈ اِن نورس منجری (مقالہ) ص ۵۲ مشمولہ جنتام پرتم ۱۹۸۵ء۔ ص ۵۲

[3] نذیر احمد۔ ظہوری لائف اینڈ ورکس (انگریزی)۔ ص ۸۳۔

Marfat.com

نہ صرف برج بھاشا اور دکنی بلکہ سنسکرت سے بھی واقف تھا اور ہندو دیومالا پر بھی وہ عبور رکھتا تھا۔ عبدل نے جو ابراہیم کے ادبی تصورات کا خوشہ چیں ہے اور جس نے اپنے ممدوح سے استفادہ کیا ہے "ابراہیم نامہ" میں شعر و سخن کی تعریف کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کرتا ہے ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ممدوح اور مداح دونوں کے شعری تصورات پر ہندو جمالیات کی چھاپ خاصی گہری ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کو لفظ نورس سے خاص لگاؤ تھا[1] نغمہ، تخلص، سکہ، محل، ہاتھی، شاہی نشان اور شراب کے علاوہ اپنے کلام کے مجموعہ کے لیے اس نے لفظ "نورس" منتخب کیا تھا۔ محمد قاسم فرشتہ کی تاریخ کا نام بھی "نورس نامہ" تجویز کیا گیا تھا۔ لفظ نورس سے غیر معمولی دلچسپی اور لگاؤ کے باعث اس کو "شاہ نورس" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا[2] کتاب نورس میں سترہ راگوں کے ذیل میں انسٹھ (۵۹) گیت اور سترہ دوہے کہے گئے ہیں۔ کلیاں، دھناسری، گوری، کیدار، رام کلی، اساوری اور ملار وغیرہ میں کتاب نورس کے مختلف گیت نظم کیے گئے ہیں اس کے دیباچے ظہوری اور ملک قمی نے لکھے تھے[3] "حدائق السلاطین" میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دو فارسی شعر محفوظ رہ گئے ہیں جنھیں "کلام الملوک" میں سعادت علی رضوی نے نقل کیا ہے[4]

ابراہیم، عادل شاہی سلاطین میں فنون لطیفہ کا سب سے زیادہ دلدادہ تھا۔ شاعری اور موسیقی سے اُسے طبعی مناسبت تھی اس نے فنِ موسیقی میں ایسا کمال حاصل کیا کہ جگت گرو کے لقب سے شہرت پائی جیسا کہ کہا جا چکا ہے "نغمہ نورس" اسی کی ایجاد ہے۔ فنِ موسیقی سے غیر معمولی رغبت کا یہ عالم تھا کہ نوآباد شہر نورس پور میں ایک محلّہ موسیقاروں کے لیے وقف کر دیا گیا تھا جن کی تعداد ہزاروں تک

---

[1] نذیر احمد۔ ظہوری لائف اینڈ ورکس (انگریزی) صـ ۲۳

[2] " " " " صـ ۸۷

[3] نذیر احمد۔ کتاب نورس۔ (مضمون) مشمولہ تحقیقی مطالعے۔ صـ ۵۱

[4] میر سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک۔ صـ ۲۹

Marfat.com

پہنچتی تھی "تذکرۃ الملوک" میں رفیع الدین شیرازی رقمطراز ہیں کہ ہر مذاق ومعیار کے موسیقار یہاں اکٹھا ہوگئے تھے۔ اعلا درجے کے ماہرین موسیقی عطائی اور کمتر درجے کے کنچن کہلاتے تھے[1] ابراہیم نے ماہرینِ موسیقی کے تین گروہ قرار دیے تھے ایک کو حضوریاں، دوسرے کو درباریاں اور تیسرے گروہ کو شہریاں سے موسوم کیا جاتا تھا اور تینوں گروہوں کے افراد کو شاہی خزانے سے تنخواہ ارسال کی جاتی تھی۔ حضوریاں ہمیشہ بادشاہ کے حضور میں رہتے۔ جشن نورس کے موقعے پر دور دور سے ماہرین موسیقی پایہ تخت آتے اور انھیں انعام واکرام سے سرفراز کیا جاتا تھا[2]۔ نصرتی نے "گلشنِ عشق" میں عہد علی عادل شاہ ثانی کے جن آلات موسیقی کا ذکر کیا ہے ان میں منڈل، پکھاوج، دمامہ، نقارہ، قالو اور شہنائی وغیرہ ہیں جو بیجاپور میں مقبول تھے۔ میر احمد علی لکھتے ہیں کہ "اہلِ علم وہنر مختلف اضلاع ہند سے آکر بیجاپور میں بس گئے اور خیر وبرکت سے معمورہ بیجاپور کو رشک دہ دہلی ولاہور بنا دیا"[3]

ابراہیم کے عہد کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس کے زمانہ حکومت میں ہندوستانی تہذیب اور مقامی روایات، مسلم معاشرت میں شیر وشکر ہوکر اس کا جزو لاینفک بن گئے تھے۔ ابراہیم کی چار بیویاں تھیں جن میں سے ایک سندر محل بھی تھی۔ بادشاہ کی خانگی زندگی اس کے عہد کا تمدن اور اس کا تصفی مذاق ہندوستانی اثرات کا ترجمان معلوم ہوتا ہے[4]

دلکشا باغ، نورس محل، برج حیدری اور تاج باولی اسی عہد کی تعمیری یادگاریں ہیں۔ برج حیدری کو اُپلی یا اوپری برج کہتے ہیں۔ برج کے احاطے میں نصب ایک فارسی کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ اس برج کی تکمیل ۱۵۸۴ء میں مشہور عادل شاہی سپہ سالار حیدر خان نے کی تھی برج پر دو توپیں رکھی گئی ہیں جن کی لمبائی ۲۸ر اور ۳۰ فیٹ

---

[1] رفیع الدین شیرازی۔ مخطوط: تذکرۃ الملوک۔ نمبر ۱۴۲۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ صـ ۲۰۵

[2] نصیر الدین ہاشمی۔ شاہان دکن کی اردو شاعری (مضمون) مشمولہ نوائے ادب۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء۔ صـ ۵۹

[3] میر احمد علی (مرتب سید حمید شطاری) گلدستہ بیجاپور۔ صـ ۴۲

[4] قاسم قادری بانگی بیجاپوری۔ سیر بیجاپور۔ صـ ۱۶

Marfat.com

ہے۔ یہ برج بیاسی فیٹ بلند ہے اور اوپر بارود اور اسلحہ رکھنے کا بطور خاص انتظام کیا گیا ہے۔ برج حیدری، حیدر خان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور اس کی تعمیر کا مقصد دشمن کی فوج کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا ہے کیوں کہ بلندی سے دور تک کا منظر صاف دکھائی دیتا ہے۔ تاج باولی ملکہ تاج سلطانہ کے نام پر بنائی گئی تھی شہر کے مغربی حصے میں مکہ دروازے کے قریب یہ باولی واقع ہے اس کا سنہ تعمیر ۱۶۲۰ء ہے۔ باولی کا رقبہ دو سو تئیس (۲۲۳) مربع فیٹ اور گہرائی باون فیٹ ہے مشرق کی طرف ایک خوبصورت اور عظیم الشان کمان بنائی گئی ہے جو پینتیس (۳۵) فیٹ بلند ہے اور اس سے متصل باولی میں اترنے کے لیے سیڑھیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ ابراہیم کے عہد کے دو سیاح فچ (FICH) اور نیو بیری (NEW BEREY) ہیں جنھوں نے ابراہیم کے بسائے ہوئے شہر کو ۱۵۸۳ء میں ایک متمول اور جاذب نظر شہر پایا تھا۔ اس میں ہر طرف انھیں عالیشان مکانات دکھائی دیتے تھے مورخ گلدستہ بیجاپور لکھتا ہے کہ محل ہفت کھن بھی اسی زمانے میں تیار کیا گیا تھا اس کی تاریخ اس نے در بنائے ہفت کھن (۹۹۲) بتائی ہے۔[1]

فچ اور نیو بیری نے عادل شاہی دارالسلطنت کی بڑی تعریف کی ہے۔ ان سیاحوں کا بیان ہے کہ بیجاپور کے بارونق بازار سونے چاندی اور جواہرات سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں بہت سے ہاتھی بھی نظر آتے ہیں جن سے سواری کا کام لیا جاتا ہے۔ مغل سفیر اسد بیگ بھی اسی زمانے میں وارد بیجاپور ہوا تھا وہ اپنی سیاسی عصبیت کے باوجود اس دارالسلطنت کے قول اور وقار سے متاثر نظر آتا ہے۔ اسد بیگ نے شہر کی آب و ہوا کو نہایت خوش گوار بتایا ہے[2] ابراہیم نامہ میں عبدل کے مندرجہ ذیل بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ؎

عجب شہر دستا ارا با نگار — زمین با ھیا گل پدک کر سنگار
دسیں برج پنج بچ عجب یوں نمائے — جڑے پاچ الماس کے خرش لائے

---

[1] میر احمد علی (مرتب سید حمید شطاری)۔ گلدستہ بیجاپور۔ ص ۴۳
[2] مسعود حسین خان۔ مقدمہ ابراہیم نامہ۔ ص ۲۴

Marfat.com

وہیں شہر درمیاں کا کوٹ جاں
دسے دوسرا دور در درمیاں
ہوا مدسونا یک محل شاہ کا
کنڈل تار ہو رکھ سو گھر ماہ کا
دسے شہر میں کوٹ بچ شاہ گھر
محل چاند دولت کھلا کوٹ کر

جے این چودھری لکھتے ہیں کہ بیجاپور کی راج دھانی "جنوبی ہند کی ملکہ" کہلاتی تھی [1]

"ہفت کرسی" کا مورخ فطر خاں رقمطراز ہے کہ بیجاپور میں بادشاہ پور شاہ پیٹ، فرحانی پیٹ، بارہ بازار، پالے بازار، حیدر بازار، دلیل خان بازار، محمد شاہی بازار، آہن گر بازار، مراد خان بازار، کمال خان بازار، ریستے کھنڈی بازار، ناظم بازار، کارنجی بازار، صفا بازار، تھانے بازار، راؤ بازار، مسجد بازار، شاہ مرتضیٰ بازار، کالے باوا بازار، معمور بازار، جگتی بازار، شکار خانہ بازار، فرید خاں بازار، زنگی مسجد، رومی خان بازار، اور ناگ تھانے بازار تجارت کے اہم مرکز تھے [2]

ابراہیم نے تمدنی اور انتظامی امور کی طرف خاص توجہ کی تھی۔ میڈو ٹیلر (Meadow Taylor) لکھتا ہے کہ ٹوڈرمل کی طرح ابراہیم نے لگان اور بندوبست کا معقول انتظام کیا تھا اور اسی نے پہلی بار املاک کی رجسٹری کا طریقہ رائج کیا تھا [3]

اس زمانے میں بادشاہ، امراء اور عوام سب ہی فواکہات کے دلدادہ تھے۔ ہر کھانے کے ساتھ دستر خوان پر میوہ موجود ہوتا ہندوستانی پھلوں میں آم نہایت مرغوب و پسندیدہ میوہ تھا۔ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ اپنے

---

[1] جے این چودھری۔ دی مغل ایمپائر (انگریزی) چودھواں باب ص ۴۶۳

[2] پنڈری ناتھ رانڈے۔ ہفت کرسی۔ مشمولہ سنشودھک۔ جلد۔ ۱، ۲ مارچ۔ جون، ۱۹۸۶ ص ۸۹

[3] جے این چودھری۔ دی مغل ایمپائر (انگریزی) چودھواں باب ص ۴۵۵

Marfat.com

نظر بند بھائی اسمٰعیل کو جب تحفہ بھیجا تو" اقسام میوہ ونفائس آں حدود روز بروز می رسانید"[1] بیجاپور کے تمدن میں پان کو بڑی اہمیت حاصل تھی سلطان وقت کا کسی کو یہ برگ سبز عطا کرنا اس کی قدر افزائی تصور کی جاتی تھی۔

ابراہیم عادل شاہ نہ صرف فارسی اور دکنی شعراء کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کرتا تھا بلکہ سنسکرت شعراء بھی ابراہیم کی علم دوستی اور ہنر پرستی کے مداح تھے اور دربار میں ان کی بڑی قدر افزائی اور عزت کی جاتی تھی اور وہ ابراہیم کی سرپرستی و عنایات کے مرہون منت تھے چنانچہ سنسکرت شاعر نرہری نے" نورس منجری" میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے اور اس کی شان میں قصیدہ خواں ہے۔" نورس منجری" کا شاعر نورس پور کا باشندہ ہے۔" نورس منجری" کے حصہ اول میں جو ایک سو پینتالیس اشعار پر مشتمل ہے ابراہیم کی مدح وثناء کی گئی ہے اور نرہری ابراہیم کو" جگت گرو" اور" نادمورتی" کے ناموں سے یاد کرتا ہے۔ شاعر نے ابراہیم عادل شاہ کے گھوڑے، اس کے ہاتھی اور تلوار کی تعریف میں بھی مسلسل شعر کہے ہیں۔

"نورس منجری" سے پتہ چلتا ہے کہ رعایا میں ابراہیم کتنا ہر دل عزیز تھا[2]!

پی ایم جوشی لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں رعایا کی اکثریت" ہندو" اور" مرہٹہ" تھی۔ سلاطین عوام کے عقائد پر معترض نہ ہوتے اور مذہبی رسومات کی ادائیگی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتے تھے مسلمان زیادہ تر شہری زندگی بسر کرتے تھے اور اکثر ہندو گاؤں میں ہمیشہ زراعت سے وابستہ تھے۔ بہمنیوں کے زمانے ہی سے ہندو معزز عہدوں پر فائز تھے۔ شیواجی کے والد شاہ جی بھونسلا نے عادل شاہی بادشاہ محمد عادل شاہ کے دور میں نمایاں ترقی کی تھی پھال تال کے نمبالکر اور مدھول کے گھورپارے نے عادل شاہی عہد میں اعزازات حاصل کیے تھے۔ گارسیاں دی اورٹا (GARCIA DEORTA) لکھتا ہے کہ خزانے کی نگرانی شاہی مراسلت

---

[1] محمد قاسم فرشتہ۔ تاریخ فرشتہ۔ حصہ دوم۔ ص ۷۳

[2] پی جی لالے۔ پرسنالٹی آف ابراہیم علی شاہ ایز فلکٹیڈ ان نورس منجری۔ مشمولہ جنام پرتم ۱۹۸۵ء ص ۵۳

[3] پی ایم جوشی۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن (انگریزی)۔ جلد اول۔ ص ۲۹۹

Marfat.com

اور سفارت خانے پر ہندو امرا، مامور تھے۔ اسد بیگ جو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے میں بیجاپور آیا تھا لکھتا ہے کہ انتو پنڈت اور لکھو پنڈت ابراہیم کے خاص مشیر تھے [1] علی عادل شاہ اول سنیاسیوں کی صحبت کا دلدادہ تھا اور ابراہیم عادل شاہ ثانی سرسوتی دیوی کا عقیدت مند تھا اور جگت گرو اور بالا بلی کہلاتا تھا۔ اس کے عہد کے بعض سکوں پر جگت گرو کندہ کیا ہوا نظر آتا ہے اور بعض پر

نورس مہر عادل شاہی
جگت گرو دادا الہٰی

لکھا گیا ہے۔ ابراہیم نے "ناتھ پنتوں" اور "دوسرے اہل اللہ" کا اثر قبول کیا تھا۔ چاند بی بی کی آغوش شفقت میں پرورش پانے کی وجہ سے اس نے اپنے وطن اور اپنی سرزمین سے محبت کرنا سیکھ لیا تھا۔ ابراہیم ہندو مت کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اس کے بعض فرامین کے آغاز میں سرسوتی دیوی کا نام نظر آتا ہے [2] حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم مذہب کی اصل روح پر ایقان رکھتا تھا اور مصنوعی تحدیدات کو غیر ضروری تصور کرتا تھا عادل شاہی حکمران دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے بھی بڑی محبت کرتے تھے۔ مختلف مندروں کے اخراجات شاہی خزانے سے ادا کیے جاتے تھے۔ بھگتی تحریک کا اہم مرکز پندھارپور بیجاپور کے حدود سلطنت میں واقع تھا۔ برہمنوں کو مذہبی اہمیت حاصل تھی اور وہ علاج معالجہ بھی کرتے تھے۔ ڈاکٹر ڈیلن (Dr Dellon) جو ۱۶۷۵ء میں دکن میں قیام پذیر تھا "اے وائج ٹو اسیٹ انڈیا (A voyage to East India) میں لکھتا ہے کہ برہمنوں کا طریقہ علاج روایتی انداز کا تھا اور دواؤں کے نسخے برہمنوں میں سینہ بہ سینہ چلے آتے تھے۔

عوام کے تفریحی مشاغل میں سانپ کا تماشہ بہت مقبول تھا۔ یہ تماشا دکھانے والے جو "گاڑوڑی" کہلاتے تھے گاؤں گاؤں پھر کر اپنا کمال دکھایا کرتے تھے۔ شعبدہ بازوں کے علاوہ گانے والے بھی تفریح کا سامان مہیا کرتے تھے۔ پران اور رزمیہ داستانیں سنانے والے تلقین اور تفریح کا سامان مہیا کرتے مرغ بازی

---

[1] پی ایم جوشی۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن (انگریزی) جلد اول۔ صہ ۴۰۰
[2] " " " " صہ ۳۹۸

Marfat.com

کا بھی رواج تھا اور شاہی خاندان کے افراد جنگلوں میں شکار کے لیے جایا کرتے تھے۔ جاترا اور عرس میں بھی عوام یکجا ہوتے۔ ہندو میں کرتن کا اہتمام کیا جاتا جو بالعموم گاؤں کے مندر میں ہوا کرتا تھا ہری داسی اس موقع پر عوام کو مخاطب کرتے تھے[1]

فریئر (Fryer) لکھتا ہے کہ عام لوگوں کی غذا چاول اور دال تھی۔ جوار کی روٹی ترکاری کے ساتھ کھائی جاتی تھی۔ بیجاپور کا شاعر ہاشمی کہتا ہے کہ میرے لیے ایک روٹی اور پالک کی تھوڑی سی بھاجی کافی ہے۔ تھیونو (Thevenot) کا بیان ہے کہ ہندو کیلے کے پتوں پر کھانا کھانا پسند کرتے تھے۔ پان کھانے کا رواج عام تھا۔ لنسچوٹن (Linschoten) لکھتا ہے کہ جب بادشاہ کسی امیر کو کسی مہم پر روانہ کرتا تو اسے پان عنایت کیا جاتا تھا جو نیک شگون اور باعث عزت افزائی تصور کیا جاتا تھا۔ چاول، جوار، باجرہ، کپاس، دالیں، شکر، کالی مرچ تمباکو، الائچی اور چھالیا کثیر مقدار میں پیدا ہوتی۔ ساحلی علاقوں میں ناریل اور کاجو کی کاشت کی جاتی۔ لنسچوٹن (Linschoten) ناریل کو ہندوستان کا سب سے مفید درخت کہتا ہے کیوں کہ اس کے پھل درخت اور پتوں سے مختلف کارآمد اشیاء تیار کی جاتی تھیں۔

"ابراہیم نامہ" میں عادل شاہی عہد کے جن زیورات کے نام گنائے گئے ہیں ان میں ٹیلہ (ٹیکہ)، کان کھونٹیاں، زرکمر، مسکرا (ناسکا۔ بلاق)، بسیس پھول، لون اور پھندے قابل ذکر ہیں۔ عبدل کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کے دور میں عورتیں ان زیورات کو بہت شوق سے استعمال کرتی تھیں ؎

کوئی رکھ جڑت سیس پھول سیس بال
رہیا جیوں مشک راس پر آئے لال
کوئی جڑت ٹیلہ پیشانی میں لائے
کھڑا سورج جیوں صبح میدان میں آئے

---

[1] پی ایم جوشی۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن۔ جلد اول۔ ص ۲۳۳

Marfat.com

کوئی زیب موتی سو مُسکرا ہے
سونے تھال درمیان جیوں پارا ڈھلے
کوئی کان کھونٹیاں جڑت پین آئے
بیٹھا چاند دو سُرج کے چاک لائے

"ابراہیم نامہ" میں عبدل نے اپنے ممدوح بادشاہ کے گھوڑوں اور ہاتھیوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کے زیورات بھی گنائے ہیں۔ گارساں دی اورٹا (Garcia de Orta) نے بیجاپور کے اُمول کی بڑی تعریف کی ہے اور فریئر (Fryer) نے کیلا، لیمو، نارنگی، انگور، سیتا پھل اور کٹھل کو اس سرزمین کے خاص میوے تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس علاقے میں اننا س بھی بکثرت پیدا ہوتا تھا اور یہ لفظ پرتگال سے یہاں پہنچا تھا۔ سامان تجارت میں نیل، سوت، شکر، ریشم اور بوراکس کا ذکر کیا گیا ہے۔ عادل شاہی حدود میں لوہے کی کانیں بھی موجود تھیں لیکن ان سے زیادہ مقدار میں لوہا نہیں نکلتا تھا۔ بیجاپور میں بہت سے قیمتی پتھر بھی دستیاب ہوتے تھے۔ سیاحوں نے یہاں کے ہیرے کی بڑی تعریف کی ہے۔ عادل شاہی حدود میں پندرہ ہیرے کی کانیں موجود تھیں[1] لیکن ٹراونیر (Travernier) کہتا ہے کہ وزن اور جسامت میں عادل شاہی کانوں کے ہیرے قطب شاہی ہیروں کی ہمسری نہیں کر سکتے تھے[2] عادل شاہی شہروں میں ہیرا تراشنے کی صفت بکثرت تاجروں کی رہین منت تھی یہاں کے قیمتی اور نایاب ہیرے آگرہ دہلی اور سورت بھیجے جاتے تھے۔ روسی سیاح افناسی نکیتن (Afnasy Nikitin) کہتا ہے کہ ہیرے کی کانیں بیجاپور کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ تھیں۔ اس روسی سیاح نے ایک ہیرے کی کان کا جو کلیر میں واقع تھی معائنہ بھی کیا تھا وہ کہتا ہے کہ یہاں ہیروں کو تراشنے اور اس سلسلے کے مختلف کام انجام دینے کے لیے تین سو کاریگروں کو مامور کیا گیا ہے[3]

---

[1] پی ایم جوشی۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن (انگریزی) جلد اول، ص ۴۱۰
[2] " " " " " " ص ۴۱۱
[3] وی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور (انگریزی) ص ۱۰

Marfat.com

ابراہیم عادل شاہ کے دربار کا سنسکرت شاعر نرہری "نورس منجری" میں جو سنسکرت زبان میں نظم کی گئی ہے دور ابراہیم کی خوش حالی اور فارغ البالی کو سراہتے ہوئے کہتا ہے کہ ابراہیم کے خزانے میں ایک نایاب اور خاص قسم کا ہیرا جو "بلندا" کہلاتا ہے موجود ہے[1]

دکن میں مصوری کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ شمال کی مغل مصوری اور دکنی مصوری کا آغاز کم و بیش ایک ہی زمانے میں ہوا۔ اکبر کی علوم و فنون سے دلچسپی اور فنکاروں کی قدردانی کی وجہ سے مغل سلطنت میں دوسرے فنون کے ساتھ ساتھ مصوری نے بھی ترقی کی۔ جگدیش متل لکھتے ہیں کہ ۱۵۶۰ء میں اکبر کی سرپرستی میں مغل پینٹنگ کا آغاز ہوا[2] ابتدا میں دکنی پینٹنگ نے ایران، ترکی، وجیا نگر اور یورپی مصوری سے اثر قبول کیا لیکن یہ اثرات دکنی مصوری میں شیر و شکر ہو گئے ہیں اور دکنی اسکول کے منفرد خدوخال نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ دکنی مصوری اپنی ہم عصر مغل مصوری سے مختلف تھی۔ احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈے کے دکنی حکمران مزاج اور ذوق و شوق کے اعتبار سے مغلوں سے مختلف تھے۔[3] دکنی سلاطین بقول جگدیش متل جذباتی انسان تھے وہ فنون لطیفہ کے بڑے دلدادہ تھے اور اس کی جھلک ان کی مصوری میں دکھائی دیتی ہے۔ ان کے برخلاف مغل بادشاہ اپنی مہمات کی تصویریں دیکھنا چاہتے تھے۔ دکنی سلاطین عشقیہ نظموں اور رومانی مناظر کے شائق تھے وہ اپنی اور اپنی خوبصورت محبوباؤں کی تصویر کھنچوانا چاہتے تھے ابراہیم عادل شاہ کی اکثر تصویروں میں وہ ایک موسیقار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ دکنی مصوری اپنے مخصوص موضوعات (Theme) اور منفرد مزاج کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ جگدیش متل کا خیال ہے کہ بعض دکنی پینٹنگ مغل تصویروں سے بدرجہا بہتر اور بلند پایہ ہیں[4] یہ صحیح ہے کہ دکنی مصوری کے

---

[1] پی، جی لالے۔ پرسنالٹی آف ابراہیم علی شاہ ایز ریفلکٹیڈ اِن نورس منجری، مشمولہ۔ جنتام رتم۔ ۱۹۸۵ء ص ۵۰

[2] جگدیش متل۔ پینٹنگس۔ باب سوم۔ میڈیویل دکن۔ ص ۲۰۳

[3] 〃 〃 〃 〃 ص ۲۰۴

[4] 〃 〃 〃 〃 ص ۲۰۴

Marfat.com

نمونے مغل مصوری کی یادگاروں کے مقابلے میں تعداد میں نسبتاً کم دستیاب ہوتے ہیں جس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ دکنی مصور تعداد میں کم تھے اور دوسرے شمال کی طاقتوں سے نبرد آزمائی اور جنگوں کے دوران ان کا قیمتی سرمایہ ضائع ہو گیا تھا۔

کچھ عرصہ قبل بیکانیر کے محل میں دکنی مصوری کے نادر نمونوں کی موجودگی کا پتہ چلا ہے اور اس فن سے دلچسپی رکھنے والوں نے اس کا باقاعدہ مطالعہ اور تجزیہ بھی کیا ہے۔ بعض پینٹنگ سقوط گولکنڈہ و بیجاپور کے بعد مغلوں کے قبضے میں آئیں اور دہلی پہنچ گئیں۔ ان میں سے بعض تصویریں ایران میں بھی موجود ہیں لیکن ان کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چند دکنی پینٹنگ استنبول اور شام کے عجائب خانوں میں بھی محفوظ ہیں۔ نظام حیدرآباد کے یہاں جو دکنی مصوری کے شاہکار موجود تھے ان تک عوام کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے یہ نظر سے اوجھل رہے۔ بہت سے دکنی مصوری کے نمونے مغل مصوروں سے منسوب کر دیے گئے ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ ان تصویروں کی فضا اور ماحول اسلامی تھا اور ان کا موضوع (Theme) بھی اسلامی نوعیت کا حامل تھا[1] یہ تصویریں غلط فہمی کی بنا پر مغل مصوروں سے منسوب کر دی گئی ہیں۔

بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کا عہد مصوری کا دور زرین کہا جا سکتا ہے اس دور میں اس فن لطیف نے غیر معمولی ترقی کی اور بیجاپور میں مصوری کے ایسے شاہکار تخلیق کیے گئے جن پر ہندوستان ناز کر سکتا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے یوں تو تمام فنون لطیفہ کی سرپرستی کی لیکن شاعری، مصوری اور موسیقی سے اپنی شخصی دلچسپی کی وجہ سے اس نے ان فنون کی طرف زیادہ توجہ کی۔ یہ دور دکن کی دوسری سلطنتوں میں بھی مصوری کے فروغ کا زمانہ ہے۔ اسی زمانے میں گولکنڈہ اور احمد نگر میں بھی مصوری کے اچھے نمونے منظر عام پر آئے۔ بقول جگدیش مٹل ابراہیم عادل شاہ کے دربار سے کئی مصور وابستہ تھے جن کی تصویریں محفوظ ہیں لیکن ان پر تاریخ درج نہیں اور بعض تصویروں پر مصور نے اپنے نام کی نشاندہی بھی نہیں کی ہے[2]

---

[1] جگدیش مٹل پینٹنگس۔ باب سوم۔ میڈیویل دکن۔ صد ۲۰۴

[2] " " " " "

Marfat.com

عہد ابراہیم عادل شاہ کی سب سے اچھی پینٹنگ لال گڑھ کے قلعے میں موجود ہے۔ اس شاہکار پینٹنگ کی پشت پر یہ نوٹ درج ہے کہ اسے ادھونی کے خزانے سے حاصل کیا گیا ہے۔ بیکانیر کے راجا کرن سنگھ نے ادھونی کا قلعہ فتح کیا تھا اسی کے مال غنیمت میں یہ تصویریں بھی شامل تھیں۔ ایک تصویر میں بادشاہ نوجوان شہزادہ نظر آتا ہے۔ اور تصویر سے اس کا جاہ و حشم ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ تصویر فن کے اعتبار سے پینٹنگ کا ایک عمدہ نمونہ تصور کی جاتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو مسلمانی مصوری (INDO-Muslim Paintings) اپنے نقطہ عروج پر تھی۔ اس تصویر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں علی عادل شاہ کی شخصیت کو بہت مناسب مقام پر جگہ دی گئی ہے۔ یہ پینٹنگ اپنے تناسب اور مجموعی تاثر کی وجہ سے بہت جاذب نظر بن گئی ہے۔ ابراہیم اور اس کے سات درباریوں کی پینٹنگ میں ابراہیم کا زرق برق اور قیمتی لباس اور تصویر کے گہرے اور شوخ رنگ اسے منفرد شان عطا کرتے ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ کا سراپا اس خوبی سے ابھارا گیا ہے کہ وہ تصویر میں دوسروں سے بلند اور نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ پینٹنگ ۱۵۹۶ء میں تیار کی گئی تھی۔

برٹش میوزیم میں ابراہیم کی ایک اور تصویر ہے۔ ڈوگلاس بیارٹ (Douglas Barret) اور بیزل گرے (Basil Gray) نے "پینٹنگس آف انڈیا" (Paintings of India) میں اس کی نقل کر کے تصویر اتاری ہے۔ اس تصویر میں ابراہیم کا پیکر ایک گہرے سبز رنگ کے بڑی منظر (Land scape) کے درمیان پر اسرار انداز میں دکھایا گیا ہے۔ عقبی زمین میں ابر کی طرح پتے بکھرے ہوئے ہیں۔ پس منظر میں ہلکے سبز رنگ کے درخت نمایاں ہیں یہ دکنی مصوری کا خاص انداز ہے جو سولھویں صدی کے آخر اور سترھویں صدی کے آغاز میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ابراہیم کے قدموں کے قریب للی کے پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ بادشاہ نے ایک نہایت خوبصورت اور مہین جامہ زیب تن کیا ہے۔ زربفت کا شوخ رنگ کا رومال کاندھے پر پڑا ہوا ہے جو اس کے بازوؤں پر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پس منظر میں ایک محل ہے جسے بہت احتیاط سے ابھارا گیا ہے۔ یہ انداز بیجاپور اسکول کا نمایاں وصف بن گیا ہے۔

پس منظر کو مخصوص انداز میں ابھارنے اور ان کی مدد سے ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا رجحان بیجاپور کے مصوروں کے لیے مغربی پینٹنگ کی دین تھی۔ گو بیجاپور کی سرحد

Marfat.com

پر واقع تھا اور وہ پرتگیزیوں کے قبضے میں تھا۔ بعض مصوری کے نقادوں کا خیال ہے کہ دکنی مصوری نے مغل مصوری کے توسط سے مغربی اثرات قبول کیے تھے لیکن بقول جگدیش متل یہ خیال درست نہیں ہے۔

بعض دکنی پینٹنگ پر جو ایرانی اسٹائل میں تھیں ایرانی مصوری کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے حال ہی میں برٹ ویلچ (Barret Welch) کھنڈیل والا اشلٹن (Skelton) کرام رچ ایٹنگ گاسن (Kramrisch Etlinghausesen) اور جگدیش متل نے ایسی بہت سی پینٹنگوں کے بارے میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایرانی نہیں دکنی ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ کی ایک اور پینٹنگ کلکتہ کے جوینکا کلکشن (Goenka Collection) میں موجود ہے اس میں ابراہیم کو ایک موسیقار دکھایا گیا ہے وہ اکتارا بجا رہا ہے۔ ابراہیم ایک زربفت قالین پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ پس منظر سنہری رنگوں سے تیار کیا گیا ہے۔ پیچھے دو پھولوں سے لدے ہوئے درخت نظر آرہے ہیں۔ بادشاہ نے ایک سفید لمبا جامہ پہن رکھا ہے جو بہت مہین ہے۔ گلابی چوڑی دار پاجامہ زیب تن کیا گیا ہے۔ شانوں پر رومال پڑا ہے اکتارا بائیں ہاتھ میں ہے اور سیدھے ہاتھ میں ایک کتاب دکھائی دے رہی ہے۔ ڈوگلاس بیرٹ (Douglas Barrett) نے اس پینٹنگ کی تاریخ ۱۵۹۲ء بتائی ہے[1] اس میں بادشاہ نوجوان نظر آتا ہے۔

ابراہیم کی ایک اور تصویر گوینکا کلکشن میں محفوظ ہے۔ اس میں بھی ابراہیم کو ایک موسیقار کے روپ میں پیش کیا گیا ہے بیجاپور کی پینٹنگ میں ہم عصر مغل پینٹنگ کی طرح بہت زیادہ فطری انداز نظر آتا ہے۔ مغل تصویریں ٹیکنک کے اعتبار سے نگاہوں کو چکاچوند کر دینے والی ہیں اور بیجاپور اسکول کی تصویروں سے منکسرانہ انداز کا اظہار ہوتا ہے[2] عہد ابراہیم کی پینٹنگ کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے ماہر اور قابل مصور

---

[1] جگدیش متل پینٹنگس۔ باب سوم۔ میڈیویل دکن۔ صـ ۲۱۲

[2] " " " صـ ۲۱۳

Marfat.com

تصویر کشی کے کام پر مامور تھے۔ دارا ناسی میں سیتارام ساہو کے کلکشن میں ہمیں ایک ہاتھی کی پینٹنگ نظر آتی ہے این، سی میٹا نے اس تصویر کی نقل تیار کی ہے۔ یہ ابراہیم عادل شاہ کا مشہور ہاتھی چنچل ہوگا جو ۱۶۰۴ء میں اکبر اعظم کو تحفتاً پیش کیا گیا تھا۔ چنچل اکبر کے ایلچی اسد بیگ کے ذریعہ سے بیجاپور سے دہلی پہنچا تھا۔ اس کی تفصیل موتی چندرا نے "پورٹریٹ آف ابراہیم عادل شاہ ثانی" میں تحریر کی ہے[1] اس کے علاوہ عہد ابراہیم کی بعض اور تصویریں دستیاب ہوتی ہیں۔ مثلاً ہاتھیوں کی لڑائی کی پینٹنگ، جوگی کی پینٹنگ اور عاشقوں کے ملاقات کی پینٹنگ۔ یہ استنبول میں محفوظ ہے اور غیر مطبوعہ ہے۔ یہ پینٹنگ اپنے غیر روایتی انداز کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔ دلچسپ بڑی مناظر (Land Scape) پراسرار فضاء، مرصع سازی جیسی رنگ آمیزی، سنہری رنگ کا با افراط استعمال، ماہرانہ اختتامی عمل (Finishing) لمبے درختوں کی خوبصورتی، پھولوں سے بھری ہوئی جھاڑیاں مخصوص دکنی محلات کے پس منظر میں بڑی جاذب نظر معلوم ہوتی ہیں اور دور ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مخصوص مصوری کی ترجمان ہیں۔ یونیورسٹی آف پنی سلوانیا کے پیٹر گیفکے نے اپنے مضمون "آئڈنٹی فیکیشن آف فور منیچرز فرام دی دکن" Identification of Four Miniatures from the Deccan مطبوعہ جرنل آف دی امریکن اورینٹل سوسائٹی[2] میں دکن کے ان چار تصویروں پر روشنی ڈالی ہے جو نصرتی کے مثنوی گلشن عشق کے واقعات پر مبنی ہیں ان چاروں تصویروں کو مارک زبردوشی نے "دکنی پینٹنگس"، مطبوعہ ۱۹۸۳ء لندن میں متعارف کروایا تھا ان کے بارے میں پیٹر گینکے کا خیال ہے کہ یہ چاروں تصویریں عادل شاہی دور کی فن مصوری کے نمونے ہیں۔ ان میں سے ایک بقول مارک زبردوشی قطب شاہی عہد کی یادگار ہو سکتا ہے بیجاپور کے فن مصوری کا دور عروج ابراہیم عادل شاہ کا عہد حکومت ہے پیرس کے موسی گیمٹ (Musee Guimet) میوزیم میں دو چڑیوں کی ایک پینٹنگ بھی ہے

---

[1] موتی چندرا۔ پورٹریٹ آف ابراہیم عادل شاہ ثانی، ۔جلد ۵ نمبر ۱ ۔ ص ۲۷

[2] نمبر ۱۰۷۔ ۔۲ ۔ سنہ ۱۹۸۷ء ۔ ص ۳۰۹ تا ص ۳۱۱

Marfat.com

جو بیجاپور کے ابتدائی دور کی پنٹینگ کا اچھا نمونہ ہے۔ ایک اور پنٹینگ میں پانی کے کنارے دو سارس دکھائے گئے ہیں دوسری تصویر ایک شاہین کی ہے جو درخت پر دکھایا گیا ہے۔ حیدرآباد کے اسٹیٹ میوزیم میں دو چڑیوں کی تصویر ہے جو ایک آم کے درخت پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ درخت پھولوں سے لدا ہوا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کی طرح ابراہیم عادل شاہ ثانی کو بھی پرندوں سے دلچسپی تھی۔ مغل مصوروں نے پرندوں کی جو پنٹینگ تیار کی ہے ان سے دکنی مصوروں کی پنٹینگ کا تقابل اور موازنہ کریں تو دکنی پنٹینگ بہت فطری اور بلند پایہ معلوم ہوتی ہیں دور ابراہیم کی اکثر پنٹینگ میں پرندوں کی تصویروں کو یا تو نقش (Motif) کے طور پر استعمال کیا گیا ہے یا ان کی نوعیت ایمائی اور رمزیاتی ہے جس کی وجہ سے پنٹینگ میں ایک پراسرار اور رومانی فضاء پیدا ہو گئی ہے [1]

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور میں تحریر کیے ہوئے دو مخطوطات مصور (Illustrated) ہیں۔ برٹش میوزیم میں محفوظ "رتن کلیان" قابل ذکر ہے۔ اس میں چھتیس ۳۶ تصویر چے (Miniatures) ہیں جو ۱۵۹۲ء کے تیار کردہ ہیں ان سے بیجاپور کی سماجی زندگی اور اس دور کی مصوری کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا مخطوطہ جو پکوان کے فن پر لکھا گیا ہے "نعمت نامہ" ہے۔ یہ بھی جیسا کہ کہا جا چکا ہے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کا مخطوطہ ہے جو پہلے حیدرآباد اسٹیٹ میوزیم کا مخزونہ تھا اور اب دہلی کے نیشنل میوزیم میں محفوظ ہے۔ غلام یزدانی نے ان میں سے بعض تصویر چوں کو شائع کر دیا ہے۔ یہ بیجاپور اسکول کی پنٹینگ کا عمدہ نمونہ ہے۔ تصویر کے پس منظر، بادشاہ کے سامنے ساز کی موجودگی اور ابراہیم کے لباس سے بھی پنٹینگ کے بیجاپور اسکول کا کارنامہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ تصویر [illegible] قریبی زمانے میں تیار کیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

کھینڈوالا "فائیو مینچرس" (Five Miniatures) میں نمطراز ہیں کہ ہندوستانی راگوں کی تصویری نمائندگی سب سے پہلے بیجاپور میں ہوئی یعنی بیجاپور

---

[1] جگدیش مثل پنٹینگس باب سوم۔ میڈیویل دکن۔ صہ ۲۱۵

Marfat.com

جنوبی ہند کا وہ پہلا مقام ہے جہاں راگ راگنیوں کو تصویری شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے بقول رچرڈ میکس ویل ایٹن (Richard Maxwell Eaten) یہ کام ہندو فن کاروں کے سپرد کیا تھا اسے ایرانی یا ترکی مصور بخوبی انجام نہیں دے سکتے تھے" راگ مالا تصویر چے" اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ان کے خالق ہندوستانی مصور تھے جنھوں نے وجیانگر کے طرز کو ایرانی اور ترکی عناصر سے ہم آہنگ کر کے اپنے فن میں پیش کیا تھا۔ [1] موتی چندرا لکھتے ہیں کہ ان تصویرچوں میں عورتوں کی جو شبیہیں بنائی گئی ہیں ان میں جنوبی ہند کی ساڑی، چولی، اونچی ناک، چھوٹا دہانہ دوہری تھوڑی اور کانوں تک پھیلی ہوئی آنکھوں کی وضع، جنوبی ہند کی ہندوستانی مصوری سے ان کی اثر پذیری کی غماز ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کا درباری مصور فرخ حسین تھا" سہ نثر ظہوری" میں اس کا ذکر موجود ہے [2] رابرٹ اشلٹن (Robert Skelton) نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ اکبر کا مصور فرخ بیگ ہی تھا جو ۱۶۰۱ء تا ۱۶۰۹ء بیجاپور میں بحیثیت شاہی مصور مصروف کار رہا اور پھر ۱۶۰۹ء میں جہاں گیر کے پاس واپس چلا گیا۔

بیجاپور کی دیواری تصویریں بھی بہت خوبصورت اور قابل ستائش ہیں۔ سلاطین عادل شاہیہ نے اپنے محلات اور مخصوص عمارتوں کی دیواروں کو پینٹنگ کی دلکشی سے بھی سجایا تھا ان کے نمونے ہفت محل میں جو اب منہدم ہو چکا ہے موجود تھے۔ اب صرف ان کے ٹکڑے دستیاب ہوتے ہیں اس کے علاوہ آثار محل اور مبارک خان کا شہ نشین میں اس کے عمدہ نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔

غلام یزدانی "ٹو مینیچرس آف بیجاپور (Two Miniatures of Bijapur) میں لکھتے ہیں کہ آثار محل ۱۶۶۴ء میں تعمیر ہوا تھا، اس کی دیواروں وغیرہ پر جو تصویریں بنائی گئی ہیں وہ" کانگرا قلم" کی ترجمان ہیں یہ علی عادل شاہ ثانی کے عہد کی تعمیری یادگار ہے۔ یہاں پہلے عدالت تھی لیکن بعد میں یہاں آثار مبارک رکھے جانے لگے۔ اس کا چھت

---

[1] رچرڈ میکس ویل ایٹن۔ صوفیز آف بیجاپور۔ ص ۹۴

[2] جگدیش متل۔ پنیگس۔ باب سوم۔ میڈیویل دکن ص ۲۱۵

Marfat.com

اکیاسی فٹ لمبا اور چوبیس فٹ چوڑا ہے[1] اس پر درختوں اور پھولوں کی تصویریں بنائی گئی ہیں ان تصویروں کے مطالعے سے عہد علی عادل شاہ کی مصوری کے بارے میں رائے قایم کی جا سکتی ہے۔ ہفت محل کی پہلی منزل کی شمالی دیوار کا جو ایک حصہ باقی رہ گیا ہے اس میں دو تصویریں بنی ہوئی نظر آتی ہیں اس جداری تصویر میں پولو کھیل کا ایک منظر دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح شکار کا منظر اور یورپی آدمی کی تصویر قابل ذکر ہیں۔ ایک دیواری تصویر میں گیٹار بجانے والا موسیقار بیٹھا ہوا ہے اور ملکہ اور اس کی ملازمہ ساز سے محظوظ ہو رہی ہیں۔ اسی طرح کشتیوں کا مقابلہ، شیر کی کھال اوڑھے ہوئے دو آدمیوں کی پینٹنگ اور ایک درویش سے ہم کلام بادشاہ کی پینٹنگ بہت دلچسپ اور قابل قدر ہیں بعض پینٹنگ میں صفوی اور مغربی مصوری کا اثر جھلک گیا ہے۔ صفوی دور کی پینٹنگ کی طرح پھول کے درختوں کے درمیان پیکروں کی نقاشی اور انسانوں کی تصویریں جن میں پورے چہرے کے بجائے بازو سے کھینچی ہوئی آدھے چہرے کی تصویر اتاری گئی ہے۔ یہ گوا کے توسط سے دکن پہنچنے والے مغربی مصوری کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

موتی چندرا نے "پورٹریٹ آف ابراہیم عادل شاہ ثانی" میں اور بیسل گرے نے "دکنی پینٹنگس" (Deccani Paintings) (Basil Gray) میں "دی اسکول آف بیجاپور" کے ذیل میں لکھا ہے کہ دیواری تصویریں اور نقش و نگار یا تصویریں (Miniatures) اس تہذیب کی ترجمانی کرتے ہیں جس پر مقامی اثرات کی چھاپ گہری ہے[2] اور وجیانگر کے فنی طرز کی جھلک ان سب میں نمایاں ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عادل شاہیوں نے اپنے تمدن اور فنون لطیفہ کو عرب اور عجم تک محدود نہیں رکھا تھا بلکہ مقامی تہذیب کے عناصر کو بھی اپنے فنون لطیفہ میں جگہ دے کر ان کی اہمیت اجاگر کی تھی ان کے تصویرچوں میں ہندوستانی روح جاری و ساری ہے۔ ان میں ترکی، ایرانی اور بالخصوص وجیانگر کی مصوری کا پرتو صاف نظر آتا ہے[3]

---

[1] غلام یزدانی۔ ٹو مینچرس آف بیجاپور (مقالہ) مشمولہ رسالہ اسلامک کلچر۔ اپریل ۱۹۳۵ء صہ ۲۱۱-تا-۲۱۷

[2] موتی چندرا۔ پورٹریٹ آف ابراہیم عادل شاہ ثانی۔ مارچ نمبر ۱۔ ۱۹۵۵ء۔ صہ ۲۶

[3] بیسل گرے۔ دکنی پینٹنگس۔ برلنگٹن میگزین۔ اگست ۱۹۳۸ء صہ ۷۴

Marfat.com

ہرمن گویتز۔ (Herman Goetz) کا خیال ہے کہ بیجاپوری تعمیر میں دیواروں کی کھم سے ملتی جلتی وضع، جھکی ہوئی کمانیں، کھمبوں پر بنائے ہوئے بیل بوٹے اور نقش و نگار، کنول کے تنے سے کھمبوں کی مشابہت اور کنول کی کلیوں سے ڈزائن بنانے کا طریقہ وجیانگر کے آرٹ سے اثر پذیری کا ترجمان ہے۔ اس نے اپنی کتاب "فال آف وجیانگر" (Fall of Vijaya Nagar) میں اس سے مفصل بحث کی ہے۔

ابراہیم عادل شاہ کے روضے میں اس قسم کے طرز تعمیر اور مصوری کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ ان میں ہر جگہ کنول کے پھول اور کلیوں کی موجودگی ہندوستانی طرز فکر اور مذاق کی آئینہ دار ہے۔ ہرمن گوتیز نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ۱۵۶۵ء اور ۱۵۶۷ء میں وجیانگر کی تباہی کے بعد آبادی کا ایک حصہ جنگی قیدیوں یا پناہ گزینوں کی حیثیت سے بیجاپور منتقل ہوگیا ان میں فنکار بھی تھے[1] اور اس طرح وجیانگر کی فنی روایات بیجاپور پہنچیں۔ ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں دو حیثیتوں سے ہندو باریاب تھے۔ اس نے مالگذاری وصول کرنے اگر مہاراشٹرا کے ہندو عہدے داروں کو مامور کیا تھا تو ہندو علاقے کے تلگو بولنے والے ہندو، موسیقی، آرٹ اور فن تعمیر کی باکمال ہستیوں کی حیثیت سے دربار سے متوسل تھے اور اس طرح بیجاپور اسلامی تہذیب اور ہندو ثقافت کے امتزاج کا اچھا نمونہ بن گیا تھا۔ تیسری وجہ خود سلطان وقت ابراہیم عادل شاہ ثانی کی وسیع النظری اور فنکاروں کی قدر دانی اور سرپرستی کا جذبہ تھا۔ جس کے زیر اثر حسن کار بیجاپور کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ رچرڈ میکس ویل ایٹن نے ابراہیم عادل شاہ کی رواداری اور وسیع المشربی کو بہت سراہا ہے وہ لکھتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ ہر مذہب کا احترام کرتا اور ان کے طریقہ عبادت کی قدر کرتا تھا۔ اس نے "بساتین السلاطین" کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابراہیم کے عہد میں عید نورس ایک قومی تہوار کی حیثیت سے منایا جاتا تھا۔ یہ دراصل موسیقی کا عظیم الشان میلہ ہوتا تھا جس میں شرکت کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے ۱۶۱۴ء میں سلطان ابراہیم عادل شاہ نے ایک مخصوص فرمان کے ذریعے سے ملاری دیوتا کی پوجا کا اہتمام کروایا تھا۔ نلدرگ

---

[1] ہرمن گوتیز۔ فال آف وجیانگر۔ صفحہ ۲۵

Marfat.com

میں اس پوجا کی رسومات انجام دی جاتی تھیں۔ ۱۶۱۸ء میں ابراہیم نے پونے کے قریب چنچاور کے مقام پر مندر کے اخراجات کے لیے ایک جاگیر عطا کی تھی۔ یہ پہلا عادل شاہی بادشاہ تھا جس نے پرتگالیوں کو اپنی مملکت میں گرجا گھر تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی۔ شخصی طور پر وہ سرسوتی کا معتقد تھا جس کی ایک وجہ موسیقی اور علم وادب سے اس کی دلچسپی بھی تھی [1]

موتی چندرا ابراہیم عادل شاہ کی کتاب "نورس" پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کے مطالعے سے ابراہیم کے طرز فکر کی صوفیانہ روش کا اندازہ ہوتا ہے۔" کتاب نورس" میں وہ اکثر اُن باتھ پنتھی بزرگوں کے انداز میں بات کہنے لگتا ہے جو تمام دکن میں سولھویں صدی میں گھومتے پھرتے تھے اور جو عوام میں وحدانیت کی تعلیم عام کرنا چاہتے تھے۔ وہ مذہب کی ظاہری شکل اور مذہبی رسومات پر مذہب کی اصل روح کو ترجیح دیتے تھے۔ اپنے ہم عصر شہنشاہ اکبر کی پیروی میں جس نے دین الٰہی کی بناء ڈالی تھی اور جو قومی یکجہتی کا پرستار تھا، ابراہیم نے بھی اپنی سلطنت میں ایسا ہی کیا اور اسی رواداری اور وسیع المشربی کو اختیار کیا۔ اکبر کے پیرو اسے "گرو" کہتے تھے تو ابراہیم عادل شاہ "جگت گرو" کہلایا۔ ابراہیم سنی المذہب تھا اور اس کے عہد میں اسی طرز کا خطبہ بھی پڑھا جاتا تھا۔ لیکن بنیادی طور پر ابراہیم کا مسلک صلح کل اور انسان دوستی تھا۔ ابراہیم کے عہد میں بقول مصنف "صوفیز آف بیجاپور" عادل شاہی سلطنت میں سب سے زیادہ صوفی جمع ہو گئے تھے [2] وہ رقمطراز ہے کہ یوسف عادل شاہ کے عہد میں بیرون ملک سے وارد بیجاپور ہونے والے صوفیوں کی تعداد بہت کم تھی یعنی صرف ایک ہی صوفی بیجاپور پہنچا تھا اسمٰعیل عادل شاہ، ملو عادل شاہ اور سکندر عادل شاہ کے دور حکومت میں کوئی صوفی بیجاپور میں باہر سے آکر مقیم نہیں ہوا۔ ابراہیم عادل شاہ اول کے زمانہ حکومت میں ایک صوفی اور علی عادل شاہ اول کے عہد حکومت میں ایک صوفی۔ علی عادل

---

[1] رچرڈ میکس ویل اٹین۔ صوفیز آف بیجاپور۔ ص ۱۰۱

[2] " " " ص ۱۰۴

Marfat.com

شاہ ثانی کے دور میں چار، محمد شاہ کے عہد میں گیارہ صوفی دارالسلطنت آئے تھے لیکن ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور میں کثیر تعداد میں صوفیا بیجاپور میں سکونت پذیر ہوئے تھے اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کی قدردانی کی وجہ سے وہ پایۂ تخت میں رہ بس گئے۔ ان کی تعداد ستائیس[۲۷] بتائی گئی ہے[1]۔ ابراہیم روضہ بھی ابراہیم کے عہد کی ایک شاندار یادگار ہے یہ شہر کے مغربی حصّے میں تعمیر کیا گیا ہے۔ عمارت کے فارسی کتبات سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اپنی چہیتی ملکہ تاج سلطان کی یاد میں اسے تعمیر کروایا تھا۔ اس کا معمار ملک صندل شاہی معمار تھا جب ابراہیم کا انتقال ہوا تو ابراہیم کو بھی یہیں دفن کیا گیا اور یہ روضہ اب اسی کے نام سے مشہور ہے ابراہیم عادل شاہ کی والدہ حاجی بڑی صاحبہ بھی یہیں سپرد خاک ہوئیں۔ ابراہیم روضہ اور اس کی مسجد بیجاپور کی عظمت رفتہ اور اس کے بلند پایہ فن تعمیر کے حسن اور انفرادیت کی ترجمان ہے۔ اس عمارت کے دلکش گنبد، اونچے اونچے خوبصورت مینار اور نقش و نگار سے مزین سقف: عمارت کے چاروں طرف بنائے ہوئے منقش کنگورے، عادل شاہی دور کی تعمیر کاری گری، سنگ تراشی اور بے نظیر صناعی کے اعلا ترین نمونے ہیں۔ روضے کی سنگ سیاہ سے تعمیر کی ہوئی دیواروں پر منقش جالیوں میں قرآنی آیات بڑی خوبصورتی کے ساتھ تراشی گئی ہیں۔ پرسی براؤن نے ابراہیم روضہ کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھتا ہے کہ یہ کوئی وسیع و عریض عمارت نہیں اور اس طرح کی عمارتیں جن میں آرائش و زیبائش کا بہت اہتمام کیا جائے زیادہ وسیع نہ ہوں تو اس لیے بہتر ہے کہ ان کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے میں زیادہ وقت درکار نہیں ہوتا۔ پرسی براؤن (Percy Brown) نے "انڈین آرکٹکچر" (اسلامک پیریڈ) (Indian Architecture (Islamic Period)) میں ابراہیم روضہ کی گل کاری اور اس کے درمیان تحریر کی ہوئی آیات کی خوشخطی اور خوبصورتی طرز تعمیر کے جمالیاتی حسن اور روضہ ابراہیم کے مجموعی تعمیراتی تاثر کو بہت سراہا ہے اور لکھتا ہے کہ اس روضے میں آرائش کا وہ کام کیا گیا ہے جو انسانی صنعت کا کمال کہا جا سکتا ہے[2]۔

---

[1] رچرڈ میکس ویل ایٹن۔ صوفیز آف بیجاپور۔ ص ۶۳

[2] پرسی براؤن۔ انڈین آرکٹکچر (اسلامک پیریڈ) چوتھا ایڈیشن ص ۷۴

Marfat.com

ہارون خان شیروانی "کلچرل ٹرنڈ اِن میڈیویل انڈیا" تحریر کرتے ہیں کہ ابراہیم روضہ اپنی تعمیراتی آرائش وزیبائش کے لیے منفرد ہے۔ کنول کے پتوں میں سے نکلتی ہوئی گنبدوں نے اس کے حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔ انھوں نے عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کی عمارتوں میں آنند محل، سنگیت محل، اور گگن محل کا ذکر کیا ہے [1]

سنگیت محل اور بعض دوسرے محلات کا ذکر ابراہیم کے درباری شاعر نرہری نے جو سنسکرت کا سخن گستر تھا اپنے شعری کارنامے "نورس منجری" میں کیا ہے۔ وہ ان محلات کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔

ہارون خان شیروانی لکھتے ہیں کہ مدور گنبدوں کی کنول کی وضع کی تعمیری اساس وسیع چھجوں اور چوکور وضع کی کانوں چار مرکزی محرابوں کو عادل شاہی طرز تعمیر کے نمایاں خدوخال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

آنند محل، سنگیت محل اور گگن محل بڑی دلفریب اور متاثر کن عمارتیں ہیں آنند محل اور گگن محل اب بھی بیجاپور میں موجود ہیں اور موخر الذکر میں ٹی وی کا دفتر کام کر رہا ہے۔ بقول زیڈ اے دیسائی بیجاپور کا "مہتر محل" جو ۱۶۲۰ء میں تعمیر کیا گیا تھا فن تعمیر کے بیجاپوری اسٹائل کا ایک نہایت نفیس اور عمدہ نمونہ ہے اس کا مینار چھیاسٹھ [66] فیٹ بلند ہے اور اس کی اونچائی تین منزلہ عمارت کے برابر ہے۔ نچلی منزل باب الداخلہ کے طور پر استعمال کی گئی ہے۔ اس کی منڈیر کی وضع جھالر کی سی ہے۔ مہتر محل کی اندرونی دیواروں پر آرائش کا خوبصورت کام بڑے سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ کیا گیا ہے [2]

جیسا کہ کہا جا چکا عہد علی عادل شاہ اول کے زمانے سے عادل شاہی سکوں کا پتہ چلتا ہے جس پر ایک طرف حضرت علی کا نام اور دوسری طرف ان کا القاب کندہ تھا اسی طرح ابراہیم عادل شاہ کے سکوں پر ایک طرف اگر اس کا لقب اور نام "ابراہیم ابلا بلی" کندہ ہوتا تھا تو دوسری طرف "غلام علی مرتضیٰ" کی تحریر موجود ہوتی۔ ابراہیم کے زمانے

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا۔ ص ۲۴

[2] زیڈ اے دیسائی۔

Marfat.com

میں جو فلس رائج تھے وہ "فلس نورس" کہلاتے تھے۔ پی ایل گپتا نے اس پر روشنی ڈالی ہے[1] اور "بساتین السلاطین" میں بھی اس کا ذکر موجود ہے[2] "محمد نامہ" کا مورخ محمد ظہوری رقمطراز ہے کہ محمد عادل شاہ کی ولادت ۱۰۲۲ھ میں ہوئی تھی۔ وہ تاج سلطان کے بطن سے نورس پور میں پیدا ہوا تھا[3]

محمد عادل شاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کا جانشین تھا اور ۱۰۳۷ھ میں سربرآرائے سلطنت ہوا تھا۔ مورخ گلدستہ بیجاپور نے اس کے حسن و جمال کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس نے شاہ جہاں سے دوستانہ تعلقات قایم کیے اور مغل شہنشاہ سے "معاہدہ امن" کیا[4] اس کے عہد میں سلطنت نے وسعت حاصل کی اور بحیرہ عرب سے خلیج بنگال تک پھیل گئی۔ اس کی سالانہ مالگزاری سات کروڑ چوراسی لاکھ تھی اس کے علاوہ ساڑھے پانچ کروڑ زمینداروں اور یا جگذاروں سے وصول ہوتے تھے۔ محمد عادل شاہ نے بیجاپور کے تعلیمی معیار کو بلند کیا۔ ایم اے نعیم نے گول گنبد یا بولی گنبد کو عہد محمد شاہ کی تعمیر بتایا ہے اور لکھتے ہیں کہ اس عہد کے طرز تعمیر کو "Indo Perso Ottoman Architecture" کہنا چاہیے[5] محمد عادل شاہ کے عہد میں معرکہ آرائیاں بھی ہوتی رہیں اور علم و ہنر کی آبیاری بھی۔ اس نے ۱۰۴۶ھ میں بکھر ہی فتح کیا اور اس کے بعد ۱۰۶۲ھ مطابق ۱۶۵۱ء میں بالکنڈہ تسخیر کیا۔ قلعہ ویلور پر بھی محمد عادل شاہ نے اسی سنہ میں قبضہ کیا تھا[6] محمد عادل شاہ کے دور میں حکیم آتشی نے خمسہ نظامی کے جواب میں پانچ مثنویاں لکھی تھیں۔ ظہوری کے فرزند ملا ظہور نے محمد نامہ مرتب کیا تھا۔ ملا محمد حسین نے ربیع الدین شیرازی کی کتاب "احوال السلاطین" کا ترجمہ کیا اور قاضی نور اللہ بھی اس دور کی اہم

---

[1] پی ایل گپتا - کاٹینج - باب ہفتم - میڈیویل دکن - صـ۴۴۳

[2] ابراہیم زبیری - بساتین السلاطین - صـ۲۵۰

[3] بحوالہ پنڈری ناتھ - محمد نامہ - مشمولہ سنشودھک جلد ۱، ۲، مارچ جون ۱۹۸۶ء - صـ۲

[4] ایم اے نعیم - اکسٹرنل ریلیشنس آف بیجاپور صـ۲۵

[5] " " " " " "

[6] میر احمد علی (مرتب سید حمید شطاری) گلدستہ بیجاپور صـ۵

Marfat.com

شخصیت تھے - سلطان شہر بانو نے جو بقول نصیر الدین ہاشمی بادشاہ کی ملکہ تھیں، بڑی علم پرور اور ادب نواز خاتون تھیں - ان کی پرورش گولکنڈے کی اس فضا میں ہوئی تھی جہاں علم و ادب کا بول بالا تھا رستمی کا خاورنامہ اور ملک خوشنو کی مثنوی جنت سنگار خدیجہ سلطانی شہر بانو کی علمی و ادبی سرپرستی کی یادگاریں ہیں [1]
نظام الدین احمد الصاعدی "حدیقۃ السلاطین"، میں اس قطب شاہی شہزادی کی شادی کے بارے میں رقمطراز ہے کہ جب محمد عادل شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے گولکنڈے سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کے لیے اپنے سفیر کو گولکنڈہ روانہ کیا. چنانچہ ابوالحسن سفیر بیجاپور اور شیخ رحیم گولکنڈہ پہنچے اور بادشاہ کو محمد عادل شاہ کا پیام اخوت پہنچایا تھا - اس شادی کی رسومات بڑے توزک و احتشام اور دھوم دھام کے ساتھ انجام دی گئی تھیں [2] سلطان محمد عادل شاہ کی شادی نواب مظفر خان کی لڑکی سے بھی ہوئی تھی - عبدالحق [3] نے غلطی سے اس لڑکی کو مصطفٰے خان کی صاحبزادی بتایا ہے اور ان کے تتبع میں ڈاکٹر زور [4] اور نصیر الدین [5] ہاشمی نے بھی حسن شوقی کے "میزبانی نامہ" کو مصطفٰے خان کی بیٹی اور سلطان عادل شاہ کی خانہ آبادی سے منسوب کیا ہے - حسن شوقی کے "میزبانی نامہ" کی سرخی "در بیان مہمانی کردن سلطان محمد عادل شاہ را در داون جہیز دختر نواب مظفر خان"، سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہوتا ہے حسن شوقی نے اس شادی کا مفصل حال نظم کیا ہے - محلات کی آرائش و زیبائش، ساز و سامان، در و دیوار کی سجاوٹ، پردے، فرش، "حوض خانے"، اچھلتے ہوئے فوارے اور روشنی کے انتظامات کا صراحت سے ذکر کیا ہے - ان بیانات سے عادل شاہی تمدن پر روشنی پڑتی ہے - محل میں بادشاہ کی آمد پر امراء و حاضرین دربار کا تعظیمی سجدہ

---

[1] نصیر الدین ہاشمی - شاہان دکن کی اردو شاعری، (معتمون) مشمولہ نوائے ادب - اکتوبر ۱۹۶۴ء صد ۶۲
[2] نظام الدین احمد الصاعدی (مترجم خواجہ محمد سرور) حدیقۃ السلاطین صد ۱۰۳ تا ۱۰۹ -
[3] عبدالحق - قدیم اردو - صد ۸۶
[4] ڈاکٹر زور - اردو شہ پارے - صد ۱۰۲
[5] نصیر الدین ہاشمی - دکن میں اردو - صد ۲۰۰

Marfat.com

کرنا۔ بیش قیمت تخت پر محمد عادل شاہ کا رونق افروز ہونا اور انعام واکرام سے اہل دربار کو نوازنا، گھوڑے، نیلم اور جواہرات اور سونے چاندی کے ورق لگے ہوئے پان کے بیڑوں کی تقسیم، شہنائی اور دوسرے باجوں کی نغمہ ریزی، زرق برق لباس کی سج دھج اور رقص کا سماں اس خوش اسلوبی کے ساتھ حسن شوقی نے نظم کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے ان کی تصویریں متحرک ہو جاتی ہیں اور عہد محمد عادل شاہ کے طرز معاشرت، عادات و اطوار، نشست و برخاست کے آداب لباس، سجاوٹ اور مختلف قسم کے کھانوں کے متعلق دلچسپ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ حسن شوقی کی مثنوی سے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں جن سے محمد عادل شاہ کے دور کی تہذیب و معاشرت کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

منور کیے انجمن کوں تمام — زبرجد کے شیشے زمرد کے جام
جنتر کار جھنکار میں چت کیا — جسے تار اوتار کے ات کیا
ہوئی مست مجلس خوش آواز سوں — دیوانے کیاں پاتراں ناز سوں
سرنگ ناچے ناچیں چتر پاتراں — طربناک مجلس ورامش گراں
ہوا بار سفرا شہر یار کا — ملیں لوگ سب آر کا پار کا
کیا بار دارائے دریا شکوہ — جلیبیاں کے خابے وحلویاں کے کوہ
دھرے تھال زریں میں بالا وزیر — دراجان کے ڈھگلے بیڑان کے ڈھیر
سو بریاں و لفرا و قلیا سباس — سو مچھلیاں کے کھنڈرے انڈیاں کے راس
بے لینبو و نیبو و سر کا میسر — سو حضرات ونعتا و پُدنا پنیر
کمیت ہور کا مینخ تارے رعیف — تفک ناں مانڈے کما چاں لطیف
ظروف زر و سیم تو بے حساب — نہ دفتر میں پاویں نہ اندر کتاب
دیا صاف نرمل بچھل غوریاں — بچھل غوریاں ہوا فغفوریاں

صنعتی سلطان محمد عادل شاہ کے دور کا شاعر تھا۔ قصہ بے نظیر (۱۰۵۵ھ) میں صنعتی نے پریوں اور پھر دیووں سے تمیم انصاری کی جنگ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے عادل شاہی دور کے ہتھیاروں اور سامان حرب و ضرب کا پتہ چلتا ہے۔ خنجر، کمند، نیزہ، تیغ، گرز، کدال، تیشہ، کمان، تیر اور دیگر اصلح جنگ کے نام اپنی مثنوی میں صنعتی نے گنائے ہیں۔

Marfat.com

محمد عادل شاہ کے عہد میں تعمیر کی ہوئی گول گنبد یا بولی گنبد معمارانہ کمال کا حیرت انگیز نمونہ ہے اس کو دنیا کے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ گنبد کا تعمیری معجزہ یہ ہے کہ ایک تو اتنا وسیع گنبد بغیر کسی سہارے کے آج تک قایم ہے دوسرے اندرونی جانب گنبد کے اطراف ایک چھجہ بھی ہے جس پر سیاح چاروں طرف تعمیر کی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر پہنچ سکتے ہیں۔ گنبد میں آواز کی بازگشت سات مرتبہ سنائی دیتی ہے گیارہ فیٹ چوڑے اس چھجے کو جو بغیر کسی سہارے کے قایم ہے اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ دیوار سے منھ لگا کر انتہائی آہستگی کے ساتھ بات کی جائے تو وہ گنبد کے دوسرے سرے پر دیوار کو کان لگا کر سنی جا سکتی ہے اور ٹیلی فون کی طرح بہت دور کھڑے ہوئے دو آدمی اس دیوار کی مدد سے ایک دوسرے سے بات کر سکتے ہیں بیرونی سمت چاروں طرف ہشت پہلو مینار بنائے گئے ہیں۔ گول گنبد کا قطر ۱۳۲ فیٹ اور پانچ انچ ہے۔ گنبد کی دیوار نیچے دس فیٹ اور اوپر نو فیٹ موٹی ہے۔ جس چبوترے پر یہ گنبد تعمیر کیا گیا ہے اس کی بلندی ایک سو اٹھانوے فیٹ (۱۹۸) اور چھ انچ ہے[1] ہارون خان شیروانی نے "کلچرل ٹرنڈس ان میڈیل انڈیا" میں فرگوسن کے حوالے سے لکھا ہے کہ گول گنبد یا بولی گنبد کا طرز تعمیر حیرت انگیز ہے اور اپنے قطر کے اعتبار سے یہ دنیا کا سب سے بڑا گنبد ہے (Smith) اسمتھ نے اس کو تعمیراتی فن کا کرشمہ قرار دیا ہے[2] اس میں عادل شاہی حکمراں محمد شاہ اور اس کی بیویاں اور بیٹیاں آسودہ ہیں۔

محمد عادل شاہ کے عہد میں فن مصوری میں انقلاب آگیا اور اس نے فرسکو پینٹنگ (Fresco Painting) روشناس کروائی جو اس کے آبا و اجداد کے دور میں نہیں تھی اسی زمانے میں پورٹریٹ (Portrait) بھی متعارف ہوئے جس کی مثال آثار محل کی دیواروں پر نظر آتی ہے[3]

جیسا کہ کہا جا چکا ہے علی عادل شاہ اول اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور کے سکّے

---

[1] قاسم قادری بانگی بیجاپوری۔ سیر بیجاپور۔ ص ۱۸

[2] ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈس ان میڈیول انڈیا۔ ص ۲۵

[3] ایم اے نعیم۔ اکسٹرنل ریلیشنس آف بیجاپور۔ ص ۱۱۷

Marfat.com

دستیاب ہو چکے ہیں۔ محمد عادل شاہ کے دور حکومت میں جاری کیے ہوئے بعض سکے بھی محفوظ ہیں محمد شاہ کے سکوں پر یہ عبارت کندہ کی ہوئی ملتی ہے ؎

جہاں ازایں دو محمد گرفت زینت وجاہ
یکی محمد مرسل دوم محمد شاہ

پی ایل گپتا نے عادل شاہی عہد کے سکوں کے متعلق مفید معلومات فراہم کی ہیں[1] محمد عادل شاہ نے سونے کے سکے بھی جاری کیے تھے جن کا وزن پگوڈا کے مساوی تھا۔ پگوڈا کو ہن بھی کہا جاتا تھا۔ ان کا وزن اکیاون گرین ہوتا تھا۔ یہ جنوبی ہند کا مقبول سکہ تھا۔ ان سونے کے سکوں پر وہی عبارت کندہ کی جاتی تھی جو تانبے کے سکوں پر ہوتی تھی۔

محمد شاہ کے دور میں بیجاپور میں صوفیائے کرام کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے صوفیوں سے راہ و رسم بڑھائی وہ ہاشم پیر کا بہت معتقد تھا بقول میکس ویل ایٹن محمد عادل شاہ نے اعلان کر دیا تھا کہ ہاشم پیر صوفیائے بیجاپور میں سب سے زیادہ روحانی مرتبے کے حامل اور سربرآوردہ صوفی تھے[2] وہ سلطنت کے اہم امور میں ہاشم پیر سے مشاورت کرتا تھا۔

ہاشم پیر ۱۶۲۶ یا ۱۶۲۷ء میں حج سے واپس ہو رہے تھے کہ کونکن کے ساحل پر پرتگالیوں نے ان کے جہاز پر قبضہ کر لیا۔ جہاز پر لدا ہوا مال اور جہاز کے مسافر پرتگالیوں کے جال میں پھنس گئے[3] اس وقت بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ ثانی سربرآرائے سلطنت تھا جب اسے یہ اطلاع ملی تو اس نے پرتگالی گورنر مقیم گوا کو خط لکھا کہ وہ فوراً بیجاپور کے مشہور عالم و صوفی ہاشم پیر کو رہا کریں۔ اس خط کے جواب میں مسافروں کو فوراً رہا کر دیا گیا اور ہاشم پیر بیجاپور پہنچ گئے اس واقعے نے ہاشم پیر کو دربار سے بہت قریب کر دیا اور جب ابراہیم کے بعد محمد عادل شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے ہاشم پیر کی بڑی عزت و توقیر کی کہا جاتا ہے ایک مرتبہ جب ۱۶۴۶ء میں محمد عادل شاہ سخت بیمار پڑ گیا تو ہاشم پیر نے

---

[1] پی ایل گپتا۔ کائنج۔ باب ہفتم۔ میڈیویل دکن۔ ص ۴۴۱ تا ۴۴۳

[2] رچرڈ میکس ویل ایٹن۔ صوفیز آف بیجاپور۔ ص ۱۲۰

[3] محمد ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ ص ۳۳۱

Marfat.com

اپنی عمر کے دس سال اسے عنایت کر دیے تھے۔ ہاشم پیر کا انتقال ۱۶۴۶ء میں ہوا تھا۔ چنانچہ ہاشم پیر کے ٹھیک دس برس بعد یعنی ۱۶۵۶ء میں محمد عادل شاہ نے رحلت کی۔ محمد شاہ نے ہاشم پیر کے مزار پر شاندار گنبد تعمیر کروایا تھا۔

محمد عادل شاہ کے عہد حکومت میں پرتگالیوں کے علاوہ ڈچ قوم کے افراد بھی بیجاپور کا رخ کرنے لگے تھے ڈچ سفیر وان ٹوسٹ (Van Twist) محمد عادل شاہ کے یہاں ڈچ سفیر کے حیثیت سے آیا تھا۔ وہ بندرگاہوں میں تجارت کی اجازت حاصل کرنے آیا تھا اس کا دوسرا مقصد ایک بڑے کارخانے کا قیام تھا اس نے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ بیجاپور کی حکومت ڈچ لوگوں کے تعاون سے پرتگالیوں کو نکال باہر کر سکتی ہے۔ پرتگالیوں نے ایک تجارتی جہاز کو جو سامان سے بھرا ہوا تھا تباہ کر دیا تھا ان حالات کے پیش نظر ڈچ لوگوں کی درخواست قبول کر لی گئی اور مسیحی پادری ایف مارٹن (F. Marton) قیمتی تحائف کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا[1] محمد شاہ عادل نے ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۶ء میں رحلت کی۔

محمد عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا درباری شاعر عبدالنبی نے بقول سید نوراللہ مورخ تاریخ علی عادل شاہ "نوبت شاہی زد بعد محمد علی" سے اس کی تخت نشینی کی تاریخ نکالی تھی[2] سلطان محمد عادل شاہ ایک عرصہ تک اولاد سے محروم رہا تھا اس لیے جب ۱۶ ربیع الثانی ۱۰۴۸ھ مطابق ۲۷ اگست ۱۶۳۸ء کو شہزادہ علی تولد ہوا تو سلطنت بیجاپور میں ولی عہد کی پیدائش نے خوشی کی لہر دوڑا دی۔ شاہ جہاں نے علی عادل شاہ ثانی کو محمد عادل شاہ کا جائز وارث تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا فرانسیسی سیاح برنیر جو ان دنوں مغل دربار میں موجود تھا لکھتا ہے کہ بیجاپور کا بادشاہ لاولد مر گیا ہے اور اس کی بیگم نے جو بادشاہ گولکنڈہ کی بہن ہے ایک [illegible] متبنی بنا لیا ہے سلطان علی عادل شاہ نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا[3]

[1] [illegible] ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور۔ ص ۵۹

[2] سید نوراللہ شوستری۔ مخطوطہ تاریخ علی عادل شاہ۔ نمبر ۱۰ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۹۴

[3] ایف برنیئر۔ ٹراویلس ان دی مغل ایمپائر۔ ص ۱۹۷

Marfat.com

"سری شیواچھترپتی" میں ترامبک سیج والکر نے بھی علی عادل شاہ کو شاہی خاندان کا فرد نہیں بلکہ ایک متبنیٰ بچّہ تحریر کیا ہے[1]

اورنگ زیب نے علی عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور پر حملہ کیا تھا۔ عالمگیر نے پہلے بیدر فتح کیا تھا اور پھر کلیان کے قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا تھا اس کے بعد بیجاپور کا محاصرہ کر لیا اور لڑائی جاری تھی کہ شاہ جہاں کے انتقال کی خبر پہنچی اور اورنگ زیب نے محاصرہ اٹھا لیا۔ اپنے دور حکومت میں علی عادل شاہ کو مغلوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا نصرتی نے "علی نامہ" میں مغل فوج کی بہتات، اسلحہ کی کثرت، ہاتھیوں کی قطاروں اور سامان جنگ کا بڑے پر لطف انداز میں ذکر کیا ہے۔ نصرتی کے یہ اشعار ہجو ملیح کا اچھا نمونہ ہیں۔ وہ کہتا ہے ؎

کہتا ہوں اتا فوج دہلی کی بات — چلے تھے دکن دل پہ کس دھات سات
کہ جس فوج کوں دیکھنے میں سمج — وسے نا کسے انتہا ہور اویخ
ہتیاں کا عرابہ چلے میل میل — تھا جس میں سردار اصحاب فیل
فریب ان کے فن میں بڑا مرد ہے — جنم جن کا ابلیس شاگرد ہے

علی عادل شاہ کو شیواجی سے بھی برابر مقابلہ کرنا پڑتا تھا وہ عادل شاہی علاقوں پر چھاپے مار رہا تھا۔ سرجادوناتھ سرکار نے "شیواجی اینڈ ہز ٹائمز" میں لکھا ہے کہ شیواجی عادل شاہی قلعوں کی طرف آہستہ آہستہ پیش قدمی کر رہا تھا اور اسے کامیابی بھی نصیب ہو رہی تھی[2] برنیئر اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ عادل شاہی سلطنت کی بنیادیں کمزور ہو چکی ہیں پرنیڈہ مغلوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ شیواجی عادل شاہی علاقوں پر مسلسل چھاپے مار رہا ہے اور گوا کی بندرگاہ تک پہنچ گیا ہے[3]

شیواجی نے افضل خان کو دھوکے سے مار ڈالا تو سدی جوہر صلابت خان کو شیواجی کے مقابلے کے لیے بھیجا گیا مگر اس نے دشمن سے ساز باز کر لیا اور اس کا

---

[1] ترامبک شیج والکر۔ سری شیواچھترپتی (مراہٹی)۔ ص ۴۲

[2] سرجادوناتھ سرکار۔ شیواجی اینڈ ہز ٹائمز۔ چوتھا ایڈیشن۔ باب چہارم۔ ص ۷۵

[3] ایف برنیئر۔ ٹراویلس ان دی مغل ایمپائر۔ ص ۱۹۷، ۱۹۸

Marfat.com

طرفدار بن گیا۔ "مہاراشٹرا گیان کوش" میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے[1] علی عادل شاہ کو اس باغی سردار کی سرکوبی کے لیے میدان جنگ کا رخ کرنا پڑا صلابت خان قلعہ پنہالہ میں محصور ہو گیا تھا۔ ابراہیم زبیری کی "بساتین السلاطین" میں فتح پنہالہ کا مفصل ذکر موجود ہے[2] بالآخر صلابت خاں کو شکست ہوئی اور وہ عفو کا خواستگار ہوا نصرتی "علی نامہ" میں پنہالہ کی کامیابی کے بارے میں کہتا ہے ؎

لیا اتھا جو پنالے کا چڑھ کہ او گڑھ کوں
سیوا دغا کے کُتے مکر بے نہایت سوں
جب اس سوں لڑ کہ چھوڑانے کوں گر صلابت خاں
روانہ ہم سوں ہوا شہہ کی ات عنایت سوں
دسیا کہ گڑھ نئیں آتا لگیا ہے لڑنے زور
لیں مدد کوں چلے شہہ نے جیوں شجاعت سوں
کرم سوں حق کے نہ انپڑیچہ لگ ہوا گڑھ فتح
او پیش دست کے ہت شہہ کے ات مہابت سوں
وہیں یو فتح کی تاریخ نصرتی بولیا
علی نے پل میں پنا لایا صلابت سوں

"تاریخ علی عادل شاہ" میں نوراللہ شوستری نے شیواجی اور صلابت خاں کو جو علی عادل شاہ کی مخالفت پر کمربستہ تھے اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا ہے۔ وہ انھیں ملعون و مردود کہتا ہے[3] نوراللہ شوستری نے اپنی تاریخ میں قلعۂ تورکل کے محاصرے بادشاہ کی پیش قدمی میں اس قلعہ کی فتح کا مفصل حال درج کیا ہے۔

۱۶۶۶ء میں مغلوں نے دوبارہ مرہٹہ فوجوں کے ساتھ قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ عبداللہ قطب شاہ نے سپہ سالار نیک نام خان کی سرکردگی میں بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار

---

[1] مہاراشٹرا گیان کوش۔ جلد ۷۔ ص ۵۱۷

[2] ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ ص ۲۶۹ تا ۲۷۹

[3] سید نوراللہ شوستری مخطوطہ۔ تاریخ علی عادل شاہ۔ نمبر ۱۰۱۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۱۰۴

Marfat.com

پیدل فوج بیجاپور روانہ کی۔ایک عہدنامہ مرتب ہوا جس کی رو سے بیجاپور کے شمالی علاقے مغلوں کے حوالے کر دیے گئے اور شیواجی کو تین لاکھ ادا کر کے خاموش کر دیا گیا ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء یہ فالج کے حملے سے بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔اس وقت اس کی عمر صرف پینتیس سال تھی[1] "بساتین السلاطین" میں ابراہیم زبیری لکھتا ہے کہ

"بادشاہ دین علی کرد وطن برجناں"

سے علی عادل شاہ ثانی کی تاریخ وفات اخذ کی گئی ہے[2]

علی عادل شاہ نے حسینی محل اور مسجد ۱۰۶۷ھ میں تعمیر کروائی تھی۔بیجاپور میں اب اس محل کے بہت کم آثار باقی رہ گئے ہیں حالانکہ گگن محل اور آنند محل اب بھی موجود ہیں۔ گگن محل اتنی اچھی حالت میں ہے کہ یہاں ٹی وی کا دفتر قائم کیا گیا ہے۔ان محلات کے اطراف دوہری فصیل بنائی گئی ہے جو بس ڈپو والی سڑک سے متصل ہے۔علی عادل شاہ کے تعمیر کردہ حسینی محل میں مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں جس کا ذکر نصرتی نے علی نامہ میں کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اہلِ بیت سے علی عادل شاہ کو بڑی عقیدت و مودت ہے جس کا سبب نصرتی نے بچپن کی تربیت اور "مائی نیکو کار" کی صحبت اور انداز پرورش قرار دیا ہے۔محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان نے زمانہ شہزادگی میں علی کی اپنی آغوش شفقت میں پرورش کی تھی وہ حاجی بڑے صاحب کہلاتی تھیں۔نصرتی علی نامہ میں کہتا ہے ؎

رکھتا ہے اہل بیت سوں اخلاص موروثی سدا
یعنی کہ جب مشہور ہے تس مائی نیکو کار کا
وہ حاجی حرمین ہیں حاجی بڑے صاحب کہ جس
توفیق دیتا ہے خدا مقبول ادک کردار کا

حسینی محل سے اس ملکہ کو خاص نسبت تھی یہاں محرم کے عشرہ اول میں علم ایستادہ کیے جاتے تھے۔علی عادل شاہ ثانی نے اس محل کی تعریف کی ہے۔مورخ گلدستہ بیجاپور

---

[1] مبارزالدین رفعت۔مقدمہ کلیات شاہی۔صفحہ ۱۴
[2] ابراہیم زبیری۔بساتین السلاطین۔ص ۴۲۷

Marfat.com

نے حسینی محل کا سنہ تعمیر ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۶ء تحریر کیا ہے[1] اور حسینی محل کو علی عادل شاہ ثانی کی تعمیر بتاتے ہیں۔ نصرتی حسینی محل کی ستائش کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

باندے ہیں یو صاحب بڑے ایسا حسینی اک محل
فردوس کے ہر قصر میں ہے ناؤں جس معمار کا
جس کا چھجا افلاک کے منظر کوں تہ خانہ ہوا
جس کا بھنیارا ہے چھجا تخت الثریٰ کی ٹھار کا
عارف کی روشن طبع نے نادر طبنی صاف تر
عاشق کے دل سا پر چھجر ہر بھیں چھجا پرکار کا
یک یک کماں اس دیک ہوئے قوس وقزح نیلی ہری
رہے طاق کسریٰ کسر پا ہر طاق انگے سو بار کا
جس فرش بلوریں صفا عینک ہوا ہے چاند کوں
سورج کیا ہے آئینہ مہری کی گچ ہموار کا
پڑ عکس تاریاں کا دسے سب صحن جون نیلک مٹریا
خورشید کے پرتو تے ہو جو صدر ہے زرتار کا

اس بارونق محل میں ایام عزا کے دوران جو چہل پہل اور گہما گہمی ہوتی تھی اس پر نصرتی نے روشنی ڈالی ہے اور حسینی محل میں ایستادہ کیے جانے والے علموں کے بارے میں اس کے بیانات عہد علی عادل شاہ ثانی کی تہذیب کے ایک مخصوص پہلو کی بڑی اچھی مصوری کرتے ہیں ؎

ویسے میں عاشور آئے سو ایسے محل میں نامور
کیتے شدے کرنے کھڑے رونق کیتے بستار کا
زربفت اطلس مخملاں نیلک مشجر بافتے
مٹرنے درو دیوار کوں تھا خرچ کئی خردار کا
مغرب میں لگتی شمع جون نس کا دھنواں چتر دسیا

---

[1] میر احمد علی (مرتب سید حمید شطاری) گلدستہ بیجاپور۔ ص ۶۲

Marfat.com

فانوس گرداں وہاں تلک ہوتا ہے چاروں پار کا
ہر ہر شدے کے فن اوپر تھی کسوت ایسے نور کی
سورج کو جس کے سامنے طاقت نہ تھا چک چار کا
سہرے ثوابت کے سہیں ہور کہکشاں سے نوسری
عقد ثریا سے ارک تھا ہر الاقہ ہار کا
مجمر کے مہکاراں ستی دن کا گریباں مشک بو
دامن رین کا عطر سوں نافہ ہوا تاتار کا

اس دور کے تمدن میں جو ہندو اور مسلم دونوں تصورات کا آمیزہ تھا ان دونوں عناصر کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ نصرتی محرم کی عزاداری اور حسینی محل میں ایستادہ علموں کا مرقع پیش کرتے ہوئے رام سیتا دوار کا اور بندرابن کی اُن تصویروں پر بھی روشنی ڈالتا ہے جو حسینی محل کی دیواروں کی زینت تھیں۔ یہ دو تہذیبوں کے اتحاد و امتزاج کا اظہار تھا ؎

تصویر کی ہندیاں پوئیوں وانر رسیں سیتا سوجوں
کہتا ہے کچ نگا میں چاہنو نت رام اوتار کا
کیئں چین کے تخت نول دکھلائیں بندرابن نوی
کیئں سٹ جو پھالیا لیاں کے خوش بسرائے دل تے دوار کا
ہر یک صنم کا روپ جب یک آفتاب آیا نظر
کرنے لگیا دنڈم وہاں ہر برہمن زنار کا

محرم کی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے نصرتی کہتا ہے کہ بادشاہ خود بہ نفس نفیس ان جلسوں کو "ترتیب" دیتا ہے اور خواص و عوام سب اس میں شرکت کرتے ہیں۔ شکر اور پھٹانے تقسیم کیے جاتے ہیں اور کلہیوں میں کئی قسم کا شربت تقسیم کیا جاتا ہے مرثیہ خوان اس پر درد انداز میں مرثیہ خوانی کرتا ہے کہ سننے والے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ شب عاشور عادل شاہ کے علم شہر میں گشت کرتے ہیں ؎

نو دیس ہور نورات ادک رونق تو یوں چڑھتا چلیا
دسویں رین میں قتل کی جون وقت آیا بار کا

Marfat.com

فرمائے شہہ تا شہر گشت اپنے شدیاں کے کاڑنے
دھولیئو اندھارا نورسوں ظلمات کے رخسار کا
شہہ کے نکلتے کر شدے سب شہر میں ہلبل ہوا
ہر صحن جم یک ہور ھیا عالم بھتر اور بھار کا

نصرتی کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ علموں کو قیمتی "لباس" سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ ان پر چھتریاں لگائی جاتی تھیں، انھیں رنگ برنگی کلغیوں سے سجایا جاتا تھا اور پھول چڑھائے جاتے تھے اس سلسلے میں نصرتی نے آتش بازی کا منظر بھی بڑے ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ اور کہتا ہے کہ شہاب، چکر بانی اور ہوائی وغیرہ کی روشنی نے سورج کو شرمندہ کر دیا ہے ؎

یو لسن سورج ہو زرد رو بھانا لیا بیمار کا

علی عادل شاہ ثانی نے بھی حسینی محل کی تعریف و توصیف کی ہے۔ علی داد محل (۱۰۶۹ء) ایک پرشکوہ اور شاندار عمارت تھی۔ علی داد محل اس کے باغ اور حوض کی علی عادل شاہ شاہی نے اپنے ایک قصیدے میں بڑی ستائش کی ہے اور کہتا ہے ؎

کسوایا آٹھوں سمدر بھریا جب نیر سوں حوض
سنر اور اس کے آئیں گے ہے یو علی داد محل
پایا یو اچھے اس قصر کا پاتال فلک
طاق کسریٰ ہوئے معراج اسے زہ کے اگل
بلندی سقف کی لیکھت نہ ہو طاقت بھی کسے
فلاطوں فکر تے بویا کہ یو انبر ہے نول
ہر یک یک طاق اچھے طاق اپس روپ منے
مانی من دھر کے لکھیا میز سوں تس پر جدول
بھرے تھے جام کے گل کر سارے منظر کے چھجر
نہ اچھے سور بھی اس سم جام جم تے یو نچھل
صفا صندل کی جھلا جوک دے منظر کے اوپر
اکے چندن کے دھرے پات جھروکے کے اگل

Marfat.com

علی عادل شاہ نے ۱۰۸۱ھ میں ایک اور محل "بادشاہ محل" تعمیر کروایا تھا جس کا نام و نشان بھی اب باقی نہیں۔

بقول زیڈ اے دیسائی عادل شاہی عہد میں دکن کا فن تعمیر اپنے نقطہ عروج پر نظر آتا ہے[1] ان کا طرز تعمیر بیدر کے بہمنی طرز تعمیر کی ترقی یافتہ صورت تھی۔ عادل شاہی عمارتوں میں میناروں کو اونچی گنبدوں پر ترجیح دی گئی تھی۔ عادل شاہی محلات میں سطح کی آرائش" (Surface Decoration) پر بہت زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔ علی عادل شاہ اول کے عہد میں تعمیراتی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اس نے بیجاپور میں عبادت گاہیں اور بعض دوسری عمارتیں تعمیر کروائیں۔ اس کے بعد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور حکومت میں وسیع پیمانے پر بیجاپور میں تعمیری منصوبوں کو عملی شکل میں ڈھال دیا گیا اور اسی دور میں دکنی تعمیر کے بیجاپوری اسٹائل کی نشو و نما ہوئی جو ہلکے پھلکے ڈزائن اور اپنے متناسب پلان کی وجہ سے منفرد نظر آتے ہیں۔ نازک اور خوبصورت آرائشی کام اس طرز تعمیر کا نمایاں وصف بن گیا ہے۔ ابتدائی دور میں معمولی قسم کے تعمیری مسالے سے عمارتیں تیار کی جاتی تھیں جیسے پلاسٹر اور اینٹ چونا وغیرہ اور یہ تعمیریں اکثر بھاری بھرکم نظر آتی تھیں لیکن بہت جلد ان کی جگہ نفاست کے ساتھ تراشے ہوئے پتھروں نے لے لی۔ کھمبے کنچے اور دیوار گیریوں کے طرز تعمیر میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا۔ کھمبے اور براکٹوں کے ڈزائن کھڑکی کے ڈزائن کے طرز میں تعمیر کیے جانے لگے۔ عادل شاہی عمارتوں میں بہمنی طرز کی طرح عمارتوں کی وسعت اور اونچائی پر زور دیا گیا ہے۔

بیجاپوری اسٹائل میں عمارت کے اوپری اور بیرونی حصے کی تعمیر پر بطور خاص توجہ کی جاتی تھی۔ بیجاپوری طرز میں گنبد کی وضع یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ پہلے گنبد پوری چھت پر محیط ہوتا تھا بیجاپوری اسٹائل میں گنبد کو پوری چھت کے بجائے صرف درمیانی حصے میں بنا کر اُسے خوبصورت اور چھوٹا کر دیا گیا۔ قدیم طرز تعمیر میں مینار براہ راست چھت سے شروع ہوتا تھا لیکن تعمیر کے بیجاپوری اسٹائل میں مینار کی

---

[1] زیڈ اے دیسائی۔ آرکٹکچر باب چہارم ۔ بہمنیز سیکشن اسٹیٹ۔ (ڈی) ۔ میڈیویل دکن۔ ص ۲۷۹

Marfat.com

اساس مرغول ہوتی ہے۔ بیجاپوری عمارتوں کی ایک اور تعمیری خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کارنس بہت بڑے اور باہر کی طرف نکلے ہوئے ہوتے ہیں یہ نہایت فنکارانہ انداز میں تیار کیے جاتے ہیں۔ ہندو طرز تعمیر میں چوبی کھمبوں پر نقش بنائے جاتے تھے اور کٹاؤ کا کام کیا جاتا تھا۔ بیجاپوری اسٹائل میں ہندو طرز تعمیر کی اس خصوصیت کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنایا گیا ہے۔ عمارتوں کی آرائش میں رنگ برنگی پتھر جڑنے کا کام بھی بیجاپوری طرز تعمیر کی ایک امتیازی خصوصیت بن گیا ہے۔ بیجاپور کا جل مندر اس کی اچھی مثال ہے۔ بقول عبدالقادر سروری بہمنی بادشاہوں نے ہندوستانی تہذیب کی ترقی میں حصہ لیا تھا۔ لیکن عادل شاہی بادشاہوں نے اس کو بہت فروغ دیا[1]

آثار محل میں بقول زیڈ اے دیسائی[2] انسانی پیکر پلنتھ کیے گئے تھے لیکن بیجاپور میں بالعموم عمارتی سطح کی آرائش کے لیے انسانی تصویروں سے زیادہ پتھروں کو تراش کر منبت کاری یا دوسرے آرائشی وسیلوں کی مدد لی جاتی تھی۔ میناروں کے اندرونی حصے میں بریکٹ، زنجیریں یا کارنس بنائے جاتے تھے[3] ان کے مخصوص موٹف (Motif) "پتہ اور کلی" ہے جو میناروں کی تعمیر میں بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ میناروں کی اساس یا بنیاد کلی کی وضع پر تعمیر کی گئی ہے۔ بیجاپوری طرز تعمیر کے صحیح تناسب اور عظمت کی زیڈ اے دیسائی نے بڑی تعریف کی ہے وہ گول گنبد کو جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے ایک "تعمیری عجوبہ" کہتے ہیں بیجاپوری عمارتوں کی چھتیں سپاٹ ہیں۔

علی عادل شاہ ثانی نے اپنے دور حکومت میں دارالضرب میں مخصوص قسم کے سکے بھی ڈھلوائے تھے۔ ان سکوں پر ایک طرف "علی عادل شاہ" اور دوسری طرف "غلام حیدر صفدر" کندہ کیا گیا تھا۔ عادل شاہیوں کے چاندی کے سکے اب تک دستیاب نہیں ہوئے ہیں[4]۔ عادل شاہی دور میں ایک کرنسی جاری کی گئی تھی جس کی وضع بدیسی نوعیت کی تھی۔

---

[1] عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ ص ۸۳

[2] [3] زیڈ اے دیسائی۔ آرکیٹکچر۔ باب چہارم۔ بہمنیز سکشن اسٹیٹ (ڈی) میڈیویل انڈیا۔ ص ۲۸

[4] پی ایل گپتا۔ کائنج۔ باب ہفتم۔ میڈیویل دکن۔ ص ۴۴۳

Marfat.com

یہ کرنسی" لاری" کے مقام پر جاری کی جانے والی کرنسی سے مشابہہ تھی یہ مقام خلیج ایران کے قریب واقع ہے۔ پی ایل گپتا نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ چوں کہ عادل شاہی سرحد کونکن تک پہنچ گئی تھی اس لیے بہت ممکن ہے کہ عادل شاہی بادشاہوں نے مقامی باشندوں کی طلب (Demand) کے پیش نظر لاری میں اپنا یہ مخصوص سکّہ ڈھلوایا ہو یہ سکہ" لارن" کہلاتا تھا یہ چاندی کے موٹے سے تار کی طرح ہوتا تھا۔ اس لیے اس سکّے کی سطح بہت مختصر اور چھوٹی سی ہوتی تھی جس پر الفاظ کندہ کروانا مشکل تھا اس کے باوجود بعض سکوں پر ایک طرف" سلطان علی عادل شاہ" پڑھا جاسکتا ہے اور دوسری طرف" ضَرَبَ لَارِیٰ وَبَلی" کندہ ہوتا تھا۔ بعض سکّوں پر ۱۰۷۱ھ یا ۱۰۷۷ھ بھی لکھا ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عادل شاہ ثانی کے دور میں جاری ہوئے تھے۔ محمد عادل شاہ نے بھی لارن جاری کیے تھے لیکن اس کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوا ہے۔

خطاطی کے فن نے بھی عادل شاہی دور میں بڑی ترقی کی تھی اور اس کے بہت سے نمونے دستیاب ہوتے ہیں جو فنکاری کی عمدہ یادگاریں ہیں۔ حیدرآباد کے میوزیم میں قلعہ رایچور کی خطاطی کا ایک نمونہ محفوظ ہے یہ سید حسین ابن فضل اللہ کا تحریر کردہ ہے اور ۱۰۳۹ھ کی یادگار ہے یہ محمد عادل شاہ کا زمانہ حکومت تھا۔ یہ خط ثلث کا عمدہ نمونہ تصور کیا جاتا ہے اس میں لکھے ہوئے حروف کی سائز حاشیے تک پہنچ گئی ہے یعنی حروف اور حاشیے کے درمیان جگہ نہیں چھوڑی گئی ہے۔ حاشیے پر ایسی جلا کی گئی ہے کہ حروف چمکتے رہتے ہیں اور حاشیہ آئینہ کی طرح نظر آتا ہے۔ رایچور کا خسرو برج بھی حیدرآباد کے میوزیم میں محفوظ ہے اس پر بھی خط ثلث کی تحریر ہے۔ حاشیہ کسی خاص قسم کے سیاہ روغن سے چمکایا گیا ہے جس سے تحریر نظر فریب بن گئی ہے۔ بیجاپور میں ابراہیم روضہ کی تحریریں بطور خاص قابل ذکر ہیں ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انھیں پتھر میں تراشا گیا ہے۔ حروف ابھرے ہوئے ہیں اور پتھر کی ان سلوں کو روضہ کی دیواروں میں لگا دیا گیا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ کی" کتاب نورس" حیدرآباد کے میوزیم کا مخزونہ ہے اس کا کاتب عظمت اللہ ہے۔ وہ خط ثلث کا ماہر تھا اس میں خط نسخ کے نمونے بھی موجود ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کا تحریر کردہ ایک قطعہ حیدرآباد میوزیم کی زینت ہے عادل شاہی بادشاہوں کے فرامین بالعموم خط نستعلیق میں ملتے ہیں اس دور کے تانبے کے جو

Marfat.com

سکے دستیاب ہوتے ہیں ان پر خط ثلث اور نسخ استعمال کیا گیا ہے۔

علی عادل شاہ کا انتقال ۱۰۸۳ھ میں ہوا وہ خود شاعر تھا اور اہل علم اور شعراء کی صحبت پسند کرتا تھا۔ قاضی کریم اللہ، شاہ کمال علامہ فتح اللہ شیرازی، ارسطو زماں ملّا احمد قاضی نور اللہ، اور مصطفےٰ خاں کیانی اس عہد کی اہم ادبی شخصیتیں تھیں شاہ ابو المعالی کے ذمے یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ بادشاہ کے کلام کو جمع کر کے مرتب کرے [1]

مرزا مقیم، دولت شاہ، حکیم آتشی اور عبد القادر اس عہد کے مشہور سخنور تھے جو بالعموم فارسی میں طبع آزمائی کرتے۔ شاہ نور اللہ نے فارسی میں اس دور کی تاریخ "تاریخ علی عادل شاہ" مرتب کی تھی نصرتی نے ان کی علمی صلاحیتوں کو بہت سراہا ہے اور کہتا ہے ؎

مدبر بڑا رائے زن دور بین — قومی رکن ہے سلطنت کا یقین
زہے شاہ نور اللہ فرخندہ نام — منوّر ہے جس فضل سے جگ تمام
وہ سب لکھ کے تاریخ میں خوب دھات — کیا نت حوالے زمانے کے ہات
کیا جیوں وہ تاریخ لکھنی شروع — ہوا فیض حق تس کی جانب رجوع

نور اللہ کی تاریخ نویسی کی نصرتی نے بہت تعریف کی ہے۔ دیوی سنگھ چوہان نے اپنے ایک مضمون "نور اللہ اور نصرتی" میں ان دونوں کے باہمی ربط پر تبصرہ کیا ہے [2]

"بساتین السلاطین" میں دکنی کو علی کی "مادری زبان" تحریر کیا ہے۔ اور مورخ ابراہیم زبیری لکھتا ہے کہ دکنی سے علی عادل شاہ ثانی کو خاص طبعی لگاؤ تھا اور وہ اپنے عہد کا بلند پایہ شاعر اور سخن گستر تھا، اس لیے "استاد عالم" کے لقب سے مشہور تھا [3]

ہارون خان شیروانی "کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا" میں لکھتے ہیں کہ بیجاپور میں مصوری کی ترقی کا زمانہ دور علی عادل شاہ ہے [4] ڈاکٹر موتی چندرا کے کلکشن میں ایک

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ شاہان دکن کی اردو شاعری۔ نوائے ادب۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء۔ ص ۶۴

[2] دیوی سنگھ چوہان۔ نور اللہ اور نصرتی (مضمون) مشمولہ نوائے ادب بمبئی ۱۹۶۷ء ص ۲۱

[3] محمد ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ ص ۲۵۰

[4] ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا۔ ص ۶۲

Marfat.com

تصویر چہ (Miniature) ہے جس میں علی عادل شاہ اور اس کے ملازمین کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ غلام یزدانی "ٹوپیچرس آف بیجاپور" میں رقمطراز ہیں کہ ایرانی مصوری کے خطوط نیچے کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس منظر میں نازک موٹف (Motif) بنائے جاتے ہیں یہ مصوری کی صفوی روایات ہیں جو دکنی مصوری میں اپنی جھلک دکھاتی ہیں [1]

علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد سکندر تخت نشین ہوا۔ علی عادل شاہ جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے عبدالمحمد کو خردسال شہزادے کو تخت نشین کر کے کاروبار سلطنت سنبھالنے کی ہدایت کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ خواص خاں سکندر کو تخت پر بیٹھا کر دارالخلافہ اور اس کے آس پاس کے علاقے کا انتظام کرے اور عبدالمحمد کو شمال مشرقی علاقے، قلعہ شاہ درک اور گلبرگہ وغیرہ سپرد کر دیا جائے تاکہ مغلوں کی مناسب روک تھام کا انتظام ہو سکے [2] عبدالکریم بہلول خاں کو مغرب یعنی مرج اور قلعہ پنہالہ وغیرہ کی طرف روانہ کیا جائے تاکہ وہ شیواجی کے مقابلے کے لیے تیار رہے اور اسی طرح مظفر خاں کو جنوب (بدنور) کا صوبہ دار مقرر کیا جائے تاکہ وہ ہندو راجاؤں پر نظر رکھے [3]

مورخ "تاریخ رشید الدین خانی لکھتے ہیں کہ سکندر علی عادل شاہ کا متبنیٰ بیٹا تھا اور پانچ سال کی عمر میں خواص خاں بہلول خان افغان اور سید مسعود حبشی نے سلطنت کے لیے اُسے نامزد کیا تھا [4] سکندر نے چودہ سال حکومت کی اس کے دور میں حکومت کا شیرازہ بکھر رہا تھا مرہٹوں اور مغلوں کی پے در پے یورشوں نے حکومت کی بنیادیں متزلزل کر دی تھیں۔ بادشاہ کی ناتجربہ کاری اور امراء کی خود غرضی نے بیجاپور کی سلطنت کی بنیاد پر ملاڈالی تھیں اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیواجی نے بعض عادل شاہی قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا اس نے عادل شاہی مملکت کی تسخیر کے لیے لشکر روانہ کر دیا۔ خواص خان نے عبدالکریم بہلول خاں کو مقابلے کے لیے بھیجا جب وہ امراوتی کے قریب پہنچا تو شیواجی کی فوج نے اس پر حملہ کر دیا۔ بہلول خاں نے بڑی پامردی اور ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اور شیواجی کا لشکر

---

[1] غلام یزدانی۔ ٹوپیچرس آف بیجاپور (مضمون) مشمولہ اسلامک کلچر اپریل ۱۹۳۵ء صہ ۲۱۱ تا ۲۱۷

[2] عبدالحق نصرتی۔ صہ ۲۱۸

[3] غلام امام خاں ترین ہجر۔ تاریخ رشید الدین خانی۔ صہ ۲۲۲

ال کرلی۔

Marfat.com

گھبرا کر منتشر ہوگیا اسی جنگ کا حال نصرتی نے اسکندر نامہ میں نظم کیا ہے۔ علی نامہ کے مقابلے میں نصرتی کا "اسکندر نامہ" اس لیے کمزور معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو یہ نصرتی کے دور آخر اور ضعیف العمری کا کلام ہے جب کہ شاعر میں ولولہ اور جوش و خروش باقی نہیں رہا تھا۔ دوسرے بیجاپور میں اب نہ وہ اگلی سی شان و شوکت باقی رہی تھی نہ بادشاہ کا وہ دبدبہ اور جاہ و جلال۔ بادشاہ کے وہ پرعظمت کارنامے جو شاعر کی فنی صلاحیتوں کو مہمیز کرتے ہیں کہاں تھے؟ بہلول خان کی یہ فتح برائے نام کامرانی تھی انہی حالات نے "اسکندر نامہ" کو "علی نامہ" سے کمتر شعری تخلیق بنا دیا ہے۔ بہلول خان کی معرکہ آرائی کا یہ منظر ملاحظہ ہو ؎

سنبایا سو بھائے نے ثابت کٹار　　کیا پھاڑ بکتر کوں چھاتی کے پار
چلا دیں اگر دھنک ہاتی پہ توڑ　　پڑے دو مہتی دیکھ اپس جیو چھوڑ
دیکھا دیں تو سنداں توڑاں کے بھانت　　اوڑیں ہو کر چنگیاں متے گج کے دانت
کمر پر ستیں میں تو نیں لگ خبر　　نیکل جاوے یک دل کو دو پھانک کر

ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا" میں پی این چوپرا اور این سبرامنیم لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب نے اولا خاں اور خان جہاں کو تاکید کر دی تھی کہ وہ بیجاپور کا محاصرہ کر لیں۔ عادل شاہیوں نے یہ دیکھ کر مغل فوجوں کی رسد روک دی اور مغل حملہ آور پریشان ہوگئے۔ اورنگ زیب واپس ہوگیا لیکن اس کے بیٹے اعظم نے فوجی کارروائی جاری رکھی۔ بالآخر اورنگ زیب نے غازی الدین خان کو شہزادہ اعظم کی کمک کے لیے روانہ کیا[1]

یکم اپریل ۱۶۸۵ء کو شہزادہ اعظم نے بیجاپور کا محاصرہ کر لیا عادل شاہی فوج نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور مغلوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ سقوط بیجاپور کا ایک سبب بے وفا اور دغاباز سفیر خواص خاں بھی تھا جس نے لشکر کو قصداً کمزور کر دیا تھا۔ وہ اورنگ زیب کو قیمتی تحائف نذر کرتا رہتا تھا جس سے اس کی بدنیتی کا پتہ چلتا ہے۔ عالمگیر نے اپنے تجربہ کار جرنل بہادر خان کو صوبدار مقرر کر دیا اور سابق صوبہ دار معظم کو بے دخل کر دیا بہادر خان نے نیا عہدہ سنبھالتے ہی

---

[1] پی این چوپرا اور این سبرامنیم۔ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ جلد دوم۔ ص ۱۲۱۔

Marfat.com

حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں اور فوجی کارروائیوں میں مصروف ہوگیا۔ اورنگ زیب سے ہدایت پاتے ہی اس نے چڑھائی کر دی۔ عادل شاہی فوجیں بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کر رہی تھیں۔ یہ حال دیکھ کر خود عالمگیر رسول پور پہنچا جو بیجاپور کے مغرب میں واقع ہے اور ۳ر جولائی ۱۶۸۶ء کو محاصرہ سخت کر دیا گیا۔ بعض تاریخوں کے بیان کے مطابق یہ محاصرہ ۱۶۸۵ء تا ۱۶۸۶ء تک برقرار رہا[1]۔ "ماثر عالمگیری" میں محمد ساقی مستعد خان لکھتا ہے کہ یہ محاصرہ دو ماہ برقرار رہا جس سے سکندر عادل شاہ اور اس کے بہی خواہ پریشان ہو گئے کیوں کہ مغل فوجوں کے ساتھ سامان جنگ اور دوسری ضروری اشیاء کی کثرت تھی[2]۔ سید علی محسن نے "زوال سلطنت قطب شاہیہ" میں بیجاپور کے اس محاصرے کی تفصیلات بیان کی ہے[3]۔ مغلوں کے اس زبردست حملے سے قبل بھی سکندر کو سکون نصیب نہیں ہوا تھا۔ شیواجی نے بلگی، جمکنڈہ اور یادواڑ کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا اور زر تحصیل بھی وصول کرنے لگا تھا۔ اس نے ادھونی کی طرف بھی اپنی فوج روانہ کر دی تھی تاکہ وہاں بھی عوام کو ہراساں کیا جائے۔ گلدستہ بیجاپور کے مورخ عہد سکندر عادل شاہ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ یہ بیجاپور میں بد امنی اور لاقانونیت کا دور تھا۔ مہدیوں اور افغانوں کے ہنگامے برپا ہوتے رہتے تھے۔ جب دارالسلطنت بیجاپور کی اس بدامنی اور سیاسی خلفشار کی خبریں عالمگیر تک پہنچیں تو سلطان معظم اور دلیر خاں دہلی سے، شیواجی اور عادل شاہوں کی تنبیہ کے لیے بیجاپور روانہ کیے گئے لیکن بیجاپور میں ابتری برقرار رہی بالآخر ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء میں اورنگ زیب برہان پور پہنچا اور سات مہینے کے بعد احمد نگر آیا۔ سیناجی اور عالمگیر کے لشکر میں سخت رن پڑا۔ ماہ ربیع الاول ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء کو سکندر عادل شاہ نے مغل فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سیدی یاقوت کو حوالداری عطا کی۔ میر احمد علی لکھتے ہیں کہ ۱۰۹۷ھ میں مغلوں نے قلعہ بیجاپور کو چاروں طرف سے گھیر لیا تو سکندر عادل شاہ نے اپنے امراء سے مشورہ کر کے علماء کی ایک

---

[1] ایم اے نعیم۔ دی اکسٹرنل ریلیشنس آف بیجاپور۔ ص ۲۷

[2] محمد ساقی مستعد خاں۔ ماثر عالمگیری۔ ص ۱۸۹

[3] سید علی محسن۔ زوال دولت قطب شاہیہ۔ باب یازدھم۔ ص ۲۲۶ تا ۲۴۰

Marfat.com

جماعت عالمگیر کے پاس بھیجی تاکہ وہ یہ دریافت کریں کہ مسلمان سلطنت پر مسلمان حاکم کا حملہ شریعت کے اعتبار سے کس عہد تک درست ہے ؟ اورنگ زیب نے جواب دیا کہ وہ شقی جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ؎

حرم میں اچھے بھی تو ہے کشتنی

تمھاری بغل میں موجود ہے اور اس فتنے کو فرو کرنا ضروری ہے[1] سعید خان ترین، منشی عبدالرؤف، منشی شیخ حسین اور سید مخدوم اور شرزہ خان نے مغلوں سے صلح کی کوشش کی جو ناکام ثابت ہوئی سپاہیوں، جنگی جانوروں کی موت اور دوسری مشکلات نے بیجاپور کو کمزور کر دیا تھا۔ ۱۲ر اپریل ۱۶۸۶ء/۱۰۹۷ھ کو سکندر عادل خاں کی حیثیت سے بادشاہ نے خزانے کی کنجیاں اورنگ زیب کے حوالے کر دیں اور شاہی نشانات بھی پیش کر دیے۔[2] ۱۲ر ستمبر ۱۶۸۶ء کو سکندر عادل شاہ نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور اورنگ زیب کی خدمت میں رسول پور پہنچ گیا تھا۔ ماثر عالمگیری میں محمد ساقی مستعد خاں لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے کلان بار میں اپنا خیمہ نصب کروایا تھا۔ اور فتح بیجاپور کے بعد ۲۲ر ذیعقدہ ۱۰۹۷ھ تک یہیں قیام پذیر تھا اور یہیں سے شولاپور کی جانب روانہ ہوا تھا۔ عالمگیر نے حکم دیا کہ سکندر خان کو بیگمات شاہی کے ہمراہ شولاپور بھیج دیا جائے اور عادل شاہی ماہی مراتب اور دیگر سامان عظمت "محکمہ ضبطی خانہ" میں محفوظ کر دیا جائے۔[3]

سکندر عادل شاہ کو پہلے قلعہ دولت آباد میں قید رکھا گیا اور پھر وہ اورنگ زیب کے ہمراہ قیدی کی حیثیت سے شمال کی جانب روانہ ہوا۔ جے این چودھری لکھتے ہیں کہ سکندر عادل شاہ کا انتقال ۳ر اپریل ۱۷۰۰ء میں ہوا۔[4] "بساتین السلاطین" میں ابراہیم زبیری تحریر کرتا ہے کہ ۱۰۹۷ھ میں عادل شاہی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا[5] اور بقول ایم اے نعیم اورنگ زیب

---

[1] میر احمد علی (مرتب سید حمید شطاری)۔ ص ۱۱۱

[2] پی۔ ایم جوشی۔ دی عادل شاہیز اینڈ دی برید شاہیز مشمولہ میڈیویل ہسٹری آف دکن۔ جلد اول ۱۲۹۵۔

[3] محمد ساقی مستعد خان (مترجم فدا علی)۔ ص ۱۹۲

[4] جے این چودھری۔ دی مغل ایمپائر۔ ساتواں باب۔ ص ۲۸۵

[5] محمد ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ ص ۵۲۹

Marfat.com

کی دیرینہ تمنا پوری ہوگئی [1] اورنگ زیب نے روح اللہ خاں کو پنج ہزاری منصب سے سرفراز کرکے بیجاپور کا صوبہ دار مقرر کردیا۔ مورخ گلدستہ بیجاپور کے بیان کے مطابق سکندر عادل شاہ چودہ سال تک عالمگیر کی قید میں رہا۔ عالمگیر نے بادشاہ سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اُسے زہر ہلاہل سے ۱۱۱۱ھ میں مارڈالا [2] سکندر عادل شاہ کی وصیت کے مطابق اس کے جنازے کو بیجاپور روانہ کیا گیا اور مزار شاہ نعیم اللہ کے پائیں میں جو سکندر کے مرشد تھے دفن کیا گیا۔ شاہ نعیم اللہ شاہ ہاشم کے پوتے اور شاہ برہان کے مرید تھے۔ ان کے علاوہ سکندر عادل شاہ نے محمود بحری سے بھی فیض روحانی حاصل کیا تھا [3]

عادل شاہیوں نے بیجاپور میں تمام شاہی لوازمات جو ایک خود مختار حکومت کے لیے ضروری ہوتے ہیں مہیا کیے تھے ان کے یہاں تخت اور چتر تھا شاندار دربار بھی موجود تھا اور ان کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جاتا تھا تانبے چاندی اور سونے کے سکے بھی ڈھالے جاتے تھے۔ دن میں پانچ مرتبہ نوبت بجائی جاتی تھی۔ خبر رساں مختلف علاقوں سے خبریں لاتے جنھیں دربار عام میں بادشاہ سناتا اور دائیں اور بائیں امراء سلطنت اپنے مرتبے کے اعتبار سے ایستادہ ہوتے۔ یہاں چوں کہ ہر کس و ناکس کی رسائی تھی اس لیے فریادی فریادے کر آتے تھے [4] عادل شاہی دربار اپنی شان و شوکت کی وجہ سے ممتاز تھا نماز عصر تک دربار کی کارروائی چلتی اور پھر بادشاہ دو گھنٹے آرام کرتا تھا۔ ہفتے میں ایک دن بادشاہ خود بہ نفس نفیس فوج کا معائنہ کرتا۔ "مجلس خلوت" میں صرف وہی امراء موجود ہوتے جن پر سلطان کو اعتماد کامل ہوتا۔ یہ کونسل یوسف عادل شاہ نے قایم کی تھی [5] عادل شاہی سلطنت میں وزراء کے علاوہ وکیل السلطنت

---

[1] ایم اے نعیم۔ دی اکسٹرنل ریلیشنس آف بیجاپور۔ ص ۲۷

[2] میر احمد علی (مرتب سید حمید شطاری) گلدستہ بیجاپور ص ۱۱۸

[3] " " " ص ۱۲۰

[4] ڈی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور۔ باب دہم۔ ص ۲۱۷

[5] " " " ص ۲۱۹

Marfat.com

بھی ہوا کرتے تھے۔ وکیل السلطنت بیجاپوری فوج کا سپہ سالار ہوتا اور تمام فوج کی نگرانی کرتا تھا۔ "وکیل السلطنت" کے بعد "امیر جملہ" کا عہدہ تھا وہ وزیر مالیہ ہوتا۔ "مستوفی الملک" "امیر جملہ" کا مددگار ہوتا جس کے تحت ہندو منشیوں کی ایک جماعت ہوتی اور وہ حسابات کا ذمہ دار ہوتا اس طرح عادل شاہیوں کی مالگزاری اور عدلیہ دونوں اہل ہنود کے سپرد تھے جس سے ان سلاطین کی مذہبی رواداری اور وسیع النظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ "پیشوا" اور "خانساماں" بھی ہوتے۔ خانساماں محلات کے تمام انتظامات کی نگرانی کرتا۔ بقول ڈی سی ورما مورخ "ہسٹری آف بیجاپور" عادل شاہی حکمرانوں کے تعلقات اہل ہنود سے بہت اچھے تھے اور سلطنت میں کبھی تبدیل مذہب کی مہم نہیں چلائی گئی [1]

اسد بیگ جو مغل شہنشاہ جہانگیر کا سفیر بن کر بیجاپور آیا تھا لکھتا ہے کہ عادل شاہی پایہ تخت کے تمام بازار شراب، عطریات، حسین رقاصاؤں اور زر و جواہر سے معمور تھے وہ لکھتا ہے کہ دنیا کا کوئی اور مقام سیاح کے لیے اس سے بہتر منظر پیش نہیں کر سکتا [2]

عادل شاہی حکومت کے نظم و نسق کو مورخین نے بہت سراہا ہے۔ سلطان کے بعد "وکیل سلطان" کا مرتبہ تھا جو وزارت کے عہدے پر فائز ہوتا حکومت کی خارجی پالیسی اور داخلی معاملات پر بحث کرنے کے لیے مختلف مسائل کو "مجلس" میں پیش کیا جاتا۔ یہ بڑے بڑے جاگیرداروں اور امرائے عظام پر مشتمل ہوتی یہ مجلس مختلف امور میں بادشاہ کو مشورے دیتی تھی [3]

پرتگال سے بیجاپور کے تجارتی تعلقات تھے۔ ڈچ لوگ بھی عادل شاہیوں سے تعلقات استوار کرنا چاہتے تھے۔ یورپ کے دوسرے ممالک نے بھی ان کی تقلید کی۔ انگلستان نے بھی اپنی تجارت کے لیے بیجاپور کو منتخب کیا۔ رالف فچ

---

[1] ڈی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور۔ ص ۲۵۳

[2] " " " " ص ۲۶۵

[3] اے ایم نعیم۔ دی اکسٹرنل ریلیشنس آف بیجاپور۔ ص ۲۹

Marfat.com

(Ralph Fitch) ملکہ الیزابتھ کی اجازت سے یہاں آیا تھا اور اس نے ۱۵۸۵ء میں سلطنت کے کئی مقامات کی سیر کی تھی اور ہیروں کی تجارت میں مصروف رہا۔ اس کے ساتھی جان نیوبری (John Newbery) ولیم لیڈس (William Leeds) اور جیمس اسٹوری (James Story) تھے۔ جب اپریل ۱۵۸۵ء میں یہ لوگ بیجاپور پہنچے تو انھیں جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور پھر ۲۲ دسمبر ۱۵۸۵ء کو انھیں پادری اسٹیونس (St. Stevans) کی درخواست پر دو ہزار روپیہ جرمانہ عائد کرنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔[1] ۱۶۳۶ء میں انگریزوں نے بندرگاہ دابل سے باقاعدہ تجارت شروع کر دی اور دابل میں ایک کارخانہ بھی قایم کر دیا جس کا لائسنس بادشاہ سے حاصل کیا گیا تھا ۱۶۳۷ء کے معاہدے کے تحت یہ طے پایا تھا کہ انگریز کالی مرچ بیجاپور پہنچائیں اور یہاں سے سیسہ لے جائیں۔ یہ معاہدہ کیپٹن ویڈل (Capt. Waddells) سے طے پایا تھا۔ جب بیجاپور میں چاندی کے سکّوں کی جو تجارت میں کام آتے تھے قلت ہو گئی تو ریونگٹن (Revington) نے رستم زماں سے خواہش کی کہ انگریزوں کو ایک دارالضرب قایم کرنے کی اجازت دی جائے جس میں عادل شاہی حکومت کے لیے سکّے ڈھالے جائیں۔ اس کے تیرہ سال بعد بمبئی میں یہ دارالضرب قایم ہوا اور بیجاپور میں یہاں کے سکّے جاری ہوئے ۱۶۷۰ء میں شیر خاں لودھی نے جو ولی کنڈاپورم میں عادل شاہی گورنر تھا۔ فرانکو مارٹن (Franco Martin) کو جو ایک فرانسیسی "ڈائریکٹر" تھا ہندوستان میں کارخانہ قایم کرنے پر اکسایا اور پانڈیچری میں ایک مناسب مقام کی نشاندہی بھی کی اور یہ مقام ۴ فروری ۱۶۷۳ء میں فرانسیسیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ اورلس پنے (Les Pinay) نے رفتہ رفتہ اس مقام پر مکمل قبضہ کر لیا۔[2]

---

[1] ایم اے نعیم۔ دی اکسٹرنل ریلشنس آف بیجاپور۔ ص ۲۳۷

[2] " " " " ص ۲۳۷

[3] " " " " ص ۲۶۰

Marfat.com

مختصر یہ کہ عادل شاہی حکمرانوں نے امورِ سلطنت، تجارت، صنعت و حرفت، فنِ تعمیر، مصوری، خطاطی اور شعر و ادب کی ترقی میں جو نمایاں حصّہ لیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے اور تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ گیا۔

Marfat.com

قطب شاہی سلطنت

مغل مورخین حیدرآباد کو" دارالجہاد[1]" کہنے کے باوجود اس کے محل وقوع، پرفضا ماحول اور زرخیز زمین کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ محمد ساقی مستعد خان " ماثر عالمگیری" میں لکھتا ہے کہ یہ قطعۂ زمین "بہشت بریں کا نمونہ ہے"۔ شہر کی عمارتیں بہت بلند اور دلکش ہیں، ہوا کی رطوبت اور چشموں کی روانی و شیرینی اور سبزہ کی شادابی اس درجہ "معتدل" ہے کہ یہاں "گل و سبزہ" بلاشبہ "زمرد و لعل" نظر آتے ہیں[2]

بانی سلطنت گولکنڈہ سلطان قلی ترکستان کے قبیلے قراقونیلو سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کا سلسلہ نسب بقول شاروکو (Sha Rocco ..) حضرت نوح کے بیٹے سے جا ملتا ہے[3] عبدالمجید صدیقی لکھتے ہیں کہ یہ ترکوں کا "شیعہ قبیلہ" تھا اور ایران کے شہر ہمدان سے اس کا تعلق تھا[4] "حدیقۃ السلاطین" میں قراقونیلو قبیلے کے سب سے بڑے سردار کا نام اغرخان بن قراخان بتایا گیا ہے جو حضرت نوحؑ کی اولاد سے تھا[5]

---

[1] سید علی محسن۔ زوال دولت قطب شاہیہ۔ ص ۳۱۴

[2] محمد ساقی مستعد خان (مترجم فدا علی طالب)۔ ص ۲۰۲

[3] شاروکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز۔ (انگریزی) ص ۴

[4] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۲۶

[5] نظام الدین احمد الصاعدی حدیقۃ السلاطین۔ ص ۵

Marfat.com

سلطان قلی اپنے چچا اللہ قلی بیگ کے ساتھ محمود شاہ بہمنی کے دربار میں باریاب ہوا تھا۔ "سلطان" اس کے نام کا جزو تھا۔ ہارون خان شیروانی نے اس سے بحث کی ہے اور وہ رقمطراز ہیں کہ لفظ سلطان بادشاہ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے[1] "تاریخ محمد قطب شاہ" کا نا معلوم مصنف لکھتا ہے کہ بانی سلطنت گولکنڈہ ہمدان سے واردِ ہندوستان ہوا تھا اور یہاں کے حکمران خاندان سے اس کا تعلق تھا[2] ہمدان کے شاہی خاندان کے ان دونوں افراد کی بہمنی دربار میں بڑی آؤ بھگت ہوئی لیکن ترکستان کے امیر یعقوب کے انتقال کے بعد اللہ قلی اپنے وطن واپس ہوگیا اور سلطان قلی نے جو قراقونیلو قبیلے کی شورشوں سے بیزار تھا دکن کی سکونت اختیار کی اور یہیں کا ہو رہا[3]۔

"صولت عثمانیہ" کے مصنف نے محمد قلی کے بیدر پہنچنے کی تفصیلات بیان کی ہیں اور لکھتا ہے کہ سلطان محمد قلی ۸۶۰ھ میں سعد آباد، ہمدان میں پیدا ہوا تھا جب ہمدان کی حکومت پر سلطان محمد قلی کا چچازاد بھائی خلیل سلطان قابض ہوگیا تو اس سے محمد قلی کے تعلقات بہت کشیدہ ہوگئے اور وہ اپنے وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوگیا اور ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ جب اللہ قلی اور سلطان قلی نیرو پہنچے تو حضرت نورالدین نعمت اللہ ثانی سے ملاقات کی۔ وہ صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ ان کی رفیقہ حیات خاندان سلاطین ہمدان سے تعلق رکھتی تھیں۔ نورالدین نعمت اللہ ثانی نے پیشن گوئی کی تھی کہ ملک دکن کا سفر سلطان محمد قلی کے لیے بہت مبارک ثابت ہوگا اور وہ ایک دن وہاں کا بادشاہ بنے گا۔ انھوں نے اپنے سجادے کے نیچے سے چند اشرفیاں نکال کر سلطان محمد قلی کو عنایت کی تھیں۔ یہ عمل مستقبل میں محمد قلی کی خوشحالی، اقتدار اور تمول کا فال نیک ثابت ہوا[4]

"تاریخ فرخندہ" کا مورخ محمد قادر خان بیدری لکھتا ہے کہ محمد قلی اپنے چچا کے

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ محمد قلی قطب شاہ۔ ص۵

[2] نامعلوم۔ تاریخ سلطان محمد قطب شاہ۔ مخطوطہ نمبر ۳۳۱۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ورق ۱۲۷

[3] ابو تراب۔ حدیقۃ العالم۔ ص۱۳

[4] ابوالفتح محمد امیراللہ۔ صولت عثمانیہ۔ ص۴

Marfat.com

ساتھ سوداگروں کے گروہ میں شامل ہو کر وارد دکن ہوا تھا انھوں نے بانی سلطنت گولکنڈہ کے شجرے پر بھی روشنی ڈالی ہے اور محمد قلی کے دادا کا نام امیرزادہ الوند اور ان کے والد کا نام اسکندر بن یوسف تحریر کیا ہے [1]

وہ بیس برس کی عمر میں سلطان محمود شاہ بہمنی کے دور حکومت میں بیدر پہنچا تھا۔ سلطان محمد قلی نے بہت جلد بہمنی بادشاہ کے دل پر اپنی بہادری، تدبر اور شجاعت کا سکّہ بٹھا دیا۔ جب ۸۹۰ھ میں تلنگانہ میں شورش برپا ہوئی تو سلطان محمد شاہ کو وہاں بھیجا گیا اور اس نے وہاں غیر معمولی کارکردگی اور دانشمندی کا ثبوت دیا اور کامیاب و کامران بیدر واپس ہوا تو بادشاہ نے خدمت وزارت اور جاگیر سے سرفراز کیا۔ جب قطب الملک کا انتقال ہوا تو ۸۹۲ھ میں محمود شاہ نے محمد قلی کو خطاب خواص خاں امیر الامراء عطا کر کے قطب الملک کے خطاب سے بھی عزّت افزائی کی اور تلنگانہ کا صوبہ دار بنا دیا [2]

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطان محمد قلی بہت اچھا خوش نویس تھا اور علم ریاضی کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ غلام امام خان ترین ہجر "تاریخ رشید الدین خانی" میں تحریر کرتے ہیں کہ "مملکت تلنگ" میں بغاوت فرو کرنے کے صلے میں نہ صرف قطب الملک کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا بلکہ "بلدہ گولکنڈہ مع مضافات واقطاع" عطا کیے گئے تھے [3] چوں کہ سلطان قلی میں علمی اور انتظامی دونوں صلاحیتیں موجود تھیں اس لیے اس کو "صاحب السیف والقلم" کہا گیا ہے [4] ۱۴۸۷ء میں سلطان محمد قلی نے بادشاہ کی زندگی بچائی تھی۔ اس کے بعد بہادر جیلانی نے جو گوا کا تھانہ دار تھا بغاوت کر دی تھی اس سرکشی کو روکنے کے لیے بادشاہ کی نظر انتخاب سلطان محمد قلی پر پڑی اور نومبر ۱۴۹۴ء میں سلطان نے پنہالہ کی بغاوت فرو کی اور کامیاب و فتح مند

---

[1] محمد قادر خان بیدری۔ مخطوطہ تاریخ فرخندہ۔ مخطوطہ نمبر ۲۱۸۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ص ۳

[2] ابوالفتح محمد امیر اللہ۔ صولت۔ عثمانیہ۔ ص ۶

[3] غلام امام خان ترین ہجر۔ تاریخ رشید الدین خانی۔ ص ۲۱۷

[4] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۲۹

Marfat.com

واپس ہوا۔ ان واقعات نے سلطان محمد قلی کی ہمت و تدبر اور فوجی مہمات کی جنوبی ہند میں دھاک بٹھا دی۔ سلطان محمد قلی ترقی کے زینے طے کرتا ہوا تلنگانہ کا طرفدار بن گیا اور قلعہ گولکنڈہ اس کی وسیع جاگیر کا ایک حصہ بن گیا۔ ۹۲۴ھ میں سلطان محمد قلی نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور گولکنڈے کو اپنا پایہ تخت قرار دیا گولکنڈے کو محمد نگر کے نام سے موسوم کر کے اس نے اپنے دار الخلافہ کو مستحکم کرنے کے منصوبے بنانے شروع کر دیے۔ پہاڑی پر سابقہ راجاؤں کا قلعہ موجود تھا۔ سلطان نے سیاسی اغراض و مقاصد کے پیش نظر اس کی تعمیر و ترمیم کا کام شروع کر دیا اور اسے زیادہ سے زیادہ مضبوط اور محفوظ بنانے کی کوشش کی۔ "ماثر دکن" میں اس قلعے کا قدیم نام منکل بتایا گیا ہے[1] شارو کو لکھتا ہے کہ یہ علاقہ چالوکیوں کے قبضے میں تھا پھر کاکتیہ راجاؤں نے اس پر قبضہ کیا۔ بہمنی دور میں دوسرے بہمنی حکمران نے اسے فتح کیا تھا۔ کاکتیہ راجاؤں کے قبضے سے پہلے یہ قلعہ مٹی سے بنا ہوا تھا۔ ۱۳۶۳ء میں ورنگل کے کینا نائک نے فیروز شاہ سلطان دہلی کو مشورہ دیا کہ وہ بہمنی بادشاہ محمد شاہ بہمنی پر حملہ کر دے جب محمد شاہ بہمنی کو اس کی خبر ملی تو اس نے ورنگل کی طرف پیش قدمی کی۔ کاکتیہ نائک نے معاہدہ کر لیا جس کی رو سے اس نے بخوشی ضلع گولکنڈہ اور قلعہ گولکنڈہ محمد شاہ بہمنی کے حوالے کر دیا[2] سلطان محمد قطب شاہ نے قلعے کے اندر محلات اور دوسری عمارتیں تعمیر کروائیں فصیل کے اندر حمام، مسجدیں اور دیگر تعمیرات سے شہر کی آبادی کو سہولتیں پہنچائی گئیں یہاں تک کہ بقول مورخ "تاریخ سلطان قطب شاہی" چند روز میں یہ شہر "رشک ہر دیار و غیرت افزائے سائر بلاد و امصار" ہو گیا[3] وہ اس کو "مرغزار جنت آثار" کہتا ہے۔ شارو کو نے تھیونو (THEUONOT) کے حوالے سے لکھا ہے کہ چوں کہ ایک چرواہے کے لڑکے نے بانی سلطنت کو جنگل کے راستے سے اس پہاڑ کا پتہ بتایا تھا جہاں یہ قلعہ واقع تھا اس لیے تلگو لفظ "گول" سے گولکنڈہ نام مشہور ہو گیا لیکن یہ ایک کمزور روایت ہے۔

---

[1] سید علی اصغر بلگرامی۔ ماثر دکن۔ ص ۲۷

[2] شارو کو۔ گولکنڈہ اینڈ قطب شاہیز۔ (انگریزی)۔ ص ۳

[3] نامعلوم مصنف مخطوطہ۔ تاریخ سلطان قطب شاہی۔ مخطوط نمبر ۲۳۱۔ کتب خانہ سالار جنگ ورق ۲۴۱

Marfat.com

سلطان قلی نے اس نوخیز حکومت کے حدود میں توسیع کی اور مشرق میں مچھلی پٹنم اور کاکی ناڈا سے اس کی حدیں جا ملیں۔ راجمندری قلعہ کا راجا وینکٹ نائک فوجی طاقت کے نشے میں چور تھا اور اپنے حدود سلطنت میں مسلسل توسیع کرتا جا رہا تھا۔ سلطان نے اس کی سرکوبی کی لیکن کئی ہزار سپاہیوں سے ہاتھ دھونا پڑا اس کے بعد سلطان قلی دیورکنڈے کے قلعے کی طرف متوجہ ہوا۔ جان برگس نے "دی رائز آف محمڈن پاور اِن انڈیا" میں اس کی تفصیل بیان کی ہے[1] وجیانگر کے راجا کشن رائے نے مزاحمت کی لیکن اسے شکست اٹھانی پڑی۔ سلطان قلی نے گھن پور اور کوہیل کنڈے کے قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ واپسی پر اُسے اطلاع ملی کہ کھم میٹ کا راجا قطب شاہی علاقوں پر قبضہ کرتا جا رہا ہے تو وہ اس کو سزا دینے کے لیے آگے بڑھا اسی لڑائی میں جنوب کے چند اور راجا متحد ہو گئے تھے ان کے نام مکجا رام، رام چندر اور ہری چندر تھے۔ سلطان محمد قلی گوداوری کے کنارے پہنچ گیا اور ایسی یلغار کی کہ متحدہ فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ مختصر یہ کہ سلطان قلی کا عہد حکومت سلطنت کے استحکام کی تجویزوں اور حدود سلطنت میں توسیع کی کارروائیوں میں گزرا۔ کھم میٹ کے راجا سیناپتی نے کھم میٹ، بیلم کنڈہ اور ورنگل کے بعض علاقوں میں مضبوط قلعے تعمیر کر لیے تھے اور بارہ ہزار فوج جمع کر لی تھی۔ جب سیناپتی کو خبر ملی کہ بیلم کنڈہ پر سلطان محمد قلی نے حملہ کر دیا ہے تو وہ پریشان ہو گیا اور بھاری فوج کے ساتھ سلطان کے مقابلے کو آیا لیکن قطب شاہی فوجوں نے اُسے پسپا کر دیا[2]

مورخ "تاریخ رشید الدین خانی" کا بیان ہے کہ سلطان قلی نے دس گیارہ قلعے فتح کیے تھے قلعہ راج کنڈہ، دیورکنڈہ، پاگھل گھنپور، ویلی کنڈہ، کھم میٹ، بیلم کنڈہ، کوہیر، نلگنڈہ اور تلنگانہ کے قلعوں پر اس کا تسلط قایم تھا[3]

سلطان قلی کو ۳ر اگست ۱۵۴۳ء میں جب کہ اس کی عمر بقول ہارون، خان شیروانی

---

[1] جان برگس۔ دی رائز آف محمڈن پاورز اِن انڈیا۔ ص ۲۱۲، ۲۱۳

[2] 〃 〃 〃 ص ۲۱۶

[3] غلام امام خان ترین بجر۔ تاریخ رشید الدین خانی۔ ص ۲۱۷

Marfat.com

نوے برس سے متجاوز تھی ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا[1] سلطان قلی نے "آتش خانہ" کے نام سے ایک محل تعمیر کروایا تھا۔ ڈاکٹر زور رقمطراز ہیں کہ اس محل میں علمی مذاکرے ہوا کرتے تھے اور یہاں علما، وفضلا، جمع رہتے تھے[2] سلطان قلی کے چھ فرزند تھے ان کے نام حیدر خاں، قطب الدین، یار قلی، جمشید ابراہیم، عبدالکریم اور دولت قلی بتائے گئے ہیں۔ دولت قلی دعویدار تخت تھا اور ہر جائز وناجائز طریقے سے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس سے بعض ناشایستہ حرکتیں سرزد ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے لوگ اس کو" دیوانہ ملک زادہ" کہنے لگے تھے[3] جمشید کا رویہ بھی باغیانہ تھا اس لیے سلطان قلی نے جمشید کو قلعہ گولکنڈہ میں اور دولت قلی کو قلعہ بھونگیر میں قید کر دیا تھا۔ دولت قلی عمر بھر قلعہ بھونگیر میں قید رہا اور وہیں وفات پائی۔ جمشید نے جو قلعہ گولکنڈہ میں قید تھا سازشوں کا جال بچھا دیا اور میر محمود ہمدانی گورنر گولکنڈہ کی مدد سے اپنے باپ سلطان قلی کو جب وہ منزل صفا میں مشغول نماز تھا قتل کروادیا۔ شاروکو کا بیان ہے کہ سلطان قلی جامع مسجد گولکنڈہ میں قتل ہوا تھا۔ صولت عثمانیہ اور تاریخ رشید الدین خانی کے مورخ رقمطراز ہیں کہ سلطان قلی مذہب اثنا عشری کا حامل تھا اور اس نے خطبے میں آئمہ معصومین کے نام داخل کیے تھے[4] ماہ نامہ میں غلام حسین جوہر نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے[5]

جمشید ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں قید سے نکل کر قطب شاہی تخت پر متمکن ہوا[6] اس نے سات سال حکومت کی لیکن رعایا اس سے ناخوش تھی وہ اپنی مملکت میں کبھی ہر دلعزیز نہ ہوسکا کیوں کہ اس نے اپنے بھائی قطب الدین کو ہوس سلطنت میں اندھا کر دیا تھا[7] اور باپ

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ محمد قلی قطب شاہ (انگریزی) ص۵

[2] ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص۸۰

[3] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص۴۵

[4] (الف) ابوالفتح محمد امیر اللہ۔ صولت عثمانیہ۔ ص۹ (ب) غلام امام خان ترین ہجر۔ تاریخ رشید الدین خانی۔ ص۲۱۷

[5] غلام حسین جوہر۔ مخطوط ماہ نامہ۔ مخطوط نمبر ۵۶۰۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ورق ۱۲۲۔

[6] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص۴۶

[7] شاروکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز۔ ص۷

Marfat.com

کوقتل کروا کے حکومت حاصل کی تھی۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے چھوٹے بھائی ابراہیم کو طلب کیا جو دیور کنڈے میں مقیم تھا، ابراہیم اپنے بڑے بھائی کا حشر دیکھ چکا تھا اس نے بھاگ کر قاسم برید کے یہاں پناہ لی۔ جمشید کے چھوٹے بھائی ابراہیم نے دیور کنڈہ میں فوج اکٹھا کرلی تھی اس نے والی بیدر سے مدد طلب کی اور گولکنڈہ پر حملہ کردیا[1] جمشید کو اگر برہان نظام شاہ والی احمد نگر سے فوجی کمک نہ ملتی تو اسے کامیابی نصیب نہ ہوتی ابراہیم کو شکست اٹھانی پڑی اور اس نے وجیانگر میں پناہ لی۔ والی احمد نگر نے اس شاندار کامیابی کے پرمسرت موقع پر اسے "شاہ" کا خطاب عطا کیا تھا۔ اور آفتاب گیری پیش کی تھی[2] لیکن جمشید نے یہ کہہ کر شاہی اعزازات قبول نہیں کیے تھے ؎

مرا نیست با چتر شاہی نیاز
خطابے نہ خواہم بہ عمر دراز[3]

جمشید کو ۹۵۱ھ/۱۵۴۴ء میں برہان نظام شاہ کے ساتھ شولاپور کی لڑائی میں حصہ لینا پڑا جس میں اس نے دشمن کی فوج کو پسپا کر کے اپنی شجاعت کا لوہا منوایا تھا۔ ۱۵۴۵ء میں برید نے گولکنڈے پر حملہ کر دیا تو جمشید نے اسے مار بھگایا اور اس کے پایۂ تخت بیدر تک پہنچ گیا۔ پٹن چرو کے قریب جمشید اور برید کا مقابلہ ہوا اور بالآخر قطب شاہی فوج کے ہاتھوں برید کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ۹۵۳ھ/۱۵۴۶ء میں برید نے ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کی مدد سے قلعہ میدک پر قبضہ کر لیا اور یہاں سے چالیس ہاتھی اور سات ہزار ہون مال غنیمت کے طور پر حاصل کیے تھے لیکن جمشید نے اس کے حملے کا جواب دیا اور اپنی عسکری قوت کی دھاک بٹھا دی۔ نارائن کھیڑ کے قریب ان دونوں میں تصادم ہوا اور برید کے قدم اکھڑ گئے۔ برید کے متواتر حملوں نے جمشید کو پریشان کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۵۴۶ء میں اس نے برہان نظام شاہ سے مل کر یہ منصوبہ تیار کیا کہ برید کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے چنانچہ برہان نظام شاہ نے قلعہ اوسہ اور اودگیر پر حملہ کر دیا اور جمشید

---

[1] بمان برگس۔ دی رائز آف محمڈن پاور اِن انڈیا۔ ص ۲۸۔
[2] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۵۰
[3] سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک۔ ص ۲۵

Marfat.com

کولاس تک آگے بڑھ آیا اور قلعہ میدک پر جمشید کا قبضہ ہوگیا بہ یک وقت دو حکمرانوں کے حملے نے برید کو ہراساں کردیا اور اس نے بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ سے مدد کی درخواست کی جس پر ابراہیم نے پانچ ہزار فوج روانہ کی۔ یہ جنگ جمشید کے عہد کی سب سے فیصلہ کن لڑائی تھی۔ سات سال حکومت کرنے کے بعد جمشید نے بقول محمد قاسم فرشتہ تپ دق کے عارضے سے انتقال کیا تھا[1] شارو کو "گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز" میں لکھتا ہے کہ جمشید کا انتقال مرض کینسر سے ہوا تھا[2] اس کا مقبرہ سلطان محمد قطب شاہ کے مقبرے کے قریب واقع ہے۔ جمشید کی قبر پر جو گنبد تیار کیا گیا ہے وہ فن تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ جمشید فارسی میں طبع آزمائی کرتا تھا" کلام الملوک" "تاریخ قطب شاہی" اور "حدائق السلاطین" میں اس کی غزلیں، قصیدے اور متفرق اشعار محفوظ ہیں۔ عبدالمجید صدیقی نے بھی "تاریخ گولکنڈہ" میں جمشید کے کلام کے بعض نمونے پیش کیے ہیں[3] بقول نصیرالدین ہاشمی وہ جمشید تخلص کرتا تھا[4] "تاریخ ماہ نامہ" کے مصنف نے جمشید کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "شریر النفس واوباش بود"[5]

جمشید کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سبحان قلی جس کی عمر صرف سات سال تھی تخت پر بیٹھا دیا گیا۔ اس نے چھ ماہ حکومت کی اس کے انجام کے بارے میں تاریخیں خاموش ہیں[6] جمشید کو شعر و ادب سے دلچسپی تھی وہ خود شعر کہتا تھا اس نے علماء اور شعراء کی سرپرستی بھی کی۔ اس کے دربار کا ملک الشعراء محمد شریف وقوعی تھا[7]

ابوالمظفر ابراہیم قطب شاہ ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء میں تخت نشین ہوا وہ بقول ہارون خان

---

[1] محمد قاسم فرشتہ (مترجم فدا علی طالب) تاریخ فرشتہ - جلد چہارم - ص ۳۲۱

[2] شارو کو - گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز (انگریزی) ص ۸

[3] عبدالمجید صدیقی - تاریخ گولکنڈہ - ص ۳۸۴، ۳۸۵

[4] نصیرالدین ہاشمی - دکن میں اردو - ص ۵۷

[5] غلام حسین خان جوہر - مخطوطہ ماہ نامہ - مخطوطہ نمبر ۵۶ ادارہ ادبیات اردو - ص ۱۲۲

[6] شارو کو - گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز (انگریزی) - ص ۸

[7] عبدالقادر سروری - اردو کی ادبی تاریخ - ص ۹۹

Marfat.com

شیروانی "تلنگ آندھرا" کا پہلا حکمران ہے جو بادشاہ کہلایا[1] اس کا عہد سلطنت گولکنڈہ کی حقیقی ترقی اور شان وشوکت کا زرین دور ہے۔ ابراہیم قلی، سلطان قلی کا سب سے چھوٹا فرزند تھا۔ جمشید کے انتقال کے بعد جب گولکنڈے کی بساط الٹ گئی تو رعایا اور امراء ابراہیم کو تخت وتاج کا وارث تصوّر کرنے لگے چنانچہ جب ابراہیم کا کارواں گولکنڈے کی طرف آنے لگا تو لوگ جوق در جوق اس سے آملے۔ ابراہیم کو اپنے بھائی جمشید کے انتقال تک وجیانگر میں سات سال قیام کرنا پڑا تھا۔ وجیانگر میں ابراہیم نے ایک ہندو خاتون بھاگ رتی سے شادی کرلی تھی[2] رام راج والی وجیانگر نے اس کی بڑی خاطر تواضع کی تھی۔ وجیانگر کا تمدن ایسا تھا کہ محمد قاسم فرشتہ کے الفاظ میں بہمنی سلاطین بھی اس کے متمول شہروں کو دیکھنے کے متمنی رہا کرتے تھے[3] تاریخ گولکنڈہ کے مورخ عبدالمجید صدیقی لکھتے ہیں کہ ابراہیم قطب شاہ نے وجیانگر میں سیاست وتمدن کے بیشمار سبق سیکھے تھے۔ گولکنڈہ کی سیاست جس مسالے سے تیار کی گئی تھی اس میں اسلامی عناصر کے ساتھ تلنگانہ اور کرناٹک کے تمدنی عناصر بھی شامل تھے اور اسی وجہ سے یہ سلطنت تلنگانہ کی جغرافیائی اور قومی خصوصیات کے ساتھ کچھ ایسی پیوست ہوگئی تھی کہ اہل تلنگانہ اس کو اپنی قومی سلطنت سمجھتے تھے[4]

جمشید کے انتقال کے بعد اس کے کم سن شہزادے کو تخت نشین کرنے میں ملکہ بلقیس زمان اور خدیجہ دوران کا بڑا ہاتھ تھا۔ انھوں نے بعض عمائدین سلطنت جیسے مصطفٰے خان اروستانی اور صلابت خان کو اپنا ہمنوا بنالیا تھا۔ گولکنڈے میں امراء عظام اور عوام کو غیر یقینی سیاسی حالات نے بد دل کر دیا اور ملک میں ہر طرف افراتفری کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ قلعہ گولکنڈہ پر نائکوں کے سردار جگ دیو رائے نے قبضہ کرلیا اور جمشید کے دیوانے بیٹے دولت خاں کو حکومت کا لالچ دے کر اپنا

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ محمد قلی قطب شاہ (انگریزی)۔ ص ۸

[2] " " " " ص ۹

[3] محمد قاسم فرشتہ۔ تاریخ فرشتہ۔ مقالہ سوم۔ ص ۲۹۷

[4] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۶۷

Marfat.com

مقصد حاصل کرنا چاہا لیکن سیف خاں کو اس منصوبے کا پتہ چل گیا اور اس نے جگ دیورائے کو گرفتار کرلیا۔ سماج کے مختلف طبقوں میں بے چینی بڑھنے لگی اور بقول فرشتہ شورش پسندوں نے محل پر حملہ کرکے دولت خانہ لوٹ لیا [1] جب گولکنڈے سے مختلف عرض داشتیں ابراہیم کو وصول ہونے لگیں تو اس نے سید جی، خان اعظم اور حمید خان کے مشورے سے گولکنڈہ کی طرف کوچ کی تیاری شروع کردی [2] ابراہیم اور اس کے ساتھی وجیا نگر سے روانہ ہوکر سب سے پہلے پانگل پہنچے جو سرحد پر واقع تھا۔ یہاں پہنچ کر ابراہیم نے گولکنڈے کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا۔ خواص وعوام میں اس کی آمد سے مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جب ابراہیم گولکنڈہ پہنچا تو جگ دیو اور دوسرے نائکوں نے قلعہ گولکنڈہ کی کنجیاں ابراہیم کے حوالہ کر دیں۔ ۱۲ رجب بروز دوشنبہ مطابق ۲۷ جولائی ۱۵۵۰ء (۹۵۷ھ) ابراہیم کی رسم تخت نشینی بڑے تزک واحتشام سے انجام دی گئی [3]

سب سے پہلے ابراہیم کو جگ دیورائے کی سرکوبی کرنی پڑی جس نے جمشید کے بعد سلطنت گولکنڈہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر قلعہ گولکنڈہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ جان برگس (John Briggs) لکھتا ہے کہ ابراہیم نے مصطفٰے خان کو سفارت پر پہلے حسین نظام شاہ کے دربار میں بھیجا اور پھر اسے علی عادل شاہ والی بیجاپور کے یہاں جانے کی ہدایت کی تاکہ ان ریاستوں سے خاندانی تعلقات بھی قایم ہوں اور دکن میں ایک متحدہ سیاسی مرکز کے قیام کے امکانات کا جائزہ بھی لیا جا سکے مصطفٰے خان اپنے مشن میں کامیاب ہوا۔ حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی چاند بی بی کا علی عادل شاہ سے بیاہ کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور قلعہ شولاپور جہیز میں دینے کا فیصلہ کیا اور حسین نظام شاہ کے بڑے شہزادہ مرتضٰی سے علی عادل شاہ کی بہن کی نسبت طے ہوگئی۔ یہ بھی طے پایا کہ شولاپور کے قلعے میں تینوں بادشاہ ملاقات کرکے مستقبل کے منصوبوں کو

---

[1] محمد قاسم فرشتہ۔ تاریخ فرشتہ۔ مقالہ سوم۔ ص ۲۹۷
[2] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۷۵
[3] " " " ص ۸۱

Marfat.com

قطعیت دیں[1] ابراہیم کا سب سے بڑا سیاسی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دکن کا سیاسی توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ ۱۵۵۸ء میں حسین نظام شاہ والی احمد نگر کے ساتھ عادل شاہی سلطنت پر یلغار کرکے گلبرگہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ علی بن عزیز نے "برہان ماثر" میں اس کی تفصیل بیان کی ہے[2] یہ دور ابراہیم کی سب سے بڑی جنگ نہیں تھی بلکہ جنگ تالی کوٹہ وہ فیصلہ کن جنگ تھی جس نے دکن کی سیاست پر دور رس نتائج مرتب کیے۔ احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈے اور بیدر کی چاروں سلطنتیں متحد ہو گئیں۔ جنگ کے لیے کوئی بہانہ چاہیے تھا علی عادل شاہ اول نے اپنا سفیر وجیانگر بھیجا اور وہ اضلاع واپس مانگے جو راجا نے عادل شاہی سلطنت سے لے لیے تھے۔ وجیانگر کے راجا نے سفیر کو شہر بدر کر دیا اس طرح جنگ چھڑ گئی[3] ۲۴ جنوری ۱۵۶۵ء کو اس جنگ کا آغاز ہوا اور اس کے نتیجے میں وجیانگر تباہ و تاراج ہو گیا۔ جنگ کے اختتام پر جب مال غنیمت اور مقبوضہ علاقوں کی فاتح سلطنتوں کے درمیان تقسیم عمل میں آئی تو مسولی پٹنم کی بندرگاہ بائیس سال بعد گولکنڈہ کو واپس مل گئی۔ ۲۰ جمادی الثانی ۹۷۲ھ کو جب جنگ تالی کوٹہ کا آغاز ہوا تو حسین نظام شاہ، علی عادل شاہ اور ابراہیم عادل شاہ نے متفقہ طور پر وجیانگر کے راجا رام راج پر چڑھائی کر دی۔

پی این چوپرا اور این سبرامنیم نے "ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا" میں راجا رام راج کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جنوب کا ایک بہت بڑا طاقتور راجا بن گیا تھا اور اس نے اپنی حکمت عملی سے دکن کے دوسرے حکمرانوں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ یہ لڑائی بنی ہٹی کے مقام پر شروع ہوئی تھی جو ماسکی اور سکھری دریاؤں کا سنگم تھا۔ "ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا" میں جنگ تالی کوٹہ کی تاریخ ۲۳ جنوری ۱۵۶۵ء بتائی گئی ہے[4] جنگ کے دوران قطب لشکر میں حسین نظام شاہ معہ لشکر صف آرا تھا۔ میمنہ پر علی عادل شاہ

---

[1] جان برگس۔ دی رائز آف محمڈن پاورانِ انڈیا (انگریزی) ص ۲۴۸

[2] علی بن عزیز۔ برہان ماثر۔ ص ۲۹۵

[3] شاروکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز۔ (انگریزی)۔ ص ۱۱۔

[4] پی این چوپرا اور این سبرامنیم۔ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ جلد دوم۔ ص ۱۲۷

Marfat.com

اور میسرہ پر ابراہیم قطب شاہ اور علی بریدکی فوجیں تھیں۔ رام راج کی فوج میں پینتیس[۳۵] ہزار سوار، پانچ لاکھ پیادے اور پانچ سو ہاتھی تھے۔ کرشنا سوامی آئینگار نے "سورس آف وجیانگر ہسٹری" میں اس کی تفصیل بیان کی ہے[۱] ایلتم راج کو بیس ہزار سواروں، دو لاکھ پیدل اور پانچ سو ہاتھیوں کے ساتھ میمنہ سونپ دیا گیا تھا۔ رام راج نے یہ غلطی کی کہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بجائے سنگھاسن پر بیٹھ گیا۔ جب چاروں طرف سے اس کی فوجیں گھر گئیں اور خود حسین نظام شاہ کشور خان لاری کے ساتھ رام راج پر حملہ آور ہوا اور اس کی تمام صفیں الٹ دیں تو ایک نظام شاہی ہاتھی نے ایسا حملہ کیا کہ سنگھاسن زمین پر ٹپک کر رام راج کے ملازم میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے رام راج کو گرفتار کر کے تہہ تیغ کر دیا گیا۔ اُدھر میسرہ پر ابراہیم عادل شاہ نے وینکٹادری کو اور میمنہ پر علی عادل شاہ نے ایلتم راج کو بُری طرح پسپا کر دیا۔ "تاریخ جنوبی ہند" میں محمود خان محمود رقمطراز ہیں کہ عادل شاہی، قطب شاہی اور نظام شاہی فوجوں کے تیر اندازوں اور شمشیر زنوں نے رام راج کی فوج کے ہاتھیوں کو اپنا نشانہ بنا کر انھیں پریشان کر دیا۔ جس کی وجہ سے وجیانگر کی فوج میں ہراسانی پھیل گئی[۲] مورخ ہیگ کے حوالے سے مصنف لکھتا ہے کہ وجیانگر کی فوج نے بڑی بہادری سے مدافعت کی اور ایسا جوابی حملہ کیا کہ علی عادل شاہ کا میمنہ قلب لشکر سے علاحدہ ہو گیا۔

"تاریخ فرخندہ" میں قادر خاں بیدری نے جنگ تالی کوٹہ کی تفصیلات قلمبند کی ہیں اور اس جنگ میں قطب شاہیوں کی کامیابی کو ایک اہم تاریخی واقعہ بتایا ہے[۳] مورخ ہیگ تحریر کرتا ہے کہ حسین نظام شاہ کی ہمت و عزم نے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ کشور خان بیجاپوری حسین نظام شاہ سے اُکرمل گیا تو حسین نے حکم دیا کہ مشہور توپ "مالک میدان" سے کام لیا جائے۔ توپ میں تانبے کے سکّے بھر کر رام راج کی فوج پر حملہ کیا گیا۔ اس غیر متوقعہ حملے سے رام راج کی فوج میں انتشار پیدا ہو گیا۔ رام راج

---

[۱] کرشنا سوامی آئینگار۔ سورسیز آف وجیانگر ہسٹری (انگریزی) صـ ۱۸

[۲] محمود خان محمود ۔ تاریخ جنوبی ہند ۔ صـ ۳۳۱

[۳] محمد قادر خان بیدری مخطوطہ۔ تاریخ فرخندہ۔ مخطوطہ نمبر ۲۱۸۔ ادارہ ادبیات اردو ۔ صـ ۱۵

Marfat.com

سنگھاسن میں سوار ہوگیا تھا۔ ہاتھی نے مہاوت کا اشارہ پاکر رام راج کو سنگھاسن سے اپنی سونڈ میں اٹھالیا اور اس نے احمد نگر کے سردار رومی خان کے پاس رام راج کو پیش کر دیا۔ اور اس طرح وجیا نگر کے راجا کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا[1] اس جنگ میں سلطنت وجیا نگر کے کئی سپاہی مارے گئے۔ محمد قاسم فرشتہ نے ان کی تعداد ایک لاکھ تحریر کی ہے[2] اور اسی طرح مورخ ہیگ نے بھی ایک لاکھ سپاہیوں کے زیر تیغ ہونے کا ذکر کیا ہے۔ میسور گزیٹر کا مصنف برہان ماثر کے بیان سے اتفاق کرتے ہوئے مقتولین کی تعداد نو ہزار بتاتا ہے[3] بشیر الدین احمد "تاریخ بیجا نگر" میں جنگ تالی کوٹ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ رام راج کے قتل اور وجیا نگر کے لشکر کی شکست کی خبر سن کر اطراف واکناف کی "جنگلی اقوام" "بنجاروں" "لمباڑوں" "کورووں" اور "لٹیروں" نے شہر کو لوٹنا شروع کر دیا اور شہر کی عمارتیں، دکانات اور بازار تباہ کر دیے[4]

مختصر یہ کہ جنگ تالی کوٹ دکن کی ایک فیصلہ کن لڑائی ثابت ہوئی اور ابراہیم کامران و فتح مند گولکنڈہ واپس ہوا۔

شاروکو ابراہیم قطب شاہ کی ذہانت اور اس کے تدبیر کی تعریف کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ وہ ایک عیش پسند انسان ہونے کے باوجود اپنی ذمہ داریوں کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ محسوس کرتا تھا۔ قلعہ کی فصیل کے علاوہ ابراہیم پٹن کا تالاب، مدارس اور مساجد اور لنگر حوض کی تعمیر ابراہیم کی یادگاریں ہیں۔ ابراہیم باغ بھی اسی بادشاہ نے آباد کیا تھا۔ مورخ "تاریخ رشید الدین خانی" لکھتا ہے کہ ابتدا میں قلعہ گولکنڈہ مٹی کا ایک قلعہ تھا جسے کشن راؤ نے بنوایا تھا مصطفٰے خان کے اصرار پر ابراہیم قطب شاہ نے قلعے کو گچ اور پتھر سے مضبوط تعمیر کروایا۔ فصیل بنوائی اور قلعے کے اندرونی

---

[1] محمود خان محمود۔ تاریخ جنوبی ہند۔ ص ۲۲۲، ۲۲۳

[2] محمد قاسم فرشتہ (مترجم فدا علی طالب) تاریخ فرشتہ۔ جلد چہارم۔ ص ۲۳۰

[3] محمود خان محمود۔ تاریخ جنوبی ہند۔ ص ۲۲۸

[4] بشیر الدین احمد۔ تاریخ بیجا نگر۔ ص ۳۱۸

Marfat.com

علاقے میں دکانات اور محلات تعمیر کروائے[1] تاریخ فرخندہ کا مورخ لکھتا ہے کہ ابراہیم نے دو لاکھ ہون کے صرفے سے پگ اور پتھر سے تالاب حسین ساغر (حسین ساگر) تعمیر کروایا تھا اور اس کی تعمیر کا سہرا حسین شاہ ولی کے سر ہے[2] ابراہیم کے زمانے میں ایسا امن و امان قایم ہوا کہ بقول عبدالمجید صدیقی "ہیر بڑھیا زر و جواہر کی کشتی لیے تنہا گولکنڈہ سے احمد نگر اور بیجاپور چلی جاتی اور کوئی شخص اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا"[3] ابراہیم قطب شاہ کے قیام وجیانگر نے اسے رموز مملکت سکھائے۔ آئین جہانبانی کے انداز ابراہیم نے اسی راجا کی ریاست میں سیکھے تھے اور یہ اس کی عمدہ تربیت کا سبب بنے وجیانگر کے نظم و نسق کے اصولوں سے بھی ابراہیم قطب شاہ نے بہت استفادہ کیا تھا[4] ابراہیم نے تلگو شعراء اور ادیبوں کی بڑی سرپرستی کی تھی جلاوطنی کے زمانے میں وجیانگر میں اس نے تلگو زبان پر عبور حاصل کرلیا تھا وہ تلگو بولنے والے عوام میں بے حد مقبول اور ہر دلعزیز تھا۔ رعایا اُسے "ملک بھرام" کے نام سے یاد کرتی تھی۔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد حکومت میں صنعت و حرفت کو بھی بہت فروغ حاصل ہوا اور تمدنی ترقی کی راہیں کھل گئیں۔ ابراہیم تعلیم یافتہ شخص تھا۔ عربی اور فارسی کے علاوہ تلگو زبان سے بخوبی واقف تھا۔ ابراہیم علم دوست حکمران تھا اور اس نے شہر میں کئی مدارس قایم کیے تھے۔ "تاریخ قطب شاہ" کے مورخ نے ابراہیم کی علمیت اور اس کی علم دوستی کو بہت سراہا ہے[5] قطب شاہی بادشاہوں میں ابراہیم تلگو کا پہلا قدردان اور سرپرست بادشاہ تھا اس کو تلگو زبان سے بڑی محبت تھی ابراہیم کے ابتدائی ایام حیات دیورکنڈہ میں بسر ہوئے تھے اور بعد میں اس نے جلاوطنی کے سات سال وجیانگر میں گزارے

---

[1] غلام امام خان ترین ہجر۔ تاریخ رشیدالدین خانی ۔ ص ۲۲۰

[2] عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ ۔ ص ۱۰۰

[3] محمد قادر خان بیدری۔ مخطوط تاریخ فرخندہ۔ مخطوط نمبر ۳۱۸۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ص ۱۸

[4] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ ۔ ص ۱۰۴

[5] نامعلوم مخطوط تاریخ سلطان قطب شاہی۔ مخطوط نمبر ۳۳۱ کتب خانہ سالار جنگ۔ ورق ۲۲۵

Marfat.com

تھے جو اس زمانے میں تلگو کا اہم مرکز تھا اس لیے ابراہیم کا تلگو زبان پر عبور ایک فطری بات معلوم ہوتی ہے۔ ابراہیم نے اپنے دربار میں جہاں فارسی شعراء کی قدر دانی کی وہیں تلگو شاعروں کو بھی سرفراز کیا۔ ابراہیم کی سرپرستی میں مشہور تلگو کتاب "تپتی سمورن پاکھیانم" مرتب ہوئی تھی یہ نظم مہابھارت سے ماخوذ ہے اور شاعر نے اسے ابراہیم کے نام سے معنون کیا ہے[1] اس کے علاوہ کندی کوی، رودرا کوی اور مرن گنٹی سنگراچاریہ بھی بادشاہ کے منظور نظر تھے۔ کندی کوی کو چنتل پالم کی جاگیر عطا کی گئی تھی۔ بقول ہارون خان شیروانی ابراہیم کا دربار ہندو شعراء سے بھرا رہتا تھا[2] شاروکو لکھتا ہے کہ ابراہیم نے ۲ر جون ۱۵۸۰ء کو اچانک انتقال کیا[3] لیکن تاریخ فرخندہ کا بیان ہے کہ اس کا انتقال تپ محرقہ سے ۔ ۲۱ر ربیع الثانی بروز پنجشنبہ ہوا تھا[4]

ابراہیم ایک وجیہہ اور خوبصورت بادشاہ تھا۔ تلگو زبان کی پہیلی "اکچھا" نظم امین خان کے نام۔ پوٹی کانتی تلیگنّا نے معنون کی تھی اس میں وہ سلطان وقت ابراہیم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ حسن و جمال میں یکتا ہے اور جود و سخا میں بے مثل ہے بہت سے بادشاہ اس کے زیر فرمان ہیں اور اس کی حکومت مرفع الحال اور شاندار ہے۔ واسومتی نے اپنے مقالے "ابراہیم قطب شاہ اینڈ تلگو پوئیٹس" میں اس کی تفصیل بیان کی ہے[5] اپنی ایک اور نظم میں شاعر ابراہیم قطب شاہ کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور کہتا ہے کہ دشمن بھی ہزیمت کے بعد اس کی ذات سے مستفید ہوتے ہیں وہ کہتا ہے کہ "کل یگ" میں رام دوبارہ پیدا ہوئے ہیں۔ ابراہیم رحمدلی میں رام، پاکیزگی میں اگنی۔ شاہی ذمہ داریاں سنبھالنے میں شیش (ناگ)

---

[1] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۴۰۲

[2] ہارون خان شیروانی۔ محمد قلی (انگریزی)۔ ص ۹

[3] شاروکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز۔ (انگریزی)۔ ص ۱۳

[4] محمد قادر خان بیدری مخطوطہ تاریخ فرخندہ مخطوطہ نمبر ۲۱۸۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ص ۱۸

[5] واسومتی۔ ابراہیم قطب شاہ اینڈ تلگو پوئیٹس (مقالہ) ص ۲۱

Marfat.com

اور نبرد آزمائی میں ارجن ہے[1] کہا جاتا ہے کہ ۱۴۸۰ء میں چنتل بالم کا موضع تلگو شاعر رودراکوی کو عطا کیا گیا تھا لیکن این وینکٹا رامنیا[2] لکھتے ہیں کہ چنتل پالم میں ایک جگہ کندہ اس تحریر کی تاریخ سے تردید ہوتی ہے اس پر کسی نے غلط سنہ تحریر کر دیا ہے۔ رودراکوی نے ابراہیم کی وفات پر جو اشعار کہے تھے ان میں وہ خدا سے مخاطب ہو کے کہتا ہے اے خدا جان لینے کے لیے دنیا میں کئی ظالم بادشاہ موجود تھے" ملک بہرام" ایک خوش صفات بادشاہ ہے وہ بیکسوں کا سہارا ہے کیا تو مستقبل میں زمین پر ابراہیم جیسا بادشاہ پیدا کرنے پر قادر ہے؟[3] عہد ابراہیم کا تلگو رومانی شاعر گنیش کوی تھا۔ اس نے بھی دوسرے تلگو شعراء کی طرح ابراہیم کی شان میں اشعار کہے ہیں۔

ابراہیم قطب شاہ علماء کی بڑی قدر کرتا تھا۔ یوسف کوکن لکھتے ہیں کہ قطب شاہی سلاطین نسلاً ترک تھے انھوں نے علماء اور مشائخین و سادات کی قدر و منزلت کی لیکن ابتدائی دور کے حکمرانوں کو عربی سے زیادہ فارسی زبان سے شغف تھا۔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں عربی سے دلچسپی لی گئی۔ وہ خود عربی دان تھا اس کے بیٹے مرزا محمد امین کو عربی زبان سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ حکومت میں عربی تعلیم کا قطب شاہی دارالسلطنت میں عام رواج ہو گیا تھا۔ ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء میں شیخ محمد ابن خاتون پیشوا مقرر ہوئے وہ عربی کے بلند پایہ عالم تھے۔ "ہدیہ قطب شاہیہ" کے مصنف محمد علی کربلائی، ابن خاتون آملی کے شاگرد تھے۔ ابن خاتون نے امیر نظام الدین بن معصوم کو مکّے سے حیدرآباد بلوایا تھا ان کا علماء کے خاندان سے تعلق تھا اور وہ خود عالم متبحر تھے۔ عبداللہ قطب شاہ علماء کی ایسی قدر کرتا تھا کہ اس نے اپنی دوسری شہزادی کا ان سے عقد کیا تھا۔ وہ عربی کے شاعر بھی تھے اور مصنف بھی۔ ان کے علاوہ عربی علماء میں شیخ محمد بن احمد، حکیم الملک (متوفی ۱۶۴۰ء) سید حسین، سید محمد بن عبداللہ موسوی اور شیخ زین الدین کا قطب

---

[1] واسومتی۔ ابراہیم قطب شاہ اینڈ تلگو پوئیٹس (مقالہ) صـ۳۲ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری۔

[2] " " " صـ۳۷ " "

[3] " " " صـ۳۸ " "

Marfat.com

شاہی دربار میں بول بالا تھا۔ سید احمد کا بیٹا سید صدرالدین بلند پایہ عالم تھا اور مکّہ سے ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں حیدرآباد پہنچا تھا۔ وہ عربی محفل شعر میں فی البدیہ شعر کہہ کے داد تحسین حاصل کرتا تھا وہ نامور عربی مصنف تھا اور اس نے "الکلم الطیب"، "صلوات التقریب فی اصوات العرب"، "الدرجات الرفیع فی طبقات الامیہ من الشیعہ"، اور "ریاض السالکین"، جیسی عربی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں شاہ احمد نے قرآن کی تفسیر لکھی اور حدیث کے موضوع پر چھ کتابیں تصنیف کیں اور علی حسینی نے عربی میں قرأت پر ایک کتاب لکھی تھی [1]

قطب شاہی فرمارواؤں کو تمدنی امور سے خاص دلچسپی تھی۔ تلنگانہ کی سرزمین پر ان بادشاہوں نے ایک پاکیزہ تمدن کو پروان چڑھایا تھا جس کے نقوش صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی مٹے نہیں ہیں۔ قطب شاہی تمدن مختلف عناصر کا امتزاج تھا سلاطین گولکنڈہ ایران و ترکستان سے کچھ تمدنی میلانات اور روایات اپنے ساتھ ضرور لائے تھے لیکن ان کی معاشرت کو گلبرگہ اور بیدر کے تمدنی ذخائر سے اصل مواد ملا کیوں کہ وہ بہمنی سلطنت کے خوشہ چیں رہے تھے۔ بہمنیوں نے اہل دکن کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا اچھا سامان فراہم کر دیا تھا۔ سلطان قلی بہمنی تمدن کا پروردہ تھا اس لیے بہمنی فضاء اور بہمنی انداز فکر کا اس کے مزاج کی تعمیر و تشکیل میں بڑا حصہ تھا قطب شاہی سلاطین کو اس کا احساس تھا کہ تلنگانہ میں ان کی حکومت خالص ترکستانی نہیں ہو سکتی کیوں کہ مقامی اثرات کی پذیرائی اس کو نیا رنگ و آہنگ عطا کر رہی تھی جذب و اخذ اور معاشرتی لین دین انسانی تمدن کے بنیادی اصول ہیں۔ قطب شاہیوں کا قابل فخر وصف یہ ہے کہ انھوں نے مقامی رجحانات کو اپنے تمدن میں اس خوبی کے ساتھ سمویا کہ بقول عبدالمجید صدیقی "شاہان قطبیہ اندھرا راجگان معلوم ہونے لگے" [2] ان بادشاہوں نے تلگو عورتوں سے شادیاں کیں۔ ترکستانی لباس ترک کر کے تلنگانہ کے طور طریق اپنائے اور تلنگی زبان سیکھی۔ مذہبی رواداری،

---

[1] یوسف کوکن۔ زبان و ادب۔ عربی۔ پہلا باب۔ ہسٹری آف میڈیول دکن۔ جلد دوم ص ۱۱

[2] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۳۳۵

Marfat.com

آزاد منشی اور وسعت قلب ونظر نے دکن کے علاقے کو تمدنی اعتبار سے ایک منفرد اکائی بنا دیا۔ ابراہیم قطب شاہ کے ایک امیر امین الملک ــــــ کا تلگو شاعر پوٹی کانتی تلیگنّا نے اپنی طویل نظم "نیتی چرتر" میں ذکر کیا ہے امین الملک کے دربار میں اپنی باریابی کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ تلگو شعراء کی بھی قطب شاہی دور میں وہی عزت و توقیر تھی جو دکنی شعراء کو حاصل تھی وہ کہتا ہے:-

"مجسم اخلاق امین خان نے مجھے اپنے قریب بیٹھنے کی عزت دی۔ میرے جسم پر خوشبو لگائی۔ ایک نہایت قیمتی کیسری رنگت کی شال میرے کندھے پر ڈالی گئی اور جواہر کا ایک ڈبہ جس میں کئی یاقوت تھے مجھے دیا گیا اور اس کے بعد نظم سنانے کی فرمائش کی گئی" [1]

شاروکو "گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز" میں لکھتا ہے کہ ابراہیم کی تیئس (۲۳) اولادوں میں سے صرف چھ فرزند اور تیرہ لڑکیاں سن شعور کو پہنچنے کے بعد بقید حیات رہیں ایک بیٹا مرزا حسین نامپلی کے تالاب میں ڈوب کر مر گیا تھا [2] جب ابراہیم کا انتقال ہوا تو اس کے چھ بیٹے موجود تھے۔ ابراہیم نے گلبرگہ کے ایک مشہور مشائخ خاندان میں شادی کی تھی۔ اور اس خاتون کے بطن سے عبدالقادر اور عبدالفتاح تھے۔ ابراہیم کا بڑا فرزند عبدالقادر تھا جس کی شادی بیدر کے ایک صوفی گھرانے میں ہوئی تھی۔ اسی خاندان کے ایک مشہور فرد خلیل اللہ بت شکن تھے۔ "تاریخ قطب شاہی" میں لکھا ہے کہ ایک بغاوت کے جرم میں عبدالقادر کو دیورکنڈہ کے قلعے میں قید کر دیا گیا تھا اور یہیں اس نے بیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ عبدالقادر کو زہر دیا تھا لیکن اس کا انتقال نہیں ہوا تھا امراء نے ابراہیم کو یہ باور کروایا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا لیکن وہ روپوش ہو کر پایہ تخت میں ادھر اُدھر چھپتا پھرتا [3] اسی لیے بقول عبدالمجید صدیقی محمد قلی کو عمر بھر اس سے خدشہ لگا رہا [4] دوسرا شہزادہ حسین قلی تھا۔ ابراہیم کے انتقال

---

[1] ڈاکٹر زور۔ داستان ادب حیدرآباد۔ ص ۱۸

[2] شاروکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز (انگریزی)۔ ص ۱۳

[3] محمد قاسم فرشتہ۔ تاریخ فرشتہ۔ جلد چہارم۔ ص ۲۲۷

[4] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۱۱۰

Marfat.com

کے وقت اس کے حمایتی نلدرگ میں عادل شاہی فوج سے نبرد آزما تھے۔ اس وقت گولکنڈے میں رائے راؤ مقرب خاص کا طوطی بول رہا تھا "برہان ماثر" کے مرطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ رائے راؤ ہی کی خواہش پر ابراہیم نے حسین قلی کے بجائے محمد قلی کو اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا۔ "تذکرۃ الملوک" میں رفیع الدین شیرازی بھی علی بن عزیز مورخ "برہان ماثر" کے ہم خیال نظر آتے ہیں ان دونوں مورخین نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ابراہیم نے انتقال سے قبل ہی اپنی سلطنت محمد قلی کے حوالے کر دی تھی فوجی حکام شاہی عہدے داروں اور امرائے عظام نے محمد قلی کی وفاداری کا حلف بھی اٹھایا تھا۔

جان برگس نے محمد قلی کو ابراہیم کا تیسرا فرزند تحریر کیا ہے[1] محمد قلی کے متعلق تاریخ محمد قطب شاہ کا یہ بیان صداقت پر مبنی نہیں کہ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر بارہ سال تھی اس حساب سے محمد قلی کی تاریخ ولادت ۱۵۶۸ء قرار پاتی ہے۔ اس بیان کو پروفیسر ہارون خان شیروانی نے غیر مستند قرار دیا ہے[2]

محمد قلی کے بارے میں ڈاکٹر زور کا یہ بیان درست نہیں کہ وہ تعلیم و تربیت میں اپنے بھائیوں سے کمتر تھا[3] محمد قلی کا علم و ہنر سے بے بہرہ ہونا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔ ابراہیم نے دوسرے شہزادوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی تھی وہ محمد قلی کی تعلیم و تربیت سے جو بادشاہت کے لیے نامزد کیا جا چکا تھا، کیسے غافل رہ سکتا تھا اس کا "داخلی ثبوت" بقول خان رشید خود محمد قلی کے کلام میں موجود ہے[4]

گولکنڈے کا پانچواں حکمراں محمد قلی قطب شاہ ۲۱ ربیع الثانی ۹۸۸ھ مطابق ۵ جون ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ تاریخ فرخندہ کا مورخ لکھتا ہے کہ محمد قلی بروز جمعہ ماہ رمضان میں تولد ہوا[5] اس کی کنیت ابو المظفر تھی "طبقات اکبر شاہی" میں نظام الدین

---

[1] جان برگس۔ دی رائز آف محمڈن پاوران انڈیا۔ (انگریزی) ص ۲۶۹

[2] ہارون خان شیروانی۔ محمد قلی۔ (انگریزی) باب دوم ص ۱۲

[3] ڈاکٹر زور۔ مقدمہ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ص ۳۴

[4] خان رشید۔ تین مثنویاں۔ " ص ۶۴

[5] محمد قادر خان بیدری مخطوطہ تاریخ فرخندہ۔ مخطوطہ نمبر ۳۱۸۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ص ۱۴

Marfat.com

نے محمد قلی کا نام غلط تحریر کیا ہے وہ اس کو محمد قلی قطب الملک کے نام سے یاد کرتا ہے جو ایک فاش غلطی ہے۔ نظام الدین محمد قلی کا ہم عصر ضرور تھا لیکن وہ دکن سے دور رہ کر یہاں کی تاریخ پر قلم اٹھا رہا تھا اس لیے بھی اس کے بعض بیانات مشتبہ ہیں[1]

"تاریخ قطب شاہی" کا مورخ رقمطراز ہے کہ

"دوپہر اول روز جمعہ دہم رمضان سہ ثلث و سبعین و تسعمایہ ساعتی کہ سعود آسماں بداں تولد کند از افق ولادت طالع گردید"[2]

"بستان آصفیہ" میں مانک راؤ وٹھل راؤ نے محمد قلی کا سنہ پیدائش ۹۷۱ھ بتایا ہے[3] جو درست نہیں محمد قلی ۱۴ رمضان ۹۷۲ھ کو بروز جمعہ مطابق ۱۴ اپریل ۱۵۶۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ ابراہیم نے اس شہزادے کی ولادت کی خوشی میں عظیم الشان جشن منعقد کیا تھا۔ پایہ تخت میں کئی دن تک رقص و سرود کا جلسہ ہوتا رہا اور خوشی منائی گئی۔ بادشاہ نے غریبوں میں کئی ہزار ہون تقسیم کیے۔ "تاریخ قطب شاہ" میں اس جشن کی تفصیلات موجود ہیں[4] محمد قلی کی والدہ کے بارے میں "ماہ نامہ" کے مصنف غلام حسین خان لکھتے ہیں کہ وہ ایک ہندو خاتون تھی اور اس کا نام بھاگ رتی تھا[5] ڈاکٹر زور محمد قلی کی تلگو شاعری کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں "ابراہیم کی ہندو دوستی کے پیش نظر یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی کی ماں بھاگ رتی ایک تلنگن ہو جیسا کہ ماہ نامہ میں لکھا ہے"[6] ڈاکٹر زور نے اس سلسلے میں ایک داخلی شہادت کی طرف توجہ مبذول نہیں کی جو محمد قلی کے کلیات میں موجود ہے۔ اپنی ایک نظم میں جو مولود علی کے موضوع پر لکھی گئی

---

[1] سیدہ جعفر۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ۔ ص ۲۴

[2] نامعلوم۔ مخطوطہ تاریخ سلاطین محمد قطب شاہی۔ مخطوطہ نمبر ۳۳۱۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ورق ۱۷۹

[3] مانک راؤ وٹھل راؤ۔ بستان آصفیہ۔ ص ۱۷۸

[4] نامعلوم۔ مخطوطہ تاریخ سلطان محمد قطب شاہی۔ کتب خانہ سالار جنگ ورق۔ ۱۷۹

[5] غلام حسین خان۔ مخطوطہ ماہ نامہ۔ مخطوطہ نمبر۔ ۵۶۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ورق ۱۲۳۰

[6] ڈاکٹر زور۔ مقدمہ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ ص ۲۳، ۲۴

Marfat.com

ہے شاعر کہتا ہے کہ میں نے اپنا "دین" ترک کر کے شیعہ مذہب اختیار کر لیا ہے حالانکہ میری پرورش میں "ہندوے فرخ" کا ہاتھ رہا ہے۔ دکنی میں لفظ "پنانا" پیدا کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ محمد قلی کہتا ہے ؎

میں آپ دین چھوڑ پکڑیا اس دین کا مارگ
پناتے اجھوں موکو ہندوے فرخ

محمد قلی قطب شاہ کے بھائی حسین قلی کی عمر ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے وقت تقریباً بیس برس تھی حسین قلی بڑا ہونہار اور ذی علم شہزادہ تھا اس کے بارے میں تاریخ کے الفاظ "بہ زیور علم وفضل آراستہ بود و از علم و حکمت بہرہ تمام داشت" سے اس کے علم و دانش کا اندازہ ہوتا ہے۔ ابراہیم کے فرزند اکبر عبد القادر کی عدم موجودگی میں حسین قلی کو تخت نشین ہونا چاہیے تھا لیکن جس وقت بادشاہ کا انتقال ہوا حسین کے طرفدار اور حمایتی پایہ تخت سے دور نلدرگ میں عادل شاہی فوج سے نبرد آزما تھے۔ حسین قلی کے ہمدرد اور موئید شاہ میر طباطبا تھے جو قطب شاہی سلطنت کے میر جملہ تھے اور بقول علی بن عزیز مورخ "برہان ماثر"[1] ابراہیم کے ایک جلیل القدر عہدہ دار اور سپہ سالار تھے[2] شاہ میر کی لڑکی حسین قلی سے منسوب تھی اس وقت گولکنڈہ میں بادشاہ کے مقرب خاص رائے راؤ کا بول بالا تھا رائے راؤ بعض وجوہات کی بنا پر شاہ میر کا مخالف بن گیا تھا[3] "برہان ماثر" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رائے راؤ کی خواہش پر ابراہیم نے حسین قلی کے بجائے محمد قلی کو اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا۔ ہارون خان شیروانی "ہسٹری آف میڈیویل دکن" میں لکھتے ہیں کہ رائے راؤ جیسے وزیروں کی سازش سے محمد قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا تھا۔ محمد قلی نرم دل امن پسند اور صلح جو انسان تھا اس لیے اس کو اپنے اشاروں پر چلانا آسان سمجھتے ہوئے "الکشن" کے ذریعے سے ان کو بادشاہ منتخب کیا گیا تھا[4] ابراہیم کے انتقال کے وقت اگر شاہ میر نلدرگ میں قطب شاہی فوج کے ساتھ موجود

---

[1] علی بن عزیز طباطبا۔ برہان ماثر۔ ۵۲۶

[2] سیدہ جعفر۔ مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ۔ صـ۲۶

[3] ہارون خان شیروانی۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن۔ جلد اول۔ صـ۴۴۶

Marfat.com

نہ ہوتے اور ان کا قیام گولکنڈے میں نہ ہوتا تو حسین قلی شاہی سلطنت کا پانچواں حکمران نہ ہوتا۔ بادشاہت کے لیے حسین قلی پر محمد قلی کو رائے راؤ نے بقول غلام حسین خان مورخ "ماہ نامہ" اس لیے ترجیح دی تھی کہ محمد قلی کی ماں بھاگ رتی تھی[1] اور رائے راؤ یہ سمجھتا تھا کہ محمد قلی کی تخت نشینی اس کے حق میں مفید ثابت ہوگی۔ بھاگ رتی کا بیٹا محمد قلی اس کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھے گا۔ اگر حسین قلی بادشاہ وقت ہوتا تو رائے راؤ کے بجائے اس کے مخالف شاہ میر کا سلطنت گولکنڈہ میں بول بالا ہوتا۔ امراء اور عمائدین نے رائے راؤ کی اس لیے حمایت کی تھی کہ شاہ میر غیر ملکی تھا اور اگر حسین قلی تخت نشین ہوتا تو قطب شاہی حکومت پر غیر ملکی چھا جاتے۔ حسین قلی نے ۱۵۸۶ء میں قید میں انتقال کیا[2] محمد قلی کی دو بہنوں کا ذکر تاریخ میں موجود ہے ایک بہن دکن کے مشہور پیر طریقت حسین شاہ ولی سے بیاہی گئی تھی اور دوسری بہن شاہ مظہر الدین کی زوجہ تھی۔ شاہ مظہر الدین بھی اپنے عہد کے مشہور مشائخین میں سے ایک تھے۔

محمد قلی اپنے باپ کا تیسرا بیٹا تھا۔ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں ابراہیم کے تیسرے بیٹے کا نام سبحان قلی بتایا ہے جو درست نہیں ہے[3] محمد قاسم فرشتہ سے ایک اور غلطی کا مرتکب ہوا ہے اس نے محمد قلی کو ابراہیم کا بڑا بیٹا بتایا ہے۔ محمد قاسم فرشتہ رقمطراز ہے کہ ابراہیم کے انتقال کے وقت محمد قلی کے صرف دو بھائی (حیات) تھے اس کے علاوہ محمد قاسم فرشتہ نے محمد قلی کے چھوٹے بھائی محمد امین کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ اس کا بیٹا محمد قلی کا داماد تھا اور وہی محمد قلی کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوا۔ فرشتہ کے یہ تمام بیانات غلط فہمی پر مبنی ہیں اس نے اعتراف کیا ہے کہ "تلنگانہ" کے "قطب شاہی خاندان" کے بارے میں اس کی معلومات محدود ہیں کہ عبدالفتاح اچھا قاری تھا اور قرأت کا ماہر ہونے کی وجہ سے

---

[1] غلام حسین خان۔ مخطوطہ۔ ماہ نامہ۔ مخطوطہ نمبر ۳۶۴ کتب خانہ سالار جنگ۔ ورق

[2] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۱۲

[3] سیدہ جعفر۔ مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ ص ۲۷

[4] " " " ص ۲۸،۲۷

Marfat.com

اس نے بڑی شہرت حاصل کی تھی اس کا انتقال ۱۵۹۴ء میں ہوا۔ خدابندہ محمد قلی کا حقیقی بھائی تھا لیکن علم بغاوت بلند کرنے کے جرم میں اس کو قلعہ گولکنڈہ کے ایک تہہ خانے میں قید کر دیا گیا تھا اس نے یہیں ۱۶۱۲ء میں وفات پائی تھی۔ محمد امین ۱۵۷۱ء میں پیدا ہوا تھا۔ باپ کے انتقال کے وقت اس کی عمر صرف نو سال تھی وہ ایک خوش مزاج اور نیک سیرت شہزادہ تھا۔ محمد قلی سے اس کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ محمد قلی کے متعلق تاریخ "سلطان محمد قطب شاہ" کا یہ بیان صداقت پر مبنی نہیں معلوم ہوتا کہ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر بارہ سال تھی اس طرح محمد قلی کی تاریخ ولادت ۱۵۶۸ء قرار پاتی ہے۔ اس بیان کو ہارون خان شیروانی نے غیر مستند قرار دیا ہے[1] جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے محمد قلی ۱۵۶۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ محمد قلی کے جشن ولادت کے موقع پر ابراہیم کے ایک درباری شاعر نے شہزادے کی تاریخ پیدائش "باعث روزی اہل عالم" نکالی تھی ؎

شاہ را داد خدا فرزندے — کہ شد از دیدن او دل خرم
پے شکرانہ شہ دریا دل — کرد با خلق بہ صد لطف و کرم
سالِ مولودشِ را یافت فلک — باعثِ روزیِ اہل عالم

۹۷۳

ڈاکٹر زور کا بیان صداقت پر مبنی نہیں کہ محمد قلی قطب شاہ علم و فضل کے اعتبار سے اپنے دوسرے بھائیوں سے کمتر تھا اور یہ کہ کسی مورخ نے محمد قلی کے علم و فضل کی تعریف نہیں کی ہے۔ مانک راؤ وٹھل راؤ "بستان آصفیہ" میں لکھتے ہیں کہ اس نے اچھی تعلیم پائی تھی[2] اور "برہان ماثر" میں علی بن عزیز طباطبا رقمطراز ہیں کہ محمد قلی کو اس لیے بادشاہت کے لیے نامزد کیا گیا تھا کہ وہ ابراہیم کی تمام اولاد میں "منفرد" تھا[3] "تذکرۃ الملوک" میں رفیع الدین شیرازی بھی علی بن عزیز طباطبا کا ہم خیال نظر آتا ہے۔ ہارون خان شیروانی اور ڈاکٹر زور نے اپنے اس خیال کی تائید میں کہ

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ محمد قلی (انگریزی)) باب دوم۔ ص ۱۲
[2] مانک راؤ وٹھل راؤ۔ بستان آصفیہ۔ ص ۲۷
[3] علی بن عزیز طباطبا۔ برہان ماثر۔ ص ۵۲۷

Marfat.com

محمد قلی علم وفضل سے بے بہرہ تھا اس کے کلیات سے ایسے شعر منتخب کیے ہیں جن میں اس نے خود لو "اُمّی" کہا ہے۔ محمد قلی کے یہ اشعار ان کے "امی" اور "ان پڑھ" ہونے کا ثبوت فراہم نہیں کرتے اس زمانے میں دکن میں صوفیاء اور اولیاء کی تعلیمات کا چرچا تھا ان اشعار میں محمد قلی نے صوفی شعراء کی طرح عقل پر عشق کو اور علم پر وجدان کو ترجیح دی ہے۔ صوفیاء "علم" کو "حجاب اکبر" تصور کرتے ہیں اور جذبہ عشق کو اپنا رہنما سمجھتے ہیں۔ اس موضوع پر اردو اور فارسی شاعروں کے سیکڑوں شعر موجود ہیں لیکن ان اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ جن شاعروں نے یہ اشعار موزوں کیے ہیں وہ جاہل اور امّی تھے درست نہیں۔ اہلِ طریقت، اہل شریعت، کو "سرکشتہ خمار رسوم وقیود" سمجھتے ہیں اس لیے ان کی ظاہر پرستی کو انھوں نے ہدف تنقید بنایا ہے وہ دینوی علوم پر باطنی علوم کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر ہم ان اشعار کی بنا پر محمد قلی کو جاہل اور ان پڑھ تصور کر لیں جس میں اس نے علم ظاہری کو علم باطنی کے مقابلے میں ہیچ بتایا ہے تو پھر ہم محمد قلی کے ان اشعار کے متعلق کیا رائے قایم کریں گے۔ جن میں انسں نے اپنے علم وفضل پر ناز کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

نہ لکھ سکے گا کسے شرح منج کتاباں کا
ہمارا علم ہے سب عالماں میں جیوں اعجاز
میں کتاباں تو علم کیاں پڑیاں ہوں بہوت ولے
خال خط مشکیں جتا پڑتا نہ ہوتا آخر
میں استاد تعلیم سے سر نہ کھینچا
جتے کوئی کھینچے گا پکارے گا جیوں خر
علم سوگیان تھے کرتا ہوں تو میں سرداری عالم میں
انداز اکیا ہے رستم کا کہ کہوے سب میں ہوں میں فرد

آخری شعر میں محمد قلی کہتا ہے کہ علم کی بدولت دنیا میں مجھے عظمت اور "سرداری" نصیب ہوئی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی جو تصویریں دستیاب ہوتی ہیں ان سے "قطب مشتری" میں محمد قلی قطب شاہ کا جو سراپا پیش کیا گیا ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وجہی کہتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ ایک خوش رو جوان ہے اور وجاہت میں بے مثل ہے۔

Marfat.com

اس کی آنکھیں بڑی اور دہانہ چھوٹا ہے۔ اس کے سیاہ بال اس کے سرخ و سفید چہرے پر بڑے نظر فریب دکھائی دیتے ہیں محمد قلی کا بدن مضبوط اور چھریرا ہے اور وہ سرو قد جوان رعنا ہے۔ شیخ احمد شریف گجراتی نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا میں "تعریف قطب شاہ محمد قلی" کے زیر عنوان ایک سو چونسٹھ (۱۶۴) اشعار میں بادشاہ کا سراپا پیش کیا ہے۔

محمد قلی نے اٹھارہ سال کی عمر میں ۹۹۱ھ میں شاہ میر طباطبا کی بیٹی سے جو اس کے بڑے بھائی حسین قلی سے منسوب تھی شادی کی تھی۔ "برہان ماثر" میں علی بن عزیز طباطبا نے اس کی تفصیل بیان کی ہے[1] "تاریخ قطب شاہ" "تذکرۃ الملوک" "حدیقۃ السلاطین" اور "تاریخ فرشتہ" میں بھی محمد قلی کی خانہ آبادی کی تقریبات پر روشنی ڈالی گئی ہے[2] شارو کور مطراز ہے کہ محمد قلی نے شاہ نظام اصفہانی کی بیٹی سے جو ابراہیم قطب شاہ کے میر جملہ تھے شادی کی تھی۔ کچھ عرصہ بعد بیجاپور سے محمد قلی قطب کی جھڑپ کے سلسلے میں محمد قلی نے اپنے خسر کو ناراض ہو کر جلاوطن کر دیا تھا جب گولکنڈہ اور بیجاپور کے درمیان دوستانہ تعلقات قایم ہوئے تو اس کے نتیجے میں ابراہیم عادل شاہ نے محمد قلی قطب شاہ کی بہن سے شادی کی[3] جان برگس بھی تحریر کرتا ہے کہ محمد قلی کی ایک ملکہ امیر شاہ میر کی صاحبزادی تھی[4]

سلطان محمد قلی قطب شاہ خانوادہ قطب شاہی کا ایک ایسا حکمراں گزرا ہے جس کے عہد حکومت میں امن و امان کا دور دورہ تھا چند بغاوتوں سے قطع نظر محمد قلی کو زبردست اور فیصلہ کن جنگوں سے سابقہ نہیں پڑا۔ جب ۱۵۸۲ء میں ملی خاں نے علم بغاوت بلند کیا تو قطب شاہی فوجوں نے اس کا بروقت خاتمہ کر دیا۔ جب ۱۵۹۶ء میں قاسم کوٹ کا قبضہ شروع ہوا تو محمد قلی قطب شاہ نے میر زین العابدین

---

[1] علی بن عزیز طباطبا۔ برہان ماثر۔ ص ۵۲۵

[2] سیدہ جعفر۔ مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ۔ ص ۳۶

[3] شارو کو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز (انگریزی)۔ ص ۱۰۷

[4] جان برگس۔ دی رائز آف محمڈن پاور ان انڈیا۔ (انگریزی) ص ۲۷۱

Marfat.com

کی سرکردگی میں ایک بھاری لشکر روانہ کیا جس نے مکند راج کو بھگا دیا۔ اس نے پنالور کے راجا رام چندر سے مدد طلب کی لیکن امین الملک نے اس کی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور رام چندر قطب شاہی سلطنت کا باجگذار بن گیا۔ اس سے ایک سال قبل ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء میں جب محمد قلی کے بھائی نے شورش برپا ہوئی تو قطب شاہی لشکر نے اسے مار بھگایا اور اس نے بیجاپور میں پناہ لی۔ ۱۰۰۸ھ میں فوجی افسر راوت راؤ کی سرکوبی کی گئی اور پھر ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء میں کشتم راج کی بغاوت کا خاتمہ کیا گیا کشتم راج' راوت راؤ کا بیٹا تھا۔ جب ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء میں پایہ تخت میں محمد قلی کے بھائی خدابندہ نے فتنہ برپا کیا تو شاہی افواج نے اسے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ فرو کر دیا[1] ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء میں جب محمد قلی کو یہ اطلاع ملی کہ پرتاب سا نے جو بستر کا راجا تھا بعض قطب شاہی علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے تو اس نے میر محمد امین کو پرتاب سے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ بستر کا قلعہ گھنے جنگل میں واقع تھا اس لیے قطب شاہی افواج کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور فوجی تنظیم پر اس کا بُرا اثر پڑا۔ محمد قلی نے کمک کے لیے پانچ ہزار فوج روانہ کر دی[2]۔

مختصر یہ کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد کی یہ مہمات عظیم الشان جنگیں نہیں تھیں بلکہ چھوٹی چھوٹی بغاوتیں تھیں، محمد قلی کو اپنے والد ابراہیم کی طرح تالی کوٹ جیسی زبردست لڑائی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ سیاسی اعتبار سے محمد قلی کا عہد حکومت اس کے پیشرو قطب شاہی سلاطین کے مقابلے میں پرامن رہا تو غلط نہ ہوگا ان بغاوتوں کو فرو کرنے میں ہر وقت محمد قلی کامیاب و کامران رہا اور اقبال مندی اس کے قدم چومتی رہی اور اس میں محمد قلی کے سیاسی شعور، اس کی بیدار مغزی اور اعلا ذہنی صلاحیتوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ عیش و عشرت میں مصروف رہنے کے باوجود وہ امور ملکی سے کبھی غافل نہیں رہا۔ محمد قلی کے عہد حکومت میں قطب شاہی سلطنت کے حدود دریائے تنگبھدرا، پنکنڈہ اور کندی کوٹ تک پہنچ گئے تھے اور شمال مشرق میں دریائے گوداوری کے اوپر سکاکول تک جا ملے تھے۔ محمد قلی نے سرحدوں کی حفاظت

---

[1] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۱۲۲، ۱۲۳

[2] جان برگس۔ دی رائز آف محمڈن پاور اِن انڈیا (انگریزی)۔ ص ۲۹۲

Marfat.com

کے لیے بھاری فوج متعین کردی تھی)۔ رام چنارری اور شمال میں سکاکول قطب شاہیوں کا بڑا فوجی مستقر تھا۔ مشرق میں مرتضیٰ نگر یا گنٹور مستحکم فوجی چھاؤنی تھی۔ "دسچنتی دلاسم" کا شاعر اپنے اشعار میں محمد قلی قطب شاہ کو چورا(۸۴) سی قلعوں کا مالک بتاتا ہے۔ محمد قلی نے قطب شاہی سلطنت کے حدود اتنے وسیع کر دیے تھے کہ وہ ایک چھوٹی شہنشاہیت معلوم ہوتی تھی[1] شاردکو لکھتا ہے کہ کرنول، نندیال، ڈول، گنڈی کوٹ اور کڑپہ سلطنت قطب شاہیہ میں شامل ہوگئے تھے[2]

ابراہیم قطب شاہ نے امیر عنبر خاں حبشی سے مقابلہ کر کے اسے بیجانگر میں شکست دی تھی اور اس کا نشان چھین لیا تھا اس نشان کا رنگ آسمانی تھا۔ یہی رنگ قطب شاہی سلطنت کا "سرکاری رنگ" قرار پایا تھا۔ محمد قلی نے اپنے اکثر اشعار میں اس کا ذکر کیا ہے[3]

نبی صدقے قطبا کے سر پر سدا
گگن رنگ کا چتر چھایا دسے
میرا قطب تارا ہے تاریاں میں نچھل
تو مجھ پر فلک رنگ کا چتر چھایا
تا نے ازل تھے مجھ پر گگن رنگ کا چتر
پیاریاں پریاں سوا وے ابر اور مال عید

شاہ عباس صفوی والیِ ایران نے محمد قلی قطب شاہ کی اکلوتی بیٹی حیات بخشی بیگم سے اپنے شہزادے کی شادی کا پیام بھجوایا تھا مورخ "تاریخ رشید الدین خانی" لکھتے ہیں کہ اس واقعے نے ہمسایہ ریاستوں میں محمد قلی کی عزت و توقیر میں اضافہ کر دیا کہ ایک جلیل القدر شہنشاہ اس سے برابری کا رشتہ جوڑنا چاہتا تھا[4]

عہد محمد قلی کا ایک اہم تاریخی واقعہ یہ بھی ہے کہ ۱۶۱۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلی بار مسولی پٹنم میں اپنی "ایجنسی" قایم کی تھی[5]

---

[1] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۱۲۵
[2] شاردکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز (انگریزی)۔ ص ۱۵
[3] غلام امام خان ترین ہجر۔ تاریخ رشید الدین خانی۔ ص ۲۲۵
[4] شاردکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز (انگریزی)۔ ص ۱۵

Marfat.com

محمد قلی قطب شاہ انتہا رقیق القلب تھا کہ اپنے دور حکومت میں بقول "صاحب گلزار آصفیہ"، کبھی کسی کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا[1] محمد قلی کی عدل گستری اور انصاف پسندی کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ داد محل کے دروازے غریبوں اور مصیبت زدہ لوگوں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ یہاں مظلوم اور آفت رسیدہ عوام بلا روک ٹوک پوری آزادی کے ساتھ بادشاہ سے عرض حال کر سکتے تھے۔ جان برگس نے محمد قلی کے دس عوامی کارنامے گنائے ہیں محلات و باغات کی تعمیر باغ محمد شاہی کا اہتمام، نوبت کھاٹ پر محل کی تعمیر، محل کوہ طور، ناری محل کی تعمیر، خیرات خانے کا قیام "جو بارہ اماموں کا لنگر کہلاتا تھا" جامع مسجد، تعلیم گاہوں، اور عوامی دواخانوں کا قیام وغیرہ[2] جان برگس لکھتا ہے کہ ہر سال غریبوں میں ساٹھ ہزار ہون تقسیم کیے جاتے تھے[3]

محمد قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا اس کے دور حکومت کے فن تعمیر کے نایاب نمونے اس کے اعلا اور شائستہ ذوق کے ترجمان ہیں۔ سعید آباد اور میر پیٹ کی مسجدیں فن تعمیر کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ چار مینار، چندن محل، گگن محل، خداداد محل، محل کوہ طور، سجن محل، حنا محل اور اعلیٰ محل کی سجاوٹ اور خوبصورتی کی تصویریں ہمیں نہ صرف "تاریخ قطب شاہ"، "حدیقۃ العالم" اور "حدیقۃ السلاطین" میں نظر آتی ہیں بلکہ محمد قلی کے کلام میں بھی ان کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ "تاریخ فتوحات عادل شاہی" کا مورخ فزونی استرآبادی حیدرآباد کے شہر اور یہاں کی عمارتوں کی شان و شوکت اور دلکشی کا ذکر سن کر قطب شاہی پایہ تخت آیا تھا۔ محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں شہر حیدرآباد کی آرائش و تزئین کی جو بانی شہر کے نفیس ذوق کی نمایندگی کرتی ہے، بڑی تعریف کی ہے اور لکھتا ہے:-

"شہری کہ در تمامی ہندوستان شرقاً غرباً شمالاً وجنوباً مثل آن در لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود"[4]

---

[1] غلام حسین۔ تاریخ گلزار آصفیہ۔ ص ۲۴

[2] جان برگس۔ رائز آف محمڈن پاورز ان انڈیا (انگریزی)۔ ص ۲۹۲

[3] " " " ص ۲۵۲

[4] محمد قاسم فرشتہ۔ تاریخ فرشتہ۔ مقالہ سوم۔ ص ۱۰۳

Marfat.com

ہارون خان شیروانی لکھتے ہیں کہ شہر حیدرآباد کی منصوبہ بندی میں اگرچہ میر مومن کا ہاتھ تھا لیکن بلاشبہہ اس کا نقشہ محمد قلی کا تیار کردہ تھا[1] محمد قلی کی شخصیت بڑی پہلودار اور متنوع تھی فنون لطیفہ سے اُسے خاص شغف تھا۔ شاعری کے علاوہ محمد قلی کو خوشنویسی کا بھی بڑا شوق تھا۔ اس نے خط نسخ اور خط نستعلیق کے استاد ایران اور عراق سے بلوائے تھے ان کے خطوط کے نایاب نمونے حیدرآباد کی عمارتوں اور کتبوں میں اب بھی محفوظ ہیں۔ جامع مسجد کے بیرونی دروازے کا کتبہ خط نستعلیق کا ایک عمدہ نمونہ ہے اسی مسجد کی محراب کا کتبہ خط نسخ کا بے مثل کارنامہ سمجھا جاتا ہے حروف کی نشست، قلم کا زور، دائروں کی گولائی، ہاتھ کی صفائی اور خوش خطی لاجواب ہے۔ اس کی تاریخ ۱۰۰۶ھ / ۱۵۹۷ء ہے اور کاتب کا نام بابا خان بتایا گیا ہے۔ ٹولی مسجد کاروان ساہو میں خط نستعلیق کے دو نمونے نظر آتے ہیں اس کا سنہ ۱۰۴۳ھ / ۱۶۳۳ء تحریر کیا گیا ہے اس کے کاتب کا نام لطف اللہ حسینی تبریزی بتایا گیا ہے۔ خط رقع کا بھی ایک دلکش نمونہ قطب شاہی عہد کا یادگار ہے یہ میاں مشک کی گنبد کے باب الداخلہ پر لکھا گیا ہے۔ ابوالحسن تانا شاہ کا ایک فرمان خط رقع میں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط دور ابوالحسن میں بھی موجود تھا۔ خط طغرا کے بھی نمونے ملتے ہیں[2] محمد قلی قطب شاہ کے دور سے لے کر ابوالحسن تانا شاہ کے عہد تک کے سکّوں پر خط ثلث اور نسخ لکھا گیا ہے۔ بعض سکّے خطاطی کے بہترین نمونے ہیں۔ سلطان قلی بانی سلطنت قطب شاہیہ بہمنی بادشاہوں کا بڑا وفادار تھا۔ چنانچہ بقول ڈاکٹر پی ایل گپتا اس نے اپنے نام کا سکّہ جاری نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد کے قطب شاہی بادشاہوں کے سکّے دستیاب ہوتے ہیں۔ تانبے کے سکّے بالعموم دو وزن کے ہیں ایک ۱۶۴ تا ۱۶۶ گرین وزنی ہے اور دوسرے کا وزن ۱۰۴ تا ۱۱۰ گرین ہے۔

ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں تین قدر قیمت کے سکّے جاری ہوئے اوپر بیان کیے ہوئے دو وزن کے علاوہ ۳۱۵ گرین کا سکّہ بھی جاری ہوا۔ یہ خاصا وزنی سکّہ

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ محمد قلی قطب شاہ (انگریزی)۔ باب نہم۔ صـ ۱۲۱

[2] خواجہ محمد احمد کیلی گرافی۔ باب ششم۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن۔ جلد دوم۔ صـ ۴۱۹، ۴۲۰

Marfat.com

تھا۔ محمد قلی قطب شاہ نے اسے موقوف کروادیا تھا۔ اس نے چوکور اور گول دو وضع کے سکّے جاری کیے۔ چوکور سکّے پانچ وزن کے ہوتے ۲۰۳ تا ۲۳۲ گرین، ۹۷ تا ۱۱۲ گرین، ۱۶۸ تا ۱۸۵ گرین، ۱۳۵ تا ۱۴۸ گرین، ۶۷ تا ۷۳ گرین اور ۲۸۵ گرین۔

قطب شاہی سلاطین، سکّوں پر کندہ عبارت (Legend) کے سلسلے میں بقول پی ایل گپتا لاپرواہ تھے۔ صرف محمد قلی قطب شاہ کے سکّوں پر" ابوالمظفر" تحریر کیا ہوا نظر آتا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ نے ایک اور سکّہ جاری کیا تھا جس پر

تغیر دہ فلوس شاہی

پیوستہ بہ نعتِ الٰہی

تحریر کیا ہوا ملتا ہے۔ راقمۃ الحروف کے یہاں یہ سکّے موجود ہیں ان میں سے بعض پر بادشاہ کا نام کندہ نہیں۔ بعض پر مذکورہ بالا پورا شعر ہے اور بعض پر صرف " عدل محمد قلی قطب شاہ" کندہ ہے۔ اور دارالضرب کا نام" دارالسلطنت گولکنڈہ" اور تاریخ ۹۹۱ھ یا ۹۹۲ھ موجود ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے لفظ" ابوالمظفر" کو برقرار رکھا اور باقی بادشاہوں نے صرف لفظ" سلطان" پر اکتفا کی ان کے سکوں کے ایک طرف بادشاہ کا نام کندہ ہے جیسے سلطان جمشید قطب شاہ، سلطان سبحان قلی قطب شاہ، ابوالمظفر محمد قلی قطب شاہ، ابوالمظفر سلطان محمد قلی قطب شاہ، سلطان عبداللہ قطب شاہ یا سلطان عبداللہ بادشاہ غازی۔ بانی سلطنت گولکنڈہ سلطان محمد قلی نے گولکنڈے کا نام محمد نگر رکھا تھا اس دور کے بعض سکّوں پر محمد نگر گولکنڈہ یا دارالسلطنت گولکنڈہ لکھا گیا ہے۔ ۱۰۱۲ھ سے محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں سکّوں پر دارالسلطنت حیدرآباد۔ کندہ کیا جانے لگا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے بعض سکّوں پر محمد نگر بھی کندہ نظر آتا ہے اور بعض پر حیدرآباد بھی کندہ کیا گیا ہے۔ عہد عبداللہ قطب شاہ کے بعض سکّے مغل سکّوں سے مشابہہ ہیں۔ بعض پر دارالضرب کا نام کندہ ہے[1]

محمد قلی قطب شاہ نے ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک حکومت کی۔ قطب شاہی تاریخوں میں محمد قلی کی خرابی صحت یا اس کی بیماریوں کی تفصیل نہیں ملتی لیکن اپنے کلیات میں

---

[1] پی ایل گپتا۔ کاٹیج۔ باب ہفتم۔ میڈیویل ہسٹری آف دکن۔ جلد دوم۔ ص ۴۴۵

Marfat.com

محمد قلی قطب شاہ نے اکثر جگہ آنحضرتؐ اور حضرت علیؓ سے شفا حاصل ہونے کی دعا کی ہے کلیات کی پہلی ہی غزل میں محمد قلی قطب شاہ نے اپنی صحت کے متعلق تشویش کا اظہار کیا ہے اور وہ ان مقدس ہستیوں سے جام شفا عطا کرنے کی استدعا کرتا ہے۔ کلیات کی پہلی غزل کا ایک شعر ہے ؎

این بخت حقیرے تھے کدھیں دل میں نہ غم کر
تجھے واردے صحت سوں شفا جام دیوے گا

محمد قلی قطب شاہ کی صحت کو بقول ڈاکٹر زور کثرت شراب نوشی کی وجہ سے گھن لگ گیا تھا[1] رمضان ۱۰۲۰ھ میں وہ بیمار پڑا اور یہ بیماری مرض الموت ثابت ہوئی کوئی ڈھائی مہینے تک تپ کا سلسلہ جاری رہا۔ تاریخ گلزار آصفیہ میں غلام حسین لکھتے ہیں "از عارضہ جانکاہ قضا کرد"[2] "تاریخ ظفرہ" کا مورخ رقمطراز ہے "از سموم حرارت تن بر بستر ناتوانی نہاد"[3] بہر حال محمد قلی اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکا "حدیقۃ العالم" کا مورخ لکھتا ہے "در عرض دو روز مرض آں چناں قوی گشت کہ مزاج مبارک بہ ضعف گرید"[4] شارو کو نے "گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز" میں محمد قلی کی وفات تاریخ ۱۱ دسمبر ۱۶۱۱ء تحریر کی ہے[5] محمد قلی نے اپنے اکثر اشعار میں کئی سال زندہ رہنے کی تمنا ظاہر کی ہے لیکن انتقال کے وقت اس کی عمر صرف ۴۷ سال سے کچھ زیادہ تھی۔ "حدائق السلاطین" میں علی بن طیفور نے محمد قلی کی تاریخ وفات یوں درج کی ہے ؎

سال تاریخ فوت او جستم
گفت رضواں کہ بادشاہ بہشت[6]
۱۰۲۰

---

[1] ڈاکٹر زور۔ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ص ۳۱۹

[2] غلام حسین۔ گلزار آصفیہ۔ ص ۲۹

[3] گردھاری لال احقر۔ تاریخ ظفرہ۔ ص ۲۱

[4] میر ابو تراب۔ حدیقۃ العالم۔ ص ۲۶۰

[5] شارو کو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز (انگریزی) ص ۱۵

[6] علی بن طیفور بسطامی۔ مخطوطہ حدائق السلاطین۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ مخطوطہ نمبر ۵۲۷۔ ص ۱۱۴ ب۔

Marfat.com

محمد قلی قطب شاہ کا مزار ایک گنبد میں جو اس نے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کروالیا تھا واقع ہے۔ گولکنڈہ کے شاہی مقبروں اور ان کے طرز تعمیر پر مشہور فرانسی سیاح موسیو تھیونو نے اپنے سیاحت نامہ میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ محمد قلی کی قبر کے اطراف روزانہ کئی حافظ قرآن تلاوت میں مصروف رہتے ہیں۔ قبر پر اطلسی چادر بچھائی گئی ہے۔ طلائی ڈنڈوں پر زربفت کا قیمتی شامیانہ تانا گیا ہے۔ اور رات میں یہاں کئی چراغ روشن کیے جاتے ہیں[1] گنبد میں قیمتی قالینوں کا فرش ہے۔ گولکنڈہ کے اس مشہور ہیرو کا مزار آج بھی مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے۔

حکومت کے علاملانہ فرائض کے لیے مختلف عہدے دار مقرر کیے جاتے تھے ان میں پیشوا کی ہستی سب سے زیادہ اہم اور مقتدر ہوتی تھی وزیر اعظم وکیل مطلق یا پیشوا کہلاتے تھے۔ وہ بادشاہ کا مشیر خاص تھا اور امور سلطنت کی نگرانی کے علاوہ داخلی اور خارجی پالیسی کو متعین کرتا۔ میر جملہ عہدہ میں پیشوا سے کم ہوتا۔ محمد قلی کے عہد میں پہلے میر مومن اسی عہدے پر فائز تھے۔ میر جملہ کو اس کی کارکردگی اور حسن انتظام کے صلے میں پیشوائی کے عہدے پر ترقی دی جاتی تھی بہمنی اصطلاح میں یہ امیر جملہ ہوتا جس کو جملۃ الملک کے خطاب سے نوازا جاتا تھا سلطنت کے مداخل اور مصارف کی جانچ پرتال اسی کے ذمے ہوتی اور مالگذاری کے انتظامات کی بھی وہی دیکھ بھال کرتا تھا محمد قلی کے زمانہ حکومت میں مرزا محمد امین میر جملہ بھی بڑے مستعد اور فرض شناس عہدے دار سمجھے جاتے تھے۔ "حدیقۃ السلاطین" کا مورخ لکھتا ہے کہ بادشاہ نے ان کی لیاقت اور اعلا صلاحیتوں سے خوش ہوکر انھیں مرصع قلم دان عطا کیا تھا[2] قطب شاہی دستور میں وزارت عین الملکی کو مخصوص اہمیت کا حامل تصور کیا جاتا وہ محکمہ فوج کا صدر اور ذمہ دار ہوتا۔ محمد قلی کے عہد حکومت میں مرزا محمد امین میر جملہ کو خاص اعزازات سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اس کو "سیادت پناہ" اور وزیر الممالک کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ میر جملہ نے محمد قلی قطب شاہ کی دعوت کا جو انتظام کیا تھا۔

---

[1] موسیو تھیونو۔ سیاحت نامہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۹

[2] نظام الدین احمد القاعدی۔ حدیقۃ السلاطین۔ صفحہ ۶۴

Marfat.com

اس کی تفصیل "صولت عثمانیہ" میں ابوالفتح محمد امیراللہ نے درج کی ہے۔ میر جملہ نے محمد قلی کو جو بیش بہا اشیا نذر کی تھیں ان میں ہاتھی مع سامان، عربی گھوڑے بازین و لگام مرصع نیلک، مشجر، مطلق، اطلس مخمل اور زربفت وغیرہ کے تھان، عمدہ قالین، کشمیری شالیں، تکیہ کرمانی، عنبر خوشبودار" لنگر غوری خوش قماش" اور اس کے علاوہ چودہ مصحف طلا جن کی جلد پر جواہرات کا کام تھا شامل تھے[1]

میر جملہ کا ماتحت قطب شاہی سلطنت میں ناظر کہلاتا اور خرچ کی تنقیح کے کام پر معمور ہوتا تھا۔ محمد قلی کے عہد میں ابو طالب ناظر نے اپنی دیانت داری کی وجہ سے نیک نامی اور شہرت حاصل کی تھی۔ ناظر کا شاہی خطاب ناظر الملک تھا۔ مجموعہ دار مرکزی خزانے کا نگراں کار ہوتا۔ دبیر سلطنت منشی اور دبیر الملک کے خطابات سے سرفراز کیے جاتے تھے۔ شاہی فرامین کی نگہداشت اور احکام شاہی کو ضبط تحریر میں لانے کا کام انہی کے سپرد کیا جاتا تھا۔ کوتوال شہر میں امن و امان قایم رکھتا۔ اجنبیوں پر نظر رکھتا اور غیر سماجی عناصر کی سرکوبی کرتا تھا۔ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی روک تھام کے لیے جاسوسوں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ جاسوس بادشاہ کے خفیہ پیام اور احکام بھی لے جاتے اور بادشاہ کو ضروری اور مفید معلومات فراہم کرتے تھے۔ چنانچہ محمد قلی اپنے ایک شعر میں کہتا ہے ؎

جاسوس کہہ مج یار کوں موچھوڑ کر کس سات ہے
اس شہر کا دے مج پتہ وہ باٹ کہہ کس دھات ہے

بقول ڈی وی سبھا ریڈی[2] محمد قلی کے عہد میں شہر کی صفائی اور عوام کی صحت کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ دارالشفا، دنیا کے عظیم شفاخانوں میں سے ایک تھا جس میں نہ صرف علاج معالجہ ہوتا بلکہ طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور یہاں دو قسم کے حکماء

---

[1] ابوالفتح محمد امیراللہ۔ صولت عثمانیہ ۔ ص ۴۴، ۴۵

[2] ڈی وی سبھا ریڈی۔ محمد قلیز انٹریسٹ ان پبلیز ہلت اینڈ میڈیکل ایڈ (مضمون) (Mohd Qulis Intrest in Public Health) مشمولہ قطب شاہی سلطانز اینڈ آندھرا سنسکرتی۔ ادارہ ادبیات اردو ۱۹۱۲ء ۔ ص ۲۱ تا ۲۶

Marfat.com

کا تقرر عمل میں آتا تھا ایک وہ جو تشخیص کر کے مریضوں کو دوائیں دیتے اور ہر طرح کا علاج کیا کرتے تھے دوسرے وہ حکماء تھے جو انتہائی عالم و فاضل تھے اور علم طب کے معلم خاص تصور کیے جاتے تھے۔ شاہی بجٹ میں ایک کثیر رقم صحت عامہ کے لیے مختص تھی بعد میں میر مومن بھی اس شفا خانے میں لکچر دینے لگے تھے انھوں نے "اختیارات قطب شاہی" کے نام سے علم طب پر ایک مفید کتاب سپرد قلم کی تھی۔ جس کے دو نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔ دور محمد قلی کے ایک طب کے مخطوطے کا پتہ چلتا ہے جسے شمس الدین علی الحسن الجرجانی نے تصنیف کیا ہے۔ دار الشفا کے انتظامات کی نگرانی اور دیکھ بھال حکیم صفی الدین محمد جیلانی کے ذمے تھے جو درباری طبیب تھے۔ ان کی کتاب "تذکرۃ الشہوۃ" جنس کے موضوع پر ایک منفرد تصنیف تصور کی جاتی تھی رضا لائبریری رام پور میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ یہ تمام کتابیں اور دوسرے مختلف علوم و فنون اور ادب سے متعلق تصانیف محمد قلی قطب شاہ کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے کتب خانے کی مہر "ذکر خوازم شاہ"، مخطوطے پر موجود ہے جو کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔

وینکٹ رامنیا لکھتے ہیں کہ ابراہیم قطب شاہ تلگو کا ایسا دلدادہ تھا، اور اس زبان سے اُسے ایسی غیر معمولی محبت تھی کہ اپنے عہد حکومت میں اس نے اس کی بڑی سرپرستی کی اور اپنے شہزادوں کو بھی تلگو زبان و ادب کی تعلیم دلوائی[1] اس بیان کی روشنی میں ڈاکٹر زور کا یہ خیال غلط نہیں معلوم ہوتا کہ محمد قلی قطب شاہ نے تلگو میں بھی اپنا ایک دیوان چھوڑا تھا جو اب ناپید ہو گیا ہے۔ اس بیان کی تصدیق وینکٹ رامنیا کے بیان سے بھی ہوتی ہے[2] اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلاطین قطب شاہیہ کے دور میں تلگو کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھی اور بقول وینکٹ رامنیا تلگو سے واقفیت اور اس زبان میں لکھنا پڑھنا، علمیت اور شائستگی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ وینکٹ رامنیا نے محمد قلی قطب شاہ کو تلگو کا ماہر تحریر کیا ہے اور رقمطراز ہیں کہ وہ اپنے والد

---

[1] [2] وینکٹ رامنیا۔ دی قطب شاہیز (مضمون) مشمولہ قطب شاہی سلطانز اینڈ آندھرا سنسکرتی۔ ادارہ ادبیات اردو ۱۹۶۲ء صـ ۹۸

Marfat.com

ابراہیم قطب شاہ کی طرح تلگو شعراء اور ادیبوں کی صحبت پسند کرتا تھا۔ تلگو کا مشہور شاعر سانگا وتمبا جس نے "وسجینتی ولاسم" نظم اپنی یادگار چھوڑی ہے بڑے فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ مجھے سلطان کی محفلوں میں شریک رہنے کا اعزاز ملا ہے۔ وہ مجھ سے وقتاً فوقتاً گفتگو کرتا رہتا ہے[1]

قطب شاہی دور میں بادشاہوں کی خانگی اور درباری زندگی اتنی شاندار تھی کہ دوسرے ہم عصر شاہی خانوادے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ عظیم الشان اور آراستہ دربار فلک بوس محلات، پر شکوہ عمارتیں قطب شاہیوں کے نفیس طریقہ بود و باش کی شاہد ہیں۔ بادشاہ ہاتھی پر باہر نکلتا اور وزراء، امراء گھوڑوں اور پالکیوں میں سوار ہوتے شیشے اور بلور کی آرائشی اشیاء، سونے چاندی کے ظروف، قیمتی قالین اور لباس فاخرہ سے محمد قلی کے دور کی مرفع الحالی کا ثبوت ملتا ہے محمد قلی قطب شاہ کے بسائے ہوئے نئے دارالسلطنت میں نئی نئی مصنوعات کا فروغ ہوا۔ ملک میں باکمال صناع اور اہل حرفہ جمع ہونے لگے۔ اہل شہر کے لطیف ذوق نے پارچہ بافی کی صنعت کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ ورنگل میں انتہائی نفیس اور مہین زیب تن تیار کیا جاتا تھا اور سمندر کے راستے سے باہر بھیجا جاتا تھا۔

قطب شاہی دور میں جو سونے کے سکّے استعمال ہوتے تھے وہ ہون کہلاتے تھے ان کی قدر و قیمت مغلوں کے طلائی سکّے سے زیادہ ہوتی۔ ہارون خان شیروانی لکھتے ہیں کہ قطب شاہی سکّہ ہون سائز میں چھوٹے ہوتے۔ عبدالمجید صدیقی تحریر کرتے ہیں کہ ان کے گننے کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ صاف لکڑی کے تختے پر خانے بنا کر ہون کو ان پر پھیلا دیا جاتا جو ہون خانوں میں رہ جاتے انھیں گن لیتے اور باقی علاحدہ کر لیے جاتے[2] محمد قلی کے دور کے سکّوں پر "دارالسلطنت" گولکنڈہ کی عبارت درج ہوتی یا "دارالسلطنت حیدرآباد" کندہ کیا ہوا ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں دارالضرب قایم

---

[1] وینکٹ رامنیا۔ دی قطب شاہیز (مضمون) مشمولہ قطب شاہی سلطانز اینڈ آندھرا سنسکرتی۔ ادارہ ادبیات اردو ۱۹۶۲ء۔ ص ۹۔

[2] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۳۷۹

Marfat.com

ہونے کے بعد گولکنڈہ کے ٹکسال میں سکّہ ڈھالنا بند کر دیا گیا تھا۔ ہارون خان شیروانی لکھتے ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ نے اپنی تخت نشینی ۱۵۸۰ء کے بعد سکّوں پر امام حسین کے "علم کا نقش" کندہ کروایا تھا[1]

احمد نگر کی تباہی کے بعد پناہ گزین جوق در جوق گولکنڈہ چلے آرہے تھے۔ گنجان آبادی سے عوام کی صحت کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ محمد قلی اور میر مومن نے اس صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے نئے شہر کی تعمیر ضروری سمجھی۔ میر مومن نے اپنی دانش مندی سے مسطح زمین کے ایک پچاس مربع میل قطعے کا انتخاب کیا جس کا محل وقوع تمدنی ضروریات خوش منظری اور رسل و رسائل کی سہولت کے اعتبار سے بھی موزوں تھا۔ ۹۹۹ھ میں میر مومن نے سرکاری طور پر موسیٰ ندی کے کنارے ایک عالی شان شہر کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس شہر کے محل وقوع اور پر فضا ماحول کے بارے میں "تاریخ قطب شاہی" کا مورخ کہتا ہے ؎

لطیف و دلکشا آب و ہوائے
مبارک منزلے فرخندہ جائے[2]

"تاریخ [illegible] شہر حیدرآباد کو "شہر فرخندہ اثر، مجمع فضلائے زماں و منزل مسافراں جہاں و مسکن و ماوائے اکابران" لکھتا ہے[3]

میر مومن [illegible] عباس صفوی کے اصفہان نصف جہان کی رونق، دل فریبی اور آرائش دیکھ چکے تھے اس لیے خوبصورت شہر کا ایک واضح تصور ان کے ذہن میں موجود تھا۔ ایک عظیم الشان شہر کی تعمیر کا منصوبہ بنانا آسان کام نہ تھا اس زبردست منصوبے کی تکمیل کے لیے میر مومن نے ایران سے میر ابو طالب، استاد کمال الدین شیرازی اور شہر یار جہان کو جو ایران کے مشہور و معروف ماہر ان فن تعمیر تھے مدعو کیا اور انھیں خاص عمارتوں اور محلات کے خاکے مرتب کرنے پر مامور کیا تھا۔ چار مینار اور دولت خانہ عالی کی

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ محمد قلی قطب شاہ (انگریزی)۔ ص۷

[2] ڈاکٹر زور۔ فرخندہ بنیاد حیدرآباد۔ ص۱۲

[3] محمد قادر خان بیدری۔ مخطوط تاریخ فرخندہ۔ مخطوطہ نمبر ۳۱۸۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ص۱

Marfat.com

عمارتوں کا پلان میر ابو طالب نے تیار کیا تھا شہریار جہان بھی اپنے وقت کے بہترین آرکیٹیکٹ تھے۔ خداداد محل، محل کوہ طور اور داد محل ان ہی کی فنکارانہ صلاحیتوں کے زندہ جاوید کارنامے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ نے حنا محل بھی تعمیر کروایا تھا[1] راقمۃ الحروف کے مرتب کردہ کلیات محمد قلی قطب شاہ میں محمد قلی کے دوسرے غیر مطبوعہ کلام کے ساتھ حنا محل پر بھی محمد قلی قطب شاہ کی غیر مطبوعہ نظم "حنا محل" شامل ہے اس کے بارے میں محمد قلی کہتا ہے ؎

قدرت تھے اس دھرتی اپرا ے محل اوتارا ہوا
دشتی علی تھے وگگن اس بیچ سوتارا ہوا
وہ سور ہے اسمان کا اے محل سورج دھرت کا
فردوس اس کی ہے سبا جگ میں اظہارا ہوا
حناں محل اس محل کا ہے ناوں حیدر وشٹی تھے
تو اس محل میں عیش سوں آنند آپارا ہوا
نرمل اتم تارے رتن دھر کہکشاں کے بندرس
تس محل میں بند کر پینگن نوچند گہوارا ہوا

میر ابو طالب نے محمد قلی کے جانشین اور بھتیجے سلطان محمد قطب شاہ سے مخاطب ہو کر ایک نظم میں کہا تھا ؎

گر صفا ہاں نوشد از شاہ جہاں عباس شاہ
حیدر آباد از تو شدہ شاہاں صفایاں نوی

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدر آباد اس وقت ایک عظیم استان اور بارونق شہر بن چکا تھا۔ حیدر آباد کی عمارتوں میں مقامی طرز تعمیر، یہاں کے موسمی حالات اور ایرانی طریق تعمیر کے عناصر کا خوبصورت امتزاج نظر آتا تھا۔ سب سے پہلے شہر کے وسط میں چارمینار کا سنگ بنیاد رکھا گیا جو تین لاکھ ہون کے صرفے سے کوئی دو سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ فرانسیسی سیاح تھیونو اس کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ یہ عمارت

---

[1] عبد القادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ صـ۱۰۲

Marfat.com

۱۸۹۰ فٹ بلند ہے اور "یا حافظ" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ ڈاکٹر غلام یزدانی لکھتے ہیں کہ چار میناروں نے عمارت کے حسن میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ "توزک قطب شاہیہ" میں میر روشن علی رقمطراز ہیں کہ چار مینار کا ڈزائن امام حسین کے تعزیہ کی شکل پر بنایا گیا تھا[1] محمد عبداللہ چغتائی بادشاہی عاشور خانہ اور چار مینار کے طرز تعمیر کو "طرز قطب شاہی" سے تعبیر کرتے ہوئے انھیں بے مثل تعمیراتی نمونے قرار دیتے ہیں[2] بادشاہی عاشور خانہ ۱۰۰۳ھ میں تیار ہوا تھا۔ آج بھی یہ سنہ اور محمد قلی قطب شاہ کا نام اس عاشور خانے کی اندرونی دیوار کی بائیں جانب موجود ہے۔ دادمحل کے طرز تعمر کو دیکھ کر سیاح حیرت کرتے تھے فزونی استرآبادی جس نے عادل شاہی عمارتوں کو بھی دیکھا تھا۔ اس محل کی بے حد تعریف کرتا ہے اس میں سطح زمین سے بلند ایک خوبصورت حوض تعمیر کیا گیا تھا اور اس کے نیچے کمانیں تھیں جن سے گزر کر لوگ محل میں داخل ہوتے تھے۔ خداداد محل ایک آٹھ منزلہ شاندار عمارت تھی "تاریخ ظفرہ" اور "حدیقۃ السلاطین" کے مورخ نے اس محل کی بڑی تعریف کی ہے۔ گردھاری لال احقر لکھتے ہیں کہ معین سبزواری نے جو احمد نگر سے حیدرآباد آیا ہوا تھا اس عالیشان محل پر ایک نظم کہی تھی اور بادشاہ کی حضور میں ایک رباعی پیش کی تھی جس سے تاریخ تعمیر اخذ کی جا سکتی ہے اس کے صلے میں اسے گرانقدر انعام سے سرفراز کیا گیا تھا[3]

ایں قصر کہ ہست رشک فرمائے بہشت ایام بہ آب زندگانش سرشت
تاریخ مرتب شد نش کلک قضا بر لوح بقا بنائے جاں بخش نوشت

خداداد محل کی پہلی منزل موسوی محل، دوسری منزل جعفری محل، تیسری حسینی محل، چوتھی حسنی محل، پانچویں حیدری محل چھٹی محمدی محل ساتویں اور آٹھویں ہاشمی محل کے نام سے موسوم تھی۔ اس محل کی ہر منزل گویا آرٹ کی ایک نمائش گاہ تھی یہاں مصوروں اور نقاشوں کے شاہکار جمع کیے گئے تھے۔ ایک منزل پر کتب خانہ بھی تھا۔ نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ

---

[1] میر روشن علی۔ مخطوطہ۔ توزک قطب شاہیہ۔ مخطوطہ نمبر ۱۲۶۵ - ادارہ ادبیات اردو - حیدرآباد۔ ص ۴

[2] محمد عبداللہ چغتائی۔ تمدن ہند میں دکن کا حصہ ص ۵۷

[3] گردھاری لال احقر۔ تاریخ ظفرہ۔ ص ۱۶

Marfat.com

اسی منزل میں کاغذ صاف کرنے والوں کی نشست ہوا کرتی تھی[1] یہ محل جل کر خاکستر ہوگیا تھا[2] محمد قلی نے اپنی ایک نظم میں خداداد محل کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

خداداد محل کو محمد سنوارے — تو اس میں جنت کے نگاراں نگارے
بلندی محل کا ہے اسمان جیسا — سورج چاند تارے سو اس میں سنگارے
جوں آٹو بہشت نمنے آٹو چھجے اس — خضر چشمے بہتے ہیں تس میں سدارے

صولت عثمانیہ کے مورخ لکھتے ہیں کہ ہر ایک محل کے اوپر بارہ اماموں کے نام خوشخط لکھے تھے جب خداداد محل تیار ہوا تو ایک شاندار اور پر تکلف جشن کا اہتمام کیا گیا اور گولکنڈہ کی تمام رعایا کو یہ محل دیکھنے کا موقع دیا گیا تھا عزہ محرم کے سات دن ایک ایک محل میں چراغاں کا انتظام کیا جاتا تھا[3]

محل کوہ طور بھی اپنے مخصوص طرز تعمیر کے اعتبار سے ایک منفرد شان رکھتا تھا یہ محل محمد قلی نے اسی جگہ تعمیر کروایا تھا جہاں اب قصر فلک نما ہے یہ سہ منزلہ محل بہت پر فضا اور بلند مقام پر واقع تھا۔ محل کے سامنے اونچی کمانیں اور ایک وسیع حوض بنا کر جو ایک سو پچاس فٹ لمبا اور نوے فٹ چوڑا تھا اس محل کی دلکشی اور دیدہ زیبی میں اضافہ کیا گیا تھا۔ "تاریخ محمد قطب شاہ" کا مورخ اس محل کی بڑی تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ایوانوں اور نشستوں میں ہر جگہ حوض اور فوارے موجود ہیں جو بادل کی طرح پانی برساتے رہتے ہیں۔ محمد قلی نے اپنی ایک نظم میں محل کوہ طور کا جو مرقع پیش کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بادشاہ کی مستقل سکونت کا محل نہیں تھا۔ یہاں بادشاہ اور اس کی پیاریاں مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے برسات کے موسم میں قیام کرتیں۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں بھی محل کوہ طور میں اسی طرح رہائش اختیار کی جاتی تھی۔ چنانچہ "حدیقۃ السلاطین" کا مورخ نظام الدین احمد الصاعدی اس کو "عشرت سرا" کے نام سے یاد کرتا ہے اور عبداللہ کے بارے میں رقمطراز ہے۔

---

[1] نصیر الدین ہاشمی: "دکھنی ادب کا تہذیبی پس منظر" (مضمون) دکنی ادب نمبر مجلہ عثمانیہ ۱۹۶۳ء ص ۵۱
[2] نظام الدین احمد۔ حدیقۃ السلاطین۔ ص ۲۲
[3] ابوالفتح محمد امیر اللہ۔ صولت عثمانیہ۔ ص ۶۲، ۶۳

Marfat.com

"درآن عشرت سرا روز وشب بہ عشرت وطرب اشغال نمودند"۔ محمد قلی محل کوہ طور کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے ؎

کہہ طور پر سدا ہے سبحان کا اُجالا
تو خلق سرمہ کرتی رحمان کا اُجالا
بارا برج پر ہے بارہ امام دشتی
تو اس اُپر جھلکتا ایمان کا اُجالا
اس محل کے کنگورے لاگے ہیں عرش یک کوں
جگ قبلہ ہو کے دستا اس بھان کا اُجالا
قطبا نبی کے صدقے آنند کر اس محل میں
بستا ہے اس میں شیر یزدان کا اُجالا

سبحن محل شہر کے وسط میں واقع تھا اور محلات کے اس مجموعے میں سے ایک تھا جو دولت خان عالی کے نام سے موسوم تھا[1] "تاریخ ظفرہ" کا مورخ لکھتا ہے کہ اس کشادہ محل میں "اعیان وفضلاء" رہا کرتے تھے۔ لیکن محمد قلی نے اس محل کا ذکر کرتے ہوئے اس میں رہنے والی پیاریوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ان کے حسن کو سراہا ہے اس نظم سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ سبحن محل میں علماء وفضلاء رہا کرتے تھے محمد قلی نے اپنے کلام میں سبحن محل کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

ساجنی سبحن محل میں ساج کر چھنداں سوں آئی
جان جانی ہو کے جان کا پیالا سوں منجکوں پلائی

سبحن محل سے متصل وہ مشہور ومعروف دالان تھا جہاں شاہی مطبخ واقع تھا۔ یہاں ہر روز مطبخ شاہی سے دس ہزار آدمیوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ سبحن محل سلطان عبداللہ کے عہد میں مغلوں کے حملے سے تباہ ہوگیا تھا۔" کلچرل ٹرنڈس اِن میڈیویل انڈیا" میں ہارون خان شیروانی بالاحصار کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے ہندو صناعی کے نمونے اس مخلوط کلچر کی نمایندگی کرتے ہیں جو گولکنڈہ میں پروان چڑھ رہا تھا[2]

---

[1] ڈاکٹر زور۔ مقدمہ۔ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ص ۱۲۷

[2] ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا۔ ص ۱۹

Marfat.com

شہر حیدرآباد کے گرد باغات کا سلسلہ کئی کئی میل تک چلا گیا تھا۔ ہارون خان شیروانی "تاریخ ظفرہ"، مصنفہ گردھاری لال احقر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بھونگیر تک یہ باغات پھیلے ہوئے تھے[1] محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں باغ محمد شاہی کا ذکر موجود ہے۔ محمد قلی اس باغ کی دلکشی و خوبصورتی اور اس کے درختوں اور پھلوں کی بڑی تعریف کرتا ہے۔"

"محمدی باغ" کے بارے میں مشہور ہے کہ ایام گرما میں ایک دن وہ تفریح کے لیے نوبت پہاڑ کے دامن میں قیام پذیر تھا یہ مقام اسے بہت پسند آیا اور یہاں اس نے ایک باغ تیار کرنے کا حکم دیا جو "باغ نبات گھاٹ" یا محمدی باغ کہلایا[2]

عہد محمد قلی قطب شاہ میں مختلف مذہبی تقاریب نے سرکاری تقاریب کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ عید میلاد النبی کے موقع پر تمام شہر میں جشن منعقد کیے جاتے اور دعوتوں کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے کی نرم آرائیوں، شہر کی سجاوٹ اور دوسری تفریحات کا محمد قلی اور عبداللہ قطب شاہ نے اپنے اشعار میں بار بار ذکر کیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی ذاتی دلچسپی اور خوش اعتقادی نے جشن میلاد النبی کو ایک قومی تہوار بنا دیا تھا۔ یہ جشن خداداد محل کے میدان میں منایا جاتا تھا جس کے اطراف چاروں طرف جواہر و نفائس کی دکانیں سجی ہوتیں۔ عمارتوں کو آراستہ کر کے انھیں روشنی سے جگمگا دیا جاتا۔ محل کے سامنے چالیس ستونوں اور چار طنابوں کا خیمہ نصب کیا جاتا جس کو مخمل اور اطلس کے زرنگار پردوں سے مزین کیا جاتا تھا۔ اس جشن کے آغاز سے قبل فنکار، صناع اور کاریگر اپنے کمالات کا مظاہرہ شروع کر دیتے شامیانے کے بیچ میں تخت شاہی رکھا جاتا اور ایک ہزار طوائفیں اپنے ناچ اور گانے سے مجلس عشرت کو گرماتی تھیں۔ سازندے اپنے کمال سے حاضرین کو محظوظ کرتے، بادشاہ کی سواری برآمد ہوتی تو سواری خاص کے ہاتھی کو جو پانچ گز لمبا ہوتا، زعفران اور صندل سے نہلا کر زنجیروں اور زیورات سے آراستہ کیا جاتا۔ عصر کے وقت بادشاہ اس ہاتھی پر سوار ہو کر میدان کی طرف آتا اور

---

[1] ہارون خان شیروانی۔ محمد قلی قطب شاہ (انگریزی)۔ ص ۲۷

[2] ابوالفتح محمد امیر اللہ۔ صولت عثمانیہ۔ ص ۶۳

Marfat.com

ارکان سلطنت امرا، وعمائدین اس ہاتھی کے ساتھ پیادہ چلتے [1]

محمد قلی نے بہت سی نئی عیدوں کا اضافہ کیا اور عید عذیر، عید بعث نبی، نوروز اور شب برات کے موقع پر نئی نئی رنگ رلیوں، تفریحات اور جشنوں کا انتظام کیا ان جشنوں میں زرق برق لباس، قیمتی فرش، مزین محلات اور مہ جبینوں کی سج دھج قابل دید ہوتی ان تہواروں اور جشنوں میں سلطنت کے غریب اور امیر سب ہی حصّہ لیتے اور ان تفریحات میں شریک ہوکر ان کی رونق میں اضافہ کرتے تھے محمد قلی قطب شاہ نے اپنے کلیات میں ایک شاہی تقریب کا ذکر کیا ہے جو غالباً کسی عید کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی۔ اس کی ایک تصویر ملاحظہ ہو ؎

کسوت مکلل زر زری شہ آج سنگارے اہیں
گوہر سو تن مکھ نور کے چوندھیر جھلکارے اہیں
بجلیاں کے ٹکڑے کر میں دھرئی دھات کے چھند بند کر
کولانٹ کھیلے سر بسر کیا شوخ مہ پارے اہیں
سب مست گج گنجیر جون قدر است دھرتے نیر جون
آہستگی میں نیر جوں ہیگی منے بارے اہیں
ہوتا انند خوشحال سب نت گاتے نائک سال سب
بجتے طنبورے تال سب منڈل کے دھمکارے اہیں
چنچل چتر بدونت فنی اک اک ملک جس درسنی
سو قطب شہ پیو بھوگنی جگ جیو کے پیارے اہیں

مندرجہ بالا اشعار میں بادشاہ کے زرین لباس زیب تن کرنے، "کولانٹ کھیلنے" والوں کے کمالات، محبوباؤں کی مست چال، بزم موسیقی میں راگ راگنی کی گونج، اور مختلف فنوں کے ماہرین کے مظاہروں اور عوام وخواص کے ان تفریحات سے محظوظ ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور محمد قلی قطب شاہ میں جو جشن اور تقریبات منعقد ہوتی تھیں ان میں عوام وخواص دونوں برابر کے شریک ہوتے تھے۔

---

[1] ڈاکٹر زور۔ مقدمہ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ص ۱۶۷

Marfat.com

محمد قلی کے عہد میں شاہ عباس کا "وکیل" اعزاز سلطان گولکنڈہ آیا تھا۔ محمد قلی نے قلعہ محمد نگر میں اس کا شاندار استقبال کیا تھا اس نے شہنشاہ ایران کا خط پڑھ کر سنایا تھا اور شہنشاہ نے تحائف میں تاج مرصع، بیش قیمت خنجر، مرصع مکلل و چہل راس اسپ عربی بازیں و لجام مرصع و عنان ہائے زربفت، مخمل و اطلس و خطائی بارہ جفت، قالین کرمانی اور دوسرے قیمتی تحفے محمد قلی کو بھیجے تھے[1]

مرفہ الحالی، صنعت و حرفت کے فروغ اور معاشی اعتبار سے اس وقت سلطنت گولکنڈہ بقول جگدیش متل دکن کی سب سے زیادہ متمول سلطنت تھی۔ اس میں زراعت کی روز افزوں ترقی، کانوں کی آمدنی اور دوسرے ذرائع معاش کا بڑا ہاتھ تھا۔ جگدیش متل لکھتے ہیں کہ قطب شاہی سلطنت کے تمول اور دولت و ثروت کا اس کی بعض تصویروں سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے[2]

"ماہ نامہ" کا مورخ غلام حسین خان جوہر لکھتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں محرم کی تقریبات اور عزاداری کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ بادشاہ کے دسترخوان پر ہندو مسلم سب ساتھ کھانا کھاتے اور شربت و طعام کا انتظام ہر محلے میں کیا جاتا تھا۔ ہر محلے میں بادشاہ کی جانب سے ایک داروغہ اور باورچی متعین ہوتے جو رات دن قند اور مصری کا شربت تیار کرتے رہتے۔ چار کمان کا حوض شربت نبات و گلاب سے بھر دیا جاتا اور یہ اذن عام تھا کہ جس شخص کا دل چاہے "آبخورہ" یا "صراحی" میں "خوشبودار شربت" بھر کر لے جائے۔ عوام میں بریانی تقسیم کی جاتی اور دس محرم کے دن "حلہ ہائے سیاہ" پہننے والے "اہل عزا" اور "غربا" میں بڑے پیمانے پر شاہی طعام خانے سے عمدہ غذا تقسیم کی جاتی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ علم کی "ڈھیٹی" میں ہون یا اشرفی رکھ دیتا[3]

شمس اللہ قادری لکھتے ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ کا جانشین محمد قطب شاہ چہار شنبہ ۲۳ رجب ۱۰۰۱ھ مطابق ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوا تھا[4] میر مومن نے محمد قطب شاہ کی ولادت

---

[1] محمد قادر خان بیدری۔ مخطوطہ تاریخ فرخندہ۔ مخطوطہ نمبر ۳۱۸۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ص ۲۸

[2] جگدیش متل پٹنگ۔ باب سوم۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن۔ جلد دوم۔ ص ۲۱۸

[3] غلام حسین خان جوہر۔ مخطوطہ ماہ نامہ۔ مخطوطہ نمبر ۵۶۰ ادارہ ادبیات اردو۔ ص ۲۵۲

[4] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۱۵۸

Marfat.com

پر فارسی میں جو تہنیتی نظم پیش کی تھی[1] اس سے شہزادے کے سنہ ولادت پر بھی روشنی پڑتی ہے ؎

خواستم تاریخ آن فرخندہ گوہر عقل گفت
اول کام است فیروزی و اقبال و ظفر

شہزادے کی ولادت کی مسرت میں تمام مملکت میں روشنی کا خاص انتظام کیا گیا تھا اور عمائدین سلطنت کو ان کی حیثیت اور مرتبے کے اعتبار سے "خانہ عامرہ" سے خلعت خاص تقسیم کی گئی تھی ان کی تعداد مورخوں نے سینتیس (۳۷) ہزار بتائی ہے"۔ "تاریخ قطب شاہ" کے مورخ نے اس کی تفصیل قلمبند کی ہے[2] میر مومن نے اپنی علم نجوم میں مہارت کی بناء پر یہ پیشن گوئی کر دی کہ یہ نومولود قطب شاہی تخت کا وارث ہوگا۔ حیات "میر محمد مومن" میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ میر مومن نے شہزادے کے بلند اقبال اور خوش بخت ہونے کی پیشن گوئی اسی وقت کر دی تھی جب شہزادہ تولد ہوا تھا[3] محمد قطب شاہ کا اصل نام سلطان مرزا تھا اور وہ محمد قلی کے بھائی محمد امین کا فرزند تھا۔ اس کی والدہ خانم آغا بڑی دانشمند خاتون تھیں اور اتنی دانا و فریس تھیں کہ امور سلطنت میں نہ صرف اپنے بیٹے محمد قطب شاہ بلکہ پوتے عبداللہ قطب شاہ کو بھی صلاح و مشورہ دیتی تھیں۔ جب ۱۵۹۵-۹۶ء میں محمد امین کا انتقال ہو گیا تو شہزادہ سلطان مرزا (محمد قطب شاہ) کو اپنے چچا محمد قلی قطب شاہ کے سایہ عاطفیت میں پناہ لینی پڑی[4] محمد قلی کو چونکہ کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی وہ اپنے بھتیجے کو اپنا ولی عہد اور جانشین مقرر کرنا چاہتا تھا، اس لیے اس کی تعلیم و تربیت کی طرف محمد قلی نے خاص توجہ کی۔ علوم متداولہ کی تعلیم کے لیے قاضی صمنانی اور فوجی تربیت کے لیے شاہ یوسف مقرر ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں سلطان مرزا کی شادی اپنی چچازاد بہن اور محمد قلی قطب شاہ کی اکلوتی بیٹی

---

[1] نامعلوم مخطوطہ تاریخ سلطان قطب شاہی۔ مخطوطہ نمبر ۳۳۱۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ورق ۴، ۳۰، ۳۱۲

[2] ڈاکٹر زور۔ حیات میر محمد مومن۔ صـ۵۵

[3] غلام حسین۔ تاریخ گلزار آصفیہ۔ صـ۲۹

[4] نامعلوم مخطوطہ تاریخ محمد قطب شاہ۔ مخطوطہ نمبر ۳۳۱ اورنٹیل مینوسکرے لائبریری صـ۳۰۲

Marfat.com

حیات بخشی بیگم سے ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء میں ہوئی جب ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۱ء میں محمد قلی قطب شاہ کا انتقال ہوگیا تو اس کی وصیت کے مطابق سلطان مرزا شنبہ ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۲۰ھ کو سریر آرائے سلطنت ہوا۔ عبدالجبار ملکاپوری تحریر کرتے ہیں کہ تاج پوشی کے سلسلے کے تمام انتظامات میر مومن استرآبادی نے کیے تھے[1]۔ "تاریخ قطب شاہ" کے مورخ نے سلطان محمد قطب شاہ کے علم وفضل کی بڑی ستائش کی ہے اور لکھتا ہے۔ "از اقسام علوم عقلی ونقلی آگاہی تمام ایشان را حاصل است"[2] محمد قطب شاہ کا عہد امن وامان کا دور تھا اور ہمسایہ ممالک سے نبرد آزمائی کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ محمد قلی قطب شاہ نے اس کے لیے ایک ایسی وسیع وعریض سلطنت چھوڑی تھی جس میں ہر طرف خوشحالی فارغ البالی اور امن وامان کا دور دورہ تھا۔ عبدالمجید صدیقی "تاریخ گولکنڈہ" میں رقمطراز ہیں کہ "سچ تو یہ ہے کہ ایسا خوشگوار زمانہ اس کے پہلے گزرا تھا نہ اس کے بعد کیوں کہ اس عہد کے سوا ہر زمانے میں سلطنت کچھ نہ کچھ جنگ و جدل کے لپیٹ میں آئی"[3]

سلاطین صفویہ سے قطب شاہیوں کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ محمد قلی قطب شاہ نے دو خطوط علی الترتیب مہدی قلی سلطان اور قاضی مرتضیٰ کے ذریعے سے روانہ کیے تھے جن میں بقول سیّد محمد رضا نقوی خود کو بادشاہ ایران کا "ہوا خواہ" لکھا تھا[4]۔ محمد قطب شاہ کے عہد میں بھی ایران سے گولکنڈے کے دوستانہ تعلقات رہے۔ شہنشاہ نے حسین بیگ تبریزی کو گولکنڈہ روانہ کیا تھا۔ محمد قطب شاہ کے عہد میں ڈچ تاجروں نے مسولی پٹنم پر ۱۶۱۵ء میں اپنے قدم جمائے اور ۱۶۲۲ء میں انگریزوں نے اپنا اثر ورسوخ بڑھانا شروع کر دیا[5]

---

[1] عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن۔ حصہ دوم۔ ص ۲۳۷

[2] نامعلوم۔ مخطوطہ۔ تاریخ سلطان قطب شاہی۔ مخطوطہ نمبر ۲۳۱۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ورق ۴-۳۰۴-۱

[3] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۱۶۳

[4] سید محمد رضا نقوی "شاہ عباس اینڈ دی کانفلکٹ بٹوین۔ جہانگیر اینڈ دی دکن اسٹیٹس (مضمون) مشمولہ۔ میڈیویل انڈیا۔ جلد اوّل۔ ص ۲۸

[5] شاروکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز۔ (انگریزی)۔ ص ۱۶

Marfat.com

محمد قطب شاہ اپنی رعایا میں اپنے پاکیزہ اخلاق اور اوصاف حمیدہ کی وجہ سے انتہائی ہر دل عزیز تھا۔ وہ پابند صوم وصلواۃ تھا یہاں تک کہ اس نے نماز تہجد بھی کبھی قضا نہیں کی تھی۔ جب ۲۷-۱۰۲۶ھ میں مکہ مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کا سوال پیدا ہوا تو خدا کے گھر کا سنگ بنیاد رکھنے سلطنت میں ایک ایسی برگزیدہ شخصیت کی تلاش ہوئی جس نے کبھی کوئی نماز ترک نہ کی ہو۔ اس روحانی معیار پر اگر کوئی پورا اترا تھا تو وہ بادشاہ وقت سلطان محمد قطب شاہ تھا اس نے یہ کہہ کر مجمع کو حیرت میں ڈال دیا تھا کہ" بارہ سال کی عمر سے میری نماز تہجد بھی کبھی قضا نہیں ہوئی ہے"[1] "محبوب السلاطین" کے مورخ محمد حسین نے اس واقعے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[2]۔ مکہ مسجد کی تاسیس محمد قطب شاہ کا بڑا تعمیری کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

شہر حیدرآباد کا محل وقوع ایسا تھا کہ یہ مقام بیرونی حملہ آوروں کے لیے انتہائی سریع العبور تھا اور بڑی آسانی کے ساتھ باہر سے آنے والے اس سلطنت میں داخل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں مغل فوجیں بڑی آسانی سے شہر میں داخل ہوئی تھیں۔ دفاعی انتظام کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے محمد قطب شاہ نے حیدرآباد کے مشرق میں ایک شہر" سلطان نگر" کے نام سے آباد کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بانی شہر حیدرآباد محمد قلی قطب شاہ کی یہ دعا خدا نے مستجاب کی تھی ؎

میرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں تو دریا میں من یا سمیع

اور حیدرآباد کی آبادی تیزی کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ سلطان نگر شہر کا نقشہ تیار ہو چکا تھا اور فصیل و قلعے کی تیاری کا آغاز ہو چکا تھا اور مغربی سمت عیدگاہ بھی تعمیر ہوئی تھی[3]۔ لیکن سلطان محمد قطب شاہ کی بے وقت موت کی وجہ سے شہر

---

[1] عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن۔ حصہ دوم۔ ص ۲۵۷

[2] محمد حسین۔ محبوب السلاطین۔ ص ۳۵۷

[3] یہ عیدگاہ قدیم کے نام سے موسوم ہے۔

Marfat.com

سلطان نگر کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ وہ نیا شہر محمد قلی کے شہر حیدرآباد کی طرز پر بسانا چاہتا تھا اور درمیان میں چارمینار جیسی خوبصورت اور بلند عمارت بنانے کا منصوبہ بھی تھا لیکن یہ شہر آباد نہ ہو سکا[1] بقول شاروکو یہ شہر حیدرآباد کے "حریف شہر" کے طور پر بسایا جانے والا تھا لیکن تاریخ اس کو فراموش کر چکی ہے[2] یہ نامکمل قلعہ آج بھی موجود ہے مورخ "زوال دولت قطب شاہیہ" رقمطراز ہے کہ شاہان گولکنڈہ کو اس زمانے میں بیرونی طاقتوں سے خطرہ پیدا ہوتا جا رہا تھا اور وہ اس کا تدارک کرنا چاہتے تھے اس لیے سلطنت کی دفاع پر خاص توجہ کی گئی۔ شہزادہ خرم (شاہ جہاں) اور ملک عنبر کے محاربات سے اہل دکن پریشان تھے۔ دارالسلطنت کو کسی امکانی حملے سے محفوظ رکھنے کے لیے حیدرآباد سے چند میل دور جانب مشرق ایک اور قلعہ کی بنیاد رکھی گئی تھی اس کی تعمیر پر نو لاکھ ہون خرچ ہوئے اور اس کا نام قلعہ سلطان نگر تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن سلطان کی بے وقت رحلت نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچنے نہ دیا[3]

محمد قطب شاہ نے بعض محلات بھی تعمیر کروائے تھے "امان محل" ایک چار منزلہ خوبصورت عمارت تھی اور فن تعمیر کے اعتبار سے انتہائی وقیع اور دیدہ زیب تھی[4] اس کے ساتھ قطب شاہی روایت کے مطابق ایک پرفضاء باغ بھی لگایا گیا تھا جو "نبی باغ" سے موسوم کیا گیا تھا۔

چونتیس[34] سال کی عمر میں ۱۳ جمادی الاوّل ۱۰۳۵ھ کو محمد قطب شاہ نے اس دار فانی سے رحلت کی اور لنگر فیض اثر میں جہاں اس کا مقبرہ تیار تھا مدفون ہوا اس کی تاریخ وفات

"حشرش بہ علی ابن علی طالب باد"

سے بھی نکالی گئی تھی[5]

---

[1] عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ ص ۱۰۵

[2] شاروکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز۔ (انگریزی)۔ ص ۱۶

[3] سید علی محسن۔ زوال دولت قطب شاہیہ۔ باب دوم۔ ص ۹

[4] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ۱۶۵

[5] میر سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک۔ ص ۵۷

Marfat.com

"تاریخ فرخندہ" کا مورخ لکھتا ہے کہ سلطان نے "تپ محرق" سے انتقال کیا۔ سلطان کی والدہ مصری اطباء کی تجویز سے اطباء ہند کا علاج کروانا چاہتی تھی. اطبا مصری کا خیال تھا کہ چوں کہ بادشاہ نے دکن میں پرورش پائی ہے اس لیے اطباء ہندی کا علاج موافق مزاج ثابت ہوگا اطباء یونانی چاہتے تھے کہ بخار کی حرارت کا ٹھنڈی دواؤں سے علاج کیا جائے لیکن اطباء ہندی نے گرم دوائیں تجویز کیں۔ بالآخر چہار شنبہ ۱۳ ماہ ربیع الاوّل ۱۰۳۵ھ کو محمد قطب شاہ نے داعی اجل کو لبیک کہا[1] بعض مصنفین نے محمد قطب شاہ کی رحلت کا مہینہ جمادی الاول تحریر کیا ہے لیکن سنہ ایک ہی تحریر کیا گیا ہے۔ شمس اللہ قادری نے تاریخ "آثار قدیمہ کے سہ ماہی رسالے" تاریخ" میں سلطان محمد قطب شاہ پر جو مقالہ سپرد قلم کیا ہے اُس میں اس بادشاہ کا سنہ وفات تو ۱۰۳۵ھ ہی تحریر کیا ہے لیکن دن اور مہینہ مختلف بتایا ہے وہ لکھتے ہیں کہ سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ۱۳ جمادی الاول کو ہوا تھا[2]

اپنے چچا کے دیوان کا منظوم مقدمہ محمد قطب شاہ کے دکنی کلام کا واحد نمونہ ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کا فارسی کلام "کلام الملوک" میں شائع ہوکر ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں منظر عام پر آچکا ہے اس کا تخلص ظل اللہ تھا اور بقول علی بن طیفور بسطامی وہ فارسی کا ایک خوش گو شاعر تھا[3]۔ اس کے عہد کے مشہور شاعر وجہی اور غواصی تھے۔ محمد قطب شاہ کو گل و بلبل کی داستانوں یا موسیقی کی محفلوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے اس کے عہد میں فنون لطیفہ کی سرپرستی کے بجائے علم و ہنر کی قدردانی ہوئی۔ خود بادشاہ عالم تھا۔ محمد قطب شاہ کی علم دوستی اور اہل علم کی سرپرستی کا مفصل بیان غلام حسین نے تاریخ "گلزار آصفیہ" میں تحریر کیا ہے[4] محمد قطب شاہ علم و فضل کا دلدادہ تھا اور اکثر

---

[1] محمد قادر خان۔ مخطوط تاریخ فرخندہ۔ مخطوط نمبر ۳۱۸ ۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ص ۲۹

[2] شمس اللہ قادری ۔ سلطان محمد قطب شاہ (مقالہ) مشمولہ تاریخ (سہ ماہی رسالہ) جلد دوم۔ حصہ ہشتم۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۰ء ۔ ص ۱

[3] علی بن طیفور بسطامی (مرتبہ شریف النساء) حدائق السلاطین۔ ص ۱۰۱

[4] غلام حسین۔ گلزار آصفیہ۔ ص ۳۱، ۳۲۰

Marfat.com

مطالعہ میں مشغول رہتا تھا اس کا کتب خانہ مختلف علوم وفنون کی کتابوں سے معمور تھا۔ ڈاکٹر زور "داستان ادب حیدرآباد" میں لکھتے ہیں کہ وہ ہر کتاب کا مطالعہ کرتا اور پڑھنے کے بعد اس پر اپنے دستخط ثبت کرتا تھا۔ بعض وقت کتاب سے متعلق بعض یادداشتیں بھی سپرد قلم کرتا یا اس خاص تصنیف کے متعلق اپنی رائے قلمبند کرتا تھا چنانچہ تاحال ایسے بہت سے مخطوطے دستیاب ہو چکے ہیں" جو سلطان کے زیر مطالعہ رہ چکے تھے اور جن پر خود بادشاہ نے اپنے قلم سے کچھ نہ کچھ تحریر کر دیا ہے"[1] شمس اللہ قادری اپنے مقالے سلطان محمد قطب شاہ" میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان عبارتوں کو جمع کرتا تو یہ "نکات النفسیہ اور فوائد بدیعہ کا ایک بے نظیر ذخیرہ ہو جاتا"[2] میر مومن جیسے عالم متبحر کی صحبت نے محمد قطب شاہ کے علمی شغف کو جلا بخشی تھی۔ وہ دور دراز مقامات سے گرانقدر کتابیں منگواتا "کتاب کثیر المیامن" یہاں بطور خاص قابل ذکر ہے۔ "کثیر المیامن" عربی زبان کا ایک نایاب نسخہ ہے جو مکہ معظمہ میں موجود تھا اور جسے خود حضرت امام رضا علیہ السلام نے تحریر فرمایا تھا۔ اس نسخے کو خود میر مومن کے ایک ہم وطن مرزا محمد استرآبادی نے سلطان کے لیے نقل کر کے اصل سے اس کا مقابلہ کرنے کے بعد اس کی تصحیح کی تھی، اور ۱۰۲۹ھ میں مرزا اسمٰعیل نے اسے بارگاہِ خسروی میں پیش کرنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی افادیت کے پیش نظر سلطان محمد قطب شاہ نے محمد الشہیر بہ شاہ قاضی کو حکم دیا تھا کہ وہ اسے فارسی میں منتقل کریں کتاب کے آغاز میں مترجم نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شاعر بادشاہ کے بارے میں کہتا ہے ؎

خدیو دہر محمد کہ از خدا ست مویدہ
ظہیر ملت احمد امیر ملک ستان[3]

جیسا کہ کہا جا چکا سلطان محمد قطب شاہ فارسی اور دکنی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔

---

[1] ڈاکٹر زور۔ داستان ادب حیدرآباد۔ صفحہ ۲۱

[2] شمس اللہ قادری۔ سلطان محمد قطب شاہ (مقالہ) مشمولہ سالنامہ تاریخ۔ سہ ماہی۔ جلد دوم حصہ ہشتم۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۰ء صہ ۳

[3] ڈاکٹر زور۔ داستان ادب حیدرآباد۔ صہ ۲۴

Marfat.com

اس نے دکنی میں بقول ڈاکٹر زور پہلے ظلِ اللہ اور بعد کو سلطان تخلص اختیار کیا تھا۔
سلطان محمد قطب شاہ نے ظلّ اللہ اور ظلِ الٰہی تخلص بھی استعمال کیا ہے ؎

بجد ہو کے ظلِ الٰہی نو ل　　پڑے شعر تا پائیں کر حظ سکل

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں اس کی علم پروری کے چرچے سن کر دور دراز ممالک سے علماء وفضلاء حیدرآباد چلے آئے تھے۔ علامہ ابن خاتون، حسین آملی، شیخ جعفر علی، عشرتی یزدی، علی گل استرآبادی یزدی، مسیح کاشی اور محمد عبدالحکیم جیسے علماء اس وقت دارالسلطنت گولکنڈہ میں موجود تھے۔ مختصر یہ کہ عہد محمد قطب شاہ میں علم و فضل کی بڑی قدردانی کی گئی۔ شعراء سے بھی سنجیدہ اور علمی و مذہبی موضوعات پر کتابیں لکھوائی گئیں چنانچہ محمد قطب شاہ نے اصفہان کے ایک نووارد شاعر سید مراد کو حضرت امیر حمزہ کے واقعات پر مثنوی لکھنے کا حکم دیا تھا جو ۱۰۲۱ھ میں مکمل ہوئی۔ اردستان سے مرزا صالی، گرجستان سے قباد بیگ کوکبی اور کاشان سے مرزا شریف محمد قطب شاہ کی علم دوستی کا شہرہ سن کر حیدرآباد آئے تھے[1] اس بادشاہ کے علمی شغف کے بہت سے ثبوت موجود ہیں۔ اس نے میر مومن کو ایک ایسی کتاب لکھنے کا حکم دیا تھا جس میں اوزان و پیمانہ جات کو شرع شریف کی روشنی میں مرتب کیا جائے۔

محمد قطب شاہ کے کتب خانے میں مختلف علوم وفنون پر لکھے ہوئے مخطوطات ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ فنون کے اعتبار سے کتب خانوں کے موجودہ طریقہ کار کے مطابق انھیں علاحدہ علاحدہ رکھا جاتا تھا۔ ہر کتاب کے ورق اول پر بادشاہ کی مہر ثبت کی جاتی اس کے نیچے کتاب دار کی مہر یا اس کا نام لکھا ہوتا ۱۰۲۵ھ میں جب کلیات محمد قلی قطب شاہ داخل کتب خانہ شاہی ہوا تو اس وقت جملہ کتابیں ۹۰۴۰ تھیں اور جب ۱۰۳۴ھ میں ملا آذری کی "جواہر الاسرار" داخل کتب خانہ ہوئی تو اس وقت کتابوں کی جملہ تعداد ۲۶۹۲۰ تھی۔ سلطان کے کتب دار کا نام نجف شاہ تھا۔ اور محی الدین، شیخ حسین اور ملا عجب شیرازی کاتب تھے جو کتب خانہ شاہی کے لیے نادر اور مفید مخطوطات کی نقلیں کرنے پر مامور تھے۔ ملا عجب کا اصل نام محمد مومن تھا

---

[1] ڈاکٹر زور۔ داستان ادب حیدرآباد۔ ص ۲۵

Marfat.com

اس کی زود نویسی کا یہ عالم تھا کہ روزانہ ساٹھ ستر صفحے لکھا کرتا تھا[1] جب عالمگیر نے حیدرآباد فتح کیا تو مغلوں نے جہاں قطب شاہی سلاطین کی بیش بہا، اور نادر اشیاء لوٹ لیں اور شہر کو تباہ کر دیا وہیں کتب خانے بھی اس ہنگامے کی زد میں آ گئے اور بہت سی نادر و نایاب مخطوطات جل کر خاکستر ہو گئے یا ہمیشہ کے لیے گم ہو گئے۔

محمد قطب شاہ قاضی محمد سمنانی کا شاگرد تھا اور ان سے عربی اور فارسی سیکھنے کے علاوہ جملہ علوم منقول و معقول تحصیل کیے تھے۔ وہ ایک متقی و پرہیز گار سلطان اور انتہائی علم دوست حکمراں تھا۔ اس نے جلوس کے پانچویں سال ۱۰۲۵ھ میں اپنے خاندان کی ایک مفصل تاریخ لکھوائی تھی جو "تاریخ سلطان محمد قطب شاہی" کے نام سے مشہور ہے اس کے دیباچے سے پتہ چلتا ہے کہ کسی درباری مورخ نے قطب شاہی بادشاہوں کی ایسی مبسوط اور مفصل تاریخ اس سے پہلے قلم بند نہیں کی تھی[2] محمد قطب شاہ کے دربار میں کئی علماء اور مصنفین موجود رہتے تھے۔ محمد قطب شاہ کی فرمائش پر شیخ زین الدین علی نے محقق طوسی کی کتاب تجرید کی فارسی میں شرح لکھی تھی اور اس کا نام "تحفہ شاہی" رکھا تھا۔ محمد حاجی ہمدانی نے محمد قطب شاہ کے لیے امیر حمزہ کی داستان کو فارسی میں منتقل کیا تھا۔ محمد حاجی ہمدانی ایک فقیہ خواں تھا جو ۱۰۲۲ھ میں عراق سے حیدرآباد آیا تھا۔ حکیم تقی الدین محمد بن صدر الدین علی محمد قطب شاہ کا درباری طبیب تھا اس نے محمد قطب شاہ کے لیے ایک ایسی مفید کتاب تصنیف کی تھی جس میں دواؤں کی خصوصیات اور ان کی تحقیق کے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ہر دوا کے متعلق ضروری معلومات عام فہم انداز میں قلمبند کی گئی تھیں اس طبی تصنیف کا نام "میزان الطابع قطب شاہی" ہے[3]

عبداللہ قطب شاہ گولکنڈہ کا ساتواں حکمران تھا وہ محمد قطب شاہ اور ملکہ

---

[1]، [2] شمس اللہ قادری۔ سلطان محمد قطب شاہ (مقالہ) مشمولہ رسالہ تاریخ سہ ماہی جلد دوم حصہ ہشتم۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۰ء۔ صہ ۵۔

[3] شمس اللہ قادری۔ سلطان محمد قطب شاہ (مقالہ) مشمولہ رسالہ تاریخ سہ ماہی۔ جلد دوم۔ حصہ ہشتم۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۰ء۔ صہ ۹۰۸

Marfat.com

حیات بخشی بیگم کا فرزند اور محمد قلی قطب شاہ کا نواسا تھا[1] دکن کے مورخین اس کی تاریخ ولادت ۲۸ شوال ۱۰۲۳ھ مطابق ۱۶۱۴ء بتائی ہے۔ درباری مورخ نظام الدین احمد العاندی نے "حدیقۃ السلاطین" میں عبداللہ قطب شاہ کے مفصل حالات زندگی قلمبند کیے ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ حیات بخشی بیگم کا فرزند اکبر تھا اس کی حقیقی بہن خدیجہ سلطان تھی جو محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ) سے بیاہی گئی تھی اور عمر میں بھائی سے چھوٹی تھی۔ عبداللہ کا نام عبداللہ مرزا تھا "حدیقۃ السلاطین" میں لکھا ہے کہ اس کی ولادت پر قطب شاہی پایہ تخت میں بڑے پیمانے پر جشن منعقد کیے گئے تھے اور شعرائے دربار نے تاریخی قطعات اور قصیدے پیش کر کے گراں بہا انعامات حاصل کیے تھے۔ پیشوائے سلطنت میر مومن نے "کام بخش جانہا" سے مادہ تاریخ برآمد کیا تھا اور مورخ نظام الدین احمد العاعدی نے اپنا مشہور تاریخی قطعہ پیش کیا تھا جس کے آخری شعر سے شہزادے کے سنہ ولادت کا پتہ چلتا ہے ؎

در داد این ندا پے تاریخ عقل کل
باحُسن یوسف آمد و شانِ سکندری[2]
۱۰۲۳

قطب شاہیوں کی روایت کے مطابق شہزادے کا زائچہ تیار کر کے اسے عبداللہ مرزا کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ داستانوں کے ہیرو کی طرح عبداللہ قطب شاہ کے بارے میں محمد قطب شاہ کو یہ بتایا گیا تھا کہ وہ بارہ سال تک اپنے بیٹے کے چہرے پر نظر نہ ڈالے ورنہ اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ رمالوں اور نجومیوں کی ہدایت پر عمل کر کے قطب الدین نعمت اللہ کے محل میں شہزادے عبداللہ مرزا کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا لیکن دو سال بعد جب نعمت اللہ نے وفات پائی تو ان کے داماد مرزا شریف شہرستانی کے سپرد شہزادے کی پرورش اور تربیت کا کام کیا گیا لیکن عبداللہ نے ابھی عمر کی آٹھ منزلیں بھی طے نہیں کی تھیں کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا اور میر مومن نے منشی الملک خواجہ مظفر علی کو عبداللہ کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کر دیا۔ مثنوی "سحر البیان"

---

[1] سید محمد۔ مقدمہ کلیات سلطان محمد عبداللہ قطب شاہ۔ ص ۱

[2] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۴۶۹

Marfat.com

کے شہزادے بے نظیر کی طرح عبداللہ قطب شاہ کو ایک ایسے عالیشان محل میں رکھا گیا تھا کہ جس کی تعریف میں قطب شاہی مورخ نظام الدین احمد رطب اللسان ہے اور اس کو "قصر رفیع بہ تکلفات گوناگوں وتصرفات موزوں" بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ شہزادے کے اس محل کو نگارخانہ چین کی طرح آراستہ کیا گیا تھا[1] عبداللہ مرزا ولی عہد سلطنت تھا اس لیے اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی گئی تھی اور حسین شیرازی کو شہزادے کی دیکھ بھال کے لیے مامور کیا گیا تھا ابھی عبداللہ مرزا کا سن بارہ سال سے بھی کم تھا کہ حسین شیرازی نے بھی وفات پائی۔ شہزادے کی پرورش کی ذمہ داری کسی امیر کو راس نہ آئی بالآخر محمد قطب شاہ نے شہزادے کو اپنے محل میں بلا لیا اور عبداللہ مرزا کی آمد پر شاہی محلات میں تہنیتی تقریبیں منعقد ہوئیں درباریوں اور متوسلین کو گرانقدر انعام واکرام سے سرفراز کیا گیا۔ چند روز بعد سلطان محمد قطب شاہ اچانک علیل ہو گیا اور ایک ہفتے کے اندر چہارشنبہ ۱۳ جمادی الاول ۱۰۳۵ھ کو انتقال کیا دوسرے دن یعنی ۱۴ جمادی الاول ۱۰۳۵ھ کو عبداللہ مرزا کو تخت نشین کیا گیا درباری شاعر فقیر سراج نے تاریخ تخت نشینی "شہنشاہ دکن قطب زماں عبداللہ" سے اخذ کی تھی اس کے بعد دارالضرب میں عبداللہ قطب شاہ کے نام کا سکہ ڈھالا گیا چوں کہ بادشاہ کم عمر تھا اس لیے امور سلطنت کی ذمہ داری ایک مجلس تولیت کے سپرد کی گئی اس مجلس کے نگراں حیات بخشی بیگم تھیں۔ "منتخب اللباب" میں خافی خاں نے اس کی تفصیل قلمبند کی ہے[2] سید علی بلگرامی لکھتے ہیں کہ حیات بخشی بیگم کے علاوہ عبداللہ کی دادی خانم آغا بھی جو میر مقصود علی طباطبا کی دختر تھی، سیاسی معاملات میں مفید مشورے دیا کرتی تھیں[3]۔ باہمی مشاورت سے انتظام مملکت کو بہتر بنانے کے لیے بعض سیاسی تبدیلیاں بھی عمل میں لائی گئی تھیں۔ شاہ محمد کو پیشوا، قاسم بیگ کو کوتوال، خواجہ احمد ترک کو

---

[1] نظام الدین احمد الصاعدی۔ حدیقۃ السلاطین۔ ص ۹

[2] خافی خان منتخب اللباب۔ جلد سوم۔ ص ۲۹۲

[3] سید علی اصغر بلگرامی۔ ماثر دکن۔ ص ۳۳

Marfat.com

سرخیل اور نارائن کو مجوعہ دار کے جلیل القدر عہدہ پر فائز کیا گیا تھا[1] ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء میں عبداللہ کی رسم موتراشی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ انجام دی گئی۔ مسلسل کئی دن تک قطب شاہی دربار میں رقص و سرود کی محفلیں منعقد ہوتی رہیں اور بادشاہ کی سواری کا جلوس حیدرآباد سے حیات نگر روانہ ہوا۔

غلام حسین "گلزار آصفیہ" میں تحریر کرتے ہیں کہ ایک دن جب شہزادہ عبداللہ مرزا ہاتھی پر سوار ہو کر شکار کے لیے نکلا تو موسیٰ ندی کی طغیانی کو دیکھ کر ہاتھی بے قابو ہو گیا اور جنگل کی راہ لی۔ جب یہ خبر محل شاہی میں پہنچی تو شہزادہ عبداللہ مرزا کی والدہ حیات بخشی بیگم بہت پریشان ہو گئیں۔ انھوں نے جنگل کے درختوں پر "توشہ ہائے طعام و کوزہ ہائے آب" لٹکا دیے تاکہ شہزادے کا فیل مست اس کے نیچے سے گزرے تو وہ انھیں حاصل کر کے اپنی بھوک پیاس مٹا سکے۔ اسی اثنا میں محرم کا چاند نظر آیا اور حیات بخشی بیگم نے جو "مان صاحبہ" کہلاتی تھیں امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر شہزادہ صحیح و سالم محل واپس ہو جائے تو دولت خانہ شاہی میں داخل ہونے سے پہلے وہ چالیس من وزنی طلائی لنگر جیسا کہ ہاتھی کے پاؤں میں باندھا جاتا ہے، عبداللہ مرزا کے کمر میں باندھیں گی اور وہ قلعہ محمد نگر گولکنڈہ سے حسینی علم اندرون بلدہ تک فقراء و مساکین سادات اور ارباب احتیاج میں تقسیم کر دی جائے گی۔ حیات بخشی بیگم کی دعا مستجاب ہوئی اور مست ہاتھی شہزادے کے قابو میں آگیا۔ جب شہزادہ عبداللہ مرزا بخیر و عافیت محل میں داخل ہوا تو حیات بخشی بیگم نے جو منت مانی تھی اسے پورا کیا۔ بی بی کے علم کے جلوس کے ساتھ لنگر اسی کی یادگار تھی[2] اس واقعے کو شارو کو نے سہوا" محمد قلی قطب شاہ سے منسوب کر دیا ہے جو درست نہیں[3] دو قطب شاہی ہاتھی "صورت" اور "مورت" بہت مشہور تھے عبداللہ قطب شاہ ان دونوں میں سے کسی ایک پر سوار ہوا کرتا تھا[4]

---

[1] محمد حسین۔ محبوب السلاطین۔ ص ۳۵۸

[2] غلام حسین۔ تاریخ گلزار آصفیہ۔ ص ۴۲، ۴۳

[3] شارو کو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز۔ (انگریزی)۔ ص ۱۵

[4] ابوالفتح محمد امیر اللہ۔ صولت عثمانیہ۔ ص ۱۰۳

Marfat.com

بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر علامہ ابن خاتون کو جو گولکنڈے کے سفیر بن کر ایران روانہ ہوئے تھے واپس طلب کر لیا گیا تھا اور نائب پیشوائی کا کام ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ شاہ جہاں احمد نگر کے علاقوں کو فتح کرتا ہوا دریائے نربدا کے کنارے تک آپہنچا تھا اس نے قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں کے نام فرامین روانہ کیے تھے اور انھیں متنبہ کیا تھا کہ وہ مغل فوجوں کا راستہ روکنے اور مزاحمت کرنے کی کوشش نہ کریں۔ شیخ عبداللطیف شاہ جہاں کا فرمان لے کر حیدرآباد پہنچا۔ شاہ جہاں نے عبداللہ قطب شاہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ خطبے میں شاہ ایران کے نام کے بجائے شہنشاہ ہندوستان شاہ جہاں کے اسم گرامی کو شامل کرے اور گراں بہا ارمغاں پیش کیے جائیں قطب شاہی سلطنت کی بنیادیں کمزور پڑ گئی تھیں اس لیے اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ شاہ جہاں کا حکم تسلیم کر لیا جائے۔ بقول جے این چودھری ۲ر مارچ ۱۶۳۶ء میں "انقیاد نامہ" لکھ کر مغلوں کی شرطیں منظور کر لی گئیں[1] جس کے بعد عبداللہ قطب شاہ ایک خود مختار والی سلطنت کے بجائے مغل شہنشاہ کا حلیف بن گیا۔ اس انقیاد نامے کی رو سے جیسا کہ عبدالمجید لاہوری نے تحریر کیا ہے، خطبے میں خلفائے راشدین کے نام کے بعد شاہ جہاں کا نام لینا ضروری قرار پایا تھا اور سکّے پر بھی شاہ جہاں کا نام کندہ کروانے کا اقرار کیا گیا تھا[2]۔ "تاریخ گولکنڈہ" میں عبدالمجید صدیقی لکھتے ہیں کہ عبداللہ قطب شاہ میں سیاسی تدبر اور بیدار مغزی نہیں تھی اور اس نے سیاسی امور میں سنجیدگی سے کبھی غور بھی نہیں کیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر مغل سلطنت گولکنڈے میں قدم جمانے لگی[3]۔

عبداللطیف سے عبداللہ کی ملاقات کا مفصل حال سید علی محسن نے "زوال دولت قطب شاہیہ" میں تحریر کیا ہے مغل سفیر عبداللطیف ۸ر رمضان ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۶ء کو واردِ دکن ہوا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ نے کریم خان کو ایک فوجی دستے کے ساتھ سرحد

---

[1] جے این چودھری۔ دی مغل ایمپائر۔ باب ہفتم ص ۲۰۸

[2] عبدالمجید لاہوری۔ بادشاہ نامہ۔ جلد اول۔ حصہ دوم۔ ص ۲۱۰، ۲۱۱

[3] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۱۷۷

Marfat.com

کی سمت استقبال کے لیے روانہ کیا۔ ضیافتوں کا خاطرِ خواہ انتظام کیا گیا اس کے بعد سرخیل وقت میر معزالدین محمد مشرف الملک کو خوش آمدید کہنے کے لیے بھجوایا گیا شہر کو آراستہ کیا گیا اور حسین ساگر سے کوئی آدھے میل کے فاصلے پر ایک شاندار حویلی میں مغل سفیر کے قیام کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا۔ ۱۴ رمضان کو خود عبداللہ قطب شاہ کی سواری بڑے جاہ و تجمل کے ساتھ نکلی۔ اس نے حسین ساگر پہنچ کر مغل سفیر سے ملاقات کی اور تحائف کا تبادلہ عمل میں آیا اور تین گھنٹے تک عبداللہ قطب شاہ اور عبداللطیف میں گفتگو ہوتی رہی۔ جس انداز سے مغل سفیر کی آؤ بھگت کی گئی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قطب شاہی بادشاہ مغل حملوں سے کتنے خوف زدہ تھے بالآخر ۱۷ رمضان کو قطب شاہی محل میں سفیر کی طلبی ہوئی اور اس نے شاہ جہاں کا وہ مکتوب حوالے کیا جس نے گولکنڈے کی سیاسی دنیا میں ہلچل پیدا کر دی۔ اس مکتوب کے تین اہم موضوع تھے۔ مذہبی سیاسی اور معاشی[1]

سید محمد رضا نقوی اپنے مضمون "شاہ عباس اینڈ دی کانفلکٹ بٹیون جہاں گیر اینڈ دی دکن اسٹیٹس" میں رقمطراز ہیں کہ عقائد کی بنا پر شاہ عباس صفوی کی دکن حکمرانوں سے دوستی تھی شاہ عباس نے جہاں گیر کو بعض خط دکنی حکمرانوں کی سفارش میں لکھے تھے اور اپنے سیاسی تعلقات کا حوالہ دیتے ہوئے انھیں معاف کر دینے کی خواہش کی تھی اپنے ایک خط میں شاہ عباس نے لکھا تھا کہ مغل سلطنت کے حدود بہت وسیع ہیں اگر دکن کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں باجگذار ریاستوں کی حیثیت سے باقی رہیں تو مغل سلطنت کے لیے کوئی خطرہ نہیں[2] نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین نے جو خطوط شاہ عباس کو لکھے تھے وہ "مکاتیب سلاطین صفویہ" کے نام سے ایک "مجموعے" میں حیدرآباد کی اورنٹیل مینوسکرپٹ لائبریری میں محفوظ ہیں[3] ایسا

---

[1] سید علی محسن۔ زوال دولت قطب شاہیہ۔ ص ۴۲

[2] سید محمد رضا نقوی۔ شاہ عباس اینڈ دی کانفلکٹ بیٹوین جہاں گیر اینڈ دی دکن اسٹیٹس (مضمون) مشمولہ میڈیویل انڈیا۔ جلد اول۔ ص ۲۷۵

[3] مخطوط نمبر ۲۷۸۔ دفتر آرکائیوز تارناکہ۔ حیدرآباد۔

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے کہ مغل "حکمرانوں" نے شاہ عباس صفوی کے ان خطوط کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

کرناٹک کے گورنر میر جملہ نے گوا کے وائسرائے ڈام فلپی مسکارنس (Dom Filippe Mascorennas) سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے تھے اٹلی کا سیاح منوچی لکھتا ہے کہ میر جملہ نے قطب شاہی لشکر کے علاوہ خود اپنا ایک رسالہ تیار کر لیا تھا۔ اس نے اورنگ زیب سے مدد طلب کی جو ان دنوں مغل علاقے کا گورنر تھا۔ اورنگ زیب نے سوچا کہ حیدرآباد کی سیاست میں دخیل ہونے کا یہ بہترین موقعہ ہے۔ اس کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے ۱۶۵۶ء میں میر جملہ کو پانچ ہزار سواروں کا کماندار بنا دیا اور اپنے بیٹے محمد امین کو جو دو ہزار سواروں کا رسالہ دار تھا، میر جملہ کی کمک پر مامور کر دیا۔ ادھر عبداللہ قطب شاہ نے محمد امین کو قید کر دیا اور یہ خبر سن کر اورنگ زیب نے اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان کو ایک بھاری فوج کے ساتھ گولکنڈے کی سمت روانہ کر دیا یہ اطلاع ملتے ہی عبداللہ قطب شاہ قلعہ گولکنڈہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ محمد سلطان حسین ساگر تک پہنچ گیا اور اس کی فوجوں نے شہر میں داخل ہو کر لوٹ مار شروع کر دی۔ عبداللہ قطب شاہ نے محمد امین کو رہا کر دیا لیکن اورنگ زیب اس سے مطمئن نہیں ہوا اور خراج میں کثیر رقم اور قیمتی اشیا طلب کیں اور گولکنڈے کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کے کچھ عرصہ بعد ایک توپ چی نے دیکھا کہ اورنگ زیب اپنے ہاتھی پر سوار باہر نکلا ہے۔ اتفاقاً قلعہ کے اس مقام پر عبداللہ قطب شاہ معائنہ کے لیے موجود تھا۔ توپ چی نے عبداللہ قطب شاہ سے اجازت چاہی کہ وہ اورنگ زیب کو اپنی توپ کا نشانہ بنا دے۔ قطب شاہی بادشاہ نے منع کر دیا۔ توپ چی کے نشانے سے مغل جرنل ہلاک ہو گیا ورنہ بقول شاروکو[1] اس کی جگہ عالمگیر موت کے گھاٹ اتر جاتا اسی اثنا میں خاص حالات کے تحت شاہ جہاں نے اورنگ زیب کو دہلی بلا لیا اورنگ زیب سے معاہدے کے تحت محمد سلطان سے عبداللہ قطب شاہ نے اپنی بیٹی کا بیاہ کر کے اُسے اپنا جانشین مقرر کیا۔ میکس ویل اپٹن (Maxwel Eaten) نے اس

---

[1] شاروکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز (انگریزی) ص ۲۴

Marfat.com

کاروائی کو گولکنڈے کے ایجنٹ مقیم دہلی کی شاہ جہاں سے گفتگو کا نتیجہ قرار دیا ہے [1]
سرجادو ناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ شہزادہ اورنگ زیب فتح گولکنڈہ کی خواہش دل میں لیے
اپنے والد شاہ جہاں سے آزردہ ہو کر دکن سے دہلی روانہ ہوا تھا [2] میر جملہ دہلی پہنچا
اور شاہ جہان کو بقول شارو کو کوہِ نور ہیرا پیش کیا۔ منوچی کہتا ہے کہ یہ ہیرا بہت نایاب
اور انتہائی بیش بہا تھا اس کا وزن تین سو ساٹھ کیرٹ تھا [3]۔ کوہ نور دریائے کرشنا میں
کلور کے مقام پر ۱۶۵۶ء میں دستیاب ہوا تھا اس کا اصلی وزن سات سو پینسٹھ (۷۶۵)
انگلش کیرٹ تھا۔ میر جملہ نے اس کو ترشوا کر مغل شہنشاہ کی نذر کیا تو تراشنے سے اس کے
وزن میں کمی واقع ہو گئی۔ یہ ہیرا پہلے ہارٹنسیو بوگیو (Hartensio Borgio)
کو جو برازینی (Bronzeni) کہلاتا تھا تراشنے کے لیے دیا گیا تھا لیکن اس
نے کوہ نور کو تراشنے میں نقصان پہنچایا اور اُسے بہت ضائع کر دیا۔ جب ٹیونیر
(Tavener) نے کوہِ نور کو اورنگ زیب کے خزانے میں ۱۶۶۵ء میں
دیکھا تو اس کا وزن صرف دو سو ساٹھ کیرٹ سے کچھ زیادہ تھا۔ جب ۱۷۳۹ء میں
نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا تو کوہ نور بھی مال غنیمت کے ساتھ ایران لے گیا اور اسی
نے اس قیمتی ہیرے کو "کوہ نور" کے نام سے موسوم کیا۔ یہ ہیرا پہلے کابل کے حکمرانوں
کے خزانوں میں رہا اور پھر ۱۸۰۹ء تک یہ بادشاہ شجاع کے بازو بند کی زینت بنا
رہا اور اس کے بعد رنجیت سنگھ کے قبضے میں آگیا۔ ۱۸۱۹ء میں ملکہ وکٹوریہ نے اُسے
حاصل کر لیا [4] اور ۱۸۵۲ء میں کوہ نور کو دوبارہ تراشا گیا اس مرتبہ جس کاریگر نے کوہ نور
تراشا تھا اس کا نام ورسنگر (Voor Sanger) تھا۔

۱۶۵۶ء کے مغل حملے کے قطب شاہی سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں اور قطب شاہی
بادشاہ کو زر و جواہر کے علاوہ رقم کی صورت میں بھی مغل بادشاہ کو نذرانہ دینا پڑا تھا۔

---

[1] میکس ویل ایٹن۔ دی صوفیز آف بیجاپور۔
[2] جادو ناتھ سرکار۔ ہسٹری آف اورنگ زیب۔ جلد اول۔ ص ۲۱۷
[3] شارو کو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز (انگریزی) ص ۲۵
[4] " " ص ۲۵

Marfat.com

۱۶۶۷ء میں شیواجی آگرہ سے فرار ہو کر دکن پہنچا تو عبداللہ قطب شاہ سے فوجی دستہ اور معقول رقم طلب کی گولکنڈے کے بعض قلعے عادل شاہیوں کے قبضے میں چلے گئے تھے ان پر فوج کشی کرنے کے بہانے سے شیواجی نے انھیں فوجی طاقت کے ذریعہ سے اپنے قبضے میں لے لیا اور یہ قلعے عبداللہ قطب شاہ کو واپس نہیں کیے اور شیواجی نے انھیں اپنے تصرف میں رکھا۔ اس سال سیاح برنیر (Bernier) حیدرآباد میں موجود تھا اس نے ان حالات پر اپنے سفرنامے میں روشنی ڈالی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغلوں سے عبداللہ قطب شاہ کے تعلقات خاصے کشیدہ ہو چکے تھے۔ میر جملہ اور ان کے بیٹے محمد امین کی باغیانہ سرگرمیوں کا بھی اس میں بڑا دخل تھا۔ ۱۴ر صفر ۱۰۶۶ھ میں محمد سعید اور محمد امین کو جب مغلیہ ملازمت میں داخل کرنے کا فرمان جاری ہوا تو عبداللہ قطب شاہ نے جوان کی گستاخیوں اور غداریوں سے ناراض تھا مغل فرمان کو واجب التعمیل تصور نہیں کیا تھا[1] جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ برہی کے عالم میں شہزادہ محمد سلطان نے حیدرآباد کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی ان حالات کے پیش نظر محمد امین کو عبداللہ قطب شاہ نے رہا کر دیا لیکن مغل فوجیں حسین ساگر تک آپہنچی تھیں اور ادھر کھلے شہر میں مغل فوجوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ دو ہفتہ بعد اورنگ زیب بھی ایک لشکر جرار کے ساتھ حیدرآباد پہنچا اور قلعہ گولکنڈہ پر گولہ باری کا آغاز کر دیا۔ اپنی مدافعت کو کمزور پا کر عبداللہ قطب شاہ نے عالمگیر سے صلح کر لی اور اپنی شہزادی کی شادی محمد سلطان سے کر دی۔ گردھاری لال احقر لکھتے ہیں کہ ایک کروڑ مالیت کے زر و جواہر اور ہاتھی گھوڑے بطور تاوان پیش کیے گئے تھے دو لاکھ پچاس ہزار ہن اور رائے گیر کا قلعہ شہزادی کے جہیز میں دیا گیا تھا[2] مغلوں کا محاصرہ، فروری ۱۶۵۶ء کو شروع ہوا تھا اور مارچ ۱۶۵۶ء میں اٹھا لیا گیا۔ اس واقعے کی یادگار کے طور پر اپنے اختیارات کو سلب ہوتے دیکھ کر عبداللہ قطب شاہ نے بقول علی اصغر

---

[1] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۲۲۲

[2] " " " "

[3] گردھاری لال احقر۔ تاریخ ظفرہ۔ ص ۳۱

Marfat.com

بلگرامی ایک خاص مہر بنوالی تھی جس پر "ختم بالخیر والسعادۃ" کندہ تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے بہت سے فرامین پر یہ مہر ثبت ہے[1]

برنیر (Bernier) کہتا ہے کہ قطب شاہی دربار میں مغلوں کا سفیر بادشاہ کی طرح بااقتدار تھا اس کے برخلاف منوچی (Manucci) کہتا ہے کہ مغل دربار میں قطب شاہی سفیر کی یہ حیثیت نہیں تھی۔ ۱۶۵۶ء میں جو سفیر دلّی میں مقیم تھا وہ نہایت ذہین اور حاضر جواب انسان تھا۔ منوچی نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دن شاہ جہان نے مگس رانی کرنے والے غلام کی طرف اشارہ کرکے سفیر گولکنڈہ سے سوال کیا کیا تمھارے بادشاہ کا قد اس غلام کے برابر ہے؟ سفیر نے برجستہ جواب دیا "میرے بادشاہ کا قد عالم پناہ سے چار انگل زیادہ ہے"[2] شاہ جہاں اس وفاداری سے بہت متاثر ہوا اور سفیر کو ایک قیمتی گھوڑا اور سراپا عطا کیا۔ ۱۶۶۵ء میں ایک اور سیاح تھیونو (Thevenot) بصرے سے ہندوستان آیا تھا وہ اپریل ۱۶۶۵ء سے نومبر ۱۶۶۶ء تک گولکنڈہ میں رہا۔ اس نے ایک سیاحت نامہ میں گولکنڈے کے سماجی اور تہذیبی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔

"انقیاد نامہ" کی تکمیل کے بعد سے عبداللہ قطب شاہ اتنا دل گرفتہ ہوگیا تھا کہ اس نے قلعہ گولکنڈہ میں گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ مغل فوجوں سے جنگ کے دوران خزانے خالی ہو چکے تھے۔ حکومت کے انتظامات کی باگ ڈور سید احمد کے ہاتھ میں تھی عبداللہ قطب شاہ کی والدہ جو اس کی رہبر بھی تھیں اور امور مملکت کی دیکھ بھال بھی کرتی تھیں ۱۸ر شعبان ۱۶۶۹ء کو رحلت کرگئی تھیں۔ عبداللہ قطب شاہ نے ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے عملی طور پر حکومت کے انتظامات سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اور آخری زمانے میں مذہب کی طرف بہت زیادہ راغب ہوگیا تھا۔[3] عبداللہ قطب شاہ کی تاریخ وفات ۳ر محرم ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء بتائی گئی ہے۔ شارد کو نے عبداللہ کا یوم رحلت

---

[1] علی اصغر بلگرامی۔ ماثر دکن۔ ص ۱۵

[2] شارد کو گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز (انگریزی) ص ۲۶

[3] سید محمد۔ مقدمہ کلیات عبداللہ قطب شاہ۔ ص ۱۴

Marfat.com

یکم مئی اور سنہ وفات ۱۶۷۲ء تحریر کیا ہے[1]

عبداللہ قطب شاہ کا عہد سیاسی اعتبار سے قطب شاہی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کا زمانہ ہے۔ لیکن ثقافتی نقطۂ نظر سے عہدِ عبداللہ قطب شاہ علوم وفنون کے احیاء کا دور ہے اس نے اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کے عہد کی گنگا جمنی تہذیب کی روایات کو نئی زندگی عطا کی۔ وہ خود ایک شاعر تھا اور تہذیبی امور سے اسے غیر معمولی شغف تھا۔ اس لیے اس کے زمانۂ حکومت میں حیدرآباد ایک بار پھر شعر وسخن کے چرچوں سے گونجنے لگا اسی لیے غواصی نے عبداللہ قطب شاہ کے بارے میں کہا تھا کہ اس دور میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر محمد قلی قطب شاہ دوبارہ تخت گولکنڈہ پر رونق افروز ہوا ہے یعنی شعر وادب اور فنون لطیفہ کی ایسی ہی سرپرستی اور قدردانی ہو رہی ہے جیسی کہ محمد قلی کے دور میں ہوا کرتی تھی ؎

کہیں یوں بحق علی ولی
کہ پھر جگ میں آیا محمد قلی

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف محمد قلی اور عبداللہ قطب شاہ کے کلام اور طرز ادا میں یکسانیت نظر آتی ہے بلکہ ثقافتی تصورات، علم وفن سے فطری لگاؤ، موسیقی سے وابستگی، تفریحی مشاغل سے شغف اور فنون لطیفہ سے دلچسپی بھی دونوں میں قدر مشترک معلوم ہوتی ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے ملا غواصی جیسا بلند پایہ شاعر وابستہ تھا[2] ملا وجہی نے طویل عمر پائی تھی عہد محمد قطب شاہ میں وہ گوشہ نشین ہو گیا تھا اور بقول ڈاکٹر زور اس اثنا میں وہ اپنا فارسی دیوان مرتب کرتا رہا[3] لیکن جب عبداللہ قطب شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا اور پایۂ تخت میں دوبارہ ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کا احیاء ہوا تو ملا وجہی دوبارہ میدانِ ادب میں نمودار ہوا اور عبداللہ قطب شاہ کے حکم پر کہ "کچھ عشق کا بیان کرنا 'پنا ناؤں یہاں کرنا کچھ نشان دھرنا" "سب رس" جیسا بلند پایہ

---

[1] شاردکو۔ گولکنڈہ اینڈ قطب شاہیز (انگریزی)۔ ص ۲۹

[2] سید محمد۔ مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ۔ ص ۱۵

[3] ڈاکٹر زور۔ داستان ادب حیدرآباد۔ ص ۲۶

Marfat.com

ادبی کارنامہ پیش کیا تھا۔ وینکٹارامنیا لکھتے ہیں کہ عبداللہ موسیقی کا دلدادہ تھا وہ اپنے دربار میں مختلف مقامات کے ماہر موسیقاروں کو آنے کی دعوت دیتا اور خود ان محفلوں کی صدارت کرتا اور انعامات تقسیم کرتا تھا۔ ایک موقعے پر مشہور موسیقار وگی یا کاراکشی ترایا عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں حاضر ہوا تھا اور اس نے سلطان کے درباری موسیقار کو مقابلے میں شکست دے دی تھی۔ اس نے اپنے پدوں میں ابراہیم کی تعریف و توصیف کی تھی اور اس کے معاوضے میں اسے کثیر رقم بطور انعام عطا ہوئی تھی[1] حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کا عہد "شمشیر و سناں" کا نہیں "طاوس و رباب" کا دور تھا۔ قطب شاہی دربار میں ایسے نامور فنکار اور سخن گستر موجود تھے جن پر اردو زبان و ادب بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ ابراہیم قطب شاہ کے "بیرونی محل" میں ایک ایسا حصّہ تھا جہاں شعراء اور خطاط جمع رہتے تھے اور یہاں ادبی مباحث میں حصّہ لیتے اور شعر خوانی کرتے۔ محمود، فیروز اور ملا خیالی اس دربار کے شاعر بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے تک جاری رہا چنانچہ اس دور کے شعراء ایک خاص عمارت "آش خانہ" میں جمع ہوتے اور رات رات بھر محفل مشاعرہ گرم رہا کرتی تھی[2] محمد قطب شاہ مذہب کی طرف بہت زیادہ مائل تھا اس لیے راگ رنگ کی محفلوں، تفریحی مصروفیات، شاہی جشنوں اور اسی قسم کی دوسری تقریبات کی رونق باقی نہیں رہی تھی۔ عبداللہ کی فنون لطیفہ سے وابستگی کی وجہ سے پھر گولکنڈہ شعر و نغمہ کی جانفزا صداؤں سے گونج اٹھا تھا۔ وہ فنکار اور شعراء جو عہد محمد قطب شاہ میں ادبی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے، دوبارہ قطب شاہی دربار میں اکٹھا ہونے لگے اور جوہر شناس بادشاہ عبداللہ قطب شاہ کے گرد جمع ہو گئے غواصی بھی جو عہد محمد قطب شاہ میں خانہ نشین ہو گیا تھا۔ دربار میں باریاب ہوا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

ڈوبے تھے ہنرمند سو پھیر کر نکل آئے تج دور میں تیر کر
دیا جیو پھر راگ ہور رنگ کوں کیا دور سیناں پوکے زنگ کو

---

[1] وینکٹارامنیا۔ دی قطب شاہیز (مضمون) مشمولہ قطب شاہی سلطانس اینڈ آندھرا اسکرتی۔ صـ ۱۱

[2] سخاوت مرزا۔ عبداللہ قطب شاہ (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۴ء۔ صـ ۲۱

Marfat.com

بدیا ونت ملکے ملک کے تمام تیرے شہر میں آئے سب تمام

عبداللہ قطب شاہ، محمد قلی کی طرح روادار، وسیع النظر اور کشادہ قلب حکمران تھا۔ قطب شاہی سلاطین نے وسیع المشربی سے کام لے کر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی تھی جس میں مذہب و ملّت، فرقہ، گروہ اور رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ مسلمان بسنت کے میلے میں خوشی سے پھولے نہ سماتے تو ہندو انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ محرم کی عزاداری میں شریک ہوتے۔ محمد قلی نے محرم میں تعزیہ داری کے ایسے مراسم رائج کیے تھے جو ہر مذہب و ملّت کے افراد کے لیے کشش رکھتے تھے اور ان میں سب ہی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ نے ۱۰۰۳ھ میں ساٹھ ہزار روپے کے خرچ سے بادشاہی عاشورخانہ تعمیر کروایا تھا[1] یہ عاشورخانہ اپنے تعمیری حسن کے اعتبار سے منفرد حیثیت کا حامل ہے اس میں کارکاشی سے دیواروں کو بڑے سلیقے کے ساتھ مزین کیا گیا ہے۔ اور بیل بوٹوں کے خوبصورت ڈزائن بنائے گئے ہیں جن میں رنگوں کا امتزاج قابل دید ہے۔ سامنے کی جانب بائیں طرف دیوار پر سنہ تعمیر بھی درج کیا گیا ہے اور محمد قلی قطب شاہ کا نام بھی خوبصورت خط میں تحریر کیا گیا ہے۔ آج بھی محرم کے پہلے دہے میں بادشاہی عاشورخانے میں حسب روایت علم استادہ کیے جاتے ہیں۔ بادشاہی عاشورخانے میں استادہ کیے جانے والے چہاردہ معصومین کے چودہ علم کاریگری اور ہنرمندی کا اعلا ترین نمونہ تصور کیے جاتے ہیں۔ چودہ گز کے زربفتی تھان جن میں آئتیں اور ادعیہ عاشور نہایت عمدہ طریقے سے کپڑے کے تانے بانے سے تیار کی جاتی تھیں، ان علموں کی "ڈھٹی" کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔ نظام الدین احمد العاعدی نے "حدیقۃ السلاطین" میں اس کی تفصیل قلمبند کی ہے[2] عبداللہ قطب شاہ محرم کی تقاریب عزاداری سے بطور خاص دلچسپی لیتا تھا اور اس عاشورخانے میں جو محفل عزا منعقد کی جاتی تھی اس میں بہ نفس نفیس شرکت کرتا تھا۔ غلام حسین کی تاریخ "گلزار آصفیہ" سے بھی اس کی تفصیلات کا پتہ چلتا ہے[3] "ذکر ماتم و تعزیہ داشتن

---

[1] ڈاکٹر زور۔ مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ۔ ص ۱۴۵

[2] نظام الدین احمد العاعدی۔ حدیقۃ السلاطین۔ ص ۴۱

[3] غلام حسین۔ تاریخ گلزار آصفیہ۔ ص ۲۵

Marfat.com

شہادت حضرت سید الشہداء علیہ السلام در امام عاشورا" کے زیر عنوان "حدیقۃ السلاطین" میں عہد عبداللہ قطب شاہ کے مراسم عزاداری کی تفصیل بیان کی ہے جس کا لب لُباب یہ ہے کہ قطب شاہی سلطنت کے قدیم طریقے اور روایت کے مطابق جسے دور محمد قلی قطب شاہ میں بڑی تقویت پہنچی تھی محرم کا چاند دیکھتے ہی بادشاہ اپنے اورنگ زرنگار سے اتر جاتے اور لباس شاہی کو جامہ عزا سے تبدیل کر دیتے۔ محرم میں سلطنت قطب شاہیہ کے حدود میں کہیں کوس، نقارہ، طبل اور دمامہ نہیں بجائے جاتے تھے گانے والے اور نغمہ نواز اپنے آلات موسیقی کو غلافوں میں رکھ دیتے۔ شاہی باورچی خانے میں گوشت کی آمد موقوف ہو جاتی اور بادشاہ کے تتبع میں عوام بھی اس سے پرہیز کرتے تھے۔ تاڑی، سیندھی، بھنگ اور تمام نشہ آور اشیاء کی خرید و فروخت پر پابندی عائد کر دی جاتی، قصابوں، تنبولوں اور حجاموں کا کاروبار بند ہو جاتا تھا۔ بادشاہی عاشور خانے میں طاقچوں کی دس صفیں ایک دوسرے کے متوازی بنائی گئی تھیں اور ہر طرف تقریباً ایک ہزار طاقچے تیار کیے گئے تھے تاکہ ان میں چراغ جلائے جائیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ محرم کی پہلی تاریخ کی رات میں پہلی صف، دوسری تاریخ کو دوسری صف اور تیسری تاریخ کو تیسری صف اسی طرح دس محرم کی رات میں تمام صفیں چراغوں سے روشن ہوتیں اور عاشور خانہ بقعۂ نور بن جاتا اس کے علاوہ عاشور خانے میں بصورت اشجار ہر شاخ پر بڑے بڑے چراغ دان بھی بنائے جاتے تھے ان میں سے ہر ایک میں ایک سو بیس شمعوں اور چراغوں کی روشنی کا انتظام کیا جاتا تھا۔ ایوان اور حوض کے اطراف قد آدم سے بھی بلند کافوری شمعیں ہر رات روشن کی جاتی تھیں۔ بادشاہی عاشور خانے میں سیاہ پوش عزاداروں کا اژدھام رہتا خوش الحان ذاکر اور نغمہ پرداز دل سوز مرثیے اور غم اندوز اشعار پڑھتے اور سننے والوں پر بے اختیار رقت طاری ہو جاتی۔ عصر کے وقت عبداللہ قطب شاہ بنفشی رنگ کا لباس زیب تن کر کے آہستہ رفتار سواری میں یا سیاہ مخمل کے سنگھاسن پر بیٹھ کر سیاہ پوش مقربوں، مجلسیوں، امیروں اور وزراء کے ساتھ عاشور خانے میں داخل ہوتا۔ دو خوش آواز ذاکر شاہی سواری کے دونوں طرف خود بادشاہ کے لکھے ہوئے مرثیے پڑھتے ہوئے آتے تھے جب

Marfat.com

عبداللہ قطب شاہ بادشاہی عاشور خانے کے دروازے پر پہنچتا تو سنگھاسن سے اتر کر برہنہ پا آگے بڑھتا اور اپنے ہاتھ سے علموں پر پھول چڑھاتا اور شام ہونے پر کافوری شمعیں اور ایوانوں کے چراغ اپنے ہاتھ سے روشن کرتا تھا۔ اس وقت مرثیہ خوانی ہوتی رہتی اور ائمہ اطہار کی مدح میں اشعار پڑھے جاتے تھے۔ جب چراغ روشن ہو جاتے تو ایک فصیح و بلیغ خطیب کھڑا ہو کر شہدائے کربلا کا ذکر کرتا اور مجلس کے اختتام پر عبداللہ قطب شاہ دولت خانہ عالی کو واپس چلا جاتا اور وہاں کے عاشور خانے میں امراء وزراء کے ساتھ آدھی رات تک ماتم و مرثیہ خوانی میں مصروف رہتا یہاں شربت وغیرہ تقسیم کیے جاتے تھے[1] نظام الدین احمد العاعدی جو مشہور قطب شاہی مورخ ہے لکھتا ہے کہ عزاداری کے یہ رسومات قطب شاہیوں سے مخصوص تھے اور دوسرے ممالک میں ان کا بڑا چرچا تھا ؎

رسم عزائے قتل جگر گوشۂ رسول
از قطب شاہ شہرہ آفاق عالم است

قطب شاہی بادشاہوں نے محرم کی تقریبات کو خواص و عوام کی وابستگی کا ذریعہ بنا دیا جس کے پیچھے غالباً یہ مقصد بھی پوشیدہ تھا کہ عقائد کے اعتبار سے نہ سہی محض تفریح اور تماشہ بینی کے لیے ہی وہ لوگ جو واقعہ کربلا کی عظمت اور فلسفۂ شہادت کی اہمیت سمجھنے سے قاصر تھے، تقریبات عزاداری میں حصہ لیں اور رفتہ رفتہ اس سے ذہنی اور جذباتی وابستگی پیدا کر سکیں۔ اس لیے محرم کی تقریبات اور سرگرمیوں میں ان قطب شاہی بادشاہوں نے بعض ایسے ثقافتی عناصر داخل کیے جن کی اہمیت مذہبی سے زیادہ تمدنی اور ثقافتی تھی۔ مثلاً علم کے پٹکوں پر صناعی، جواہرات کی میناکاری، پنجوں پر مرصع سازی، امام باڑوں اور عاشور خانوں کا تعمیراتی حسن، ان کی سجاوٹ، روشنی کا انتظام اور مخصوص رسومات عزاداری، قطب شاہی شہریوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔

جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے عبداللہ قطب شاہ کے دور حکومت میں

---

[1] نظام الدین احمد العاعدی۔ حدیقۃ السلاطین۔ ص ۴۲ تا ۴۴

Marfat.com

ان تقریبات کا احیا ہوا جنھیں محمد قطب شاہ جیسے متقی و پرہیز گار حکمران کے عہد میں " مکروہات دینوی" تصور کر کے ترک کر دیا گیا تھا۔ لہو و لعب کھیل تماشوں اور میلے ٹھیلوں سے اس سنجیدہ و متین بادشاہ کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے مملکت کے غیر ضروری اخراجات میں کمی کرنے کے لیے بعض شاہی تقریبات موقوف کروا دی تھیں اور بقول نظام الدین احمد الحاعدی " خلائق " ان سے " مہجور و محروم" ہو گئی تھی۔ عہد عبداللہ قطب شاہ میں یہ دوبارہ منعقد ہونے لگیں اور " جملہ تکلفات ماکولات و اغذیہ" جن کا خرچ ہزار ہون تھا، دوبارہ رائج ہو گئے[1] عبداللہ قطب شاہ نے تعمیراتی کاموں سے بھی دلچسپی لی تاریخ " دولت عثمانیہ" کے مورخ نے عبداللہ کی تعمیر کردہ عمارتوں میں گوشہ محل اور فصیل قلعہ کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ گوشہ محل کی تعمیر پر تین لاکھ چالیس ہزار ہون صرف ہوئے تھے۔ یہ محل اتنا ہوا دار تھا کہ بقول ابوالفتح محمد امیر اللہ اگر لیموں زور سے اس کے چھت پر پھینکا جاتا تو وہ پہنچ نہیں سکتا تھا۔ قلعے کی فصیل اس پہاڑ کے اطراف تیار کی گئی تھی جو عبداللہ قطب شاہ کے عہد تک قلعہ گولکنڈہ کی فصیل کے باہر تھا یہ تعمیر جنگی نقطہ نظر سے اہم تھی اور اس پر برج بنا کر ان پر توپیں رکھی گئی تھیں اور اس کی تیاری میں پانچ لاکھ چورانوے ہزار روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ باغ لنگم پلی اور باغ سلطان شاہی اس دور میں بہت مشہور تھے۔ باغ لنگم پلی عبداللہ قطب شاہ نے تین لاکھ روپیہ کے مصارف سے تیار کروایا تھا اور اس میں " سکندر آباد کے تالاب " سے " نہر آئی" تھی[2] عبدالمجید صدیقی تحریر کرتے ہیں کہ باغ لنگم پلی میں تین منزلہ محل بڑے اہتمام سے تعمیر کروایا گیا تھا[3]

بیجاپور اور گولکنڈے کے تمدن میں پان اور پان کے بیڑے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اگر بادشاہ کسی کی قدر افزائی کرنا چاہتا تھا تو اس کو پان کا بیڑہ مرحمت کرتا جو خوش بختی اور عزت افزائی کی نشانی تصور کیا جاتا تھا۔ وجہی " سب رس" میں

---

[1] نظام الدین احمد الحاعدی۔ حدیقۃ السلاطین۔ ص ۵۰

[2] ابوالفتح محمد امیر اللہ۔ دولت عثمانیہ۔ ص ۱۰۰، ۱۰۱

[3] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۴۲۲

Marfat.com

عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش اور اپنی عزت افزائی کے بارے میں کہتا ہے :۔

"صبا کے وقت، بیٹھے تخت، یکایک غیب نے کچھ رمز پا کر دل میں اپنے
کچھ لیا کر وجہی نادر سخن کوں دریا دل گوہر سخن کوں، حضور بلائے پان دیئے
بہوت مان دیئے"[1]

نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ عبداللہ قطب شاہ کو شعر و سخن سے ایسی دلچسپی تھی کہ رات بھر محفل مشاعرہ میں موجود رہتا اور شعراء کے کلام سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ سرشنبہ عام تعطیل کا دن تھا۔ اس روز عبداللہ قطب شاہ ادبی محفلوں میں شرکت کرتا اور "قدماء کے کلام" پر نقد و تبصرہ کیا جاتا تھا[2]

محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں عید میلاد النبی بڑے اہتمام اور شان و شوکت کے ساتھ منائی جاتی تھی دادمحل کے میدان میں جشن منعقد کیا جاتا اور اس سلسلے میں مختلف محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور میں بھی عید میلاد النبی خاص تکلفات اور اہتمام کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ دکن کی تاریخوں میں اس کی تفصیلات درج ہیں[3]۔ گذشتہ صفحات میں اس کا ذکر آچکا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں یہ عید کس احترام و عقیدت کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ محمد قطب شاہ نے بھی عید میلاد النبی سے خاص دلچسپی لی وہ ماہ ربیع الاول میں دس ہزار ہون علماء اور سادات میں تقسیم کرتا تھا۔ اس کے جانشین عبداللہ قطب شاہ کے زمانۂ حکومت میں عید میلاد النبی سلطنت قطب شاہیہ کی سب سے شاندار اور اہم عید تصور کی جاتی تھی۔ ۱۷ ربیع الاول کو کو جو شیعوں کی روایت کے مطابق آنحضرت صلعم کی ولادت باسعادت کا دن ہے عام شاہی دسترخوان پر ساری رعایا شکم سیر ہو کر عمدہ اور لذیذ کھانا تناول کرتی، روشنی اور آتشبازی کا اہتمام کیا جاتا، دوکانیں آراستہ کی جاتیں اور تمام پایۂ تخت میں خوشیاں

---

[1] اسداللہ وجہی ۔ سب رس ۔ (مرتبہ عبدالحق) ص ۸

[2] نصیرالدین ہاشمی ۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی شاعری (مضمون) مشمولہ دکھنی ۔ (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین ۔ ص ۱۰۶

[3] ابوالفتح محمد امیراللہ ۔ صولت عثمانیہ ۔ ۱۰۹ ، ۱۱۰

Marfat.com

منائی جاتی تھیں عبداللہ قطب شاہ ہاتھی پر سوار ہو کر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ روشنی دیکھنے شہر کی گشت کرتا تھا[1] نصیر الدین ہاشمی اس جشن کی تفصیل بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اس موقع پر محلات کو پر تکلف انداز میں سجایا جاتا تھا قیمتی مسندیں بچھائی جاتیں۔ تمام خیموں میں جو اس جشن کے لیے لگائے جاتے تھے۔ مشک عنبر اور صندل طلائی و نقروی کشتیوں میں بھر کر ہر روز تقسیم کیے جاتے اور خاصہ کے ساتھ ایک ایک طبق پان بھی تقسیم کیے جاتے تھے۔ جب عید کا دن آتا تو دماموں نقاروں نفیریوں اور قرنا کی آواز سے میدان اور محلات گونجنے لگتے۔ ایوان کے سامنے میدان میں ان تقریبات سے محظوظ ہونے والوں کے لیے شامیانے اور اطلسی خیمے لگائے جاتے ماہرین فن اپنے فن کے کمالات دکھاتے اور رقص کرنے والے بھی بادشاہ کی نوازشات سے مالا مال ہو جاتے تھے۔ صاحبان کمال جن میں بازی گر، رسیماں باز، لعبت باز، حقہ باز، مقلد، اہل ہزل، مسخرے اور شب باز وغیرہ شامل ہوتے اپنے اپنے ہنر اور کرتب دکھا کر بادشاہ اور عوام کو محظوظ کرتے تھے۔ جب بادشاہ کی سواری روانہ ہوتی تو سواری خاص کا ہاتھی جو طلائی زنجیروں، موتیوں کی جھول مرصع کلغی اور دوسرے زیورات سے آراستہ کیا جاتا آہستہ خرامی کے ساتھ روانہ ہوتا۔ ارکان دولت اور شاہی ملازمین سواری کے ہمراہ پیادہ چلتے۔ موسیقار گاتے گاتے اور رقاصائیں ناچتی ہوئی ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ عید میلاد النبی کے طمطراق کو دیکھنے اور اس کی گوناگوں پر لطف تقریبات میں شرکت کے لیے دوسری سلطنتوں کے لوگ جوق در جوق حیدرآباد چلے آتے تھے۔ عبداللہ قطب شاہ بھی ہمسایہ ریاستوں کی خاص شخصیتوں کو اس جشن میں مدعو کرتا میدان دلکشا میں جہاں کوتوال کی چاوڑی تھی، ہاتھی تھوڑی دیر کے لیے روک دیا جاتا اور عبداللہ قطب شاہ پر سے زر و جواہر کی کشتیاں نثار کی جاتی تھیں اور نذریں پیش ہوتیں تجار اپنے گرانقدر تحائف پیش کر کے انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے یہ جشن ماہ ربیع الاوّل میں بارہ دن تک جاری رہتا اور اس موقع پر شاہی خزانے سے تیس ہزار ہون

---

[1] ابوالفتح محمد امیر اللہ - سلطنت عثمانیہ - ص ۱۰۹، ۱۱۰

Marfat.com

صرف کیے جاتے تھے [1]

عہد عبداللہ قطب شاہ میں جو گوناگوں تفریحات رائج تھیں ان کا ذکر "حدیقت السلاطین" میں موجود ہے۔ پیراکی کے میلے، باغات کی سیر، دریاؤں اور حوضوں میں چراغاں، آتشبازی اور سیر و تفریح کی تفصیلات نظام الدین احمد العاعدی نے بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی ہیں۔

عبداللہ قطب شاہ نے فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو ادب اور شاعری کی بھی سرپرستی کی۔ اس دور کے شعراء میں وجہی، غواصی ابن نشاطی اور احمد جنیدی قابل ذکر ہیں۔ احمد جنیدی کی مثنوی "ماہ پیکر"، کو راقمۃ الحروف نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ ملک خوشنود کی ابتدائی زندگی قطب شاہی دربار میں بسر ہوئی تھی۔ جب عبداللہ قطب شاہ کی بہن خدیجہ سلطان شہر بانو بیگم بیجاپور کے سلطان سے بیاہی گئیں تو جہیز کے غلاموں میں بقول ڈاکٹر زور ملک خوشنود بھی شامل تھا [2] اس نے بیجاپور میں اپنی فراست اور تدبر کی بدولت شہرت اور عزت حاصل کی اور یہیں اس کے شاعرانہ جوہر بروئے کار آئے۔

بہمنی سلاطین کی طرح شاہان قطب شاہیہ بھی اپنے دربار کی سجاوٹ و آرائش سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ قطب شاہی دربار کا تزک و احتشام مشہور تھا۔ بانی سلطنت کے زمانے میں دربار کی تزئین کے متعلق تاریخیں خاموش ہیں۔ ابراہیم قطب شاہ کے دور حکومت میں "دولت خانہ عالی" میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ دربار منعقد کیا جانے لگا اور اس کی آرائش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اس کو چار چاند لگ گئے اور اس کی رونق اور شان و شوکت میں اضافہ ہوا۔ دولت خانہ عالی کا بڑا ایوان جہاں دربار ہوا کرتا تھا کوئی ہزار گز طویل تھا اور اس کے اطراف عالی شان ایوان اور خوبصورت محرابیں تھیں جن

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی شاعری (مضمون) مشمولہ دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین۔ ص ۱۱۲

[2] ڈاکٹر زور۔ داستان ادب حیدرآباد۔ ص ۳۱

Marfat.com

سے قطب شاہیوں کے کروفر کا اظہار ہوتا تھا۔[1] اس کا مشرقی جانب کا دروازہ ہندو طرز تعمیر کا آئینہ دار تھا اور سلاطین قطب شاہیہ کے مشترکہ تہذیبی نظریے کا مظہر۔ امراء عظام اور عمائدین سلطنت کو حکم تھا کہ وہ ہر روز صبح اپنی فوج اور ہاتھیوں کے ساتھ سلام کے لیے دربار میں حاضر رہیں یہ امراء فوج اور ہاتھی، گھوڑوں کو باہر چھوڑ کر پیادہ حاضر ہوتے اور تسلیم بجا لاتے تھے۔ غلام یزدانی ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد لکھتے ہیں کہ دولت خانہ عالی کے سامنے دو رویہ صفیں باندھ کر فوج کے ہزار پیادے اور فیل خانۂ شاہی کے ہاتھی استادہ ہوتے۔ دروازے پر کئی سو حبشی سپاہی پہرہ دیتے تھے۔ بارگاہ شاہی کے جنوب میں شاہی "دفتر خانہ" اور مغرب میں جامدار خانہ اور شاہی کارخانوں کی عمارتیں تھیں۔ پایہ تخت کے شاہی قصر داد محل اور محمدی محل میں بھی دربار منعقد ہوتے تھے۔ "پھول بن" میں ابن نشاطی نے شہر کنجن آباد کا جو مرقع کھینچا ہے وہ قطب شاہی دارالخلافے کا وہی نقشہ معلوم ہوتا ہے جو سیاحوں نے اپنے سفر ناموں میں پیش کیا ہے ؎

حصار اس کا تھا دریا کے کنارے
دسے خندق ہو دریا تس بندھارے
یتے اونچے تھے اس گھر کے دیواراں
الگ ناسک رہے تھے واں اجالاں
گگن کے تل کئیں ایسا شہر نادر
نہیں دیکھے تھے انکھیاں کے مسافر
عجب تاثیر تھا واں کی ہوا کا
سدا ہنگام تھا نشو ونما کا
سدا خوش حال تھے سب لوگ واں کے
تھے خاطر جمع واں کے سالکاں کے

ابن نشاطی کے اس بیان کا ٹیورنر کے سیاحت نامہ کے دسویں باب "سلطنت گولکنڈہ کا

---

[1] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ صـ ۳۳۹

Marfat.com

کا بیان" سے مقابلہ کریں تو دونوں کے بیانات میں بڑی یکسانیت نظر آتی ہے۔

سلاطین قطب شاہیہ کے دور میں قانون سازی کا غالباً کوئی علاحدہ شعبہ نہیں تھا۔ ملک کے رسم ورواج اور شاہی احکام قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ قطب شاہی بادشاہوں نے عدلیہ کی طرف خاص توجہ کی تھی۔ پنڈت اور قاضی مقدمات فیصل کرنے کا کام انجام دیتے تھے۔ پیچیدہ اور اہم مقدمات بادشاہ سے رجوع کیے جاتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کے زمانے میں معدلت گستری کے لیے داد محل کی عمارت وقف تھی۔ ٹیورنر (Tavernier) کے سیاحت نامہ میں اس محل اور یہاں کے مقدمات کے فیصل کرنے کے طریقے کی بڑی ستائش کی گئی ہے اور اس سیاح نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[1] سلطان محمد قطب شاہ نے ایک قصر "امان محل" بھی اس مقصد کے لیے بطور خاص تعمیر کروایا تھا۔ قطب شاہی حکمرانوں میں عبداللہ قطب شاہ کو بھی نظام عدلیہ کے امور سے غیر معمولی دلچسپی تھی چنانچہ جب فرانسیسی سیاح ٹیورنر گولکنڈہ آیا تو اپنی آنکھوں سے عدالت میں مقدمات کا فیصلہ کرنے کی کاروائی دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا تھا[2]۔ دوسرا سیاح تھیونو (Thevenot) اپنے سیاحت نامہ میں رقمطراز ہے کہ عبداللہ قطب شاہ بڑا انصاف پسند بادشاہ ہے اور عدل گستری کے انتظامات سے شخصی دلچسپی لیتا ہے[3]

حکومت کے نظم ونسق میں بڑی باضابطگی تھی۔ سلطنت گولکنڈہ مختلف صوبوں میں منقسم تھی جن کو بہمنیوں کی تقلید میں "طرف" کہا جاتا تھا اور اس کے انتظام کی ذمہ داری سنبھالنے والا عہدے دار "طرفدار" کہلاتا تھا۔ آخری دور میں گولکنڈہ چھ مختلف صوبوں میں تقسیم ہوگیا تھا کرناٹک کا صوبہ وسعت میں سب سے بڑا تھا اور اس کے ساحل پر چوں کہ تجارت کا کاروبار ہوتا تھا اس لیے یہ مملکت کے لیے ایک اہم ذریعہ آمدنی تصور کیا جاتا تھا[4]۔ صوبے کی جمع بندی کے لیے جو افسر مقرر کیے

---

[1] ٹیورنر۔ سیاحت نامہ۔ جلد اول۔ صـ۱۲۵

[2] " " " صـ۱۲۵، ۱۲۶

[3] تھیونو۔ " جلد سوم۔ صـ۹۷

[4] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ صـ۳۴۸

Marfat.com

جاتا تھا اسے "دیوان" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا جو ہر سال مقررہ مدت کے بعد اپنے صوبے سے آمدنی جمع کر کے شاہی خزانے میں داخل کرتا تھا۔ بادشاہ بہ نفس نفیس ان اضلاع کا اچانک معائنہ کیا کرتے چنانچہ ابوالحسن تانا شاہ نے (جسے مغل مورخوں نے عیاش اور نااہل بادشاہ بتانے کی کوشش کی ہے) اپنے وزیر ماونا کے ساتھ چار مرتبہ صوبہ کرناٹک کا دورہ کیا تھا۔ ابوالحسن تانا شاہ کے دور حکومت میں قطب شاہی مملکت کے طریقہ مالگذاری کی بھی اصلاح ہوئی تھی عبداللہ قطب شاہ کے عہد تک "اجارہ دار" مالگذاری وصول کرتے تھے اور بعض بے ایمان اور حریص اجارہ دار عوام کا استحصال کر کے ان سے زائد رقم وصول کرتے تھے۔ ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں تمام ریاست کو چھ "صوبوں" "سینتیس" "سرکار" اور پانچ سو سترہ (۵۱۷) "سمتوں" میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ گردھاری لال احقر لکھتے ہیں کہ یہ چھ صوبے سرکار محمد نگر، سرکار ایل گندل، سرکار پانگل، سرکار کویل کنڈہ، سرکار نظام پٹن اور کرناٹک یا ارکاٹ تھے[1]

قطب شاہیوں کی فوجی تنظیم بھی قابل تعریف تھی فوج کو ہر صوبے میں اس طرح پھیلا دیا جاتا کہ کسی بھی ناگہانی صورت حال کا بروقت مقابلہ کیا جا سکتا تھا میر جملہ فوج کی تنظیم کرتا رہتا اور بادشاہ بھی وقتاً فوقتاً فوج کا معائنہ کیا کرتا۔ ہفتے میں تین مرتبہ تمام فوج گولکنڈے میں حاضر ہوتی اور مشرقی دروازے سے داخل ہو کر بادشاہ کی خدمت میں سلام کی عزت حاصل کرتی۔ بادشاہ ایک آراستہ شہ نشین پر بیٹھ کر فوج کا معائنہ کرتا۔ سلطان قلی، جمشید، ابراہیم اور محمد قلی قطب شاہ نے اکثر موقعوں پر خود فوج کی قیادت کی تھی[2] تھیونو لکھتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی فوج کی تعداد پانچ لاکھ تھی[3] فوج کا ایک حصہ جاگیرداروں اور امراء کی جاگیروں میں رہا کرتا تھا۔ اور یہ فوج ان ہی کے تحت کام کرتی تھی۔ یہ فوج حسب ضرورت

---

[1] گردھاری لال احقر۔ تاریخ ظفرہ۔ ص ۱۷۴

[2] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۲۵۲

[3] تھیونو۔ سیاحت نامہ۔ جلد سوم۔ ص ۱۰۲ تا ۱۰۳

Marfat.com

بادشاہ کے حکم پر مقررہ مقام کی طرف کوچ کرتی اور یلغار یا مدافعت کی فوجی کارروائی میں حصّہ لیتی تھی۔ "ماہ نامہ" کا مورخ لکھتا ہے کہ ابوالحسن تانا شاہ نے چالیس ہزار کی تعداد میں ایک خاص فوجی دستہ ترتیب دیا تھا جس کی تنخواہ وہ شخصی طور پر ادا کرتا تھا۔ ابوالحسن کے وزیر مادنا نے دس ہزار سواروں کا ایک علاحدہ رسالہ تیار کر رکھا تھا۔[1] "تاریخ ظفرہ" میں ابوالحسن تانا شاہ کی فوج کے سواروں کی تعداد پچیّس ہزار اور پیدل سپاہیوں کی چھیانوے (۹۶) ہزار بتائی گئی ہے۔ مورخ رقمطراز ہے کہ اس کے علاوہ تنخواہ یاب یورپی سپاہی بھی فوج میں موجود تھے[2] نظام الدین احمد الصاعدی رقمطراز ہے کہ فوج میں مسلمان اور تلنگے سپاہی دونوں ملازم تھے اور تلنگے سپاہیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ تھیونو کا بیان ہے کہ سپاہیوں کی تنخواہ دس ہون ماہانہ تھی[3] سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں تلنگے سپاہیوں کی تنخواہ زیادہ تھی کیوں کہ اس وقت قطب شاہی فوج میں مغل اور ایرانی کم تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ حکومت میں مغل اور ایرانی بڑی تعداد میں شامل ہوئے اور ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں یورپی سپاہی بھی لشکر میں ملازم رکھے گئے تھے اور ان کی فوجی خدمات سے استفادہ کیا گیا تھا ان کو "رکابہ فرنگ" کہتے تھے۔ تمام سلطنت میں چھیاسٹھ[66] قلعے موجود تھے جو بلند پہاڑوں پر تعمیر کیے گئے تھے۔ ہر قلعہ میں اس کی حفاظت کی خاطر بارہ سو سپاہی مامور کیے جاتے تھے[4] "حدیقۃ السلاطین" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ قطب شاہی سلطنت میں سپاہیوں کی فوجی تربیت کا باقاعدہ انتظام تھا[5]

ٹیورنر اپنے سیاحت نامہ میں لکھتا ہے کہ جب کوئی مسافر شہر کے دروازے پر آتا تو پہلے اس کی تلاشی لی جاتی تھی کہ اس کے پاس نمک اور تمباکو تو نہیں کیوں کہ یہ

---

[1] غلام حسین خان جوہر۔ مخطوطہ ماہ نامہ۔ مخطوطہ نمبر ۵۶۰۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ص ۳۱۷

[2] گردھاری لال احقر۔ تاریخ ظفرہ۔ ص ۱۷۵

[3] تھیونو۔ سیاحت نامہ۔ جلد سوم۔ ص ۱۰۰

[4] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۳۵۴

[5] نظام الدین احمد الصاعدی۔ حدیقۃ السلاطین۔ ص ۸۵

Marfat.com

یزیں شاہی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھیں۔ مسافر کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے ایک دو دن دروازے پر ٹھہرنا پڑتا تھا۔ دروازے کا دربان پہلے اپنے افسر کو اطلاع دیتا اور اس کے بعد افسر، داروغہ کے پاس آدمی بھیجتا اور ہر طرح مطمئن ہونے کے بعد مسافر کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی تھی[1]

گولکنڈے کی معاشرت بڑی پاکیزہ اور اعلا تھی۔ فلک بوس محلات پرفضا باغات شاہراہیں علمی و تہذیبی محفلیں اور عمدہ طریقہ بود و باش، قطب شاہی معاشرے کی پہچان بن گئے تھے شاہی قصر میں قالینوں کا فرش چینی و بلوری ظروف، سامان آرائش اور باغوں کی رونق قابل دید ہوتی۔ مورخ دکن عبدالمجید صدیقی نے "گولکنڈے کے تعلقات" کے عنوان سے لکھا ہے کہ ایک مغل شہزادے نے جو شاہ جہانی محلات کا رہنے والا تھا لکھا تھا کہ ان قطب شاہی محلات میں رہنا تو کجا ان میں چراغ جلانا بھی مشکل ہے۔[2] "ماثر عالم گیری" میں مغل مورخ نے شہر حیدر آباد کی خوبصورت اور بلند عمارتوں کو دیکھ کر کہا تھا "آبادی وسیع تر از احاطہ خیال و عمارات رفیع تر از پایۂ اندیشہ"[3] جب حیدر آباد کو مغلوں نے لوٹ لیا تو ہزار ہا قسم کے نایاب ظروف، ملبوسات، قالین اور نایاب اشیاء ایسی ہاتھ لگیں جنھیں دیکھ کر مغل حیران رہ گئے۔ خافی خان نے "منتخب اللباب" میں اس کی تفصیل درج کی ہے[4] شاروکو نے گولکنڈے کے تمول اور یہاں کے پر آسائش زندگی کے بارے میں لکھا ہے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الف لیلیٰ کا کوئی شہر ہے یہاں کے بادشاہ ایسے ماحول میں زندگی گزارتے تھے کہ ہارون رشید بھی ایسے ماحول میں خود کو مطمئن پاتا اگر ہم عربی داستانوں کو صحیح تصور کریں تو یہ وہ جواہرات کی وادی تھی جہاں تاجر گوشت کے ٹکڑے پھینکتے تھے اور چیل اور عقاب ان ٹکڑوں کے ساتھ ہیرے جواہرات بھی

---

[1] ٹیورنر سیاحت نامہ۔ جلد اول باب دہم۔ ص ۲۳

[2] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۲۵۵

[3] محمد ساقی مستعد خاں۔ ماثر عالم گیری۔ ص ۳۰۲

[4] خافی خان۔ منتخب اللباب۔ جلد دوم۔ ص ۳۰۶

[5] سندباد جہازی کی داستان۔

Marfat.com

باہر لاتے تھے۔[1] مارکو پولو نے ۱۲۹۲ء میں رانی اردو رھا امان کے عہد میں ورنگل کی سیاحت کی تھی اس نے اس مقام پر ہیرے جواہرات کی کثرت کی وجہ سے سندباد کی داستان کے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ کہتا ہے یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا کا خزانہ جمع ہو گیا ہے۔ نیکولو کانٹی (Nicolo Conti) جو ایک اٹلی کا سیاح تھا اور جس نے ۱۴۲۰ء یا ۱۴۲۱ء میں وجیانگر کی سیاحت کی تھی کہتا ہے کہ دریائے کرشنا کے ساحلوں پر ہیروں کی کانیں ہیں جو گولکنڈے کی کانیں" کہلاتی ہیں یہاں سندباد کی ہیروں کی وادی کی طرح بے شمار ہیرے جواہرات پائے جاتے ہیں۔[2]

گولکنڈہ ہیروں کے لیے مشہور تھا اور اُسے "ہیروں کا ملک" کہا جاتا تھا۔ یہاں بقول عبدالمجید صدیقی ہیرے کی "بے شمار کانیں" تھیں۔[3] ڈاکٹر زور اپنے نیم تاریخی افسانے "کوہ نور" میں رقمطراز ہیں کہ "ہیروں کا معدن" "ہیرے کی کان" "ہیرے کی منڈی" یہ وہ الفاظ ہیں جو کسی زمانے میں گولکنڈے کے مترادف سمجھے جاتے تھے۔[4] کڑپا، سدہوٹ اور کندی کوٹ میں ہیرے کی بہت سی کانیں تھیں اور یہاں سے لاکھوں روپے کے ہیرے برآمد ہوتے تھے منوچی (Manucci) لکھتا ہے کہ محمد سعید نے شاہ جہاں کی خدمت میں چالیس لاکھ کے ہیرے پیش کیے تھے اور ایک نایاب اور قیمتی ہیرا جس کا وزن تین سو ساٹھ (۳۶۰) قراط تھا نذر کیا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے جواہر خانے ہیروں سے معمور تھے اور عبداللہ قطب شاہ کے تاج میں جو بیش قیمت ہیرے جڑے ہوئے تھے ان کی تھیونو نے بڑی تعریف کی ہے۔[5] ٹیورنر کے بیان کے مطابق قطب شاہی سلطنت میں تئیس کانیں ایسی تھیں جن سے قیمتی ہیرے نکالے جاتے تھے ان میں سے چند تلنگانہ اور کرناٹک کے علاقوں میں واقع تھیں۔ کونڈپلی اور نرساپور جو راج مندری کے قریب واقع ہیں ہیروں کے مخزن تھے۔[6]

---

[2] شاردکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز (انگریزی)۔ ص ۲، ۳

[3] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۳۶۵

[4] ڈاکٹر زور۔ کوہ نور۔ مشمولہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد۔ ص ۱۲۹

[5] تھیونو۔ سیاحت نامہ۔ حصہ سوم۔ ص ۱۰۲

[6] ٹیورنیر۔ سیاحت نامہ۔ جلد دوم۔ ص ۵۶

Marfat.com

عبداللہ قطب شاہ عیش ونشاط کا دلدادہ تھا۔ اس بادشاہ کے دور کے تاریخ اور اس کے سوانح نگار نظام الدین احمد العاندی کا بیان ہے کہ اس کے دور میں کرناٹک، احمدآباد، لاہور، آگرہ اور برہان پور سے طوائفیں حیدرآباد بلائی جاتی تھیں[1] اپنے سیاحت نامہ میں ٹیورنیر لکھتا ہے کہ طوائفوں کا ایک باقاعدہ رجسٹر موجود ہوتا تھا جس میں داروغہ ان کے نام اور دیگر تفصیلات درج کرتا تھا۔ ان کی تعداد بیس ہزار بتائی گئی ہے[2] یہی حال ابوالحسن تانا شاہ کے دور میں بھی رہا چنانچہ گردھاری لال احقر لکھتے ہیں کہ سرکار سے تین لاکھ چوبیس ہزار روپیہ طوائفوں کو دیے جاتے تھے[3]

قطب شاہی عہد کی تہذیبی زندگی کی جھلک محمد قلی قطب شاہ احمد گجراتی غواصی، ابن نشاطی اور وجہی کی مثنویوں میں نظر آتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ، احمد گجراتی عبداللہ قطب شاہ اور غواصی نے اپنے شعری کارناموں میں مختلف رسومات کی مرقع کشی کی ہے اور اپنے عہد کی معاشرت کی سچی ترجمانی کی ہے۔ محمد قلی اور عبداللہ قطب شاہ نے عیدوں، تہواروں اور شاہی تقریبات کے علاوہ شادی بیاہ کی رسومات کی تفصیلات بھی ہمیشہ کے لیے اپنے اشعار میں محفوظ کردی ہیں۔ محمد قلی کے علاوہ غواصی نے بھی شادی کی دکنی رسومات کی بڑی اچھی تصویر کشی کی ہے۔ غواصی نے اپنی مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" میں "جلوہ دارن سیف الملوک و بدیع الجمال" میں "جواہر کے منڈوے" "مرصع کے پردے" "جڑت کے چھپر پلنگ، ڈومنیوں کے "پلانے" "سہیلے" "گانے" اور "گوتیوں" کے موتی وارنے اور رسم جلوہ کی تصویر تمام جزئیات کے ساتھ کھینچی ہے۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں مہمانوں کی ضیافت اور تواضع کا جو انتظام کیا جاتا تھا، قطب شاہی مثنویوں میں اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ "سیف الملوک و بدیع الجمال" کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ قطب شاہی تمدن میں ضیافتوں اور محفل آرائیوں کی کیا اہمیت تھی۔ دعوت کے دوران ہلکے ہلکے

---

[1] نظام الدین احمد العاندی۔ حدیقۃ السلاطین۔ ص ۴۲

[2] ٹیورنیر۔ سیاحت نامہ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۷

[3] گردھاری لال احقر۔ تاریخ ظفرہ۔ ص ۱۷۵

Marfat.com

سروں کی موسیقی سے مہمانوں کو محظوظ کیا جاتا تھا۔ تناول طعام سے پہلے مہمانوں کے ہاتھ عرق گلاب سے دھلوائے جاتے تھے۔ دسترخوان پر انواع واقسام کی شیرین ونمکین غذائیں اور پرتکلف کھانے موجود ہوتے "آبدار" ہر ایک مہمان پر نظر رکھتے اور انھیں ٹھنڈا پانی پلائے جاتے۔ کھانے سے فارغ ہونے پر مہمانوں میں چاندی کے ورق لگے ہوئے پان تقسیم کیے جاتے تھے اور آخر میں جب مہمان رخصت ہوتے تو پھول پیش کیے جاتے اور عطر لگایا جاتا تھا۔ شادی بیاہ کی دعوتوں کے متعلق یہ ثقافتی معلومات، ہمیں شعراء کی مثنویوں سے دستیاب ہوتی ہیں اور قطب شاہی کلچر کی غمازی کرتی ہیں۔ غواصی کا بیان ملاحظہ ہو ؎

منڈل کار منڈل بجانے لگے　　گیتاں کار پکریاں سولیانے لگے
جنتر کار سوزاں اوچائے ہلوں　　سوں مجلس کو مستی میں لیائے ہلوں
جو مجلس کو کھانا کھلانے پہ آئے　　صفا خوش کندوریاں سولیا لیا بچھائے
کندوریاں شہانے سو اک جنس کیان　　رنگا رنگ شیرنیاں ہر اک جنس کیاں
جو پھل نیر سوں ہات سب کے دھولائے　　کندوری کھلانے لیجا بیلائے
کمر باند خوش ہور پیں آبدار　　نظر ساری مجلس پہ رکھ ٹھار ٹھار
جل امریت لیا لیا پلاتے لگیا　　پلا پیاس بھر بھر چلانے لگیا
جڑت کے طبق ہر یک اسمان تھے　　بھرا اس میانے تگٹے پٹیاں پان کے
عنبر ہور خوشبو کدم پھول مال　　پھرانے لگے جان صاحب جمال

قطب شاہی ثقافت اور قطب شاہی دور کی رسومات کی آخری جھلک وجدی کی "مخزن عشق" میں نظر آتی ہے۔ اس وقت تک دکن کی محفلوں پر اوس پڑ گئی تھی اور عالم گیر نے گولکنڈہ فتح کر لیا تھا۔ سقوط گولکنڈہ کے بعد کہی ہوئی اس مثنوی میں عہد گذشتہ کا آخری جلوہ نظر آتا ہے اجڑے ہوئے چمن کی بہاریں اور اس کی یادیں ابھی شعراء کے حافظے سے محو نہیں ہوئی تھیں۔ ابن نشاطی نے "پھول بن" میں بادشاہ کی بزم نشاط کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ قطب شاہی محفل طرب کی یاد دلاتا ہے ابن نشاطی نے اس مثنوی میں جنگ کا جو منظر پیش کیا ہے اس میں ان فوجی باجوں کے نام بھی گنائے ہیں جو میدان جنگ میں بجائے جاتے تھے۔ مثنوی نگاروں نے اپنے شعری کارناموں میں

Marfat.com

اپنے عہد کے تہذیبی عناصر کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ ان میں ہمیں ایک گذشتہ تہذیب اور ایک بٹے ہوئے تمدن کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہ دکنی شاعروں کا ایک قابل قدر تہذیبی کارنامہ ہے کہ انھوں نے گزرے ہوئے زمانے کے تہذیبی آثار کو صفحہ قرطاس پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے محمد قلی نے اپنے اشعار میں احمد گجراتی نے اپنی "مثنوی یوسف زلیخا" اور ابن نشاطی نے "پھول بن" میں اپنے عہد کے مختلف پارچوں کے نام گنائے ہیں۔ "پھول بن" میں ابن نشاطی نے اپنے زمانے کے جن پارچوں کے نام گنائے ہیں وہ حریر، بافتہ، سالو، مشجر، تافتہ، زربافت، سمور، سندس، سرمک، خطائی، سلیمی، صاحبی، کربلائی، اطلس، دیبا، خنک، تاش، سوف، مخمل، سقلادنیم، چھینٹ، پیتمبر اور ململ وغیرہ ہیں ؎

حریر و تافتہ سالو سری صاف　　مشجر تافتہ دارائے از باف
سمور و سندس و سرمک خطائی　　سلیمی صاحبی ہور کربلائی
خز و اکسوں و اطلس دق و دیبا　　خنک ہور تاش خطی سوف دیبا
مطبق، نیلک و سقلاد و مخمل　　قلم کاریاں و چھٹاں ہور ململ
پیتمبر دار چھینٹاں ہور مومیاں　　تھے شالاں خوب کشمیری و طوسیاں

مارکو پولو جو کاکتیہ سلطنت کی رانی رودرا دیوی کے عہد میں دکن آیا تھا یہاں کے عمدہ اور مہین کپڑوں کی بڑی تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ایک مخصوص کپڑا مکڑی کے جالی کی طرح باریک ہوتا ہے۔ اس نے اورنگ آباد کی پارچہ بافی کی بھی بڑی تعریف کی ہے۔ محمد عبداللہ چغتائی "تمدن ہند میں دکن کا حصہ" میں لکھتے ہیں کہ ۱۶۰۸ء میں ایرانی سفیر قطب شاہی دارالسلطنت میں آیا تھا جب وہ اپنے وطن واپس گیا تو اپنے ہمراہ یہاں کا تیار کردہ کمخواب کا پارچہ لے گیا تھا جسے پٹن اورنگ آباد کے کاریگروں نے پانچ سال میں تیار کیا تھا[1]

دکن میں مختلف پارچے بالخصوص کمخواب، زربفت، بیل، چشم مرغ، زالہ، گنگا جمنی، دھوپ چھاؤں، چاند تارا، مشجر زریں، چھ جھول اور چار جامہ وغیرہ تیار کیے جاتے

---

[1] محمد عبداللہ چغتائی۔ تمدن ہند میں دکن کا حصہ۔ ص ۵۰

Marfat.com

تھے۔ ان اعلا کپڑوں کی موجودگی میں سلمٰی ستارہ بھی تیار کیا جاتا تھا جو کارچوبی کاموں میں استعمال ہوتا تھا۔ گوکھرو اور موتی وغیرہ سے مخمل پر کارچوب کا کام کیا جاتا تھا ان قیمتی کپڑوں کے ہزارہا تھان شاہی فرمائش پر تیار ہوتے تھے اور دیگر ممالک میں بطور تحفہ بھیجے جاتے تھے چنانچہ اکبر اور جہاں گیر کے درباروں میں بھی یہ بیش قیمت اور نایاب پارچے بھیجے گئے تھے۔ فیضی اپنی ایک عرض داشت میں اس صنعت کی بڑی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے "صفت پارچہ در پٹن بے بدل است"[1] جب دہلی میں عالمگیر کی تاج پوشی ہوئی تو عادل شاہی اور قطب شاہی درباروں کی طرف سے ایلچی قیمتی تحائف لے کر وہاں پہنچے تھے۔ قیمتی اور نادر اشیاء میں دکن کا بیش بہا اور نفیس پارچہ بھی شامل تھا۔ قالین اور نقش و نگار والے کپڑے تیار کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر ماہر نقاش اور مصوروں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔

پی ایس ساگر "فیمس کاسٹیومس ان دی سیکسٹین اینڈ سیونٹین سنچری" میں رقمطراز ہے کہ "آئینہ اکبری" میں اکبر کے عہد میں استعمال ہونے والے جن کپڑوں کے نام بتائے گئے ہیں ان میں خاصا، سالو، ڈوریا، بافتا، تن سکھ، مخمل، تافتا، ریشم اور لاہ وغیرہ ہیں۔ زرین کپڑوں میں زرکش، زرتاری، زربفت، تاشا کتعان، تارامنڈل اور مکڑی کا تار وغیرہ ہیں۔ دکنی شعراء کی مثنویوں میں اس عہد کے پارچوں کے جو نام بتائے گئے ہیں ان کا ذکر آچکا ہے۔ سالو، ڈوریا، تافتا، مخمل، ریشم، زربفت، تافتا اور کتعان کے نام دکنی شعراء کی مثنویوں میں بھی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے بہت سے کپڑے بھی دکن میں تیار کیے جاتے تھے جن کے نام "آئین اکبری" میں موجود نہیں[2] عبدالمجید صدیقی لکھتے ہیں کہ گولکنڈہ کا تیار کیا ہوا کپڑا ساری دنیا میں مشہور تھا۔ سلاطین قطب شاہیہ کے لطیف و مثالیہ ذوق نے اس صنعت

---

[1] محمد عبداللہ چغتائی۔ تمدن ہند میں دکن کا حصہ۔ ص ۵۷

[2] ایس پی ساگر فیمس کاسٹیومس ان دی سیکسٹین اینڈ سیونٹین سینچری (Famous Costumes in the Sixteen & Seventeen Century)۔ مقالہ مشمولہ انڈین ہسٹری آف کانگرس پروسی ڈنگس الہ آباد سشن ۱۹۶۶۔ جلد ۱۱ - ص ۲۴۳

Marfat.com

میں چار چاند لگا دیے اور صنعت پارچہ بافی کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ گولکنڈے میں جو نفیس اور عمدہ پارچے تیار کیے جاتے تھے وہ بے مثل تھے۔ بافت، رنگ، وضع اور خوبصورتی و پائیداری میں ان کا جواب نہیں تھا۔ گولکنڈے کے کاریگروں نے نت نئے اختراعات سے کام لیا اور مختلف رنگ، دبازت اور نوع کے پارچے تیار کیے ورنگل میں بڑا مہین کپڑا تیار کیا جاتا تھا یہ زیب تن سمندر کے راستے سے باہر بھیجا جاتا۔ بافت رنگ اور وضع میں نت نئی ایجادیں ہوئیں کپڑے کی دو بڑی قسمیں تھیں ایک سادہ اور دوسرا وضع دار۔ سادہ میں تن زیب کلف دار ہوتا اور وضع دار پارچے مختلف خوشنما رنگوں سے تیار کیے جاتے تھے۔

"حدیقۃ السلاطین" میں گولکنڈے کے قلم کار کپڑے کی تعریف کی گئی ہے[1] یہ خاص حیدرآباد کی صنعت تھی۔ کپڑے پر قلم اور برش کے مدد سے نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ نے پیاریوں کا سراپا پیش کرتے ہوئے زرلفت، خوبی والا اور نگت وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور اسی طرح احمد گجراتی کی مثنوی "یوسف زلیخا" میں بھی گولکنڈہ میں تیار کیے جانے والے مختلف کپڑوں کا ذکر موجود ہے۔ منوچی نے مسولی پٹنم کے قلم کار کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھتا ہے کہ یہ کپڑا سوائے گولکنڈہ کے کہیں اور تیار نہیں کیا جاتا تھا۔ جگدیش متل کا بیان ہے کہ حیدرآباد سے منقش سوتی کپڑا جو "قلم کاری" کہلاتا تھا پیٹہ پلی اور پالکال میں تیار کیا جاتا تھا قلم کاری پارچے کی ایران میں بڑی مانگ تھی اور مسولی پٹنم کی بندرگاہ سے یہ پارچہ ایران بھیجا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد قلم کاری یورپ میں بھی بہت مقبول ہوگئی ڈچ کمپنیوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسط سے یورپی مملکت اس کپڑے سے متعارف ہوئے تھے[2] بیزل گرے (Basil Gray) رقمطراز ہے کہ سولھویں صدی میں گولکنڈہ اپنی دولت کے لیے مشہور ہو چکا تھا۔ سلطنت کے مشرقی ساحلوں سے لوہا اور کپڑے وغیرہ جنوب مشرقی ایشیا بھیجے جاتے تھے ایران کو گولکنڈے کا نقش و نگار والا سوتی

---

[1] نظام الدین احمد الصاعدی (مترجم محمد سرور) حدیقۃ السلاطین۔ ص ۲۷۲

[2] جگدیش متل پینٹنگ۔ باب سوم۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن جلد دوم ص ۲۱۸

Marfat.com

کپڑا بھیجا جاتا تھا اس کی مغربی یورپ میں بڑی مانگ تھی اور اس کپڑے کو بے حد پسند کیا جاتا تھا[1]

دولت آباد کے قریب کاغذ ساز آباد تھے جن کی وجہ سے ان کا قریہ کاغذی پورہ مشہور ہوگیا تھا[2] حیدر آباد کاغذ سازی کے لیے شہرت رکھتا تھا یہاں دبیز اور باریک دونوں قسم کے کاغذ تیار کیے جاتے تھے ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ شکن آلود نہیں ہوتے بلکہ اپنی اصلی حالت میں برقرار رہتے تھے۔ زرفشان کاغذ کے علاوہ سنہری نقش ونگار اور بیل بوٹوں والا کاغذ بھی فروخت کیا جاتا تھا اس قسم کے قیمتی کاغذ پر شاہی فرامین، اسناد اور پروانے تحریر کیے جاتے تھے[3]

تھیونو (Thevenot) نے اپنے سفر نامے میں اندور (نظام آباد) کی تلواروں، خنجر، نیزے اور دیگر اسلحہ کو بہت سراہا ہے[4] گولکنڈے میں جو فولاد تیار کیا جاتا تھا اس سے مختلف صنعتیں قایم کی گئی تھیں۔ تھیونو کہتا ہے کہ گولکنڈے کا اسلحہ تمام ہندوستان میں بڑے شوق سے خریدا جاتا تھا[5] محمد ساقی مستعد خاں "ماثر عالمگیری" میں رقمطراز ہے کہ حیدر آباد میں ہنر ور اور کاریگری ایسی کثیر تعداد میں موجود تھے کہ ان کے کام کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک مبسوط کتاب تصنیف کرنی پڑے گی ڈاکٹر زور "فرخندہ بنیاد حیدر آباد" میں لکھتے ہیں کہ سلطنت گولکنڈہ فولاد اور زہر مہرے کے علاوہ ہیروں کا بھی مخزن تھا۔ گولکنڈے کا لوہا بہت مشہور تھا اور یہاں کے فولاد سے سمرقندی تلواریں تیار کی جاتی تھیں۔ گولکنڈے سے ایران اور پنجاب کو تلواریں

---

[1] ڈوگلاس بیرٹ اینڈ بیزل گرے۔ دکنی پینٹنگس ان دی اسٹیٹس آف احمد نگر، بیجاپور اینڈ گولکنڈہ۔ مشمولہ انڈین پینٹنگ ص ۱۲۱

[2] محمد عبداللہ چغتائی۔ تمدن ہند میں دکن کا حصہ۔ ص ۸۴

[3] نصیر الدین ہاشمی۔ دکھنی ادب کا تہذیبی پس منظر (مضمون) مشمولہ مجلہ عثمانیہ ۱۹۶۳، ۱۹۶۴۔ ص ۵۷

[4] تھیونو۔ سیاحت نامہ۔ جلد سوم۔ ص ۲۳۵

[5] " " " ص ۲۳۵

Marfat.com

بھیجی جاتی تھیں۔ گولکنڈے کے قریب نرمل اور اندور (نظام آباد) میں اس کثرت سے عمدہ تلواریں تیار کی جاتی تھیں کہ قطب شاہی افواج کی سربراہی کے بعد بچی رہتیں اور "اقطائے ہندوستان" کے "اسلحہ خانوں" کے لیے روانہ کی جاتی تھی۔ زہر مہرے کی بکریاں ہزاروں کی تعداد میں قلعہ گولکنڈہ کے اطراف واکناف اور اس کے شمال مشرق کی پہاڑیوں میں پرورش پاتی تھیں۔ ایک ایک بکری میں کئی کئی زہر مہرے نکلتے تھے۔ مشہور سیاح ٹیورنر نے یہاں کا ایک زہر مہرہ تین ہزار روپے میں فروخت کیا تھا[1]

گولکنڈے میں لکڑی کی صنعت نے بھی بہت ترقی کی تھی۔ لکڑی سے عمدہ صندوق، گھریلو سامان اور قلم دان وغیرہ تیار کیے جاتے تھے ان پر خوشنما روغن کیا جاتا تھا۔ لکڑی اور لوہے وغیرہ سے جہاز بھی تیار کیے جاتے تھے۔ بقول عبدالمجید صدیقی پرتگالی بھی سلطنت گولکنڈے میں اپنے جہاز تیار کرواتے تھے۔ انگریزی کمپنی نے بھی یہاں ایک جہاز تیار کروایا تھا جس کا نام "گلوب" تھا[2]

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں کارومنڈل کا ساحل سلطنت کے قبضے میں آگیا تو تجارت کو مزید فروغ حاصل ہوا اور نئی راہیں کھل گئیں۔ سولھویں صدی میں صرف پرتگالی یہاں آئے تھے لیکن سترھویں میں انگریزوں اور ولندیزیوں نے بھی سلطنت گولکنڈہ میں اپنی کمپنیاں قایم کیں چنانچہ پلی کٹ، سان تھوم اور مسولی پٹنم میں ان کی کمپنیاں قایم ہو چکی تھیں۔ جب یہ بندرگاہیں قطب شاہی علمداری میں آگئیں تو ان سے قطب شاہی سلطنت کے لیے بیرونی ممالک سے تجارت کا راستہ کھل گیا۔ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں مولی پٹنم نے ترقی کی اور یہ مقام صنعت و حرفت اور تجارت کا ایک اہم مرکز [illegible] جہازوں کے ذریعے سے سفید اور رنگین سوت، تمباکو اور نیل [illegible] کو روانہ کیا جاتا تھا اور جب یہ جہاز واپس آتے تو [illegible]

---

[1] ڈاکٹر زور۔ فرخندہ بنیاد حیدرآباد۔ ص ۱۲۹

[2] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۳۷۱

Marfat.com

ٹین، ریشم اور سیاہ مرچ سے لدے ہوتے [1]

دکن کا سطح مرتفع ایک زرخیز علاقہ ہے اور بہت سی چھوٹی بڑی ندیوں اور ذخائر آب نے اس سرزمین کو سرسبز و شاداب بنایا ہے۔ "رقعات عالم گیر" میں اورنگ زیب کا دکن کے متعلق یہ مشہور فقرہ موجود ہے کہ یہاں "یک قطعہ زمین بے مرزعہ نیست"۔ ٹیورنیر نے بھی دکن کی آب وہوا اور زرخیزی کی بڑی تعریف کی ہے [2]۔ یہاں گیہوں، چاول اور جوار کے علاوہ مونگ، چنا، مسور، تور، تل، کپاس، تمباکو اور ارنڈ کی وسیع پیمانے پر کاشت کی جاتی تھی۔ ثمر آور درخت کثیر تعداد میں موجود تھے۔ سیاح بیان کرتے ہیں کہ سلطنت قطب شاہی میں گائے، بھینس، بکری، مچھلی اور خوشنما پرندے بکثرت نظر آتے ہیں۔ ٹیورنیر نے شہر اور اس کے گردونواح کی پرفضا ماحول کی بڑی ستائش کی ہے اور لکھتا ہے کہ بادشاہ جس قلعہ میں رہتا ہے اس کے اطراف واکناف میں خوبصورت پہاڑیاں اور پتھریلی چٹانیں ہیں۔ یہ اتنی نظر فریب ہیں کہ فرانس کے خوشنما شہر "فانٹین بلو" (Fountain Blue) کی یاد دلاتی ہیں۔ سیاح کہتا ہے کہ یہاں کی آب وہوا نہایت خوشگوار اور فرح بخش ہے۔

ٹیورنیر نے تین مرتبہ سلطنت گولکنڈہ کی سیاحت کی تھی۔ وہ ۱۶۴۳ء، ۱۶۴۵ء اور ۱۶۵۶ء میں حیدرآباد آیا تھا، اس نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ حیدرآباد تجارت کا ایک اہم مرکز ہے بیرونی ممالک اور بالخصوص ایران سے تاجر مال واسباب لاتے اور بڑے شوق سے حیدرآباد کی مصنوعات ایران لے جاتے ہیں۔

ثقافتی اعتبار سے دکنی زبان وادب کی سرپرستی بھی قطب شاہی سلاطین کا بڑا اہم تہذیبی کارنامہ ہے۔ قطب شاہی سلاطین نے دکنی شعراء اور ادیبوں کو ویسا ہی اعزاز عطا کیا جیسا کہ فارسی شاعروں کو مغل دربار میں عطا کیا جاتا تھا۔ وجہی احمد گجراتی اور غواصی قطب شاہی سلطنت کے ممتاز شاعر تھے۔ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ دکنی کے اچھے شاعر تھے اور کہا جاتا ہے کہ ابوالحسن تانا شاہ

---

[1] عبدالمجید صدیقی: تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۳۷۳

[2] تھیونو۔ سیاحت نامہ۔ جلد سوم باب دہم۔ ص ۲۱

Marfat.com

نے بھی دکنی میں طبع آزمائی کی تھی۔ بادشاہوں نے دکنی میں شعر کہہ کر بھی خواص و عوام میں اس زبان کو مقبول بنا دیا۔ شاہی سرپرستی اور قدردانی نے دکنی کو ایک شائستہ اور قابل قدر زبان بنا دیا جب ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں اکبر نے گجرات فتح کر لیا تو یہاں کے شعراء اور فن کاروں نے دکن کا رخ کیا اور قطب شاہی سلطنت میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اس کے علاوہ مغلوں سے سلاطین دکن کی کشمکش دوسرا اہم محرک ثابت ہوئی شمال اور دکن کی آویزش کے محرکات سیاسی ضرور تھے لیکن اس کا تہذیبی پس منظر بھی تھا میدان سیاست میں دکن کے حکمران، مغلوں کی عسکری قوت اور سطوت کا مقابلہ کیا کرتے تھے تو علم و فضل کے میدان میں ان سے کس طرح پیچھے رہتے ؟ اپنے سیاسی اور تہذیبی وجود کو باقی رکھنے کے لیے یہ مسابقت ضروری تھی تمدن اور ثقافت میں بھی وہ اپنی انفرادیت کا اظہار چاہتے تھے۔ اگر شمال میں مغلوں نے فارسی زبان و ادب کی سرپرستی کی تو جنوب میں دکنی حکمرانوں نے اس کے علی الرغم دکنی کی سرپرستی کی۔ دکنی کے ساتھ ساتھ قطب شاہی بادشاہوں نے تلگو کی بھی جو تلنگ آندھرا کی مقامی زبان تھی بڑی قدردانی کی تھی رعایا سے جذباتی ربط قایم رکھنے کے لیے ان کی زبان سے واقفیت ضروری تھی جیسا کہ کہا جا چکا ہے ابراہیم تلگو کا بے حد دلدادہ تھا اس کے دربار میں فارسی اور عربی علماء اور اہل کمال کے ساتھ تلگو شعراء بھی موجود رہتے ہیں۔ گنگا دھر نے اپنی مشہور کتاب "تپتی سمورن پاکھیانم" جو ایک بلند پایہ منظوم کارنامہ ہے اسی کی سرپرستی میں مکمل کی تھی۔ یہ تصنیف ابراہیم کے نام معنون کی گئی ہے اس میں قطب شاہیوں کا شجرہ بیان کر کے ابراہیم قطب شاہ کی انتہائی مدح کی گئی ہے۔ یہ کتاب پروفیسر سبارائو شعبہ تلگو عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ شائع کر دی ہے۔ گنگا دھر کے علاوہ کنڈی کوی رودراکوی اور مرن گنٹی شنکر اچاریہ کی بھی ابراہیم نے بڑی عزت و توقیر کی تھی اور انھیں سرفراز کیا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ[1] بقول ڈاکٹر زور و ڈاکٹر وینکٹا رامنیا تلگو زبان میں بھی اپنا دیوان چھوڑا تھا جو دستیاب نہیں ہو سکا ہے لیے محمد قلی قطب شاہ کے عہد کے تلگو شاعر جو دور شاہ قطب شاہ

---

[1] (ا) ڈاکٹر زور۔ مقدمہ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ص ۳۲

(ب) ڈاکٹر وینکٹا رامنیا دی قطب شاہیز (مضمون) مشمولہ دی قطب شاہی سلطانس اینڈ آندھرا ہسٹری ص ۱۴۰

Marfat.com

میں بھی عنایات شاہی سے مستفید ہوتے رہے سارنگ تمیا، ملاریڈی اور سور بھی مادھورایا تھے۔ سارنگ تمیا نے اپنی ادبی تخلیق "وسچنتی ولاسم" میں قطب شاہی سلاطین کی بڑی مدح کی ہے اور محمد قلی قطب شاہ کی رواداری، علم دوستی اور رعایا پروری کی بڑی تعریف کی ہے اور سلطان محمد قطب شاہ کے اخلاق حمیدہ کو سراہا ہے۔
قطب شاہی عہد کا آخری مشہور تلگو شاعر گوپنا رام داس ہے۔ عبدالمجید صدیقی اور وینکٹا رامنیار قمطراز ہیں کہ شاہ راجوتانی کے بیٹے شاہ اکبر نے رنگا سائی کی تلگو تصنیف "سرینگارا منجری" کو سنسکرت میں منتقل کیا تھا[1] جس سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ اکبر سنسکرت اور تلگو دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ڈاکٹر وینکٹا رامنیا لکھتے ہیں کہ مسلمان اولیا راللہ تلگو اور سنسکرت سیکھتے تھے تو ہندو اہل علم عربی اور فارسی میں مہارت پیدا کرتے تھے۔ ڈاکٹر دھرمیندر پرشاد تحریر کرتے ہیں کہ قطب شاہی دور میں ہندو اعلا عہدوں پر فائز تھے اور دونوں مذاہب کے افراد میں خلوص و یگانگت کا جذبہ موجود تھا۔ ہندو بڑے ذوق وشوق کے ساتھ مسلمانوں کی عیدوں میں شرکت کرتے تو مسلمان ہندو تہواروں سے دلچسپی لیتے اور بڑی مسرت کے ساتھ ان کا اہتمام کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے بہت قریب تھے[2] ہارون خان شیروانی لکھتے ہیں کہ قطب شاہی دور میں ہندو عہدے دار کلیدی اہمیت کے حامل عہدوں پر فائز رہے۔ بانی سلطنت کے عہد میں رام راج کو وجیانگر کا حاکم مقرر کیا گیا تھا تو جمشید کے زمانہ حکومت میں جگ دیوراؤ کا قطب شاہی سلطنت میں ڈنکا بج رہا تھا[3]۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مقامی رسم ورواج مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں پوری طرح نفوذ کر گئے تھے۔ تلگو میں واقعات کربلا

---

[1] (ا) عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۴۰۶
(ب) ڈاکٹر وینکٹا رامنیا۔ دی قطب شاہیز (مضمون) مشمولہ دی قطب شاہی سلطنس اینڈ آندھرا سمسکرتی ص ۱۳،۱۲
[2] دھرمیندر پرشاد۔ فیر فیسٹیول اینڈ سوشیل فنکشنز آف حیدرآباد۔ ص ۴
[3] ہارون خان شیروانی۔ دکنی کلچر۔ ص ۴۳

Marfat.com

پر بہت سے لوک گیت موجود ہیں۔ ابوالحسن کے دور حکومت میں اکنا اور مادنا کی جو قدر و منزلت ہوئی اس کا دکنی تاریخوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے۔ مادنا فارسی کا عالم تھا۔ نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ عالم گیر نے ابوالحسن تانا شاہ کے پاس سفید روشنائی سے لکھا ہوا فرمان روانہ کیا تھا جس کی قرارت سوائے مادنا کے کسی اور سے ممکن نہ تھی[1] قطب شاہی سلطنت میں اخوت و ہم آہنگی، رواداری اور وسیع النظری کا دور دورہ تھا اور اس عہد کے فنون لطیفہ بھی اس کے ترجمان ہیں۔ جی آر جی ہیملی نے ایک نامعلوم شاعر کا ذکر کیا ہے جس نے "چاتریا منی منباری" میں ابراہیم قطب شاہ کی تلگو زبان سے دلچسپی اور اس کی سرپرستی پر روشنی ڈالی ہے[2]۔ "قطب شاہی سلطانس اینڈ آندھرا اسمسکرتی" میں ڈاکٹر وینکٹا رامنیا رقمطراز ہیں کہ بانی سلطنت گولکنڈہ نے جب ایک آزاد اور خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی تو اس نے اپنا اولین مقصد یہ بنالیا کہ رعایا کے ساتھ ہمدردی اور شفقت کا برتاؤ کرے اور انھیں یہ محسوس نہ ہونے دے کہ ان کا حکمران نسل اور مذہب کے اعتبار سے ان سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قطب شاہی سلاطین نے اپنی ہندو رعایا کو کبھی روزگار سے محروم نہیں کیا" بلکہ ہندو زمیندار اور نائک تو خاص مراعات سے سرفراز کیے جاتے تھے اور قطب شاہی فوج میں بھی اہم عہدوں پر فائز تھے۔" ابراہیم قطب شاہ کی رواداری اور وسیع المشربی کا ثبوت ایک تحریر سے بھی ملتا ہے جو کرشنا ندی کے کنارے ایک گاؤں میں کندہ کی ہوئی ملی ہے اس کندہ کی ہوئی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پورا گاؤں ایک برہمن کو جو ویدوں کا ماہر تھا عطا کر دیا گیا تھا تاکہ وہ پوجا پاٹ کی رسومات خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر سکے اور عوام کو شاستروں اور ویدوں کا درس اطمینان کے ساتھ دے سکے۔[3] ابوالحسن تانا شاہ کے دور میں بھدراچلم اور بھرامیشور سوامی مندروں کو جو گوادری اور کرشنا کے کنارے واقع تھے اخراجات کے لیے جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔

---

[1] نصیرالدین ہاشمی۔ دکنی کلچر۔ ص ۶۰

[2] جی آر جی ہیملی۔ اسٹڈیز آف ساؤتھ انڈیا۔ باب چہارم۔ ص ۵۸۸

[3] این وینکٹا رامنیا۔ دی قطب شاہیز (مقالہ) مشمولہ قطب شاہی سلطانس اینڈ آندھرا اسمسکرتی۔ ص ۱۲

Marfat.com

قطب شاہی سلاطین نے اپنی مملکت میں ہر طبقے کے لوگوں کو آزادی عطا کی اور ایک ایسے ملے جلے اور مخلوط تمدن کو پروان چڑھایا جو تلنگ آندھرا تمدن اور اسلامی معاشرت کے بہترین عناصر کا سنجوگ تھا اس ہندو مسلمانی تہذیب نے دکنیوں کی ذہنی تربیت اور سماجی مطمح نظر کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ ٹیونیر لکھتا ہے کہ دکنی امراء نے بادشاہوں کی تقلید میں بجائے قبا اور پوستین کے جامہ اور نیمہ پہننے کو ترجیح دی تھی عوام ململ کا انگرکھا اور چوبند پہنتے اور سر پر دکنی وضع کی پگڑی باندھتے تھے[1] ہندو رعایا کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے سرشنبہ (منگل وار) کو عام تعطیل کا دن قرار دیا گیا تھا[2]

مقامی باشندے قطب شاہی سلطنت کو اپنی ریاست تصور کرتے تھے۔ ابراہیم کا عہد ہندو مسلم کلچر کے اتحاد و امتزاج کا خوبصورت نمونہ تھا۔ اہل دربار، بادشاہ، امراء اور عوام سب اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سلطان قلی قطب شاہ تلگو رعایا میں اتنا مقبول تھا کہ وہ اسے "بڑے ملک" کے نام سے یاد کرتے تھے اور اس کی اکلوتی بیٹی حیات بخشی کو رعایا "ماں صاحب" کہتی تھی۔ بقول ہارون خان شیروانی مملکت قطب شاہی کے سب سے اعلا ترین عہدے دار تلگو باشندے تھے[3] مغل مورخ محمد ساقی مستعدخاں نے ابوالحسن تانا شاہ کے عہد حکومت کے واقعات قلمبند کرتے ہوئے اکنا اور مادنا اور دوسرے تلگو امرائے عظام کا بطور خاص ذکر کیا ہے[4] ابوالحسن تانا شاہ سے بہت پہلے محمد قلی قطب شاہ نے اپنے مذہبی مسلک اپنی رواداری اور وسیع النظری کے بارے میں کہا تھا ؎

ہندو ریت کوں تم ہو دیتے روا جاں
کہ بت خانہ نمنے ہیں تم بھی ہمن سر

فن مصوری نے قطب شاہی عہد میں ترقی کی بہت سی منزلیں طے کیں۔ مصوری

---

[1] ٹیونیر۔ سیاحت نامہ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۸

[2] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۳۳۶

[3] ہارون خان شیروانی۔ محمد قلی قطب شاہ (انگریزی)۔ ص ۹

[4] محمد ساقی مستعدخان۔ (مترجم محمد فدا علی طالب) ماثر عالم گیری۔ ص ۱۹۳

Marfat.com

کا "گولکنڈہ اسکول"، اپنی انفرادی خصوصیات کی وجہ سے ایک علاحدہ "دبستان" کی شکل میں ابھرا تھا۔ ۱۵۶۵ء میں ابراہیم قطب شاہ نے وجیانگر سے جنگ کی تھی۔ یہ مشہور جنگ تالی کوٹہ کہلاتی ہے جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں درج کی جا چکی ہے اس میں وجیانگر کے راجا کو شکست ہوئی اور ابراہیم کی سلطنت کے حدود جنوب اور مشرق میں وسیع ہو گئے اور اس نے ساحل سمندر پر بھی قبضہ کر لیا جس کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیاء سے قطب شاہی سلطنت کے تجارتی تعلقات استوار ہوئے۔ قطب شاہی دور کی مصوری "ترکی ایرانی اثرات" اور مقامی روایت کے باہم شیر و شکر ہونے اور ایک مخلوط تمدن کے پروان چڑھنے کے رجحان کی ترجمان ہے۔ ان کا لباس بھی ایرانی اور دکنی طرز کے اشتراک کا مظہر ہے ان تمام امور کا اندازہ قطب شاہی دور کی مصوری سے لگایا جا سکتا ہے۔ گولکنڈہ مصوری کے دور اولین کے چار نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ جن میں سے دو پر تاریخیں درج ہیں اور دو سولھویں صدی کے دور آخر سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تصویروں کے زمانے کا تعین ماہرین فن مصوری نے ان کے "اسٹائل" اور واقعاتی شہادت سے کیا ہے۔ جگدیش متل کا خیال ہے کہ ان تصویروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی مصور گولکنڈے میں مصروف کار تھے۔ یہ تصویریں خراسان، بخارا، اور ایران کے اسالیب اور طرز مصوری کی یاد دلاتی ہیں۔ ان میں ایک پینٹنگ $\frac{۹۸۰ھ}{۱۵۷۲ء}$ کی ہے اس تصویر کے پس منظر میں فرشتوں اور مخصوص جانوروں کی تصویریں دکھائی گئی ہیں جو ایرانی طرز کی ہیں ہاتفی کی مثنوی "شیرین خسرو" بانکی پور کی اورنٹیل پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد کی یادگار ہے۔ اس کا عنوان اور سات صفحات جن پر تصویر چے (Miniatures) اتارے گئے ہیں "بخارا اسٹائل" کے نمائندہ ہیں جو ۱۵۶۰ء یا ۱۵۸۰ء گولکنڈے میں بہت مقبول تھا ہلکا اور گہرا نیلا رنگ، سبز اور نارنجی رنگ کا استعمال بخارا مصوری کا خاص وصف ہے۔ پیش منظر (fore ground) اور آسمان کے لیے سنہری رنگ جو خالص سونے سے تیار کیا جاتا تھا بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ تصویروں کو افقی انداز میں تقسیم کرنے کے رجحان سے گولکنڈے کے مصور متاثر نظر آتے ہیں۔ دیوان حافظ میں بھی اس دور

Marfat.com

کی پینٹنگ کا ایک اور نمونہ موجود ہے۔ یہ تصویر چے ۱۶۴۳ء میں تیار کیے گئے ہیں۔ یہ دیوان حافظ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اس کے ایک تصویر چے میں ایک نوجوان بادشاہ ایک دکنی لمبی تلوار پکڑے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس نوجوان نے سفید مزلن کا لباس زیب تن کیا ہے جس پر کار چوبی گل کاری میں عمودی دھاریاں بنائی گئی ہیں۔ جگدیش متل کا خیال ہے کہ یہ قطب شاہیوں کا درباری لباس ہوگا[1] ان تصویر چوں میں مغل مصوری کا اثر دکھائی نہیں دیتا رنگ آمیزی کا انداز ابتدائی صفوی دور (۱۵۸۷ء تا ۱۶۲۹ء) کی پینٹنگ کی یاد دلاتا ہے۔ یہ "تعریف حسین نظام شاہ دکن" (۱۵۶۵ء تا ۱۵۶۹ء) کے مخطوطے کی پینٹنگ سے بہت بہتر اور فنی اعتبار سے بلند پایہ ہیں۔ ان میں آرائش کا زیادہ اہتمام نظر آتا ہے یہ پینٹنگ بیجاپور کے "نجم العلوم" (۱۵۷۰ء) سے بھی بہتر اور وقیع ہے ان کا تکمیلی عمل (Finishing) بھی نفیس اور قابل تعریف ہے۔ بیرٹ (Barrett) کا خیال ہے کہ اس تصویر میں جو بادشاہ دکھایا گیا ہے وہ محمد قلی قطب شاہ ہے[2] جو صرف چودہ برس کی عمر میں سریر آرائے سلطنت ہوا تھا۔ اس تصویر میں وہ بیس تا چوبیس برس کا مرد نظر آتا ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تصویر چہ ۱۵۸۶ء تا ۱۵۹۵ء کا فن پارہ ہو سکتا ہے۔

"گلشن مصوری" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ چسٹر بلٹی (Chester Beatty) کے کلکشن میں "ذخیرہ خوارزم شاہی" موجود ہے یہ کتاب فقیر بابا میرک ہرات کی تحریر کردہ ہے اور اس کا موضوع علم طب سے متعلق ہے۔ اس مخطوطے میں پرواز کرتے ہوئے فرشتوں کے چہروں پر جو تاثرات ابھارے گئے ہیں وہ دکنی اثر کے ترجمان ہیں۔ اس کے علاوہ ابراہیم کے عہد کا ایک اور مصور مخطوط "سندباد نامہ" ہے جو لندن کے انڈیا آفس میں موجود ہے۔ یہ شیرازی مصوروں کا شاہکار ہے اور اس میں بھی دکنی مصوری کی جھلک دیکھی جا سکتی۔ اول الذکر مخطوط ۱۵۷۲ء میں اور موخر الذکر ۱۵۷۵ء میں مکمل ہوا تھا[3]

---

[1] جگدیش متل۔ پینٹنگ (مشمولہ) ہسٹری آف میڈیویل دکن۔ جلد دوم۔ ص ۲۱۹

[2] 〃 〃 〃 〃

[3] کارل کھنڈیل والا و رحمت علی۔ گلشن مصوری۔ (انگریزی)۔ ص ۳۵

Marfat.com

گولکنڈے کی سولھویں صدی کی پینٹنگوں میں محمد قلی قطب شاہ کا کلیات پیش کیا جا سکتا ہے جس میں سات نہایت عمدہ اور نفیس پینٹنگ موجود ہیں - یہ کلیات کتب خانہ سالار جنگ کا قیمتی اثاثہ ہے ان تصویروں میں تکمیلی عمل (Finishing) بہت ماہرانہ ہے - یہ تصویریں اس دور کی دوسری تصویروں سے زیادا اہم اور گرانقدر ہیں - فن مصوری کے اعتبار سے بھی یہ بہت قابل قدر ہیں - کلیات محمد قلی قطب شاہ کی یہ تصویریں خراسان کی بخارا مصوری سے اثر پذیری کی آئینہ دار ہیں اس مخطوطے کے خوش نویس کا نام زین الدین شیرازی ہے - وہ محمد قلی قطب شاہ کا درباری خوش نویس تھا اور مصور کا نام غالباً قاسم علی المذہب ہے[1] ایک تصویر میں محمد قلی قطب شاہ کو تخت پر بیٹھا ہوا دیکھا گیا ہے - ان تصویروں میں ایرانی اثر کی موجودگی کے باوجود دکنی مصوری کی انفرادیت برقرار ہے - محمد قلی قطب شاہ کی اس تصویر کو ۱۵۹۰ء میں تیار کیا گیا ہوگا -

محمد قطب شاہ کے عہد کی دو تصویریں دستیاب ہوئی ہیں یہ دونوں انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہیں - ان میں سے ایک محمد قلی قطب شاہ کی تصویر ہے - بادشاہ نہایت عمدہ زرق برق لباس میں ملبوس ہے - لباس کی خوبصورتی تصویر سے نمایاں ہے - یہ تصویر جگدیش متل کے یہاں موجود ہے - ایک تصویر ۱۶۱۵ء کی تیار کردہ ہے اور "گولکنڈہ اسکول" کی مصوری کا اچھا نمونہ ہے اس کے چمک دار رنگ بڑے جاذب نظر ہیں بادشاہ نے جو لباس زیب تن کیا ہے وہ سنہری ہے اور اس پر نقش و نگار بنائے گئے ہیں - اس تصویر کا پیش منظر سنہری ہے اور پس منظر میں پھولوں سے لدے ہوئے درخت نظر آتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ گولکنڈہ مصوری کا نمونہ ہے اور کسی مغل مصور نے اس کو تیار نہیں کیا ہے -

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد تک بیجاپور، اپنی مصوری کے اعلا نمونوں کی وجہ سے گولکنڈے پر فوقیت رکھتا تھا لیکن عہد عبداللہ قطب شاہ میں گولکنڈے کی پینٹنگ، بیجاپور کی مصوری پر سبقت لے گئی اور مصوری کے گولکنڈہ اسکول کا بول بالا

---

[1] جگدیش متل - پینٹنگ - (مشمولہ) ہسٹری آف میڈیول دکن - جلد دوم - ص ۲۲۰

Marfat.com

ہوگیا[1] فن مصوری کی ترقی کے اعتبار سے عہد عبداللہ قطب شاہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں پینٹنگ کے بہترین نمونے تخلیق کیے گئے۔ یہ ایسے عمدہ نمونے ہیں جو اپنی فن کارانہ خوبیوں کی وجہ سے شہرہ آفاق بن گئے ہیں۔ عبداللہ کے زمانہ حکومت میں مصوری کے گولکنڈہ اسکول کے اعلا ترین کارنامے منظر عام پر آئے۔ اس دور میں حکومت سیاسی اعتبار سے غیر مستحکم تھی ۱۶۵۶ء کے معاہدے کے بعد تو گولکنڈہ مغل سلطنت کا باج گزار بن گیا تھا لیکن یہی دور گولکنڈے میں فن مصوری کے عروج کا زمانہ ہے۔ ابتدائی دور کی پینٹنگ میں ایرانی اثر کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور ۱۶۵۰ء کے بعد مغل مصوری کے اثرات آہستہ آہستہ ابھرتے نظر آتے ہیں اس کے باوجود ان تصویروں میں وہ انفرادیت ہے جو گولکنڈے کی مصوری کو دوسری دکنی ریاستوں کی مصوری سے ممیز کرتی ہے اور بقول جگدیش متل اُسے مغل مصوری سے بہتر ثابت کرتی ہے[2] مقامی فضا شوخ رنگوں کی آمیزش اور ان کا فن کارانہ استعمال، سونے سے تیار کیے ہوئے سنہری رنگ کا بکثرت استعمال جو لباس میں اپنی تمام خوبصورتی کے ساتھ موجود دکھائی دیتا ہے، دکنی مصوری میں اکثر جگہ جلوہ گر ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور کی مصوری کی ایک اہم خصوصیت رنگوں کی اسکیم (Colour Scheme) بھی ہے۔ عہد عبداللہ قطب شاہ کی سب سے بیش قیمت شبیہہ (Portrait) برٹش میوزیم لندن میں ہے۔ اس میں بادشاہ کو ایک شہ نشین میں بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے اور تین سفیر چار گھوڑے پیش کر رہے ہیں جنھیں خدمت گار سنبھالے ہوئے ہیں اس تصویر کے بادشاہ کو جو نوجوان ہے پہلے علی عادل شاہ ثانی سمجھا گیا تھا بیرٹ (Barrett) نے بتایا کہ یہ تصویر محمد قلی قطب شاہ کی ہے اس کے بعد ایک اور ماہر مصور اسکل ٹن (Skelton) نے اس کی صحیح شناخت کی اور اسے عبداللہ قطب شاہ ثابت کر دیا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کی ایک اور تصویر ۱۶۲۵ تا ۱۶۳۰ء کی تیار کردہ ہے اسے ہولی فیملی (Holy Family) کے عنوان سے

---

[1] جگدیش متل۔ پینٹنگ۔ (مشمولہ) ہسٹری آف میڈیول دکن۔ جلد دوم۔ ص ۲۲۱

[2] " " " " ص ۲۲۰

Marfat.com

مزین کیا گیا ہے۔ یہ دونوں تصویریں ایک ہی مصور کی تیار کی ہوئی ہیں لیکن ہم اس کے نام سے واقف نہیں ہیں۔ پرنس آف ویلز کے میوزیم میں ایک پینٹنگ موجود ہے۔ جسے خاصے بڑے کینوس پر تیار کیا گیا ہے یہ تصویر اسی انداز کی دوسری مغل پینٹنگ کے مقابلے میں بہت بڑی اور منفرد خصوصیات کی حامل ہے اس قسم کی تین تصویریں ملی ہیں جن میں ہلوس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس زمانے میں گولکنڈے میں جلوس کی تصویریں بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں اس کا سبب یہ تھا کہ عبداللہ نت نئی تفریحات کا دلدادہ تھا اور شہر سے دور مختلف پرفضا مقامات پر محفل طرب منعقد کرتا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کا جلوس بہت شاندار اور مرعوب کن ہوتا تھا اور اس سے اس کے جاہ وحشم کا اظہار ہوتا تھا۔ جگدیش متل کا خیال ہے کہ کپڑے پر اس قسم کی بڑی تصویریں اتارنا مغرب کا فن ہے۔ اس مغرب کے فن سے گولکنڈے کے فن کار گوا بندرگاہ کے ذریعے سے روشناس ہوئے تھے[1] لیکن اپنے اسٹائل اور ترتیب میں یہ تصویریں "دکنی اسکول" کی ترجمانی کرتی ہے ان تصویروں میں انسانوں کے مرقع ٹیڑھی ترچھی قطاروں میں دکھائے گئے ہیں۔ گولکنڈے کے فن کار مجمع کی مصوری کی پیچیدگیوں سے خوب واقف تھے وہ مجمعوں کا منظر اچھا تیار کر سکتے تھے۔ گولکنڈے کی مصوری میں مغل اثرات بہت کم نظر آتے ہیں دوسری دکنی ریاستوں کے مقابلے میں ان فن کاروں نے روایتی انداز تصویر کشی کو برقرار رکھا۔ بیزل گرے (Basil Gray) نے "دکنی پینٹنگس ان دی اسٹیٹس آف احمد نگر بیجاپور اینڈ گولکنڈہ (Deccani Paintings in the States of Ahmed Nagar Bijapur and Golconda) میں گولکنڈے کی مصوری کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے شاہکاروں کو سراہا ہے[2]

کچھ عرصہ قبل جگدیش متل نے عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کی دو قدآدم

---

[1] جگدیش متل۔ پینٹنگ (مشمولہ) ہسٹری آف میڈیول دکن۔ جلد دوم۔ صـ ۲۳۳

[2] ڈوگلاس بیرٹ اینڈ بیزل گرے۔ دکنی پینٹنگس ان دی اسٹیٹس آف احمد نگر بیجاپور اینڈ گولکنڈہ انڈین پینٹنگ۔ صـ ۱۱۵ تا ۱۲۹۔

Marfat.com

تصویریں دریافت کی ہیں جو حیدر آباد کے سرکاری میوزیم میں موجود ہیں ان میں رنگوں کی اسکیم بہت عمدہ اور قابل ستائش ہے۔

عورتوں کی تصویریں اور گروپ سین، دکنی فضا میں تیار کیے گئے ہیں۔ گولکنڈے کے صورت گروں اور شبیہہ سازوں کی تصویروں میں جو لینڈ اسکیپ ہیں ان میں دکنی مناظر دکھائی دیتے ہیں مثلاً آم کے درخت جو پھولوں سے لدے ہوئے ہیں یا چمپا کے پودوں پر گلہریاں یا طوطے حرکت کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں جلوس کے مناظر کے علاوہ پورٹریٹ بھی بنائے گئے۔ بادشاہ، امراء، خواتین اور صوفیاء وغیرہ کی تصویریں تیار کی جاتی تھیں ان میں گہرے اور شوخ رنگ جو نظر فریب ہیں استعمال کیے گئے ہیں اس دور میں یورپی مصوروں کی تقلید کرنے والے مصور بھی موجود تھے۔ سیاح منوچی کو چند تصویریں دستیاب ہوئی تھیں جو ۱۶۷۶ء اور ۱۶۸۶ء کے درمیان تیار کی گئی تھیں "یودیوگا پاروا" مہابھارت کا ایک باب ہے اس کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ دہلی کے نیشنل میوزیم میں محفوظ ہے اور اسی طرح کی ایک تصویر حیدر آباد کے ریڈی ہاسٹل میں بھی موجود ہے۔ یودیوگا پاروا" دکنی اسٹائل" اور جنوبی ہند کی مخصوص مصوری کے امتزاج کا ایک خوشگوار نمونہ ہے۔ اس قسم کی تصویریں بقول جگدیش متل گولکنڈے کے ہندوؤں میں بہت زیادہ مقبول تھیں [1]

" کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا" میں ہارون خان شیروانی لکھتے ہیں کہ قطب شاہی مصوری پر ایرانی مصوری سے اثر پذیری کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۵۷۶ء میں ابراہیم قطب شاہ کے دور میں سات بڑے تصویرچے تیار کیے گئے تھے ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت قطب شاہی سلطنت میں ایرانی مصور موجود تھے اور مقامی مصوروں کے لیے ان کے آرٹ کے نمونے قابلِ حصول تھے۔ ڈاکٹر بارٹ، (Dr Barrett) کا خیال ہے کہ گہرے اور ہلکے فیروزہ رنگ، ہلکے سبز رنگ اور نارنجی رنگ کا استعمال "بخارا مصوری" سے اثر پذیری کا آئینہ دار ہے

---

[1] جگدیش متل پینٹنگ (مشمولہ) ہسٹری آف میڈیویل دکن - جلد دوم - ص ۲۲۴

Marfat.com

بخارا مصوری کا ایک رجحان یہ ہے کہ تصویر میں فرش اور پس منظر کے بیے سنہری رنگ استعمال کیا جاتا ہے۔ گولکنڈہ کے مصوروں نے اسے اپنایا ہے۔ "بخارا مصوری" کا ایک اور رجحان یہ ہے کہ تصویر کشی کے دوران تصویر کو افقی انداز میں تقسیم کر کے مصوری کے عمل کی تکمیل کی جاتی ہے۔ گولکنڈے کے فنکاروں کے یہاں اس کی بھی جھلک دیکھی جا سکتی ہے لیے ڈاکٹر چھاگاتائی (Chaghatai) لکھتے ہیں کہ شیخ احمد شریف کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" میں جو مختلف منیچر یا تصویر چے موجود ہیں وہ عہد محمد قلی قطب شاہ کی مصوری کے اچھے نمونے ہیں۔ اس مثنوی کے جو چند منتشر اوراق محمود شیرانی کو عبدالقادر نے دیئے تھے ان میں چودہ تصویر چے شامل تھے یہ ۱۹۲۵ء میں ٹونک میں موجود تھے لیکن اب ان کا پتہ نہیں چلتا۔ ڈچ سفیر لارنس پٹ (Laurence Pit) کے ذریعے سے ۱۶۸۶ء میں گولکنڈہ اسکول کا ایک نایاب البم امسٹرڈم (Amsterdam) پہنچا تھا اور آج بھی یہ یہیں محفوظ ہے اس البم میں بانی سلطنت محمد قلی سے لے کر ابوالحسن تانا شاہ تک تمام قطب شاہی سلاطین کی تصویریں موجود ہیں اور بعض اہم قطب شاہی امراء کی تصویریں بھی البم میں شامل ہیں ان تصویروں میں چہرے کے تاثرات بڑی خوش اسلوبی اور فن کارانہ مہارت کے ساتھ ابھارے گئے ہیں۔ قطب شاہی مصوری پر ایرانی مصوری کے اثرات کی وجہ ان دونوں ممالک کے خوشگوار تعلقات تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کا انقیاد نامہ (Deed of Sub mission) نے ریاست گولکنڈہ کو ایک دیسی حکومت میں تبدیل کر دیا جو مغلوں کے تابع تھی اس دور میں "دکنی اسکول" پر مغل مصوری کے رجحانات اثر انداز ہونے لگے۔ مصوری میں مغل اثرات کی کارفرمائی سیاسی اور تہذیبی حالات کا نتیجہ تھی اس کے باوجود "دکنی قلم" کی انفرادیت باقی رہی۔ یہ خیال درست نہیں کہ بیجاپور اور گولکنڈے کی مصوری مغل مصوری کی نقل ہے۔ قطب شاہی تصویروں میں جس انداز سے خارو خار [illegible] کے استعمال اور [illegible] ملبوسات کی تصویر کشی سے دکنی پینٹنگ کی انفرادیت واضح ہوتی ہے اور پتہ چلتا

لے ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرینڈس ان میڈیول انڈیا۔ ص ۶۱

Marfat.com

ہے کہ وہ مغل پینٹنگ سے مختلف ہے۔

منوچی (Manucci) کہتا ہے کہ میں نے سلطنت چھوڑنے سے پہلے تیمور لنگ سے لے کر اورنگ زیب تک کے تمام بادشاہوں کی تصویریں کھنچوائی تھیں۔ یہ مصور میر محمد میرا دوست تھا اس نے بیجاپور شاہان بیجاپور اور سلاطین گولکنڈہ کی تصویریں بھی اتاری تھیں۔ اس دور کی دو اور تصویریں بھی دستیاب ہوتی ہیں ان دونوں میں ایک ایک شخص کی تصویر ہے ایسی تصویریں "سولو پروٹریٹ" (Solo Portrait) کہلاتی ہیں ان میں سے ایک محمد قلی قطب شاہ کی ہے اس کے سیدھے ہاتھ میں پھول اور بائیں ہاتھ میں تلوار کا قبضہ ہے[1]

محمد قلی قطب شاہ نے اپنے قصر اور ایوانوں کو خوبصورت تصویروں سے سجایا تھا۔ دیواروں پر جو تصویریں اتاری گئی تھیں ان میں خود محمد قلی قطب شاہ کے دربار کی تصویر بھی ہے جس میں بقول نصیر الدین ہاشمی امراء عظام کے علاوہ شعراء اور اہل علم کو دربار میں ان کے مقررہ مقامات پر بتایا گیا تھا۔ دائیں جانب خسرو ایران اور بائیں جانب مغلیہ دربار کی تصویر بھی بڑے اہتمام کے ساتھ اتاری گئی تھیں۔ اس کے علاوہ مذہبی اور تاریخی واقعات کو بھی پینٹنگ اور رنگ کاری کے ذریعے سے پیش کیا گیا تھا۔ چھتوں پر طرح طرح کے نقش ونگار یا پریوں اور فرشتوں کی تصویریں کھینچی جاتی تھیں، ستونوں کو طلائی اور لاجوردی نقاشی سے مزین کیا جاتا تھا۔ عمارت کے مختلف حصوں میں مختلف ممالک کے بادشاہوں کی محفلوں کی تصویریں اتاری جاتی تھیں جن میں لوگ اپنے مخصوص قومی لباس میں جلوہ گر ہوتے۔ قطب شاہی بادشاہوں کی سواری اور جلوس کے مرقع بھی اتارے جاتے تھے ان میں بادشاہ اپنے لشکر، ماہی مراتب اور دیگر سامان حشمت وشکوہ کے ساتھ دکھائی دیتا[2]

عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کی دو تصویریں کچھ عرصہ قبل دریافت

---

[1] ہاردن خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈرس ان میڈیویل انڈیا۔ ص ۶۴

[2] نصیر الدین ہاشمی۔ دکنی کلچر۔ ص ۲۴۰

Marfat.com

ہوئی ہیں یہ دونوں دکنی قلم کی بھرپور نمایندگی کرتے ہیں۔ کپڑے پر پینٹنگ کرنے کا رواج قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کے آخری زمانہ میں بہت مقبول تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے جلوس کی جو تصویر اتاری گئی ہے اس میں محمد سعید میر جملہ اور دوسرے امراء کی حقیقی تصویریں موجود ہیں۔

جاوید وششٹ پرسی براؤن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس نے "دکھنی قلم" کو "دلی قلم" سے زیادہ شاندار قرار دیا ہے[1]

قطب شاہیوں کا موصلاتی نظام بہت باقاعدہ اور موثر تھا۔ ابراہیم قطب شاہ نے خبر رسانی کا ایک نیا طریقہ متعارف کروایا تھا تاکہ بادشاہ سرکاری عہدیداروں اور عوام سے ربط قایم رکھ سکے۔ اس نے کثیر تعداد میں رپورٹر مقرر کر دیے تھے جو دارالسلطنت میں مختلف مقامات پر پھیلے ہوتے تھے اور کوئی قریہ یا گاؤں ان سے خالی نہ تھا[2]۔ یہ رپورٹر براہ راست بادشاہ کو خبریں پہنچایا کرتے تھے۔ اس محکمے کی کارکردگی بہت عمدہ تھی۔ قطب شاہی سلاطین کے عہد میں خطوط رسانی کا بھی بہت معقول بندوبست تھا۔ جین بیپٹسٹ ٹیورنیر (Jean Baptist Tavernier) نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔

ٹیورنیر لکھتا ہے کہ محمد سعید میر جملہ خطوط کے جواب لکھوا کر پڑھواتا ہے اور خود مہر لگاتا ہے۔ ان میں کچھ خطوط اور مراسلے پیدل پیغامبروں کو دیے جاتے ہیں اور کچھ گھوڑا سوار پیغامبر لے جاتے ہیں۔ ٹیورنیر لکھتا ہے کہ پیدل پیغامبروں کے ذریعے سے بھیجے جانے والے خطوط منزل مقصود پر جلد پہنچ جاتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ہر چھ میل کے فاصلے پر جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں جن میں خطوط رساں ہمیشہ تیار بیٹھے رہتے ہیں اور فوراً آپہ وصول کرتے ہی لے کر دوڑنے لگتے ہیں جب خطوط رساں چھ میل کے بعد دوسری منزل کی جھونپڑیوں میں پہنچتا ہے تو زمین پر خط پھینک دیتا ہے کیوں کہ خط ہاتھ میں دینا بدشگونی تصور کی جاتی ہے خطوط رساں انھیں اٹھا

---

[1] جاوید وششٹ۔ ملا وجہی۔ ص ۱۳

[2] ایم اے نعیم۔ پوسٹل کمیونیکیشن۔ باب ہشتم۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن۔ جلد دوم۔ ص ۲۴۷

Marfat.com

کرکے فوراً بھاگنے لگتا ہے اور جلد از جلد دوسری منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ ایم اے نعیم قطب شاہی دور کے مواصلاتی نظام اور خطوط رسانی کے طریقے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سڑک کی دونوں جانب یا تو درخت لگے ہوئے ہوتے ہیں یا پتھروں پر چونا یا سفیدی لگادی جاتی ہے تاکہ برسات کی اندھیری راتوں میں یا تاریکی کے وقت خطوط رساں بھٹک نہ جائیں اور صحیح راستے پر گامزن ہو کر خطوط رساں تیزی کے ساتھ منزل پر پہنچ جائیں[1] جب فتح گندی کوٹہ کے بعد یہ مقام ریاست میں ضم ہوگیا تو گندی کوٹہ اور گولکنڈہ کے درمیان بہت معقول مواصلاتی نظام قایم کردیا گیا۔ جگدیش نارائن سرکار لکھتے ہیں کہ میر جملہ نے مواصلاتی نظام کو بہتر بنانے کے لیے۔ "ڈاک چوکیاں" قایم کی تھیں یہ چوکیاں حیدرآباد سے کرناٹک تک قایم کی گئی تھیں۔ اس محکمے کے لیے قطب شاہی سرکار کے بجٹ میں قابل لحاظ رقم مختص کی جاتی تھی[2] پناگنٹی تلی گٹاریا نے اپنی ادبی تخلیق "یاباتی چریترا ما" میں جو تلگو زبان میں لکھی گئی ہے قطب شاہی سلطنت کے سماجی حالات قلمبند کیے ہیں[3]

"دی اکنامک کنڈیشن آف گولکنڈہ ان دی سیونٹین سنچری" (The Economic Conditions of Golconda in the Seventeen - Century) میں محمد اطہر انصاری لکھتے ہیں کہ گولکنڈہ ایک متمول ملک تھا۔ مکئی، چاول، باافراط پیدا ہوتا تھا اور یہاں کے مویشی اور تجارتی اشیاء کی بہت شہرت تھی اس علاقے میں بکثرت "قدرتی تالاب" موجود تھے۔ جن سے مچھلی دستیاب ہوتی تھی اور دھان کی کاشت کی جاتی تھی۔ مسولی پٹنم اور مدرسا پٹنم کی بندرگاہیں اہم تجارتی مراکز تھے۔ کارومنڈل کے ساحل سے قطب شاہیوں نے بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات قایم کر رکھے تھے یہاں کے نفیس کپڑے جن پر نقش ونگار بنا ہوتا تھا بہت مقبول تھے۔ بارود قطب شاہی سلطنت میں تیار کی جاتی تھی اور یہاں لوہے کی بہت سی کانیں تھیں۔ پولی کٹ میں خالص بارود تیار کیا

---

[1] ایم اے نعیم۔ پوسٹل کمیونیکیشن۔ باب ہشتم۔ ہسٹری آف میڈیویل دکن۔ جلد دوم۔ ص ۲۴۷

[2] " " " ص ۲۴۸

[3] جی آر جی ہمبلی۔ اسٹڈیز آف ساؤتھ انڈیا۔ باب چہارم۔ ص ۵۸۸

Marfat.com

جاتا تھا۔ ٹن، سونا، چاندی، سیسہ، تانبا اور موم، چین، جاپان، سماترا، پیگو اور بنگال بھیجے جاتے تھے۔ پیداوار میں کالی مرچ، لہسن اور الائچی کی بیرونی ممالک میں بہت مانگ تھی۔ قطب شاہیوں کے مال بردار جہاز چین، مکہ، ہرمز، کوچین، مدغاسکر اور سیام وغیرہ کو سامان تجارت لے جاتے تھے اس کے علاوہ فرانس، پرتگال، ڈنمارک، اور انگلستان سے گولکنڈے کے تجارتی تعلقات استوار تھے[1] انگریز اور ڈچ کمپنیوں کو قطب شاہی سلاطین نے سکہ مضروب کرنے کی اجازت دی تھی۔ قطب شاہی عہد میں پگوڈا خالص سونے سے تیار کیا جاتا تھا۔ قطب شاہی "پیکا" "تانبے کا بنا ہوا ہوتا تھا اور روزمرہ لین دین میں استعمال ہوتا تھا اور بیرونی تجارت کے لیے پگوڈا استعمال کیا جاتا تھا۔

ابوالحسن تانا شاہ آخری قطب شاہی تاجدار تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت شاہ راجو کے سایہ عاطفت میں ہوئی تھی اور اسے شاہ راجو سے بیعت بھی تھی[2] ٹیورنیر ابوالحسن کو عبداللہ قطب شاہ کا رشتہ دار بھائی بتاتا ہے جو درست نہیں[3] اسی طرح تھیونو نے بھی اُسے قطب شاہی خاندان کا فرد تحریر کیا ہے[4] "ماثر عالم گیری" میں ابوالحسن کو عبداللہ قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد بتایا گیا ہے[5] لالہ جگ جیون داس مصنف "منتخب التواریخ" نے ابوالحسن کو "مرد بیگانہ" سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ ابوالحسن کو شاہی خاندان کا فرد نہیں سمجھتا اور نسل کے اعتبار سے مغل بتاتے ہوئے اُسے ہمدان کا باشندہ تحریر کرتا ہے[6] "مفتاح التواریخ" کے مورخ نے بھی ابوالحسن کو "باہر کا

---

[1] محمد اطہر انصاری۔ دی اکنامک کنڈیشن آف گولکنڈہ ان دی سیونٹین سنچری مشمولہ انڈین ہسٹری آف کانگرس پروسیڈنگ الہ آباد سیشن۔ ۱۹۶۶ء جلد ۱۱۔ صـ ۲۲۹

[2] بشیر الدین احمد۔ واقعات مملکت بیجاپور۔ جلد سوم۔ صـ ۲۸۱

[3] ٹیورنیر۔ سیاحت نامہ۔ جلد اول۔ صـ ۳۸

[4] تھیونو۔ سیاحت نامہ۔ جلد سوم۔ صـ ۱۰۱

[5] محمد ساقی مستعد خان۔ ماثر عالم گیری۔ صـ ۱۴۳

[6] لالہ جگ جیون داس، مخطوط منتخب التواریخ

Marfat.com

آدمی بتایا ہے جو فقیروں کا لباس اختیار کر کے سیاحت کرتا ہوا حیدر آباد پہنچا تھا۔ سیاحوں میں صرف اونگٹن (Ovington) نے ابوالحسن کو عرب بتایا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ ابوالحسن کا باپ عرب سے گولکنڈہ چلا آیا تھا اور یہاں اعلا خدمت پر فائز ہوا تھا اس کے انتقال کے بعد ابوالحسن فلاکت کا شکار ہو گیا لیکن سید مظفر کی کوششوں سے وہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد بن گیا۔ سید علی محسن کا خیال ہے کہ مفتاح التواریخ کے مورخ کا بیان اس لیے قابل قبول نہیں کہ یہ انگریز مورخ عہد مابعد سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے اس سلسلے میں "بے سروپا" باتیں بیان کی ہیں جس کی انتہا یہ ہے کہ اس نے عبداللہ قطب شاہ کے داماد کا نام بھی غلط تحریر کیا ہے اور اسے وہ "میران محمود" لکھتا ہے جب کہ اس کا اصل نام سید احمد تھا[1]

اس عہد کے تمام سیاح ابوالحسن کو شاہی خاندان کا ایک فرد بتاتے ہیں جس کی تصدیق تاریخوں سے بھی ہوتی ہے منوچی، ٹیورینز، تھیونو اور فرائر (Fryer) نے ابوالحسن کا تعلق قطب شاہی خاندان سے بتایا ہے۔ خافی خان نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ ابوالحسن اپنی ماں کی طرف سے شاہی خاندان کا قرابت دار تھا[2] "سرو آزاد" کے مصنف غلام علی آزاد بھی اسی خیال کے حامل ہیں[3] "گلزار آصفیہ" کے الفاظ "ابوالحسن در آقربائے قریبہ سلطان عبداللہ بود"[4] سے ابوالحسن کی شاہی خاندان سے قریبی رشتہ داری ظاہر ہوتی ہے۔ "ماثر عالمگیری" میں محمد ساقی مستعد خان نے اس قریبی رشتہ داری کی نوعیت بھی ظاہر کر دی ہے کہ ابوالحسن عبداللہ قطب شاہ کا بھتیجا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بیان کی دوسری تاریخوں سے تصدیق نہیں ہوتی غلام حسین

---

[1] سید علی محسن۔ زوال دولت قطب شاہیہ۔ صہ ۱۶۳

[2] خافی خان۔ منتخب اللباب۔ جلد سوم۔ صہ ۴۰۵

[3] غلام علی آزاد بلگرامی۔ سرو آزاد۔ صہ ۲۸۶

[4] غلام حسین خان۔ گلزار آصفیہ۔ صہ ۴۷

Marfat.com

جوہر" ماہ نامہ"، میں رقمطراز ہیں کہ ابوالحسن کا عرف تانا شاہ تھا اور وہ عین الملک کی اولاد سے تھا اور اس کا سلسلہ قطبیہ سے ملتا تھا۔ غلام حسین جوہر کا بیان اس لیے بھی قابل قبول اور مستند معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابوالحسن کے بھانجے ابو محمد خان سے ملاقات بھی کی تھی[1] محمد قادر خاں بیدری تحریر کرتا ہے کہ ابوالحسن" بیگم سلطان" کا قرابت دار تھا اور اس کا" قوم چغتائی" سے تعلق تھا۔

جے این چودھری لکھتے ہیں کہ عبداللہ قطب شاہ اولاد نرینہ سے محروم تھا اور اس کی صرف تین لڑکیاں تھیں[2] عبداللہ قطب شاہ کی تیسری شہزادی جس کا نام بادشاہ بی بی بتایا گیا ہے، سید سلطان نامی ایک" حجازی شریف زادے" سے منسوب ہو چکی تھی لیکن عبداللہ کے بڑے داماد سید احمد سے اس کی ان بن ہو گئی تھی اس لیے سید احمد نے اس شادی کی مخالفت شروع کر دی اور حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بادشاہ بی بی ابوالحسن کی شریک حیات بن گئی[3] ابوالحسن نے اپنی ابتدائی زندگی شاہ راجو کی خانقاہ میں گزار دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ابوالحسن کے مرشد شاہ راجو قتال نے پیشن گوئی کر دی تھی کہ شہزادی کا بیاہ ابوالحسن سے ہو گا اور وہی آئندہ قطب شاہی تخت و تاج کا مالک بنے گا جس طرح ابوالحسن کی شادی حیرت انگیز طریقے پر انجام پائی تھی اسی طرح اس کی تخت نشینی بھی ایک معجزہ سے کم نہ تھی۔ خافی خان نے" منتخب اللباب" میں ابوالحسن کے خانقاہ شاہ راجو سے شاہی حمام میں پہنچنے اور پھر" مروارید گراں بہاؤ" کا سہرا سر پر باندھنے" عراقی گھوڑے" پر جس کا ساز و سامان" مرصع الماس" کا تھا سوار ہو کر عقد کے لیے شاہی محل پہنچنے کے واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[4] شاہی محل میں بقول سید علی محسن ابوالحسن نے اپنی خوش اخلاقی سے سید مظفر اور موسیٰ محلدار کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور محل شاہی کے دیگر عہدے دار اور

---

[1] سید علی محسن۔ زوال دولت قطب شاہیہ۔ ص ۱۶۵

[2] جے این چودھری۔ دی مغل ایمپائر۔ باب ۱۴۔ ص ۴۷۷

[3] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۲۳۶

[4] خافی خان۔ منتخب اللباب۔ جلد سوم۔ ص ۳۱۰

Marfat.com

افراد بھی ابوالحسن کے صفات محمودہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے[1]

جب ۲۱ر اپریل ۱۰۸۳ھ میں عبداللہ قطب شاہ کا انتقال ہوگیا تو ابوالحسن کو خانہ جنگی کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ قطب شاہی تخت و تاج کے دعوے دار ابوالحسن کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے لیکن بالآخر ۵ر محرم $\frac{۱۰۸۳ھ}{۱۶۷۲ء}$ کو ابوالحسن کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا اور بقول اسٹینلی لین پول ۱۳ر محرم کو تخت نشینی کی اصل رسم ادا کی گئی[2] سید مظفر کو جو عبداللہ قطب شاہ کے آخری زمانے میں سرخیل کی خدمت پر مامور تھا "امیر الامراء" کا خطاب اور میر جملہ کا عہدہ عطا کیا گیا[3] اکنا اور مادنّا کو جو سگے بھائی تھے پیشکار بنا دیا گیا۔

ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں قطب شاہی سلطنت کا چراغ بھڑک رہا تھا اور مغل شہنشاہ کی حریص نظریں بیجاپور اور گولکنڈے پر بار بار پڑتی تھیں۔ اسٹینلی لین پول (Stanley Lane Poole) اپنی کتاب "اورنگ زیب" میں لکھتا ہے کہ مغل بادشاہ جنوب کی طرف ہمیشہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے کیوں کہ دکن میں چونسٹھ (۶۴) مضبوط قلعے موجود تھے جن میں ترپن[53] پہاڑوں پر بنائے گئے تھے اور ان کی آمدنی سالانہ پانچ کروڑ سے زیادہ تھی[4] شاروکو لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے تلنگانہ کے اضلاع پر حملے کی صورت میں اپنی دشمنی کے عملی اظہار کا آغاز کر دیا تھا[5] ابوالحسن تانا شاہ کا عہد حکومت بڑا ہنگامہ خیز اور پر آشوب رہا۔ مرہٹوں کی سرگرمیاں اپنے شباب پر تھیں ادھر مغل گولکنڈے پر حملہ کرنے کے موقعے کے منتظر تھے۔

۱۶۷۴ء میں شیواجی نے راج گڑھ کو اپنی راج دھانی بنا کر اپنے "چھترپتی"

---

[1] سید علی محسن۔ زوال دولت قطب شاہیہ۔ ص ۱۶۷

[2] اسٹینلی لین پول۔ اورنگ زیب (انگریزی)۔ ص ۱۲۱

[3] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۲۹۶

[4] اسٹینلی لین پول۔ اورنگ زیب۔ (انگریزی)۔ ص ۱۲۱

[5] شاروکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز (انگریزی) ص ۳۱

Marfat.com

ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ عادل شاہی علاقوں پر آہستہ آہستہ قبضہ کرتا جا رہا تھا۔ ۱۶۷۷ء میں شیواجی نے بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر گولکنڈہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت مغل فوج نے گلبرگہ اور نلدرگ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ شیواجی قطب شاہی سلطنت کے پایہ تخت حیدرآباد پہنچا اس نے دس برس بعد دوسری مرتبہ اس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گولکنڈے کے تعاون کے بغیر عادل شاہی علاقوں پر قبضہ کرنا اس کے لیے دشوار تھا۔ قطب شاہی دارالسلطنت میں شیواجی کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا اور وزیر مادنا نے انتظامات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس موقعے پر ایک معاہدہ مرتب ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ شیواجی کا ایک سفیر حیدرآباد میں متعین رہے گا اور تسخیر کرناٹک کے سلسلے میں قطب شاہی فوج اپنے توپ خانے کے ساتھ مرہٹوں کی اعانت کرے گی[1] مرہٹے قطب شاہی سلطنت کے لیے مستقل پریشانی کا باعث ثابت ہوئے۔ شارو کو لکھتا ہے کہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اکنا اور مادنا کے اشارے ہی پر ۱۶۷۷ء میں سمبھاجی مرہٹہ نے سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ حیدرآباد کا رخ کیا تھا اور ابوالحسن کو بصورت مجبوری ایک لاکھ ہون بطور خراج ادا کرنے پڑے تھے[2] اکنا اور مادنا کا اثر و رسوخ اتنا بڑھ گیا تھا کہ مدراس کی انگریزی کمپنی انھیں قیمتی تحائف بھیجا کرتی تھی۔ انگریز کمپنی نے بطور کرایہ سالانہ رقم ادا کرنے کا معاہدہ کیا تھا وہ مسولی پٹنم سے ابوالحسن کے بجائے اکنا اور مادنا کو بیش قیمت تحفے بھیجا کرتی تھی[3]

اپنے زمانہ شہزادگی میں جب اورنگ زیب دکن کا وائسرائے تھا اس نے جنوب کی دو آزاد سلطنتوں یعنی قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہت کا خاتمہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور جب عالمگیر کو موقعہ ملا تو اس نے میر جملہ کو آلہ کار بنا کر قطب شاہی سلطنت میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ۱۶۸۳ء میں

---

[1] سید علی محسن۔ زوال دولت قطب شاہیہ۔ ص ۲۲۱

[2] شارو کو۔ گولکنڈہ اینڈ قطب شاہیز۔ ص ۳۰

[3] " " " " ص ۳۰

Marfat.com

اورنگ زیب نے مغل سلطنت کی فوجوں کو منظم کر کے انھیں دکن پر حملہ کرنے کے لیے تیار کرلیا۔ ۱۶۸۵ء میں اورنگ زیب نے تلنگانہ کے بعض اضلاع کو مغل علاقے کا حصّہ قرار دے دیا۔ کچھ عرصے تک قطب شاہی فوجیں مقابلہ کرتی رہیں۔ قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں میں دوستانہ تعلقات تھے اور مغلوں کے حملے کے وقت متحد ہو جانے میں وہ اپنی فلاح اور سلامتی محسوس کرتے تھے اس نے جب ۱۶۶۵ء میں عبداللہ قطب شاہ اور ۱۶۸۵ء میں ابوالحسن تاناشاہ نے بیجاپور پر مغل حملے کے وقت بیجاپور کی اعانت کے لیے اپنی فوجیں روانہ کی تھیں۔ مغل حملہ آور اس کو شمال کی شہنشاہیت کے خلاف قطب شاہی بادشاہوں کا ایک بہت سنگین جرم تصور کرتے تھے چنانچہ یہ بھی اورنگ زیب کے حملے کا ایک بہانہ بن گیا۔ جولائی ۱۶۸۵ء میں شاہ عالم نے دکن کی طرف پیش قدمی شروع کر دی بقول شارو کو اس وقت قطب شاہی فوج میں چالیس تا ستر ہزار سپاہی صف آرا رکھتے۔ وہ محمد ابراہیم کی سرکردگی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ شاہ عالم اپنے اطالوی طبیب منوچی (Manucci) کے ساتھ وارد دکن ہوا تھا لیکن منوچی غیر ضروری طور پر جنگ میں ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا چنانچہ اس نے گولکنڈے کے سپہ سالار محمد ابراہیم سے مدد طلب کی ایک دن اس نے اپنے دوست تھامس گڈ کے خیمے میں شاہ عالم کے جاسوسوں کو شراب پلا کر مدہوش کر دیا اور بھاگ کر محمد ابراہیم کے خیمے میں پناہ لی۔ یہاں سے وہ بادشاہ گولکنڈہ کی بہن کے علاج کے لیے تین دن کی مسافت طے کر کے گولکنڈہ پہنچا۔ یہ شہزادی اختلاج قلب کے مرض میں مبتلا تھی [1]

خافی خان رقمطراز ہے کہ اورنگ زیب نے مرزا محمد مشرف کو گولکنڈے کی سفارت پر روانہ کیا تھا تاکہ وہ یہاں کے اصل حالات سے شہنشاہ کو آگاہ کرے۔ عالم گیر نے ابوالحسن سے ادائیگی "پیش کش" میں دو ایسے الماس طلب کیے تھے جن کا وزن ڈیڑھ سو قراط سے کم نہ تھا یہ دراصل قطب شاہیوں سے جنگ کا

---

[1] شارو کو۔ گولکنڈہ اینڈ قطب شاہیز۔ (انگریزی)۔ ص ۳۳

[2] خافی خان۔ منتخب اللباب۔ جلد سوم۔ ص ۴۱۳

Marfat.com

ایک بہانہ تھا اور بقول سید علی محسن" اورنگ زیب کی یہ ہدایت اس کے غاصبانہ اور جارحانہ منصوبوں کو صاف طور پر ظاہر کرتی ہے۔ دکنی ریاستوں کے ساتھ اس کی زیادتی اور ناانصافی کو ظاہر کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کیا دلیل مل سکتی ہے"[1]؟

محمد امین، اکنّا اور مادنّا کے اقتدار حاصل کرنے کی وجہ سے سلطنت گولکنڈہ سے ناراض تھا۔ اس نے جنگ میں جان بوجھ کر مغلوں کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ حالانکہ قطب شاہی لشکر میدان جنگ میں کثیر تعداد میں موجود تھا۔" گولکنڈہ اینڈ قطب شاہیز" کا مورخ لکھتا ہے کہ وہ اتنی بڑی فوج کے ساتھ مغل حملے کو باسانی روک سکتا تھا[2] ابوالحسن تانا شاہ نے جنگ کا نقشہ دیکھتے ہوئے مادنّا کے مشورے کے خلاف قلعہ گولکنڈہ کا رخ کیا اور دوسرے امرائے عظام بھی اپنے خاندانوں اور متوسلین کے ساتھ قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ شہر حیدرآباد میں لوٹ مار شروع ہو گئی۔ دوسری مرتبہ شہر حیدرآباد میں مغلوں کا داخلہ ۸ر اکتوبر ۱۶۸۵ء میں ہوا تھا۔ ابوالحسن گوشہ محل سے سرنگ کے ذریعے گولکنڈہ پہنچ گیا تھا۔ شہزادہ شاہ عالم کی سفارش پر اورنگ زیب نے ابوالحسن کی جاں بخشی کرنے کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ بیس لاکھ ہون کا تاوان جنگ ادا کیا جائے اکنّا اور مادنّا برطرف کر دیے جائیں[3] مالکنڈم اور سیرم اورنگ زیب کو واپس کر دیے جائیں۔ ۷ر جون ۱۶۸۶ء کو مغلوں نے قطب شاہی علاقوں کا تخلیہ کر دیا اور بیجاپور کی طرف متوجہ ہوئے اور حیدرآباد میں کچھ عرصہ سکون رہا۔

۲۸ر جنوری ۱۶۸۷ء کو اورنگ زیب حیدرآباد سے دو میل کے فاصلے پر پہنچ گیا اور ابوالحسن نے پھر قلعہ گولکنڈہ کا رخ کیا اور تیسری مرتبہ مغلوں نے شہر حیدرآباد پر غازی الدین فیروز جنگ کی قیادت میں حملہ کر دیا۔ مغلوں نے قلعہ گولکنڈہ کا محاصرہ کر لیا۔ سمبھاجی مراہٹہ ابوالحسن تانا شاہ سے کیے ہوئے معاہدے کی رو سے حملہ آوروں کی رسد روکنے پر مامور تھا۔ اس کے علاوہ قحط نے مغل

---

[1] سید علی محسن۔ زوال دولت قطب شاہیہ۔ ص ۲۴۴

[2] شاروکو۔ گولکنڈہ اینڈ قطب شاہیز۔ (انگریزی) ص ۳۳

[3] " " " ص ۳۵

Marfat.com

فوجوں کے بے دشواریاں پیدا کر دیں۔ شیواجی کی سرگرمیاں مغل علاقوں میں بھی جاری تھیں۔ منشی محمد کاظم نے اپنی تاریخ "تاریخ عالم گیری" میں ان کی تفصیل بیان کی ہے۔[1]

۱۶ رمئی ۱۶۸۷ء کی رات کو مغل سپہ سالار فیروز جنگ شب خون کے ارادے سے قلعے کے قریب اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہنچا لیکن ایک آوارہ کتّے نے بھونکنا شروع کر دیا اور قطب شاہی سپاہی جاگ اٹھے۔ قلعے پر چڑھنے کے لیے فیروز جنگ[2] اور اس کے ساتھیوں نے جو سیڑھیاں لگائی تھی انھیں خندق میں الٹ دیا اور اس طرح شب خون کو ناکام بنا دیا گیا۔ کتّے کے گلے میں جواہرات کا پٹہ باندھ کر اسے اعزاز بخشا گیا۔ اس وقت مغل فوج میں یہ افواہ پھیل گئی کہ شب خون کامیاب رہا اور مغل سپاہیوں نے قلعہ تسخیر کر لیا ہے۔ جب یہ خوشخبری عالم گیر تک پہنچی تو اس نے فتح کے نقارے بجوائے لیکن بہت جلد حقیقت حال معلوم ہو گئی اور غلط فہمی کا ازالہ ہو گیا۔ نعمت خاں عالی نے اس موقعے پر ایک ہجویہ قصیدہ کہا تھا۔

نوید فتح و ظفر چوں بہ بادشاہ رسید

گولکنڈے میں چوں کہ مسلمان بادشاہ حکمراں تھے اسی لیے بقول خافی خاں اور سید علی محسن، عالم گیر نے قاضی شیخ الاسلام اور قاضی عبداللہ سے جب اس معاملے میں فتویٰ طلب کیا تھا تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ گولکنڈہ "دارالحرب" نہیں اس اعتبار سے اس پر حملہ جائز نہیں[3] سید علی محسن نے "حدیقۃ العالم" کے حوالے سے لکھا ہے کہ مغلوں نے حیدرآباد کا نام "دارالجہاد" رکھا تھا[4]

---

[1] منشی محمد کاظم۔ مخطوطہ تاریخ عالم گیری۔ مخطوطہ نمبر ۔۴۶۔ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی۔

[2] فیروز جنگ آصف جاہ اول بانی سلطنت آصفیہ کے والد اور چین قلیچ خان ان کے دادا تھے۔ یہ دونوں مغل فوج کے ساتھ یہاں آئے تھے لیکن محاصرہ میں چین قلیچ خان مارا گیا اور فیروز جنگ شدید زخمی ہوا تھا۔

[3] (ا) خافی خان۔ منتخب اللباب۔ جلد دوم۔ صـ۳۴۴

(ب) سید علی محسن۔ زوال دولت قطب شاہیہ۔ صـ۲۸۳

[4] صـ۳۱۴

Marfat.com

چوں کہ فیروز جنگ دو مرتبہ لڑائی میں شدید زخمی ہوا تھا اس لیے اورنگ زیب نے اپنے تیسرے بیٹے شہزادہ اعظم کو سپہ سالار بنا دیا۔ مورخ گولکنڈہ شارو کو لکھتا ہے کہ اورنگ زیب کی فوجوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اسی اثناء میں مغل فوج میں نیا جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے یہ اعلان کر دیا گیا کہ گولکنڈہ کے خلاف جنگ کرنا ضروری ہے اور گولکنڈہ "دارالجہاد" ہے[1]

۱۳ ستمبر ۱۶۸۶ء مطابق ۹۷-۱۰ھ میں بیجاپور فتح کرنے کے بعد مغل فوج نے تسخیر گولکنڈہ کے ارادے سے جنوب کا رخ کیا تھا عالم گیر آہستہ آہستہ سفر کرتے ہوئے گلبرگہ آیا وہاں خواجہ بندہ نوازؒ کی درگاہ کی زیارت کی اور اس کے بعد بیدر پہنچا۔ سعادت خان حاجب کے ذریعے سے یہ فرمان روانہ کیا گیا تھا کہ ابوالحسن زرپیش کش نذر دے جس پر نوخوانچے جواہرات کے ابوالحسن نے بطور امانت عالم گیر کی خدمت میں روانہ کیے تھے۔ بقول عبدالمجید صدیقی، عالم گیر ابوالحسن کو دھوکے میں رکھنا چاہتا تھا کہ اس کا مقصد فوج کشی نہیں ہے اس لیے ابوالحسن جنگی تیاری سے غافل رہا[2]

جب عالم گیر حیدرآباد سے دو منزل فاصلے تک پہنچ گیا تو ابوالحسن نے صلح کی درخواست کی جو بے اثر ثابت ہوئی۔ اب مجبوراً ابوالحسن نے مقابلے کی تیاری شروع کر دی۔ شیخ منہاج اور مصطفیٰ خان لاری کو جس کا اصلی نام عبدالرزاق تھا مغلوں کا مقابلہ کرنے کی ہدایت کی۔ خافی خان کہتا ہے کہ ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء کو مغل فوجوں نے قلعہ گولکنڈہ کا محاصرہ کر لیا اور جنگ کا آغاز ہو گیا۔ مغلوں نے انیس سو برق انداز چار ہزار اہشام اور ایک سو چھ توپوں کے ساتھ یلغار کر دی[3] فروری ۱۶۸۷ء کو اورنگ زیب قلعہ کی فصیل کے قریب پہنچ گیا۔ قحط، شدید بارش اور دوسری دشواریوں کے باوجود مغل قلعہ کی تسخیر کی کوشش کرتے رہے۔ نعمت خان عالی

---

[1] شارو کو۔ گولکنڈہ اینڈ قطب شاہیز (انگریزی)، ص ۴۰

[2] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۲۹۶

[3] خافی خان۔ منتخب اللباب۔ جلد دوم۔ ص ۳۲۸

Marfat.com

نے محاصرہ گولکنڈہ کے ایام میں جو مصیبتیں اٹھائی تھیں ان پر ایک شہر آشوب لکھا تھا[1] جب مغلوں کو قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے پانچ مہینے گزر گئے تو ایک اور مرتبہ ابوالحسن نے عالم گیر سے صلح کی کوشش کی جس کے جواب میں محاصرہ سخت کر دیا گیا اور قلعے کے اردگرد مورچے قایم کر دیے گئے۔ توپوں کے ذریعے سے قلعہ کی فصیل کو مسمار کرنے کی کوشش کی جانے لگی آخر شوال تک محاصرے کے آٹھ مہینے مکمل ہو گئے۔ "ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا" میں پی این چوپرا اور این سبرامنیم لکھتے ہیں کہ قلعہ کی حفاظت کا کام سپہ سالار عبدالرزاق لاری کے ذمے تھا۔ اورنگ زیب نے اس سے خفیہ معاہدہ کرنا چاہا لیکن مصطفیٰ خان لاری نے مغل پیش کش کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ "میں مرنے تک ابوالحسن تانا شاہ کے لیے لڑتا رہوں گا"[2] ستمبر ۱۶۸۷ء میں عبداللہ خان پنّی نے جو افغانی سپاہی تھا[3] ہوس اقتدار و زر میں مغل فوجوں سے سازباز کر لیا اور یہ طے پایا کہ ۲۱ ستمبر کی رات کو وہ قلعے کی "کھڑکی" پر نگرانی کے لیے متعین رہے گا اور مغل فوجوں کو قلعے کے اندر داخل ہونے کا موقع فراہم کرے گا چنانچہ ۲۴ ذیعقدہ ۱۰۹۸ھ مطابق ۲۱ ستمبر ۱۶۸۷ء کو رات کے تین بجے مغل فوج اس دروازے سے جو ان کے داخلے کے لیے کھلا رکھا گیا تھا قلعے میں داخل ہو گئی[4] سپہ سالار روح اللہ، مختار خان اور رن مست خان، صف شکن خان اور جانباز خاں اندر آ گئے اور محل کی طرف بڑھنے لگے۔ شرزہ خان، مصطفےٰ خان لاری اور دوسرے "سردارانِ مبارز پیشہ" کی علو ہمتی کو خافی خان نے "منتخب اللباب" میں بہت سراہا ہے[5] شہزادہ محمد اعظم فتح دروازے کے قریب اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ موقعہ پا کر وہ اپنے لشکر جرار کے ساتھ

---

[1] خافی خان۔ منتخب اللباب۔ جلد دوم۔ ص ۳۴۴

[2] پی این چوپرا اور این سبرامنیم۔ ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ جلد دوم۔ ص ۱۳۵

[3] " " " " " ص ۱۳۵

[4] محمد ساقی مستعد خاں (مترجم فدا علی طالب) مآثر عالم گیری۔ ص ۲۰۱

[5] خافی خان۔ منتخب اللباب۔ جلد دوم۔ ص ۳۲۸

Marfat.com

قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوگیا۔ جب عبدالرزاق لاری کو یہ خبر ملی تو اس نے فوراً بقول شارو کو اپنی تلوار کھینچ لی اور اپنے بارہ ساتھیوں کے ساتھ جو گھوڑوں پر سوار تھے مغل حملہ آوروں پر حملہ کر دیا اور ان کی پیش قدمی روک دی۔ اس مورخ کے الفاظ میں عبدالرزاق لاری زخموں سے چور تھا لیکن اس کے باوجود بڑی پامردی اور بے جگری سے مغل فوجوں کا مقابلہ کرتا رہا۔" تاریخ رشیدالدین خانی" کا مورخ لکھتا ہے کہ عبدالرزاق لاری اور اس کے بارہ باہمت ساتھی مغلوں کے کثیر لشکر کا مقابلہ نہ کر سکے اور جان توڑ کوشش کے باوجود مدافعت میں ناکامی ہوئی[1] خافی خان کے الفاظ میں مغل فوج کے سیلاب کے سامنے ان کی حقیقت ایک قطرے کی سی تھی[2] عبدالرزاق لاری بُری طرح مجروح ہو چکا تھا اس لیے گھوڑے کی باگ ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اسپ وفادار نگینہ باغ میں ایک ناریل کے درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا[3] شارو کو لکھتا ہے کہ خون بہنے کی وجہ سے عبدالرزاق لاری بے ہوش ہو گیا تھا۔ گھوڑے نے جب اسے زمین پر اتار دیا تو دوسرے دن اس کی شناخت کر لی گئی۔ عالم گیر نے ایک یورپی اور ایک ہندو حکیم کو اس کے علاج پر مامور کیا ان طبیبوں نے لاری کے جسم اور چہرے پر ستر زخم دیکھے تھے اور اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ عالم گیر نے عبدالرزاق لاری کو مغل فوج میں سپہ سالار کا عہدہ دینے کی پیش کش کی لیکن لاری نے انکار کر دیا۔ اورنگ زیب نے کہا تھا قطب شاہی فوج میں چند اور لاری ہوتے تو قلعہ گولکنڈہ کبھی فتح نہیں کیا جا سکتا تھا[4]

قلعہ تسخیر کر لیا گیا تو مغل سپاہ میں فتح کے نقارے بجنے لگے میر عبدالکریم ملتف خان نے" فتح گولکنڈہ مبارکباد" سے سقوط گولکنڈہ کی تاریخ اخذ کی تھی[5] محمد ساقی لکھتا

---

[1] غلام امام خان قرین ہجر۔ تاریخ رشیدالدین خانی۔ ص ۲۳۲

[2] خافی خان۔ منتخب اللباب۔ جلد دوم۔ ص ۳۶۲

[3] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۳۰۸

[4] شارو کو گولکنڈہ اینڈ قطب شاہیز (انگریزی)۔ ص ۴۱

[5] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۳۱۳

Marfat.com

ہے کہ مرزا محمد حاجی المعروف بہ خان نے یہ تاریخ فتح نظم کر کے عالم گیر کے ملاحظہ میں پیش کی تھی ؎

از نصرت بادشاہ غازی　　گر دیدِ دل جہانیاں شاد
آمد بعلم حسابِ تاریخ　　شد فتح بہ جنگ حیدر آباد [1] ۱۰۹۷

جعفر زٹلی نے عالم گیر پر طنز کیا تھا ؎

زہے دھاکِ اورنگ شاہ بلی　　در اقلیم دکن پڑی کھلبلی
درین پیرسالی و ضعف بدن　　مچا دی دھما چوکڑی در دکن
زہے حکمت شاہ اورنگ زیب　　لڑا دے کٹا دے بہ بغض و فریب
چہ بیجاپور است و چہ کرناٹک است　　چہ آن گولکنڈہ کہ یا پھاٹک است

اس موقع پر ابوالحسن تانا شاہ نے جس وقار و تمکنت اور بلند حوصلے کا ثبوت دیا تھا اس کے قصّے آج بھی حیدرآباد میں زبان زد خاص و عام ہیں" ماہ نامہ، منتخب اللباب" اور" تاریخ اورنگ" (جلد چہارم) کے مورخین نے ابوالحسن کی ہمت اور ضبط و تحمل کو بہت سراہا ہے اور اس سلسلے میں بعض سبق آموز قصّے بھی بیان کیے ہیں [2] مورخین لکھتے ہیں کہ جب قلعہ فتح کر کے مغل سپہ سالار مختار خان اور روح اللہ ابوالحسن کو گرفتار کرنے آئے تو اس نے سلام کیا اور بڑے تمکنت اور وقار کے ساتھ شاہی مسند پر انھیں بٹھایا۔ جب خاصہ تیار ہونے کی اطلاع ملی تو ان مغل سرداروں کو تناول طعام کی دعوت دی۔ مغل سپہ سالاروں نے ابوالحسن سے جب اس اطمینان و سکون کا سبب دریافت کیا تو اس نے کہا تھا کہ خدا کا منشا اگر یہ ہے کہ میں فقیر بن جاؤں تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔ ڈاکٹر این ایچ انصاری نے" کرانیکلز آف دی سیج آف گولکنڈہ (Chronicales of the Seige of Golconda) میں فتح گولکنڈہ کے مفصل واقعات قلمبند کیے ہیں ان سے ابوالحسن تانا شاہ کی سیرت اور اس کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ مورخ ابوالحسن کی علوہمتی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

---

[1] محمد ساقی مستعد خان (مترجم فدا علی طالب)۔ مآثر عالم گیری۔ ص ۱۸۱
[2] 〃 〃 〃 ص ۲۰۱

Marfat.com

اس کی اعلا ظرفی اور خودداری کا یہ حال تھا کہ اس نے عالم گیر کی منت و سماجت نہیں کی بلکہ نہایت باوقار انداز میں حالات کا مقابلہ کیا تھا[1] جب اورنگ زیب گولکنڈے کی فوج کشی سے فارغ ہوا تو ۱۰۹۸ھ میں بیدر واپس ہوگیا اور تاناشاہ کو بقول جے این چودھری جاں نثار خان کے ہمراہ قلعہ دولت آباد میں نظر بند کر دیا گیا[2] یہاں اس نے چودہ سال گزارے اور دولت آباد کے چینی محل میں جمعرات ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں رحلت کی شاردکو نے تاناشاہ کا سنہ وفات ۱۷۰۴ء تحریر کیا ہے جو درست نہیں اور لکھتا ہے کہ اس کو "روضہ" میں سپرد خاک کیا گیا تھا[3] ابوالحسن تاناشاہ کی عمر کی تقسیم اس طرح ہے کہ اس نے چودہ سال تحصیل علم اور چودہ سال حاضر باشی خدمت مرشد میں بسر کیے، چودہ سال حکومت کی اور پھر چودہ سال دولت آباد کے چینی محل میں قید رہا۔ تاریخ رشید الدین خانی کے مورخ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے[4]

قطب شاہی سلطنت کی تباہی کے بعد شہر حیدرآباد ویران ہوگیا۔ نظام علی خان نے جب ۱۱۸۴ھ میں اورنگ آباد "خجستہ بنیاد" کے بجائے حیدرآباد "فرخندہ بنیاد" کو پایہ تخت بنایا تو پھر اس شہر کی قسمت جاگ اٹھی۔ نعمت خان عالی نے جو شہر حیدرآباد کی تباہی و بربادی کا چشم دید حال اپنے قصیدے میں نظم کیا ہے وہ شیخ سعدی کے مرثیے زوال بغداد کی یاد دلاتا ہے اور داغ کے شہر آشوب کے انداز کی نظم معلوم ہوتی ہے جو اس نے زوال دلی پر کہی تھی یا ابن رشید نے زوال اندلس پر جو مرثیہ کہا تھا اس کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ نعمت خاں عالی کہتا ہے ؎

در ایں ملک خراب امروز کس را نیست سامانے
چو گنج افتادہ اند اہلِ ہنر در کنج ویرانے
بہ آں حد رسیدہ خلق را افلاس و ناداری

---

[1] ڈاکٹر این ایچ الفاری۔ دی کرانیکلز آف دی سیج آف گولکنڈہ ص ۲۹

[2] جے این چودھری۔ دی مغل ایمپائر۔ چودھواں باب۔ ص ۴۷۹

[3] شاردکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز۔ (انگریزی)۔ ص ۴۲

[4] غلام امام خان ترین ہجر۔ تاریخ رشید الدین خانی۔ ص ۲۳۲

Marfat.com

کہ معنیٰ ہم ندارد ایں زماں حرف سخن دانے
یکی گفتہ خداوندا بہ حق نوح پیغمبر
برائے قلعہ گولکنڈہ کن ایجاد طوفانے۔ [1]

مغل مورخین نے ابوالحسن تانا شاہ کے کردار کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ عالم گیر کے دکن پر حملے کا جواز پیش کیا جا سکے۔ مغل دربار کا مورخ محمد ساقی مستعد خان نے ابوالحسن تانا شاہ کو "بوالہوس" تحریر کیا ہے اور خافی خان اس کے کردار کو "قبیح" بتاتا ہے [2] محمد ساقی مستعد خان "ماثر عالم گیری" میں لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے ابوالحسن تانا شاہ کو فرامین روانہ کیے تھے کہ وہ فسق و فجور اور بدعت و گناہ سے اجتناب کرے [3] خافی خان اور ٹیورنیر کا بیان ہے کہ چوں کہ ابوالحسن تانا شاہ کے عادات و اطوار ٹھیک نہیں تھے۔ اس لیے عبداللہ قطب شاہ نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی تھی "ماہ نامہ" کا مورخ لکھتا ہے کہ ابوالحسن فقراء کے لیے شاہ راجو قتال کی خانقاہ میں بھنگ اور گانجہ کی فراہمی کا انتظام کیا کرتا تھا [4] سید علی محسن مسٹر بندرے کی مرہٹی کتاب "گولکنڈہ میں انقلاب" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ شاہ راجو قتال کی خانقاہ سے چودہ برس تک وابستہ رہا ہے [5] اس سے بھی ہم اس کی زندگی اور سیرت کے بارے میں اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مغل مورخین نے ابوالحسن تانا شاہ کو بدکردار اور عیاش بادشاہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے بقول مورخ دکن عبدالمجید صدیقی "مغل اپنی دست درازی کو حق بجانب ثابت کرنا چاہتے تھے" [6] شاروکو نے بھی ابوالحسن تانا شاہ کو ایک "شائستہ" انسان تحریر کیا ہے [7]

---

[1] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۳۲۳
[2] خافی خان۔ منتخب اللباب۔ جلد دوم۔ ص ۳۴۲
[3] محمد ساقی مستعد خان (مترجم محمد فدا علی طالب)۔ ماثر عالم گیری۔ ص ۱۹۳
[4] غلام حسین خان جوہر۔ مخطوطہ ماہ نامہ۔ مخطوطہ نمبر ۵۶۰۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ورق ۱۳۱۔
[5] سید علی محسن۔ زوال دولت قطب شاہیہ۔ ص ۱۶۷
[6] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ ص ۳۲۵
[7] شاروکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز۔ ص ۳۰

Marfat.com

تین مرتبہ مغل فوجوں کے ہاتھوں تاراج ہونے کے باوجود قطب شاہی خزانہ معمور تھا ان کے یہاں اکسٹھ لاکھ پچاس ہزار سونے کے ہون دو کروڑ ترپن ہزار روپیہ ایک سو پندرہ کروڑ سولہ لاکھ تانبے کے سکے اور اس کے علاوہ سونے اور جواہرات کا کوئی حساب نہ تھا۔[1] قلعہ میں داخل ہو کر مغل فوجوں نے لوٹ مار شروع کردی تھی" ماہ نامہ" کا مورخ لکھتا ہے کہ جب ابوالحسن تاناشاہ قلعے سے رخصت ہونے لگا تو اس نے اپنا ہاتھی منگوایا۔ مہاوت خان نے اپنا ہاتھی حاضر کیا۔ سلطان نے عورتوں کو دلاسا دیا اور کہا کہ خدا نے چند روز کے لیے مجھے اس حکومت پر مامور کیا تھا اور اس نے اب یہ کام دوسرے کے سپرد کردیا ہے۔ ابوالحسن تاناشاہ اور ان کا ہمشیرزادہ ابو محمد خان ہاتھی پر سوار ہوئے اور فتح دروازے کے راستے سے آہستہ آہستہ قلعے سے باہر نکلے اس منظر کی مرقع کشی کرتے ہوئے غلام حسین خاں جوہر[2] لکھتا ہے کہ ابوالحسن تاناشاہ نے " روئے خود را بطرف روضہ سید راجو حسینی کردہ کرات و مرات سجدات تقدیم رسایند" اور اس طرح ۱۰۹۸ھ میں ابوالحسن تاناشاہ کی گرفتاری اور سقوط گولکنڈہ کے ساتھ تاریخ دکن کے ایک زرّین دور کا اختتام عمل میں آیا۔ "وقائع نعمت خان عالی" میں فتح گولکنڈہ کے بارے میں یہ اشعار قلمبند کیے گئے ہیں ؎

سال تاریخش از خرد جستم
ایں چنیں گفت عقل خوش تقریر

---

[1] شاروکو۔ گولکنڈہ اینڈ دی قطب شاہیز۔ ص ۴۲

[2] غلام حسین خان جوہر۔ مخطوطہ ناہ نامہ۔ مخطوطہ نمبر ۔ ۵۶۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ورق ۱۳۳۔

Marfat.com

بوالحسن داشت جابہ چار محل
بدرش کردزاں میاں تقدیر
چوں بروں رفت اوبجائش نشست
شاہ اورنگ زیب عالم گیر[1]

[1] نعمت خان عالی۔ مخطوطہ وقائع نعمت خان عالی۔ مخطوطہ نمبر ۱۹۸۴ ۔
ادارہ ادبیات اردو ۔ ص ۱۱۵ ۔

Marfat.com

تیسرا باب

شمالی ہند میں اردو شاعری ۱۶۰۰ء تک

قدیم اردو ادب میں نثر کے مقابلے میں شاعری کا ذخیرہ کہیں زیادہ ہے۔ ۱۶۰۰ء تک کی اُردو نثر پر ساتویں باب میں غور کیا جائے گا لیکن اس دور کی شاعری کو تین باب دیے گئے ہیں جن میں بالترتیب شمالی ہند، دکن اور گجرات کی شاعری کا جائزہ لیا جائے گا۔ موجودہ باب کا موضوع سولہویں صدی کے آخر تک شمالی ہند میں اردو شاعری ہے۔ اس جائزے میں گجرات کو شامل نہیں کیا گیا کیوں کہ گجرات کے دکن سے قرب کی وجہ سے گجری دکن کی ایک بولی سمجھی جاتی ہے۔

علاقے اور زمانے کا تعین کرنے کے بعد ہمارے سامنے جو سب سے بڑی مشکل آتی ہے وہ یہ ہے کہ کس زبان اور کس تخلیق کو اردو کہا جائے اور کس کو ہندی؟ کیا اردو کے تحت برج بھاشا، اودھی یا پنجابی کے ایسے اشعار کو لیا جا سکتا ہے جن میں جزو غالب کھڑی بولی کا ہے اور برج بھاشا یا پنجابی وغیرہ کے ایک دو الفاظ ہی ہیں۔ یا پھر اردو کو صرف کھڑی تک محدود رکھا جائے۔

اردو اور ہندی کی حدود طے کرنے کے لئے ذخیرۂ الفاظ اور رسم الخط سے آپ حد تک رہ نمائی ہوتی ہے لیکن رسم الخط بالکل خارجی چیز ہے جو زبان کی تعیین میں کوئی حصہ ادا نہیں کر سکتا۔ سترھویں صدی عیسوی کے بعد کے اردو ادب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں عربی فارسی اصل کے الفاظ کافی ہوتے ہیں اور سنسکرت الاصل الفاظ بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن سولہویں صدی سے قبل کے اردو شعری نمونوں میں یہ خصوصیت نہیں۔ ان کی زبان میں ٹھیٹھ ہندی الفاظ کا غلبہ ہے بجز فارسی اردو آمیز لفظوں کے

Marfat.com

صدی میں صورتِ حال بین بین ہے۔

ہمارے تصوّر میں ادب کی سطح پر اردو اور ہندی شاعری میں ایک اہم مابہ الامتیاز فرق یہ ہے کہ اردو شاعری بالعموم عربی فارسی عروض میں ڈھالی جاتی ہے اور ہندی شاعری پنگل کے اوزان میں، لیکن قدیم اردو شاعری، تختوں کے استثنیٰ کے ساتھ، شاذ ہی عربی عروض میں ہوتی ہے۔ یہ پنگل کے اوزان میں ہے بلکہ بعض اوقات اس سے بھی ہٹ کر یہ دکھائی دیتا ہے کہ شاعر نے محض موزونیِ طبیعت کا سہارا لیا ہے جس کی وجہ سے مصرعے جگہ جگہ سکتے کا شکار ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے انھیں لوک اوزان ہی میں کہا گیا ہو۔

غلش یہ ہوتی ہے کہ سنسکرت زدہ ہندی زبان، ہندی اوزان، ہندی تلمیحات واسالیب، ان سب کے ہوتے اگر ان اشعار کو اردو کہا جاتا ہے تو نام دیو، کبیر، نانک، تلسی داس، اور رَے داس وغیرہ کے نسبتاً صاف کلام کو کیوں نہیں کہہ سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ہمارے قبول شدہ اشعار اردو رسم الخط میں ہیں اور ان کے خالق مسلمان ہیں اس لئے انہیں اردو کے حصار میں داخل کر لیا گیا جب کہ ان سے ملتے جلتے دیوناگری کے نمونوں کو ہندی مان لیا گیا حالانکہ رسم الخط اور شاعری کا مذہب دونوں خارجی اوصاف ہیں محمود شیرانی کو بھی اس دُبدھا کا احساس ہے: نویں اور دسویں صدی ہجری کی اردو شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اس دور میں شعر کے میدان میں اردو زبان کا دوسری زبانوں سے تمیز کرنا ایک مشکل امر ہے، سوائے اس کے کہ اس کے خالق مسلمان ہیں یا اس میں اسلامی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یا بعض اوقات اسلامی جذبات کی پیروی کی گئی ہے، اور کوئی وجہ امتیاز نہیں لیکن یہ مابہ الامتیاز بھی نہایت ہلکے رنگ میں نظر آتا ہے۔۔۔۔

درحقیقت یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مسلمان عام طور پر ہندی اوزان وجذبات وخیالات کا تتبّع کرتے تھے۔ اردو نظم کا وہ دَور جس میں وہ دوسری زبانوں کی شاعری سے ممیز ہوتی ہے دسویں صدی ہجری سے قبل شروع نہیں ہوتا جب گجرات اور بالخصوص دکن میں اردو شاعری بہ تقلید فارسی روشناس ہوتی ہے اور فارسی جذبات وخیالات و

Marfat.com

عروض کا پَرتو قبول کرلیتی ہے۔" [1]

سولہویں صدی عیسوی کے گوجری یا گجراتی ادب کے سلسلے میں پھر انہیں خیالات کا اِعادہ کرتے ہیں۔

"ان ایّام میں اردو زبان کے امتیازی خد و خال جو دوسری زبانوں سے اسے ممیز کر سکیں صرف معدودے چند ہیں یعنی یہ کہ اس زبان میں مسلمانی جذبات و خیالات ہوں، اس میں ایک حد تک عربی و فارسی الفاظ کا عنصر موجود ہو، اس کی صرف و نحو ایک خاص اصول و قاعدہ کی پابند ہو۔" [2]

بہرحال ذیل میں ان شعراء کا ذکر کیا جاتا ہے جنھیں اردو تواریخ میں روایتاً اردو کا شاعر مان لیا گیا ہے یا جن پر اردو شاعر ہونے کا اتّہام ہے۔

خواجہ مسعود سعد سلمان

خواجہ مسعود سعد سلمان فارسی کے ۵۱۵ھ مشہور شاعر ہیں۔ ان کی زندگی کا بڑا حصّہ لاہور میں گزرا۔ انہوں نے کسی 'ہندوی' زبان میں بھی شاعری کی ہے۔ اس کی تین اسناد ملتی ہیں۔ امیر خسرو لکھتے ہیں۔

"درپیش ازیں شاہانِ سخن کسے را سہ دیوان نہ بود مگر مرا کہ خسروِ ممالک کلام و مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست امّا ایں سہ دیوان در عبارتِ عربی و فارسی و ہندوی ہست۔" [3]

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنا ماخذ دیے بغیر سلمان کے ہم عصر عروضی سمرقندی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

---

[1] محمود شیرانی: اردو کے فقرے اور دوہرے آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات سے۔ اورنٹیل کالج میگزین، اگست ۱۹۳۰ء۔ باز طباعت مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد اوّل ص ۱۵۸

[2] گوجری یا گجراتی اردو سولھویں صدی عیسوی میں۔ اورنٹیل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۰ء و فروری ۱۹۳۱ء۔ باز طباعت مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۷۴

[3] دیباچہ غرۃ الکمال ص ۶۶ بحوالہ پنجاب میں اردو ص ۵۰۔ لکھنؤ ستمبر ۵،

Marfat.com

"مسعود سعد سلمان میری طرح سہ زبان ہے۔ تین دیوان رکھتا ہے عربی فارسی اور ہندوی" [1]

محمد عوفی لکھتا ہے۔

"واو را سہ دیوان ہست: یکے بہ تازی و یکے بہ پارسی و یکے بہ ہندی" [2]

ہندی یا ہندوی سے کیا مراد ہے، یہ واضح نہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ وہی زبان ہوگی جو گیارھویں صدی عیسوی میں لاہور میں رائج رہی ہوگی۔ یہ زبان ٹکسالی اَپ بھرنش اور قدیم پنجابی کے بیچ کی رہی ہوگی۔ اس دور میں پنجاب اور مدھیہ پردیش (دلی اور مغربی یوپی وغیرہ) کی زبان میں زیادہ فرق نہ ہوگا۔ مسعود سعد کا ہندوی کلام دستیاب نہیں لیکن اس کے فارسی کلام میں دو تین ہندی الفاظ آ گئے ہیں۔

چو رعد زاکبر بہ غرّید، کوسِ محمودی برآمد از پسِ دیوارِ حصن 'مارا مار'
چو فغفور بر تختم و فور برکت' [3]

'کت' مفرّس ہے پنجابی لفظ 'کھٹ' کا جس کے معنی کھاٹ ہیں۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان نے اس دور کی لاہوری ہندوی میں بھی کچھ نہ کچھ شاعری کی ہوگی لیکن ہم اسے اردو نہیں کہہ سکتے۔ اس میں کچھ الفاظ اردو کے رہے ہوں گے۔

خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر یا شکر گنج

ان کا زمانۂ حیات ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء تا ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء ہے۔ [4] یہ پنجاب میں ملتان کے قصبے کوٹھوال یا کتھی وال میں پیدا ہوئے۔ دہلی جا کر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید ہوئے۔ وہاں سے آ کر

---

[1] آزاد بلگرامی: خزانۂ عامرہ ص۱۵

[2] عوفی: لباب الالباب جلد دوم ص۶۴۶۔ بحوالہ پنجاب میں اردو ص۶۵

[3] محمد عوفی: لباب الالباب جلد دوم ص۶۴۶۔ بحوالہ پنجاب میں اردو ص۶۵

[4] عبدالحق: اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص۳۳ نیز گربچن سنگھ طالب: بابا شیخ فرید (نیشنل بک ٹرسٹ دلی ۱۹۷۸ء) ص۱۱۵

Marfat.com

پنجاب کے قصبے اجودھن میں بس گئے۔ بعد میں اس قصبے کا نام پاک پٹن ہو گیا وہیں ۶۶۴ھ میں انتقال کیا۔ ان کے سلسلۂ طریقت میں بارھویں پشت میں شیخ برہم فریدالدین ابراہیم ثانی م ۹۶۰ ھ فائز تھے۔ انہیں ثانی فرید اور ثالث فرید بھی کہا جاتا ہے۔ [1] گرو نانک پاک پٹن جاکر شیخ فرید ثانی سے ملے تھے جن سے انہیں بابا فرید اول کی بانی ملی۔

گرنتھ صاحب میں 'اشلوک شیخ فرید کے' کے عنوان سے ۱۳۰ دوہے یا اشلوک ہیں اس سے یہ واضح نہیں کہ یہ فرید شکر گنج کا کلام ہے کہ شیخ برہم فرید ثانی کا۔ بابا شکر گنج کو محض شیخ فرید کہنا قرین قیاس نہیں۔ شکر گنج کا پورا نام فریدالدین مسعود تھا۔ اگر وہ شعر کہتے تو اس میں فرید کے بجائے مسعود تخلص استعمال کرتے۔ محمود شیرانی نے لکھا۔

"ہمارے لئے یہ معلوم کرنا بالفعل دشوار ہے کہ یہ کلام آیا فرید اوّل سے متعلق رکھتا ہے یا فرید ثانی سے؟ سکھوں کے گرنتھ صاحب میں جو مجموعۂ کلام ہے وہ فرید ثانی کا مانا جاتا ہے۔" [2]

سب سے پہلے فرید کی تشخیص کا مسئلہ میکالن نے اٹھایا تھا۔ [3] اس کی تحقیق کی اساس ایک جنم ساکھی پر ہے جس میں گرو نانک اور شیخ فرید کی ملاقات کا ذکر ہے۔ اس سے اس نے نتیجہ نکالا کہ گرنتھ صاحب میں جس فرید کا کلام شامل ہے وہ فرید ثانی ہے۔ بھائی کاہن سنگھ نابھا نے گرنتھ صاحب کی قاموس، کوش

---

[1] شیرانی: اردو کے فقرے اور دوہرے آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات سے۔ اورینٹل کالج میگزین اگست ۳۰ء۔ باز طباعت مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۴۱

[2] ایضاً ص ۱۴۱

[3] بابا فرید کی تشخیص کی بحث کا ماخذ ڈاکٹر شیام لال کالڑا عابد پیشاوری صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی کا ایک مفصل معلوماتی مکتوب مورخہ ۲۰ مارچ ۸۲ء بنام راقم الحروف ہے۔ یہ انھوں نے اسی یونیورسٹی کے شعبۂ پنجابی کے دیوندر سنگھ سے تبادلۂ خیالات کے بعد لکھا۔ اس زمانے میں دیوندر سنگھ "پنجابی ادب کی تاریخ، گرو نانک سے پہلے" کے موضوع پر مقالہ لکھ رہے تھے۔

Marfat.com

'مہان کوش' کے نام سے مرتّب کی ۔ اس میں بھی فرید کو شیخ ابراہیم مانا ہے۔ یہی رائے لاجونتی راما کرشنا کی ہے جنھوں نے فرید پر تحقیق کی تھی۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے پنجابی ادب کی تاریخ لکھی ہے۔ پہلے ایڈیشن میں وہ فرید ثانی کے نظریے کو مانتے ہیں لیکن بعد میں انہوں نے اپنی رائے بدل دی۔ انہوں نے اورینٹل کالج میگزین میں فروری ۱۹۳۸ء سے فروری ۱۹۳۹ء تک ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا " بابا فرید گنج شکر، شیخ ابراہیم اور فرید ثانی " اس میں انہوں نے گرنتھ صاحب کے اشلوکوں کو شکر گنج کا قرار دیا ہے۔ گرو نانک یونیورسٹی امرتسر کے پروفیسر پریتم سنگھ اور دیوان سنگھ شدت سے مصر ہیں کہ یہ شکر گنج ہی کا کلام ہے۔

دقّت یہ ہے کہ ان اشلوکوں کے مصنف کا مسئلہ سکھوں کے مذہبی عقیدے سے مل گیا ہے، اس لئے وہ اسے علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے مذہبی اور جذباتی رنگ میں دیکھتے ہیں۔ گرو ارجن دیو نے ۱۶۰۴ء میں گرنتھ صاحب کا جو اصل نسخہ مرتّب کیا تھا وہ تو اب ملتا نہیں۔ اس کی چار نقلیں تیار ہوئی تھیں جن میں سے ایک کرتارپور، پنجاب میں محفوظ ہے۔ اس کے محافظ گرنتھی اسے کسی کو پڑھنے نہیں دیتے۔ جلد کو کپڑے میں لپیٹے رکھے ہوئے ہیں اور اس کے درشن ہی سے کراتے ہیں۔ جموں یونیورسٹی کے دیویندر سنگھ نے دو سو روپے نذر کر کے چند لمحوں کے لئے اس میں شیخ فرید سے منسوب کلام دیکھا۔ اس میں ان کے نام کے تحت ۱۲۵ دوہے ہیں جن میں دو گرو امرداس یا گرو رام داس کے ہیں اور اس کی صراحت اس میں موجود ہے یعنی انہیں حاشیے میں لکھا گیا ہے لیکن حاشیے میں کسی دوسرے قلم اور دوسری روشنائی سے مزید پانچ دوہے فرید کے نام سے اضافہ کئے گئے ہیں۔ مروّجہ مطبوعہ گرنتھ صاحب میں جو ۱۳۰ اشلوک ملتے ہیں ان میں سے دو گرو نانک کے ہیں اور ایک دو گرو ارجن دیو کے ہیں یعنی گرنتھ صاحب میں ان اشعار کا موجود ہونا یا ان کا شیخ فرید سے منسوب ہونا اہلِ تحقیق کے لئے حتمی شہادت نہیں۔

اس کی تائید ایک اور ذریعے سے ہوتی ہے۔ سردار گربچن سنگھ طالب

Marfat.com

نے نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے لئے انگریزی میں بابا فرید کی سوانح لکھی۔اس کا اُردو ترجمہ عتیق صدیقی نے "بابا شیخ فرید" کے نام سے کیا جو نیشنل بک ٹرسٹ ہی نے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا۔اس میں لکھا ہے

"گرو نانک نے ،اور ان کے جانشینوں نے بھی بڑی دیدہ ریزی سے شیخ فرید کے کلام کا مطالعہ کیا۔اس کا ثبوت وہ الحاقی اضافے ،تشریحی حواشی اور تحسینی کلمات ہیں جو شیخ فرید کی بانی کے بعض حصّوں پر ، بہ طور ضمیمہ ان سب نے لکھے ہیں۔ان کی تفصیلات کا علم اس متن سے ہو سکتا ہے جو گرنتھ صاحب کے اوراق میں محفوظ ہے۔بعض دوسرے بھگتوں کی بانیوں میں بھی جہاں کہیں گروؤں نے اضافے کی ضرورت محسوس کی ہے، یہی عمل روا رکھّا گیا ہے۔" ص ۸۲

اب کیوں کر معلوم ہو کہ کون سا کلام واقعی شیخ فرید کا ہے ، کون سا اضافہ؟ گرنتھ صاحب میں فرید سے اشلوکوں کے انتساب کے بارے میں چار نظریے ہیں :۔

۱۔ یہ کلام بابا فرید شکر گنج کا ہے۔

۲۔ یہ کلام شیخ فرید ثانی کا ہے۔

۳۔ یہ دونوں کا ملا جلا کلام ہے۔

۴۔ جموں یونیورسٹی کے دیویندر سنگھ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ تیرھویں صدی سے سترھویں صدی تک کے مختلف صوفیوں کا ملا جلا کلام ہے۔

ڈاکٹر عابد پشاوری اور دیویندر سنگھ کے مطابق گرنتھ صاحب کے مرتب نے سنتوں اور صوفیوں کا کلام ان کی زمانی ترتیب سے دیا ہے۔ شیخ فرید کا کلام کبیر کے بعد درج ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مرتب کی رائے میں یہ شیخ فرید ثانی کی تخلیق ہے۔

متعدّد اشلوکوں کی زبان اتنی صاف ہے کہ انہیں شکر گنج کی تصنیف ماننے کے لئے جس عقیدت کی ضرورت ہے وہ اہل تحقیق کے پاس نہیں۔مثلاً

جو بن جائے تو جائے پر پیا کی پیت نہ جائے
دیکھ سکھی جوبن کتنے ، بن پریت کے کمہلائے

Marfat.com

دور ہے گھر اور گلی میں چکڑ اور پیا سے پیار چلوں فرید تو کمبل بھیگے، رہوں تو ٹوٹے پیار[1]

یہ زبان بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں وجود میں نہیں آسکتی۔ پھر بھی گرنتھ صاحب میں بعض اشلوک شکر گنج کے ہو سکتے ہیں۔ کون سے ہیں یہ کیوں کر کہا جائے۔ ذیل میں شیخ فرید ثانی سے قبل کی کتابوں سے شکر گنج سے منسوب اشعار درج کیے جاتے ہیں۔ وہ ان کے ہوں کہ نہ ہوں فرید ثانی کے بہر حال نہیں ہو سکتے۔

۱۔ میر خورد سید محمد بن مبارک کرمانی (م ۷۰۷ھ/۱۳۶۸ء) نے سیر الاولیا میں ان کا یہ دوہا درج کیا ہے

گفت نبوتیں کا زری ناکاں ست منائے بس کند سے مدھن گر ہو رین کہائے[2]

عابد پیشاوری نے اپنے مکتوب میں اعتراض کیا کہ سیر الاولیا میں صرف یہ لکھا ہے کہ یہ شعر شیخ الاسلام کی زبان پر آیا۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ انھیں کی تصنیف تھا۔ اِس سے ملتا جلتا ایک دوہا شیخ فرید کے نام سے گرنتھ صاحب میں شامل ہے۔

۲۔ گجرات کے مشہور صوفی شیخ سراج الدین مُلقّب بہ شاہ عالم (م ۸۸۰ھ) کے مجموعۂ ملفوظات کا نام جمعاتِ شاہی یا جمعاتِ شاہیہ ہے۔ اس میں شکر گنج کا یہ منظوم قول ملتا ہے۔

اس کیری یہی سوریت جاؤں تائے کہ جاؤں مسیت[3]

۳۔ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ھ / ۱۵۰۶ء) نے اپنی کسی تصنیف میں حضرت شکر کا یہ دوہا نقل کیا ہے۔

---

[1] شری آد گرنتھ صاحب جی۔ گرمکھ پریس امرتسر ص ۱۳۷۷ تا ۱۳۸۴ بحوالہ اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر ص ۱۰۸

[2] جالبی: تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۲۴

[3] سیر الاولیا ص ۶۴ بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد ص ۱۵۸۔ نیز نقوش سلیمانی ص ۴۳

[4] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۱۱

Marfat.com

سائیں سیوت گل گئی، ماس نہ رہیا دیہہ تب لگ سائیں سیوساں، جب لگ ہوسوں کیہہ[1]

۲۔ انجمن ترقی اردو پاکستان میں شیخ بہار الدین باجن (متوفی ۹۱۲ھ) کی تالیف خزائن رحمت اللہ کا مخطوطہ موجود ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق اس میں ذیل کے اشعار بابا فرید کے نام سے ہیں۔

راول دیول ہمے نہ جائیے پھاٹا پہنہ رُکھا کھائیے
ہم درویشنہ اہے ریت پانی لوریں اور مسیت
جس کا سائیں جاگتا سو کیوں سوئے داس (جالبی ص ۳۷)

لیکن اپنی ہی کتاب کے ص ۶۱۲ پر جالبی پہلے دو اشعار کا متن بدل کر اور ان میں ایک اور شعر شامل کر کے یوں لکھتے ہیں۔

راول دیول ہم سنجانا پھاٹا پہنہ اوکھا کھانہ
ہم درویشنہ ایہی ریت پانی لوڑیں ہور مسیت
بیٹھے اچھیں ٹھنڈی چھانو جو کچھ دے وے سوہی کھانو

محمود شیرانی نے بہاء الدین باجن کے کلام کے سلسلے میں مندرجہ بالا تین اشعار اسی متن سے لکھے ہیں[2] اور جالبی نے وہیں سے نقل کئے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں خزائن رحمت اللہ کا ایک نسخہ ہے جس کا نام گلستانِ رحمت[3] دیا ہے۔ شیرانی کے پیشِ نظر یہی نسخہ رہا ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں مندرجہ بالا اشعار کو 'گلستانِ رحمت' ہی سے لے کر درج کیا ہے[4]۔ ایک قباحت یہ ہے کہ مہد ویوں کی روایت کے مطابق یہ اشعار، یا یہ کہئے کہ ان میں کہ پہلے دو اشعار،

---

[1] شیرانی: اردو کے فقرے اور دوہرے آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات سے اورنٹیل کالج میگزین اگست ۱۹۳۰ء۔ بازطباعت مقالاتِ شیرانی جلد اول ص ۱۴۰

[2] شیرانی: گوجری یا گجراتی اردو سولھویں صدی عیسوی میں۔ اورنٹیل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۰ء و فروری ۱۹۳۱ء۔ بازطباعت مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۷۳۔ مقالات میں شامل کرتے وقت مضمون کے عنوان میں سولھویں صدی عیسوی، کو بدل کر دسویں صدی ہجری کر دیا گیا ہے۔

[3] شیرانی: تاریخِ عربی۔ اورنٹیل کالج میگزین بابت ماہ نومبر ۱۹۳۸ء و فروری ۱۹۳۹ء بازطباعت مقالاتِ شیرانی جلد دوم ص ۲۵۰

Marfat.com

حضرت سیّد محمدؒ جونپوری کے ہیں[1] ان کے بارے میں تفصیلی بحث انہیں کے سلسلے میں کی جائے گی۔ ان اختلافات کے پیشِ نظر یہ درست معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار بابا فرید کے نہیں، باجن یا حضرت سیّد محمد جونپوری کے ہو سکتے ہیں۔ ان کی زبان عہدِ فرید کے لئے زیادہ جدید ہے گو اس میں ایک پنجابی لفظ 'لوڑیں' آیا ہے جس کے معنی رکھنا یا چاہنا ہیں[2]۔

مندرجہ بالا نمونے فرید ثانی سے قبل کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ اب بعد کی کتابوں سے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

۵۔ ایک رختہ دو بیاضوں میں ملتا ہے۔ مولوی عبدالحق کو کسی نے خط لکھا

"کتب خانہ الاصلاح دلینہ کی ایک قلمی کتاب کی جلد خراب ہو گئی تھی۔ جب اس کی نئی جلد بندھنے کو دی تو جلد کے اندر ایک کاغذ لگا ہوا ملا۔ جس پر حضرت شیخ فرید گنج شکر کی یہ غزلِ رختہ لکھی ہوئی تھی"[3]

یہی رختہ محمود شیرانی کی مملوکہ ایک بیاض میں ہے[4]۔ دلینہ کے کاغذ پر چار شعر تھے، شیرانی کی بیاض میں پانچ ہیں اور ان کا متن صحیح تر ہے۔ شیرانی کے یہاں سے متن درج کیا جاتا ہے اور حاشیے میں اختلاف دیے جاتے ہیں۔

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے — خیز در آں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
بادمِ خود ہم رہ احرار باش — صحبت اغیار بری بات ہے
باتنِ تنہا چہ روی زیں جہاں — نیک عمل کُن کہ وہی سات ہے
پندِ شکر گنج بجاں گوش کُن — ضائع مکُن عمر کہ ہیہات ہے

---

[1] شیرانی: تاریخ عربی۔ اورنٹیل کالج میگزین بابت ماہ نومبر ۱۹۳۸ء و فروری ۱۹۳۹ء بازطباعت مقالاتِ شیرانی جلد دوم صفحہ ۲۵۰

[2] گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ہجری میں مقالاتِ شیرانی جلد اوّل صفحہ ۱۷۳، فٹ نوٹ

[3] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ صفحہ ۱۲

[4] محمود شیرانی: مقالاتِ شیرانی جلد اوّل صفحہ ۱۴۰

Marfat.com

سید سلیمان ندوی کو یہ تسلیم نہیں کہ یہ نظم شکر گنج کی ہے۔ ان کی رائے میں " یہ حضرت کے فارسی اقوال کے جامع کی نظم ہے نہ کہ خود حضرت کی۔ اخیر شعر میں شکر گنج کے توصیفی لقب کو تخلص سمجھنا تعجب انگیز ہے۔ ظاہر ہے کہ خود حضرت اپنے آپ کو شکر گنج نہیں کہتے تھے "[1]

۶۔ ایک پرانی بیاض سے مولوی عبدالحق کو شکر گنج کی یہ نظم ملی۔

تن دھونے سے دل جو ہوتا پاک — پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش سبلت سے گر بڑے ہوتے — بوکڑ واں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں — گائے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں
گوش گیری میں گر خدا ملتا — گوش چو یاں (کذا) کوئی نہ واصل تھا
عشق کار موز نیارا ہے — جز مدد پیر کے نہ چارا ہے[2]

اس نظم میں پنجابیت کا اثر ہے۔ لانے (لگانے) پنجابی فعل ہے۔ ان سے قطع نظر زبان حضرت کے عہد کے لئے زیادہ صاف ہے۔ آخری شعر آج کی زبان میں ہے۔ پہلے مصرع میں پاک کو 'پوک' باندھنا کسی خام کار کا کام ہو سکتا ہے۔

۷۔ مولوی عبدالحق ان کی ایک اور نظم جھولنا شکر گنج کا ذکر کرتے ہیں جو چار صفحوں پر مشتمل ہے۔ اب اس کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں محفوظ ہے[3] جھولنا ایک ہندی صنفِ سخن ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس کے دو شعر نمونتہً درج کئے ہیں[4]

سُگن ذکر جلی
جلی یاد کی کرنا ہر گھڑی یک تل حضور سوں ٹلنا نئیں
الٹ بیٹھ میں یاد سوں شاد رہنا، گورہ دار کو چھوڑ کے چلنا نئیں

---

[1] نقوش سلیمانی ص ۴۳۔ اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء۔

[2] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۱۲

[3] مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو (جلد اول) ص ۲۹۲۔ کراچی ۱۹۶۵ء

[4] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۱۳۔۱۲

Marfat.com

پاک رکھ توں دل کو غیر سنتی، آج سائیں فرید کا آوتا ہے
قدیم قدمی کے آونے سیں لازوال دولت کوں پاوتا ہے

سیر الاولیا اور جمعات شاہی کے کلام کی زبان اور اس جھولنے کی زبان میں مطابقت نہیں۔ اس میں فرید تخلّص سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ بابا فرید شکر گنج کے ہی اشعار ہیں۔ ممکن ہے سولہویں صدی عیسوی کے فرید ثانی کے ہوں۔

۸۔ محمد علی اصغر کی کتاب جواہر فریدی میں یہ دوہا ملتا ہے۔

فریدا دھر سولی پنجرہ تیلیاں تھوکن کاگ
اب جیون باہورے، تو دھن ہمارے بھاگ[1]

جواہر فریدی کے اردو ترجمے میں اس دوہے کا متن یوں ملتا ہے

فریدا ادھر سولی سر پنجرے تلیاں توکت کاک
اب جیوں ہہ باہڑے سو دھن ساڈے بھاگ[2]

نہیں کہا جا سکتا کہ یہ فرید ثانی کا تو نہیں ؟۔

۹۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے ان کا یہ ہندی شعر درج کیا ہے۔

جب شہ آیا رات کوں، ہوں رخ کیوں موروں
بازی میری کنتہ کی نت قائم لوروں[3]

۱۰۔ سخاوت مرزا نے کسی قدیم بیاض سے ان کے ریختے کی یہ مثال دی ہے۔

راستا وہی ہے گوید — چپّا وہی ہے گوید
در دل یہی ضرب کند — تا راستا این ہا تو گوید[4]

---

[1] فارسی جواہر فریدی ص۱۸۷ بحوالہ مقالاتِ شیرانی ص۱۴۰

[2] اردو ترجمہ جواہر فریدی ص۲۲۸۔ بحوالہ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند جھٹی جلد ص۱۵۹

[3] تعارفِ تاریخ، اردو ص۱۸-۱۷ بحوالہ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ 〃 ص۱۶۰

[4] سخاوت مرزا: قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض۔ رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۵۰ء ص۱۸ بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند جھٹی جلد ص۱۵۹

Marfat.com

ان میں سے بیشتر چیزیں صریحاً الحاقی ہیں۔ یہ مجہول الاسم بیاضوں میں ملتی ہیں جو عہد شکر گنج سے صدیوں بعد لکھی گئیں۔ سیر الاولیاء کا دوہا اور باجن کا پہلا دوہا ان کے عہد کی زبان کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے پیمانے پر جب ہم بیاضوں میں مندرج کلام کو ناپتے ہیں تو وہ بہت بعد کا معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کے شعری مرتبے کا تعلق ہے اس کی اہمیت اپنی قدامت کی وجہ سے ہے، اد بیت کے سبب نہیں۔ اسے بزرگوں کے باقیات الصالحات کے طور پر دیکھا جائے گا۔

حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری (م ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء)

یہ حضرت فرید شکر گنج کے بھانجے اور داماد تھے۔ حامد حسن قادری لکھتے ہیں کہ سیر الاقطاب (۱۰۵۶ھ) میں لکھا ہے کہ حضرت صابر کبھی کبھی شعر کہتے تھے، فارسی میں احمد اور ہندی میں صابر تخلص کرتے تھے[1]۔ مصنف سیر الاقطاب نے ان کا یہ شعر درج کیا ہے۔

اس طرح اس میں ڈوب اے صابر کہ بجز ہو کے غیر ہو نہ رہے

ظاہر ہے کہ یہ زبانِ عہد صابر پیران کلیری کی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ سیر الاقطاب کے زمانے ۱۰۵۶ھ کی بھی نہیں۔ معلوم نہیں اس شعر کا مصنف کون صابر ہے اور اس کا الحاق سیر الاقطاب میں بعد میں تو نہیں کر دیا گیا۔

شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی (م ۷۲۴ھ)

فرہنگِ آصفیہ میں لکھا ہے کہ صابر نے فاں کے ارادۂ سفر پر شیخ شرف الدین بو علی قلندر کی زبان سے یہ دوہا نکلا

بجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر، بھور کدھی نہ ہوئے

اسی مضمون کو آپ نے فارسی میں اس طرح ادا کیا ہے۔

من شنیدم یارِ من فردا رود در راہ شتاب یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب[2]

---

[1] داستان تاریخ اردو ص ۱۶۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء آگرہ

[2] فرہنگِ آصفیہ جلد اوّل مقدمہ ص ۱۹۔ ترقی اردو بورڈ طباعت ۱۹۷۲ء

Marfat.com

حضرت قلندر اور صاحبِ فرہنگِ آصفیہ کے درمیان تقریباً ۶ صدیوں کا فاصلہ ہے۔ صاحبِ فرہنگ نے اپنا مآخذ درج نہیں کیا جس کی وجہ سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ شیخ ہی کا دوہا ہے۔ ڈاکٹر پرکاش مونس لکھتے ہیں کہ اس بیان سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ دوہا ان کی تصنیف تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے حسبِ حال جان کر اسے خان موصوف کو مع اس کے فارسی ترجمے کے لکھ بھیجا۔[1]

دوہے کی زبان اتنی صاف ہے کہ 'اس عہد میں نہیں ہو سکتی'۔ اگر یہ اس دور کا دوہا ہو تو اس کی زبان فرسودہ تر رہی ہوگی، زبانوں پر چڑھ کر صاف ہو گئی۔ اس دوہے میں 'سکارے' کے معنی ہیں 'کل صبح'۔ یہ سنسکرت لفظ 'سکال' سے بنا ہے جو 'آنے والی صبح' کے معنی میں ہے محمود شیرانی لکھتے ہیں۔

"سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے"

میں فارسی لفظ 'شکار' کو ہندی بنا کر سکارے کی شکل میں تبدیل کر لیا گیا ہے"۔[2]

شیرانی کی یہ غلط فہمی حیرت انگیز ہے۔ انہوں نے بوعلی قلندر کا ایک اور دوہا درج کیا ہے جو انہوں نے شیخ نظام الدین اولیا کے دوہے کے جواب میں لکھا تھا۔

ساہرے نہ مانیوں پیو کے نیں تھانو
کنہ نہ پوچھی بات روی دھنی سہاگن نالوں[3]

---

[1] اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر ص ۱۱۱

[2] شیرانی: اردو کے فقرے اور دوہرے آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات سے اورنٹیل کالج میگزین اگست ۱۹۳۰ء بازطباعت مقالاتِ شیرانی جلد اول ص ۱۵۸

[3] شیرانی: تبصرہ اور شہ پارے جلد اوّل اورنٹیل کالج میگزین مئی ۱۹۳۰ء بازطباعت مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۲۹۳ نیز ص ۱۴۱

Marfat.com

اب ایک دلچسپ غلط فہمی ملاحظہ ہو۔
ہندی کے مصنف راج کشور پانڈے نے شیخ بوعلی قلندر کی ایک غیر مطبوعہ کتاب مورکھ سمجھاونی کا ذکر کیا ہے۔ اس کی زبان پر کھڑی بولی کا بہت اثر ہے موت کے بیان میں کہتے ہیں۔

جب جم جی لینے کو اٹکاوے — بے دردوں جی لے جاوے
ماتا پتا رہیں گے روتے — انجھو سے کہ مکھڑا دھوتے
دھی اور پوت نہیں کوئی ساتھی — روتے رہیں گے سنگ اور ساتھی
بھائی بھتیجا چاچا تاؤ — تیرے سنگ نہیں کوؤ جاؤ[1]

ان اشعار کو عہدِ قلندر سے وہی منسوب کر سکتا ہے جس کا لسانی شعور ماؤف ہو۔ مجھے اس کتاب کا نام سنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اپنی کتاب اردو مثنوی شمالی ہند میں طبع اول نکال کر دیکھی، ص ۸۲ پر مورکھ سمجھاونی از فقیر اسیانہ والا ۱۲۶۶ھ کا ذکر ہے تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) کی یہ کتاب ساتویں آٹھویں صدی ہجری کے صوفی سے منسوب کر دی گئی ہے۔ عبرت ناک بات یہ ہے کہ ہندی کتاب میں اس کے اقتباس میں فقیرا کا تخلص بھی موجود ہے۔

علم پڑھا اور عمل نہ کینھا — پھٹ پھٹ ہے وا کا جینا
اتنا پڑھے ہو کہیئے فقیرا — جا پر عمل کرو او ویرا[2]

امیر خسرو ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء تا ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء

خسرو کا وطن قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ تھا۔ یہ مقام آگرہ کشنری میں ہے جہاں کی زبان برج بھاشا یا ماقبل برج رہی ہوگی۔ بعد میں خسرو کی عمر کا زیادہ حصہ دلی میں گزرا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ تیرھویں صدی عیسوی میں آگرہ اور دلی کی زبان میں برج اور کھڑی بولی کس حد تک ابھر آئی تھیں۔

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر سمن راجے: ساہتیے اتہاس آدی کال۔ ص ۳۹۸ ۔ کانپور ۱۹۷۷ء
ہندی کتاب۔
[2] ایضاً

Marfat.com

نیز ان دونوں مقاموں کی بولی میں کس حد تک اختلاف تھا، لیکن یہ یقینی ہے کہ خسرو اس وقت کی ہندی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی فارسی تصانیف میں اردو کے کئی فقرے بلکہ جملے تک ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے فارسی نظم و نثر کے بیچ متعدد اردو الفاظ استعمال کئے ہیں۔ محمود شیرانی نے ایسے الفاظ کی ایک فہرست دی ہے۔ [1]

اوحدی نے اپنے تذکرہ عرفات میں لکھا ہے کہ خسرو کا ہندی کلام فارسی کلام سے مقدار میں زیادہ تھا۔ [2] خسرو کے محقق ڈاکٹر وحید مرزا نے یہ ماننے سے انکار کیا ہے۔ [3] امیر خسرو نے اپنے تیسرے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں لکھا ہے۔

"در پیش ازیں شاہانِ سخن کسے را سہ دیوان نہ بود مگر مرا کہ خسروِ ممالکِ کلام مسعود سعد سلماں را اگرچہ ست امّا آں سہ دیوان در عبارتِ عربی و فارسی و ہندوی ہست۔ در پارسی مجرّد کسے سخن را سہ قسم نہ کردہ جز من"

اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت تک خسرو کا کوئی ہندی دیوان نہ تھا اور نہ وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ میرے چار دیوان ہیں جن میں سے تین ایک ہی زبان فارسی میں ہیں۔ اگر خسرو کا ہندی کلام بہ قدرِ دیوان نہ تھا تو اس کی کتنی مقدار تھی؟ اسی غرۃ الکمال کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکرِ مصری نہ دارم کز عرب گویم سخن
جزوے چند نظم ہندوی نیز نثر دوستاں کردہ شدہ است"

فارسی شعر میں زور اس بات پر ہے کہ وہ عربی میں شاعری نہیں کر

---

[1] آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تالیفات سے اردو زبان کے وجود کا ثبوت اورینٹل کالج میگزین لاہور اگست ۱۹۳۰ء۔ باز طباعت مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۶۸۔ ۶۲

[2-3] ڈاکٹر وحید مرزا، امیر خسرو (ہندوستانی اکیڈمی۔ لکھنؤ ۱۹۴۹ء) ص ۳۲۹

Marfat.com

سکتے، ہندوی میں جواب دے سکتے ہیں۔ نثری جملے کے متن میں کہیں 'نثر' کی جگہ 'نذر' لکھا ہوتا ہے۔ شاید صحیح ترصورت ہے 'نیز نثر نذرِ دوستاں کردہ...'۔ نثر کو فی الحال مار یے گولی، ہندوی نظم کے لیے کہتے ہیں کہ میں نے اس کے کچھ جزو کہے تھے لیکن اسے دوستوں کی نذر کر دیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں کہ اس جملے کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ خسرو نے ہندوی میں محض چند جزو کے برابر شاعری کی تھی بلکہ 'جزوے چند' اس کلام کی مقدار کو ظاہر کرتا ہے جو انہوں نے دوستوں کی نذر کیے[1]

اس حصے کی عبارت میں انھوں نے ایک طرف یہ کہا ہے، کہ میری زبان عربی نہیں ہے میں ہندوی میں نغز گوئی کر سکتا ہوں دوسری طرف انہوں نے مسعود سعد سلمان کے دواوین کی تعداد اور ان کی زبان کا ذکر کیا ہے اور ان سے اپنا مقابلہ کیا ہے۔ اگر ان کا ہندی کلام معتد بہ ہوتا تو اس سے ایک مجموعہ تیار ہو جاتا۔ ہندی کے شعری مجموعے کے لئے کوئی ردیف وار غزلوں کی تو ضرورت ہوتی نہیں۔ وہاں تو تیس چالیس یا پچاس صفحے کا کلام ہوتا تو ایک مجموعہ (یعنی دیوان) تیار ہو جاتا۔ امیر جہاں مسعود سعد سلمان کے تین زبان کے دیوانوں کا ذکر کرتا ہے، اگر اس کا خود کا ہندی دیوان ہوتا تو اس سے مسابقت کے ضمن میں اس کا ذکر کیوں نہ کرتا۔ کہاں ہے وہ دیوان؟

اب بعد والوں کے اقوال ملاحظہ ہوں۔

تقی اوحدی نے عرفات العاشقین میں خسرو کا ذکر کیا ہے۔ خان آرزو لکھتے ہیں۔

"تقی اوحدی می گوید۔ اشعارِ فارسی او از صد ہزار زیادہ است و از دو لبست ہزار بیتے بر اقسام سخن، بزبانِ ہندی، دو ہرا برآں دور موسیقی تصانیف لفیسہ دارد۔ زبانِ ہندی و فارسی و ملمع و مرکب از ایشان کہ آں را ریختہ گویند از و

---

[1] ڈاکٹر گوپی چند نارنگ "امیر خسرو کا ہندوی کلام۔ استناد کا مسئلہ"، مشمولہ خسرو شناسی (دہلی اکتوبر ۱۹۷۵ء) صفحہ ۲۲۹

Marfat.com

بسیار مروی است۔[1]

شبلی لکھتے ہیں کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اس سے زیادہ ہندی میں ہے[2]۔

اگر خسرو نے ہندی میں ۲۰ ہزار اشعار یا فارسی اشعار سے بھی زیادہ اشعار کہے تھے تو کیا افتاد پڑی کہ وہ فنا ہو گئے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے میر کے نکات الشعرا سے یہ جملہ نقل کیا ہے۔

"اشعارِ ریختہ آں بزرگ بسیار دارد"[3]

وہ کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا ہندی کلام 'جزوے چند' سے زیادہ تھا۔ میری رائے میں یہ ضروری نہیں۔ اگر کوئی فارسی شاعر مثلاً حافظ، سعدی غیر متوقع طور پر ریختے میں سات آٹھ صفحے بھی لکھ دے تو غیر معمولی صورتِ حال کے پیشِ نظر کہہ سکتے ہیں کہ اس کے یہاں ریختے کے اشعار بہت ہیں۔ خسرو بھی ایک مستند شاعر تھے۔ انہوں نے تھوڑے سے اشعار ریختہ کہہ دیے تو انہیں بہت سمجھا جائے گا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ میر کے زمانے میں بھی بلیّنہ ہندی کلام خسرو سے منسوب کیا جاتا ہو۔ میر کی تحقیق کا یہ حال ہے کہ بزرگر پسرے چوں ماہ پارہ، جیسے قطعے کو آنکھ موند کر خسرو کا کہہ دیتے ہیں۔ ان سے پہلے کسی نے اس قطعے کے بارے میں ذکر نہیں کیا۔ اس کے دوسرے مصرعے کتنی صاف زبان میں ہیں لیکن میر نے تحقیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔

دوستوں کو نذر کرنے کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ کہ دوست ان کی نقل لے گئے اور اصل مسوّدہ خسرو کے پاس محفوظ رہا۔ یہ نذر کرنا کیا ہوا؟ ہر بڑے شاعر کے کلام کی نقلیں قدر دانوں کے پاس پہنچ ہی جاتی ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے

---

[1] خان آرزو: مجمع النفائس۔ بحوالہ ممتاز حسین: امیر خسرو دہلوی۔ (کراچی ایڈیشن ۷۶ء، دہلی ایڈیشن ۸۲ء) ص ۳۵۲

[2] شعر العجم حصہ دوم ص ۱۰۵۔ بحوالہ ممتاز حسین۔

[3] خسرو شناسی ص ۲۳۰

Marfat.com

ہیں کہ ہندی میں جو چیز کہی وہ جس دوست نے پسند کی اصل مسوّدہ ہی اسے دے دیا اور اپنے پاس کوئی نقل محفوظ نہ رکھی۔ میرا خیال ہے کہ خسرو کا عندیہ یہی ہے یہی وجہ ہے کہ اب وہ کلام موجود نہیں۔

اپنا کلام دوستوں میں بانٹ دینے کی غایت کیا ہو سکتی ہے؟ ڈاکٹر صفدر آہ کا خیال ہے کہ اسے بیش بہا جان کر دوستوں کو سوغات کے طور پر دے دیا[1] ڈاکٹر نارنگ کا بھی خیال ہے کہ امیر کا ہندوی کلام اس قدر مقبول تھا کہ اس کے "جزوے چند" انہوں نے دوستوں کی نذر کئے۔[2]

میں پوچھتا ہوں، کیا ہندی کلام فارسی کلام سے زیادہ بیش بہا یا زیادہ مقبول تھا؟ اگر خسرو فارسی کلام کو اپنے پاس محفوظ رکھ سکتے تھے تو ہندوی کلام کی نقل دوستوں کو دینے کے باوجود اسے کیوں نہ محفوظ و مدوّن کرتے۔ کوئی بیش بہا اولادِ معنوی کو تلف نہیں کرتا۔ ہندی کلام کو اس بے دردی سے لٹانے کے معنی محض یہی ہیں کہ وہ اپنے فارسی کلام کے مقابلے میں نہ صرف اسے فروتر سمجھتے تھے بلکہ اپنی ادبی شخصیت کے شایانِ شان بھی نہ گردانتے تھے۔ اسی لئے نہ اس کی نقل اپنے پاس رکھی نہ اسے مدوّن کیا۔ اس کی مقدار جزوے چند سے زیادہ نہ تھی جو تفنّن طبع کے لئے کہا گیا تھا۔ ہمارے بعض محققین مدعی سست گواہ چست بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۱۹۱۸ء میں علی گڑھ سے لآلی عمان عرف جواہرِ خسروی شائع ہوئی جس کے مرتّبین مولانا محمد امین عبّاسی چریاکوٹی اور مولانا رشید احمد سالم ہیں۔ اس مجموعے میں خسرو کا ذیل کا ہندی کلام ہے۔

خالق باری۔ چیستاں یعنی بوجھ پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دوسخنے، نسبتیں، انمل ڈھکوسلے وغیرہ۔ ایک غزل ریختہ۔ کچھ دوہے۔ کہیت اور قلبانہ وغیرہ۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے اپنی کتاب، امیر خسرو اور ان کی ہندی

---

[1] امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر۔ نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۱ء صـ۸

[2] امیر خسرو کا ہندوی کلام۔ خسرو شناسی صـ۲۲۹

Marfat.com

شاعری، (۱۹۶۱ء) میں بھی یہ سب چیزیں پیش کی ہیں۔ ان مجموعوں میں خسرو سے منسوب تمام گیت نہیں یہ تقی محمد خاں خورجوی کی کتاب 'حیاتِ امیر خسرو' میں دیے ہیں۔ [1]

خسرو کے ہندی کلام کے استناد کے بارے میں دو انتہائی نقطۂ نظر ملتے ہیں۔ ایک طرف قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں ہیں جو خسرو کی کسی ہندی تخلیق کو مستند تسلیم نہیں کرتے۔ دوسری طرف جواہر خسروی کے مرتب محمد امین چریاکوٹی، ڈاکٹر صفدر آہ، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں جو تقریباً تمام ہندی چیزوں کو اصلی مانتے ہیں۔ ان کے بیچ حافظ محمود شیرانی ہیں جو خالق باری اور غزل ترکتہ کو خسرو کی نہیں تسلیم کرتے۔ ضرورت ہے کہ خسرو سے منسوب ہندی کلام کو بہت کھلے ذہن سے پرکھا جائے۔ اس کی موافقیت یا مخالفت میں پہلے سے قائم کئے ہوئے تعصبات کے زنگ سے آئینۂ تحقیق کو پاک کر دیا جائے، اس کے بعد بالکل معروضی مطالعے کے بعد فیصلہ کیا جائے۔

استناد کے سلسلے میں دو پیمانوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

۱۔ حدیثِ رسول کو پرکھنے کے لئے قابلِ وثوق راویوں کا الوٹ سلسلہ قائم کیا جاتا ہے۔ خسرو کے سلسلے میں بھی سوال اٹھایا جاتا ہے کہ پہلی تحریری روایت خسرو کے عصر سے کتنی قریب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں صدیوں کا فصل ملتا ہے۔ ایک دوہے اور ایک غزل ترکتہ کے علاوہ اٹھارویں صدی کے آخر سے پہلے کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ احتیاط کا تقاضہ ہے کہ ان سب چیزوں کو ماننے سے انکار کر دیا جائے، لیکن ایک سوال اٹھتا ہے کہ ادبیات بلکہ دوسری نگارشات میں بھی اگر قریب العصر تحریری سند پر اصرار کیا جائے تو قدیم یونانی ادب، رامائن مہابھارت، اپنشد، کالی داس کے ڈراموں وغیرہ کو ان کے مصنفوں سے منسوب نہیں کیا جائے گا۔ ان کو تسلیم کرنے کے لئے ان کی تحریری روایت سے پہلے صدیوں کی زبانی روایت کو ماننا پڑتا ہے۔ اس طریق میں کھٹکا یہ ہے

---

[1] حیاتِ امیر خسرو کتاب منزل، کشمیری بازار لاہور، ۱۹۶۰ء ص ۲۰۷ تا ۲۲۳۔

Marfat.com

کہ اس طرح ہر قسم کی ضعیف اور وضعی چیز کو بزمِ استناد میں بار پانے کا در کھل جاتا ہے۔

۲۔ دوسرا پیمانہ داخلی شہادت ہے یعنی زبان کی صفائی کی سطح۔ اردو کا منزل یہ منزل ارتقا ہوا ہے۔ قدیم زبان فرسودہ، اجنبی اور عسیر الفہم ہوتی تھی۔ اگر قدیم زمانے سے ایسی تخلیقات منسوب کی جائیں جن کی زبان اس عہد کی نہیں تو انہیں رد کئے بغیر چارہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی میں کبیر کی لوک روایت میں متعدد ایسے دوہے اور گیت شامل ہو گئے جو تقریباً آج کی زبان میں ہیں۔ مدونین نے انہیں مسترد کر دیا ہے۔ ہندی کے دوسرے سنت کویوں کے گیتوں وغیرہ کو بھی اسی سختی سے جانچنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان میں سے بعض کی زبان اپنے دور سے زیادہ صاف معلوم ہوتی ہے۔ افسوس کہ ہندی میں کوئی قاضی عبدالودود نہیں ہوا۔

روایت کی قدامت کے پیمانے پر خسرو کا ایک بھی ہندی شعر قابلِ وثوق نہیں ٹھہرتا۔ اس سختی میں لچک پیدا کر کے زبان کے پیمانے پر اعتماد کرنا بہتر ہوگا۔

اس تمہید کے بعد خسرو کے ہندی کلام کو ایک طرف احتیاط اور دوسری طرف ہمدردی کے نقطۂ نظر سے پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہر تخلیق تین میں کسی ایک طرح کی ہو سکتی ہے: ۱۔ وہ بڑی حد تک اصلی تسلیم کی جائے۔ ۲۔ اسے مشکوک کے زمرے میں رکھا جائے یعنی جسے اطمینان سے نہ قبول کیا جا سکتا ہے نہ رد۔ ۳۔ اسے مسترد کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ حتمی اور شافی طریقے پر کوئی بھی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ طے کیا جائے گا، وہ ہر کو دیانت داری سے اس سے اختلاف ہو سکتا ہے۔

خسرو کے فارسی کلام میں کھڑی بولی کے جو الفاظ اور فقرے آ گئے ہیں ان کے استناد میں کوئی شک نہیں حالانکہ خسرو اردو اور فارسی کے ملانے کو مستحسن نہیں سمجھتے تھے۔ غرۃ الکمال کے دیباچے میں کہتے ہیں۔

Marfat.com

'لفظِ ہندوی در پارسی لطیف آوردن چنداں لطفے نہ دارد مگر بہ ضرورت۔
آں جا کہ ضرورت بودہ است، آوردہ شد،

خزائن الفتوح میں وہ ہندی فقرہ استعمال کرتے ہیں۔

'واز دروں ہندواں 'مار مار' فریادی کردند'[1]

مثنوی تغلق نامہ میں انہوں نے کئی جگہ کھڑی بولی کا استعمال کیا ہے مثلاً

ع سخن شاں 'مار مار' وسر بسر 'مار'

ع بہ راوی گفت 'ہَے ہَے تیر مارا' (ص ۲۸)

آخر الذکر فقرہ پورا جملہ ہے۔ غرۃ الکمال کے دیباچے میں ایک اور شعر ہے جو بقول ڈاکٹر وحید مرزا فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں پڑھا جا سکتا ہے

آری آری ہمہ بیاری آری ماری ماری برہ کہ ماری آری (ص ۲۲۲)

ممتاز حسین نے وحید مرزا کے اصل انگریزی مقالے سے اس شعر کو یوں لکھا ہے۔

آری آری ہمہ بیاری آئی ماری ماری برہ (کہ) ماری آئی

نیز مطبوعہ غرۃ الکمال کے دیباچے سے یہ متن دیا ہے۔

آئی آئی ہماں بیاری آئی ماری ماری براہ موری آئی (ص ۵۵-۳۵۴)

اور لکھتے ہیں کہ خسرو کے مطابق اسے ایک طرف سے پڑھا جائے تو تمام تر ہندوی کا معلوم ہوتا ہے اور اگر دوسری جانب سے پڑھا جائے تو تمام تر فارسی کا معلوم ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ خسرو کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں کہ شعر کی مندرجہ دونوں صورتوں میں اگر تجنیس خطی کو راہ دی جائے تو اس شعر کو ہندوی زبان میں اس طرح لکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔

آئی آئی ہماں پیاری آئی ماری ماری برہ کی ماری آئی

کہتے ہیں کہ اس کی فارسی صورت کیا ہوگی یہ بتانا مشکل ہے۔ لیکن ان کی

---

[1] بحوالہ ممتاز حسین: امیر خسرو ص ۵۴ - ۲۵۳

Marfat.com

تحریف شدہ ہندی شکل ہی کب قابل تشفّی ہے۔ 'ہماں پیاری' کہاں کی ہندی ہے۔ 'بیاری' کو 'پیاری' کر لینا تحریف ہے۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے بھی بغیر سوچے سمجھے لکھ دیا ہے کہ یہ شعر دونوں زبانوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ میں اپنی سُست فہمی کے سبب اس شعر کو نہ خالص فارسی میں سمجھ سکتا ہوں نہ خالص ہندی میں۔ اگر یہ فارسی ہے تو دوسرے مصرع کے کیا معنی ہیں۔ اگر یہ ہندی ہے تو پہلے مصرع میں 'ہمہ بیاری' کہاں کا ہندی فقرہ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟ ہندی بنانے کے لئے دوسرے مصرع میں 'کہ'، کو 'کی' پڑھا جائے تو یہ مصرع ہندی کا ہو سکتا ہے۔ ع۔ ماری ماری برہ کی ماری! آری۔ لیکن تانیث کی یائے معروف سے فارسیت کا امکان ختم ہو جاتا ہے یائے مجہول سے آرے = ہاں اور مارے = ایک سانپ فارسی الفاظ بن جاتے ہیں لیکن کچھ بھی کیجئے، کسی طرف سے پڑھیے دونوں مصرعے فارسی اور ہندی میں پورے نہیں اترتے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ فارسی اور ہندی کا مخلوط شعر ہے۔ قرأت ذیل سے پہلا مصرع فارسی میں اور دوسرا ہندی میں بامعنی ہے اور دونوں مصرعوں کے معنی آپس میں ہم آہنگ ہیں۔

آرے آرے ہمہ بہ یارے، آرے مارے، مارے برہ کے مارے! آرے

دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کتب خانے میں غرۃ الکمال قلمی میں خسرو کی نثر ابتدا میں نہیں خاتمے میں ہے۔ اس میں سے سیّد سلیمان ندوی نے اس شعر کو لوں نقل کیا ہے۔

آہی آئی ہماں بیاری آہی آری آری برآئی موری ماہی

اور پھر نوٹ دیا ہے اس شعر کو میں پوری طرح سمجھ نہیں سکا، [1]

فارسی رباعیوں کے بیچ ذیل کے فقرے بھی ہندی کے ہیں۔

برگاہ بہ گوئی کہ" دہی لیہو دہی" (گجری سے متعلق رباعی)

---

[1] نقوش سلیمانی ص ۴۷

Marfat.com

فریاد برآورد کہ "دُر دُر موئے"
درخندہ شد و گفت کہ 'ناہی ناہی'
فریاد برآورد کہ 'نائی نائی'، (حجّام سے متعلق رباعی)
ہر موئے خطش گفت کہ 'مورے بایا'

پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اپنے ایک مضمون میں ملّا عبدالباسط امیٹھوی (متوفی ۱۱۶۷ھ) کی کتاب منارالضوابط سے خسرو کا ایک فارسی شعر اور قطعہ درج کیا ہے جن کے ہر مصرعے میں ایک لفظ پر ایہام ہے یعنی وہ لفظ فارسی اور ہندی دونوں میں معنی دیتا ہے[1]۔ عبدالباسط نے اپنا ماخذ نہیں دیا کہ یہ تین شعر انہیں کہاں سے ملے۔ اب اس کے بارے میں کیا کہا جائے؟ بہرحال یہ فارسی اشعار ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ ایک لفظ ہندی کا ہے اس لئے انہیں ہندی کلام نہیں کہا جا سکتا۔

فرہنگِ آصفیہ میں دو شعر کا ریختہ قطعہ امیر خسرو سے منسوب کیا گیا ہے

ہندو بچہ ہیں کہ عجب حسن دھرے مچھے بر وقتِ سخن گفتن مکھ پھول جھرے چھے
گفتم زلبِ لعل تو یک بوسہ بہ گیرم گفتا کہ ارے رام ترک کائیں کرے چھے[2]

اس فارسی اور برج بھاشا ملے ریختے میں 'چھے' کہاں سے آگیا۔ یہ راجستھانی ہو سکتا ہے یا گجراتی۔ ترک کو یہ حرکتِ را باندھا ہے۔ یہ قطعہ شمالی ہند کے ابتدائی شعرا فائز، قزلباش خاں امیّد، مرزا مولوی فطرت وغیرہ کے رنگ کا ہے، خسرو کا نہیں ہو سکتا۔ مسعود حسن رضوی صاحب بھی اسے خسرو سے منسوب کرنے میں تامّل کرتے ہیں[3]۔

اب خسرو سے منسوب یہ مشہور غزل ریختہ لیجیے جس کا پہلا مصرع ہے۔

ع زحالِ مسکیں مکُن تغافل، درائے نیناں، بنائے بتیاں

---

[1] شہرآشوب: نقوش مئی ۱۹۶۵ء شمارہ ۱۰۲۔ ص۹

[2] فرہنگ آصفیہ جلد اوّل۔ ترقی اُردو بورڈ دلّی ۱۹۷۴ء۔ مقدمہ ص۱۹

[3] نقوش مئی ۱۹۶۵ء ص۱۵

Marfat.com

اس کے بارے میں سب سے اچھی تحقیق محمود شیرانی کی ہے۔ اس کا قدیم ترین متن ان کی مملوکہ ایک قدیمی بیاض میں ہے جس کے مرتب جے مل تھارنے ۱۰۶۲ھ اور ۱۰۶۷ھ میں دو اندراج کئے ہیں[1]۔ ان سے بیاض کی تحریر کا زمانہ متعین ہوتا ہے۔ بیاض میں اس غزل کے پانچوں شعر ہیں لیکن مقطع میں جعفر تخلّص ہے۔

جعفر سے اس کے انتساب کی تائید ایک اور ذریعے سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں ایک بیاض کے ایک نوٹ کی طرف توجہ دلائی۔ [2] میں نے بھی انجمن کے کتب خانے میں اسے دیکھا یہ ایک ضخیم جلد ہے جسے کشکول سے موسوم کیا گیا ہے اور جس کا نمبر ۱۲ ہے۔ اس کو درج کرنے سے پہلے مرتبِ بیاض نے نوٹ دیا ہے۔

"یہ غزل اکثر قوّال لوگ گاتے ہیں اور تذکروں میں امیر خسرو کے نام درج ہے ..... ایک بہت پرانی کتاب جو کہ عالم گیر کے زمانے کی لکھی ہوئی ہے اس میں جعفر کے نام سے لکھا دیکھا۔ نہایت تعجب ہوا کہ اس کی یہ تصنیف واللہ اعلم حقیقت کیا ہے"۔

کشکول میں اس سے آگے کی غزل پر تاریخ ۲۳/ اپریل ۱۸۸۱ء درج ہے اور یہ غزل نظیر اکبر آبادی کی ہے۔ گویا کشکول کا مندرجہ بالا نوٹ ۱۸۸۱ء کا لکھا ہوا ہے۔

کاش مرتّبِ بیاض نے عہد عالم گیر (۱۶۵۷ء تا ۱۷۰۷ء یعنی گیارھویں صدی ہجری کے نصفِ دوم اور بارھویں صدی ہجری کے اوائل) کی تفصیلات دے دی ہوتیں۔ جے مل تھار کی بیاض اور عہد عالم گیر کی کتاب یہ دو قدیم ترین روایتیں ہیں جن میں غزل کو جعفر کی تصنیف قرار دیا ہے۔ جعفر کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں کہ یہ کون تھا۔

اس غزل کی تیسری جھلک ۱۱۳۴ھ میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر صفدر آہ لکھتے ہیں کہ ان کے پاس بوعلی شاہ قلندر کے دیوان کا ۱۱۳۴ھ کا مکتوبہ نسخہ تھا۔ اس نسخے

---

[1] شیرانی، دسویں صدی ہجری کے بعض جدید دریافت شدہ ریختے۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور ۱۹۲۹ء باز طباعت مقالاتِ شیرانی جلد دوم ص

[2] عہد ہمایوں و اکبر کی دو غزلیں۔ محمد دلی جلد ۱، شمارہ ۲، ۱۹۶۸ء صد ۲۰۸

Marfat.com

کے پہلے صفحے پر اس غزل کے تین شعر خسرو کے نام سے درج ہیں[1] صفدر آہ نے یہ وضاحت نہیں کی کہ یہ کاتب متن ہی کے قلم سے ہیں یا بعد کا اضافہ ہیں۔ چوتھی بار اس غزل کے پانچوں شعر پرتاپ سنگھ کی بیاض (۱۱۴۰ھ) مملوکۂ شیرانی میں ملتے ہیں جہاں اسے پہلی بار خسرو کے نام سے دیا ہے[2] اس کے بعد کئی تذکروں میں اس کے متفرق اشعار خسرو کے نام سے ملتے ہیں۔ شیرانی کی دو بیاضوں کے بعد پوری غزل تیسری بار قاسم کے تذکرہ مجموعۂ نغز میں ملتی ہے۔

محمود شیرانی نے اس غزل کے خسرو سے انتساب پر ایک اور وجہ سے انکار کیا ہے[3] یہ غزل بحرِ متقارب شانزدہ رکنی میں ہے۔ اس وزن میں مثمن تر قدیم زمانے سے ملتی تھی لیکن شانزدہ رکنی کی قدیم ترین مثال عرضِ سیفی میں ۸۵۰ھ تا ۸۵۳ھ/۱۴۴۶-۴۹ء کی ہے۔ یعنی خسرو کے عہد میں شانزدہ رکنی وزن وضع نہیں ہوا تھا اور اس کے وسطِ عہد کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال تک بھی پتا نہیں چلتا۔ قاضی عبدالودود شیرانی کی دلیل تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر تقی میر حیات اور شاعری" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"شیرانی نے کتابِ مذکور (پنجاب میں اردو) کی اشاعت کے چند سال بعد قوی دلائل کی بنا پر اپنی رائے بدل دی تھی، اس کا ذکر ضروری تھا حقیقت یہ ہے کہ نون پر ختم ہونے والے اشعار جو خسرو کی طرف منسوب ہیں، اس تخلص کے مشہور فارسی گو شاعر کے نہیں، اس تخلص کے کسی اور شاعر کے ہوں تو ہوں"[4]

میں نے اپنے مضمون "ریختہ، تعریف و تاریخ" مشمولہ تحفۃ السرور (دہلی ۱۹۸۵ء) میں اس غزل کے خسرو سے انتساب کے خلاف دلیلیں دیں۔ انہیں دیکھ

---

[1] امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر، نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۶۱ء ص۳۰

[2] شیرانی کا مضمون مشمولہ مقالاتِ شیرانی جلد دوم

[3] " " " ص۹۵-۹۱

[4] معاصر حصہ ۹۔ ص۱۸۷ مشمولہ بہارستان پٹنہ ۱۹۵۷ء

Marfat.com

کر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مجھے اپنے مکتوب مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۸۷ء میں ذیل کے شبہات اٹھائے۔

اگر عالم گیر متوفی ۱۷۰۷ء/۱۱۱۹ھ کے عہد کی کتاب میں اسے جعفر سے منسوب کیا ہے تو اس میں اور دیوانِ بو علی قلندر مکتوبہ ۱۱۲۴ھ نیز مخزنِ نکات ۱۱۶۸ھ میں زمانی بُعد برائے نام ہے۔ جعفر نام کے کسی شاعر کا تذکروں میں ذکر نہیں۔ شیرانی کی جے مل تھار کی بیاض کا کیا بھروسہ۔ اگر یہ وزن خسرو کے عہد تک رائج نہیں تھا تو کسی نے تو پہلی بار ایجاد کیا ہوگا۔ وہ خسرو جیسا طبّاع شاعر کیوں نہیں ہو سکتا۔

مجھے عرض کرنا ہے کہ غزل کا پہلا انتساب ۶۷ - ۱۰۶۲ھ کی بیاض میں ہے۔ اس میں زیادہ تر کلام فارسی شاعروں کا ہے۔ شیرانی کے مضمون میں ان کی تفصیل پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ جے مل کوئی اچھا ذی علم واقف کار شخص تھا۔ عہدِ عالم گیر محض ۱۱۱۹ھ نہیں بلکہ اس سے پہلے کی نصف صدی کو محیط ہے۔ ایک دوسرے سے بالکل مختلف دو راویوں نے اسے جعفر سے منسوب کیا ہے۔ بو علی قلندر کا دیوان ۱۱۲۴ھ کا مکتوبہ ہے لیکن خسرو سے منسوب غزل سرورق کے اندر پہلے صفحے پر لکھی ہے۔ جب تک صریح شہادت نہ ہو کہ یہ بھی کاتبِ متن کے قلم سے ۱۱۲۴ھ میں لکھی گئی اس کے اندراج کے بارے میں کیونکر اطمینان ہو۔ ابتدائی ریختے عموماً سیدھے سادے اوزان میں ملتے ہیں، اس طرح کے پختہ طویل وزن میں نہیں۔ خسرو کے عہد کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد تک اس وزن کا نہ ملنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے خسرو نے استعمال نہیں کیا۔

جعفر کوئی غیر مشہور شاعر تھا جس نے یہ ریختہ لکھ دیا۔ شکستہ خط میں جعفر کو خسرو پڑھ لینا مشکل نہیں۔ ایک اور دلیل:

واضح ہو کہ خسرو کے فارسی کلام میں جتنے ہندی فقرے آئے ہیں وہ شاعر کی زبانی نہیں۔ اس نے اپنی زبان سے فارسی کا متعارفی جملہ یا فقرہ لکھا اور اس کے بعد کسی کردار کے منھ سے ہندی فقرہ یا لفظ کہلایا۔ کہیں بھی جعفر زٹلی

Marfat.com

کے سے غیر سنجیدہ انداز میں نہیں کہ جملے کا آدھا جزو فارسی ہو، آدھا ہندی جیسا کہ اس غزل کے مطلع میں ہے۔ واضح ہو کہ خسرو کو فارسی جملے میں ہندی لفظ لانا بالکل پسند نہیں۔ غرۃ الکمال کے دیباچے میں کہا ہے

"لفظِ ہندی در پارسی لطیف آوردن چنداں لطفے نہ دارد مگر بہ ضرورت"

ضرورت کا موقع یہ ہے کہ کسی عوامی ہندوستانی کردار مثلاً گجری، تیلی، حجّام، ہندو عورت وغیرہ کی زبان سے ہندی فقرہ کہلا دیا جائے۔ خود شاعر فارسی جملے کے نصفِ آخر کو کیوں ہندی میں ڈھال دے۔ ان سب وجوہ سے میری رائے میں یہ غزل خسرو کی نہیں۔

نکات الشعرا اور بعد کی کتابوں میں یہ قطعہ بھی خسرو سے منسوب کیا گیا ہے

زرگر پسرے چو ماہ پارا — کچھ گھڑیے، سنوار یے پکارا
نقدِ دلِ من گرفت و بشکست — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

اس قطعے کے دوسرے مصرع میں یہ نقص ہے کہ سنار کا لڑکا یہ نہیں کہے گا "گھڑیے سنوار یے" بلکہ "گھڑوایئے" "سنوروایئے" کی آواز دے گا۔ ڈاکٹر انصار اللہ نے اسے پوربی انداز دے کر یوں تجویز کیا

کچھ گڑھیے سنوریے پکارا [1]

لیکن ہمیں اس ترمیم کا اختیار نہیں۔ مخزنِ نکات میں دوسرا شعر یوں دیا ہے ؎

نقدِ دل من ربود و بشکست — آخر نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

میر نے اپنا ماخذ نہیں بتایا۔ خسرو اور میر میں پانسو سال کا فصل ہے۔ اس قطعے کے دوسرے مصرعوں کی زبان اتنی صاف ہے کہ عہدِ خسرو میں ممکن نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس کے دوسرے شعر پر بھی وہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ شاعر نے آدھی بات فارسی میں اور آدھی اردو میں کہی جو خسرو کے

---

[1] ڈاکٹر محمد انصار اللہ: تاریخ اقلیم ادب، (پہلا حصہ)، (علی گڑھ ۱۹۷۹ء) ص ۱۱

Marfat.com

مستند کلام کا وطیرہ نہیں۔

محمود شیرانی نے رسالۂ عبدالواسع ہانسوی سے لے کر ذیل کا شعر ریختہ خسرو سے منسوب کیا ہے

از چل چلِ تو کارِ من زود رشد کُچل من خود نمی چلم تو اگر می چلی بہ چل[1]

'می چلی' اور 'بہ چل' جعفر زٹلی کے ہلّر اور ٹلّر کا جواب ہیں۔ یہ شعر کسی طرح خسرو کا نہیں ہو سکتا۔ ایک اور لچر قسم کا ریختہ عہدِ ہمایوں کے شیخ جمالی کا بتایا جاتا ہے۔ اس کے دو شعر مشہور ہیں ؎

خوار شدم زار شدم لُٹ گیا در رہِ عشقِ تو کمر ٹوٹتا ہے
گاہ نہ گفتی کہ جمالی تو بیٹھ تھم کرو، کیا اپنا کرم چھوٹتا ہے

شیرانی لکھتے ہیں کہ بعض تذکروں اور بیاضوں میں یہ خسرو سے منسوب ہیں[2]۔ چنانچہ شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں اس ریختے کو خسرو کے سر منڈھ دیا ہے۔ انہوں نے مندرجہ بالا دونوں اشعار یوں لکھے ہیں ؎

نوا رشدم زار شدم لٹ گیا در غمِ ہجر تو کمر ٹوٹ ہے
گاہ ز خسرو تو نہ گفتہ کہ بیٹھ وہ چہ کند، بھاگ مرا پھوٹ ہے

اس ریختے کے سلسلے میں ڈاکٹر صفدر آہ لکھتے ہیں :-

"میں نے تھوڑے ردّ و بدل کے ساتھ یہ غزل ایسے ایرانی حکیم صاحب کے نام سے سنی تھی جن کو اردو شاعری کا تو دعویٰ تھا لیکن اردو بالکل نہ آتی تھی۔ یہ غزل صرف مسخرہ پن ہے۔ اسے خسرو سے منسوب نہیں کیا جا سکتا"۔[3]

میں اس فیصلے سے اتفاق کرتا ہوں۔

چونکہ خسرو نے ہندی کلام مدوّن نہیں کیا اس لئے وہ صدیوں تک

---

[1] دستور العمل از عبدالواسع ص۴۱ بحوالہ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص۱۴۳، ۲۹۵

[2] پنجاب میں اردو لکھنؤ ۱۹۸۱ء ص۴۳

[3] نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۱ء۔ ص۱۴ فٹ نوٹ۔

Marfat.com

سینہ بہ سینہ چلا آیا۔ اس کی کوئی قریب العصر روایت نہیں ملتی۔ مسلسل اصلاح یا تحریف کے سبب اس کی زبان موجودہ دور کے مطابق ہو گئی۔ ایک طرف اس میں کثرت سے الحاق ہو گیا دوسری طرف ان کا بہت سا ہندی کلام تلف بھی ہو گیا۔ موجودہ روایات میں ان سے جو کلام منسوب کیا جاتا ہے اس میں سے بیشتر کی زبان ان کے عہد کی نہیں۔ ان وجوہ سے خسرو کے ہندی کلام کے کسی شعر یا دوہے کو سو فی صدی وثوق سے ان کی تصنیف نہیں مانا جا سکتا جب کہ بیشتر کلام ایسا ہے جو اپنے لسانی رنگ روپ کے باعث ان سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی ہندی چیزوں پر ایک ایک کر کے مختصراً غور کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے خسرو سے منسوب دوہوں کو لیجئے۔

پنکھا ہو کر میں ڈلی، ساتی تیرا چاؤ منجھ جلتے جنم گیا، تیرے لیکھن باؤ

ڈاکٹر صفدر آہ نے کوئی دلیل دیئے بغیر اس دوہے کو ان الفاظ میں رد کیا۔

"وجہی نے اپنی کتاب سب رس (۱۰۴۵ھ) میں خسرو کا جو دوہا نقل کیا ہے وہ بہ حدِ تضحیک نامعتبر ہے۔ دکنی شاعر دہلی کی زبان کا مزاج نہیں پہچانتا تھا۔ لہٰذا یہ غلطی ہو گئی۔" [1]

میں اس تضحیک آمیز لسانی غلطی کو نہیں سمجھ سکا۔ ممتاز حسین اپنی کتاب امیر خسرو میں اس دوہے کو نقل کر کے وجہی پر ایک اور الزام دھرتے ہیں

"مگر اس کا لب و لہجہ تمام تر دکنی بنا دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ ساقط المعیار ہو گیا ہے۔

.... معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کے دوہرے کو کسی نے دکنی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ (ص ۳۵۰)

اس میں دو لفظوں کا تلفظ اور املا دکنی جیسا ہے ساتی (ساتھی) منجھ

---

[1] امیر خسرو کی مادری زبان، آج کل امیر خسرو نمبر نومبر ۱۹۷۴ء۔ ص ۱۳

Marfat.com

(مجھ)۔ یہ کوئی ایسی بڑی تبدیلیاں نہیں جن کی بنا پر اسے دکنی ترجمہ کہا جائے۔ اس سے قطع نظر قاضی عبدالودود نے مجھ سے زبانی گفتگو میں کہا کہ وجہی اور خسرو میں تقریباً چار سو سال کا فصل ہے۔ وجہی نے اپنا ماخذ درج نہیں کیا۔ ہم کیونکر مان لیں کہ یہ دوہا خسرو ہی کا ہے۔ میری رائے میں جس طرح اس کا انتساب خالی از احتیاط ہے اسی طرح سے رد کر دینا بھی مناسب نہیں۔ اسے مشکوک کے ضمن میں رکھا جائے گا۔

گوری سووے سیج پر، مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوں دیس

مختلف جگہ اس دوہے کا متن قدرے مختلف ملتا ہے۔ اس کے لئے مشہور ہے کہ خسرو نے اسے نظام الدین اولیا کی وفات پر کہا تھا چنانچہ ان کے عرس کو قوّال اسی دوہے سے شروع کرتے ہیں۔ ڈاکٹر پرکاش مونس کہتے ہیں کہ ہندی شاعری میں یہ روایت تو ہے کہ شاعر پتنی بنے اور محبوب کو اپنا پتی قرار دے لیکن پیر کو محبوبہ کہنے کی کوئی روایت نہیں[1]۔ بہ صورتِ موجودہ اس کی صاف زبان کے پیشِ نظر اسے خسرو کی گفتار نہیں کہا جا سکتا۔ عُرس کی روایت کے احترام میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر خسرو نے یہ دوہا واقعی کہا ہے تو اصلاً اس کی زبان زیادہ فرسودہ رہی ہوگی جو زبانوں پر چڑھ کر اصلاح پا گئی ہے ؎

خسرو ایسی پیت کر جیسے ہندو جوئے
پوت پرائے کارنے جل جل کوئلا ہوئے

لچھمی نرائن شفیق[2] نے ہاشم دکھنی کے ذکر میں ضمناً لکھا ہے کہ خسرو نے فارسی میں شعر کہا ؎

خسروا در عشق بازی کم رہند و زن مباش
کز برائے مردہ می سوزند جانِ خویش را

---

[1] اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر۔ ص ۱۱۴

[2] چمنستانِ شعرا (طبع اوّل ۱۹۲۸ء ص ۱۰۲

Marfat.com

اور انہوں نے اسی مضمون کو دوہے میں باندھا ہے۔
لیکن بکٹ کہانی کے نسخہ پٹنہ[1] میں یہ دوہا اس طرح درج کیا ہے۔
سُمن ایسی رین کیجو کہ جوں ہندو کی جوئی
پوت پرائے کارنے جل جل کوئلا ہوئی
اس طرح ظاہرا یہ دوہا کسی سُمن کی تصنیف قرار پاتا ہے لیکن اس صورت میں مصرع ناموزوں ہو جاتا ہے۔ جواہرِ خسروی میں ذیل کا دوہا بھی خسرو کے نام سے درج ہے۔

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ تن میرو من پیو کو، دو دو بھئے ایک انگ

ان دونوں دوہوں میں پہلا اٹھارویں صدی کے آخر میں اور دوسرا بیسویں صدی میں پہلی بار دیکھنے میں آتا ہے۔ زبان کسی قدر قدیم ہے، زیادہ قدیم نہیں۔ کسی نے اپنا ماخذ نہیں دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کس بنا پر ایک بہت قدیم شاعر سے وابستہ کر دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں مشکوک کے زمرے میں رکھ دیا جائے۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے اپنی کتاب میں ایک اور دوہا نقل کیا ہے لیکن اس کا ماخذ نہیں دیا۔ (ص ۱۴۸)

شیام سیلت گوری لے، جنمت بھئی انیت ایک پل میں پھر جات ہیں، جوگی کا کے میت

اس کا پہلا مصرع عروضی اعتبار سے ناقص ہے۔ چوں کہ یہ سندیلوی کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا اس لئے اسے خسرو کے کلام سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مفدر آہ بھی اسے خسرو کا تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ان پانچ دوہوں میں صرف دوسرے اور چوتھے کو خسرو کا مانتے ہیں۔

پنجاب میں اردو میں محمود شیرانی نے سراج الدین آرزو کی بیاض سے اور کئی دوہے ہندی اشعار اور ایک اردو غزل نقل کی ہے اور اس کے بعد لکھ دیا ہے "میں نے اس غزل کو یہاں لکھ تو دیا ہے لیکن یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ امیر خسرو اس کے مالک ہیں۔" (ص ۱۵۷)

---

[1] صدرالدین فضا: حضرت شاہ آیت اللہ جوہری، ان کی حیات اور شاعری (پٹنہ ۱۹۶۴ء) ص ۲۱۶

Marfat.com

پہیلیاں وغیرہ۔ پہیلیوں کے ضمن میں کہہ مکرنیاں، دوسخنے، ڈھکوسلے اور نسبتیں بھی شامل ہیں پہیلیوں کے علاوہ بقیہ چیزیں پہلی بار آبِ حیات میں نظر آتی ہیں۔ ان کی زبان اتنی صاف ہے کہ انہیں یک قلم زد کیا جا سکتا ہے۔ واضح ہو کہ محمد حسین آزاد بالکل غیر معتبر راوی ہے اور یہ بھی واضح ہو کہ ذہانت اور طبّاعی امیر خسرو کا اجارہ نہیں، ان کے بعد، بہت بعد والے بھی ایسی چیزیں تخلیق کر سکتے ہیں۔ جواہرِ خسروی کے مرتب نے ذیل کے شعر کو خالق باری کی خسرویت کے ثبوت میں پیش کیا۔

مولوی صاحب سرن پناہ　　گدا بھکاری خسرو شاہ

دوسرے مصرع میں کتنی طبّاعی ہے۔ ایک طرف تو مترادف لغات کا حق ادا ہوتا ہے، دوسری طرف شاعر کا اظہارِ عاجزی ہے کہ خسرو شاہ گدا بھکاری ہے، لیکن شیرانی نے پنجاب میں اردو میں دکھایا کہ یہ شعر وضعی ہے۔ اس زمانے میں 'مولوی' کا لفظ مستعمل نہ تھا۔ صاحب کا تعظیمی لاحقہ محض ایک صدی سے رائج ہے۔ شاہ محض سادات کے نام میں آتا ہے، خسرو خود کو شاہ کیوں کہتے۔

اِدھر شان الحق حقی نے "نذرِ خسرو" (کراچی ۱۹۸۳ء) میں سینکڑوں کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں تصنیف کر کے پیش کیں۔ ان میں بھی جودت کے شرارے ملتے ہیں۔ کسی نے خسرو کے فارسی انمل کو دیکھ کر اردو میں ایک انمل تصنیف کر دیا ہوگا۔ اسے اور اس جیسے دوسرے لطائف کو پیش کرنے والا کون ہے؟ محمد حسین آزاد جیسا ادبی جعل ساز جس کی روایت کا، تا وقتیکہ اس کی کسی دوسرے ماخذ سے تصدیق نہ ہو، کوئی بھروسا نہیں۔ وہ سودا سے سو سال پہلے کی فارسی رباعی "تو فخرِ خراسانی و فاساقطِ ازو" کو ایک لطیفے کی خاطر سودا اور فاخر مکین سے ملا دیتا ہے۔ بیدل اور جعفر زٹلی کے واقعے منقول تذکرۂ میر حسن ع لالہ در باغ داغ جوں دارد، کو سودا اور جعفر زٹلی کا لطیفہ بنا دیتا ہے۔ ایسے راوی کے بیانات کو قاضی عبدالودود نے بجا طور پر بازاری گپ قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں۔

"خسرو کے حال میں جتنی حکایتیں آب میں درج ہیں محض بازاری گپیں ہیں

Marfat.com

"خسرو کا جو کلام آب میں ہے اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جسے ان کی طرف منسوب کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود ہو۔" [1]

آب سے مراد آبِ حیات ہے۔ اب پہیلیوں کو لیجیے۔ مطبوعہ شکل میں چند پہیلیاں پہلی بار ڈاکٹر اسپرنگر کے ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۴ء کے دو انگریزی مضامین میں شامل ہوئیں۔ اس کے بعد آبِ حیات، فرہنگِ آصفیہ اور جواہرِ خسروی ہیں۔ جواہرِ خسروی کی پہیلیاں زیادہ تر احمد علی خاں شوق نے رام پور سے بھیجیں جن میں سے کچھ کتابوں سے نقل کرائیں، کچھ زبانی روایتوں سے لیں۔

پہیلیوں کا سب سے بڑا مجموعہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے "امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخۂ برلن ذخیرۂ اسپرنگر" کے نام سے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ اس میں انہوں نے خسرو کی پہیلیوں کے مختلف مجموعوں اور راندر راجات کی صراحت کی ہے۔ اسپرنگر نے ایشیاٹک سوسائٹی جرنل کلکتہ ۱۸۵۲ء جلد ۲۱ شمارہ ۶ میں ایک مضمون شائع کیا۔ "کیا سعدی شیرازی نے ریختہ اشعار کہے ہیں؟" میں نے یہ مضمون رسالہ اردو کراچی بابت اکتوبر تا دسمبر ۸۶ء میں دوبارہ شائع کرادیا۔ اس مضمون میں انھوں نے خسرو کی چھے پہیلیاں دی ہیں اور ساتھ ہی یہ تبصرہ بھی درج کیا ہے۔

"یہ یقینی ہے کہ خسرو سے منسوب کی ہوئی پہیلیوں میں سے ۹/۱۰ بہت بعد کی تاریخ کی ہیں۔" (رسالہ اردو ص ۳۲ نیز ڈاکٹر نارنگ کی کتاب ص ۱۱۶)

اسپرنگر نے اپنے ۱۸۵۴ء کے ایک اور مضمون میں کچھ مزید پہیلیاں دیں نیز اسی سال اس نے شاہانِ اودھ کے کتب خانے کی فہرست مخطوطات شائع کی جس میں ایک نسخہ 'پہیلی امیر خسرو' کا ذکر کیا۔ نمونتہً اس کی تین پہیلیاں درج کیں اور اس کے بعد مزید نسخوں کا تعارف دیتے ہوئے لکھا کہ توپ خانے میں دس یا بارہ چھوٹے نسخے ہیں جن میں کل

---

[1] آزاد بحیثیت محقق۔ نوائے ادب اکتوبر ۱۹۵۶ء۔ ص ۲

Marfat.com

ملاکر تقریباً دو سو پہیلیاں ہیں۔[1] ڈاکٹر نارنگ کو برلسن میں ذخیرۂ اسپرنگر میں ایک مجموعہ ملا جس میں چار نسخے ایک جلد میں مجلّد ہیں۔ ان میں تیسرا نسخہ زٹلیات جعفر زٹلی ہے اور چوتھا نسخہ 'پہیلی ہائے ہندی' چاروں نسخے خطِ نسخ میں ہیں اور ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ چوتھے نسخے پر کسی نے بعد میں نستعلیق میں اس کا نام 'پہیلی ہائے ہندی' لکھ دیا ہے۔

تیسرے نسخے کے آخر میں سنہ کتابت ۱۲۱۰ھ درج ہے جو مطابق ہے ۵۶-۱۷۹۵ء کے۔ ڈاکٹر نارنگ لکھتے ہیں:

"اگر یہ چاروں نسخے ایک ہی وقت میں نقل ہوئے ہیں تو اغلب ہے کہ 'پہیلی ہائے ہندی' بھی ۱۷۹۵ء کا مکتوبہ ہو لیکن اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" (ص ۱۰۴)

ڈاکٹر نارنگ مطلع کرتے ہیں کہ "ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، ڑ، ڑھ تمام معکوسی حروف کے لئے بالائی ط کا استعمال کیا گیا ہے۔" (ص ۱۱۰)۔ یہ ایک غیر معمولی صورت حال ہے جس کے پیشِ نظر زٹلیاتِ جعفر زٹلی اور دوسرے نسخوں کی تاریخِ کتابت مشکوک ہو جاتی ہے کیونکہ عموماً انیسویں صدی کے وسط سے پہلے کہیں معکوسی حروف میں بالائی ط نہیں ملتی۔ واضح ہو کہ نسخے کی ابتدا میں جو بعد کی اضافہ شدہ تین پہیلیاں نستعلیق خط میں ہیں ان میں معکوسی حروف کے لئے سرے سے کوئی نشان نہیں (ص ۱۰۹)۔ نسخوں میں ہکاری آوازوں کو دو چشمی ھ سے لکھا ہے جب کہ ان تین پہیلیوں میں کہیں بھی دو چشمی ھ نہیں۔ متن کی ان کتابتی جدتوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اگر ایک دفعہ کو نسخوں کو ۱۲۱۰ھ کا مکتوبہ بھی مان لیا جائے تو بھی اس سنہ سے پہلے خسرو کی ایک بھی ہندی پہیلی کہیں نہیں ملتی۔

زیرِ نظر نسخے کے اوّل و آخر میں کہیں مصنف یا مولّف کا نام درج نہیں ہے۔ اسپرنگر ہندوستان سے یورپ جاتے ہوئے ۱۹۷۲ مخطوطات ساتھ لے گیا تھا۔ اس نے ۱۸۵۷ء میں جرمن زبان میں اسپرنگر یانا اورینٹل لائبریری کی کیٹلاگ

---

[1] بحوالہ کتاب ڈاکٹر نارنگ ص ۹۹-۹۸۔

Marfat.com

شائع کردی۔ ڈاکٹر نارنگ کے پاس اس کا عکس ہے۔ انہوں نے مجھے اپنے ۵/ستمبر ۱۹۸۷ء کے خط میں لکھا کہ فہرست کے ص ۹۶ پر نہ کورہ مخطوطہ نمبر ۳۷ کے لئے لکھا ہے۔

Hindee enigmas ascribed to Myr Khasau (34 P. P.)

اس سے یہ ظاہر ہوگیا کہ انہیں خسرو سے متعلق کرنا اسپرنگر کی تشخیص ہے۔ خود نسخے میں کوئی ایسی تحریر نہیں جس میں پہیلیوں کو خسرو کی تخلیق قرار دیا ہو۔ تحریری شہادت کی عدم موجودگی میں اسپرنگر کے قیاس کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے اسپرنگر کی رائے میں پہیلیوں کا $\frac{9}{10}$ حصہ خسرو کے بعد کا ہے۔ نارنگ اسپرنگر کے اس فیصلے کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

"یعنی اس کا قوی امکان ہے کہ ان میں دس میں نو بعد کی ہوں۔ اسپرنگر کی اس رائے سے اتفاق نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اگرچہ میرا خیال ہے کہ یہ غالباً سخت احتساب ہے۔ (ص ۱۱۶۔ پھر کہتے ہیں کہ اس طرح اگر ان ۱۵۰ پہیلیوں میں صرف ۱۵ خسرو کی ہوں تو بھی جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کون سی ہیں تب تک اس سرمائے کی حفاظت ہمارا فرض ہے آگے ص ۱۳۸ پر پھر کہتے ہیں کہ "اسپرنگر کی اس رائے سے اتفاق نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔" اگر وہ اسپرنگر کی تقلید میں محض ۱۵ پہیلیوں کو خسرو کی ماننے کو تیار ہیں تو کتاب کا نام "امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ 'برلن' لکھ کر کیوں غلط فہمی پیدا کر رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"جہاں تک شاہانِ اودھ کے کتب خانوں میں محفوظ امیر خسرو کے ہندوی کلام کے ان نسخوں کا تعلق ہے جن کا ذکر اسپرنگر نے اپنے مضمون میں کیا تھا، کارکنانِ قضا و قدر یہ کام خود خاکسار سے لینے والے تھے۔" ص ۷،

ایسا لگتا ہے کہ ان کا دلی رجحان اس نسخے کو خسرو کا ماننے کی طرف ہے۔ مقدمے کے آخر میں کہتے ہیں

اگر اس میں کچھ پہیلیاں ایسی ہیں جو الحاقی ہیں تو بڑا حصہ ایسا بھی ہے جس کو غیر معتبر سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں"۔ ص ۱۴۲

اس جملے سے ایسا تاثر ہوتا ہے جیسے ۲۰، ۳۰ فی صد۔ پہیلیاں ہی الحاقی ہیں،

Marfat.com

بقیہ ۷۰، ۸۰ فی صد خسرو کی۔ ذرا ہم بھی پہیلیوں میں جھانک کر دیکھ لیں۔ ا

ڈاکٹر نارنگ مقدمے کے ص ۱۱۵ اور ۱۳۸ کی ابتدائی سطروں میں مانتے ہیں کہ بعض پہیلیاں جو بعد کی ایجادات کا ذکر کرتی ہیں صریحاً الحاقی ہیں، چنانچہ وہ تفنگ (ص ۱۵۸)، توپ (ص ۱۷۱)، عینک کی دو پہیلیوں (ص ۱۷۲)، حقّہ (ص ۱۷۵) اور پیچوان (ص ۱۸۳) کی پہیلی پر نوٹ دیتے ہیں کہ یہ الحاقی ہیں۔ میری رائے میں ان میں پہیلی حباب صابون (ص ۱۵۳) بھی شامل کر لی جائے کیونکہ اس عہد میں صابون کہاں تھا۔ مجھے لفظ 'الحاقی' کا استعمال اٹ پٹا معلوم ہوتا ہے کیونکہ نسخے میں یہ کہیں دعویٰ نہیں کیا گیا کہ یہ خسرو کی تصنیف ہے کسی مؤلف نے رائج الوقت پہیلیوں کو جمع کر دیا ہے۔ اُردو کے دو محققین جناب مالک رام اور ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے بھی مجھ سے ملاقات میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ان پہیلیوں اور مجموعے کو خسرو سے منسوب کرنا درست نہیں۔

متعدد پہیلیوں کی زبان اتنی صاف اور متروکات سے پاک ہے کہ خسرو کے دور میں ممکن ہی نہیں مثلاً چند نمونے دیکھئے

پہیلی تعزیہ

گور کے اندر روضہ دیکھا سچ لاؤ ایمان — پھر روضے میں گور بھی دیکھی ذری نہیں طوفان ص ۱۶۲

ایک جزیرہ ایسا دیکھا سدا بنے پھر ٹوٹ — گور کے اندر گور کو رکھیں ذری نہیں ہے جھوٹ " "

میری رائے میں ذرا کو ذری کہنے کا رواج انیسویں صدی میں۔ بالخصوص لکھنؤ میں ہوا۔

پہیلی سان

الٹی سیدھی چلے پھرے اور کمر سے باندھے چام — لاکھ جتن سے اسے بنایا نہیں بھولتی کام ص ۱۶۷

پہیلی کسبن

سہاگن نہیں، نہیں وہ رانڈ — چھٹی پھرے ہے جیسے سانڈ

بستی میں پھسلاتی ہے — اور جنگل زور دکھاتی ہے ص ۱۶۹

پہیلی لب

Marfat.com

تلا اوپر کے دو ہیں بھائی ان کا ہے یہ کام — لڑیں بھڑیں آپس میں دونوں مل کر کریں کام (ص ۱۷۸)

پہیلی دلہن

بن رنگیلی شرم کی بات — بے موسم آئی برسات

یہی اچھنبا مجھ کو آئے — خوشی کے دن کیوں روتی جائے ص ۱۷۹

اور ایسی بھی متعدد پہیلیاں ہیں جن میں ایک آدھ لفظ برج کے انداز کا آگیا ہے ورنہ شعر آج کی زبان میں ہے۔ ڈاکٹر نارنگ لکھتے ہیں:۔

اس زمانے کی صاف زبان کے ٹکڑے خود امیر خسرو کے اس فارسی کلام میں ہمیں مل جاتے ہیں جس کے استناد پر سب ہی محققین متفق ہیں۔ گویا 'صاف' اور 'غیر صاف' زبان کی بنیاد بھی زیادہ قابلِ اعتماد نہیں۔" ص ۱۳۸

فارسی کلام میں ہندی فقرے محض دو تین الفاظ کے ہیں محض "مارا" اور "مار" سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خسرو کے زمانے میں کھڑی بولی آج کی طرح صاف تھی۔ اگر زبان کے ارتقا کی طرف سے آنکھ موند لی جائے تو گویا ہر صدی کی زبان اس سے پانچ سات صدی ادھر ادھر بولی جانی ممکن ہے۔ بہر حال چونکہ مخطوطے میں کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ یہ خسرو کا موقف ہے اس لئے اس مد میں بحث کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔

صفائی زبان کا پیمانہ اس نسخے کے علاوہ دوسری پہیلیوں پر بھی چسپاں کرنا ہوگا۔ واضح ہو کہ ع ایک تھال موتیوں سے بھرا، والی پہیلی کو نجم الغنی نے بحر الفصاحت میں بہادر شاہ ظفر کے نام سے درج کیا ہے[1] خسرو کی بیشتر پہیلیوں کی زبان انیسویں صدی کی کھڑی بولی ہے۔ کچھ ایسی پہیلیاں ہیں جن کی زبان برج آمیز ہے مثلاً

ایک نار تر وَر سے اتری، ماں سوں جنم نہ پایو
باپ کو ناؤں جو دا سے پوچھو آدھو ناؤں بتایو
(نبولی)

---

[1] نجم الغنی: بحر الفصاحت لکھنؤ۔ سنہ طبع ندارد۔ مقدمہ، ۱۹۵ء۔ ص ۹۹۵

Marfat.com

شیام برن اور دانت انیک لچکت جیسے ناری
دونوں ہاتھ سے خسرو کھینچے اور یوں کہے تو آری' (آری)

اس قسم کی چیزوں کی زبان میں برج کی آمیزش کی وجہ سے فرسودگی کا شائبہ ہوتا ہے لیکن حق یہ ہے کہ یہ بھی تیرھویں صدی عیسوی کی زبان نہیں۔

خسرو کی ہندی پہیلیوں کا ذکر سب سے پہلے کب ملتا ہے؟ اسپرنگر نے اپنے ۱۸۵۲ء کے مضمون میں لکھا ہے کہ قائم نے اپنے تذکرے میں خسرو کے چیستانوں (Logogriphs) کا ذکر کیا ہے۔ مخزن نکات کے انجمن کے نسخے میں ان کا ذکر نہیں، اس تن میں رہا ہوگا جو اسپرنگر کے پیش نظر تھا۔ اس طرح خسرو کی ہندی پہیلیوں کا ذکر پہلی بار اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں اور کہہ مکرنیوں اور ڈھکوسلوں وغیرہ کا آبِ حیات میں ملتا ہے۔ اگر خسرو نے انہیں کہا تھا تو ان کا کوئی قدیم نسخہ یا کسی کی کتاب میں ان کا کوئی ذکر کیوں نہیں ملتا۔ اتنی جدید روایت اور جدید زبان کے پیشِ نظر کوئی عقلی دلیل ان کے خسرو سے انتساب کے حق میں نظر نہیں آتی، صرف جذباتی استدلال بچتا ہے کہ ہمارے دور میں خسرو کو جس ذخیرے کا مالک بتایا جاتا ہے، اس سے اسے کیونکر بے دخل کر دیا جائے۔ یہ صورت محض پہیلیوں کی نہیں، خسرو کے پورے ہندی کلام کی ہے۔

خالق باری۔

اب لیجئے خالق باری کے قضیے کو۔ یہ دراصل فارسی کتاب ہے اسے اردو ادب کے ضمن میں نہیں لیا جا سکتا لیکن چونکہ یہ ایک منظوم فارسی لغت ہے اس لئے اس کے بارے میں کچھ کہنا خلافِ موقع نہ ہوگا۔

فارسی میں اہلِ مکتب کے افادے کے لئے منظوم لغات کا رواج قدیم سے رہا ہے جس کی تقلید میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بھی اس قسم کی لغات لکھی گئیں۔ صفدر آہ لکھتے ہیں کہ افغانستان میں ابو نصر فراہ نے ۶۱۷ھ میں عربی فارسی منظوم نصاب 'نصاب الصبیان' لکھا۔ ڈاکٹر صفدر نے اس کے اور خالق باری کے بعض اشعار کا مقابلہ کر کے ثابت کیا ہے کہ خالق باری پر نصاب الصبیان کا واضح

Marfat.com

اثر ہے [1]

اگر خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے تو اس کے بعد ڈھائی سو برس تک سناٹا نظر آتا ہے اگلی نظم ایرانی حکیم یوسف ہراتی کی قصیدہ لغتِ ہندی ۹۵۰ھ کی ہے۔ لغات کی پوری کتاب 'اجے چند نامہ' ہے جس کی تفصیل ان ہی اوراق میں آگے ملے گی۔ اس کا مصنف اجے چند بھٹناگر متوطن سکندر آباد ضلع بلند شہر ہے، تاریخ تصنیف ۹۶۰ھ۔ مولوی عبدالحق نے اس کا تعارف رسالہ اردو جنوری ۱۹۵۲ء میں مثل خالق باری کے نام سے کرایا۔ اسے اسی نام سے افسر امروہوی نے رسالہ اردو بابت جولائی ۸۳ء اور اکتوبر ۸۳ء میں چھاپ دیا۔ اس کا مکمل نسخہ ڈاکٹر نذیر احمد کو مولانا آزاد لائبریری بھوپال میں مل گیا اور انہوں نے اسے رسالہ غالب نامہ دلی جنوری ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ رسالے کے ترقیمے میں اس کا نام 'اجے چند نامہ' دیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے خالق باری اور اجے چند نامہ کے کئی اشعار کا تقابل کر کے ان کی گہری مماثلت کی طرف توجہ دلائی [2] ہے بعض اشعار کے قافیے یکساں ہیں، بعض مصرعے دونوں میں لفظ بہ لفظ مشترک ہیں۔ کوئی شبہہ نہیں کہ موخر مصنف نے مقدم مصنف کے کارنامے کو سامنے رکھا ہے۔

اگر اجے چند نے خالق باری کو سامنے رکھا تو حیرت ہے کہ اس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس کا پہلا مصرع "باری تعالیٰ نام گسائی" ہے۔ خالق باری کی تقلید میں کتاب کا نام باری تعالیٰ رکھنا چاہیئے تھا۔

تیسری کتاب مقبولِ صبیاں مخزونہ برٹش میوزیم، ۹۹۰ھ کی ہے [3] اگلی کتاب کسی کی واحد باری (۱۰۲۸ھ) ہے۔ اس کو پاکستان کے ڈاکٹر رانا احسان الٰہی نے آٹھ قلمی اور دو مطبوعہ نسخوں کی مدد سے چھاپ دیا۔ خود ان کا نسخہ ۱۲۰۴ھ

---

[1] امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر (۲) نوائے ادب جنوری ۱۹۶۲ء۔ صـ ۲۷-۲۸

[2] نذیر احمد، اجے چند نامہ، غالب نامہ جنوری ۱۹۸۶ صـ ۹۰-۱۰۰

[3] بحوالہ ڈاکٹر نارنگ نسخہ برلن صـ ۱۳۱

Marfat.com

کا مکتوبہ ہے[1]۔ میں نے یہ کتاب نہیں دیکھی۔ پانچویں لغت تجلی کی اللہ خدائی ۱۰۶۰ھ کی ہے جس کا تعارف پروفیسر مسعود حسن رضوی نے رسالہ ہندوستانی ۱۹۳۱ء میں کرایا۔ اس کا مصنف لکھتا ہے

بہر مرغِ سخن نہادہ دام — مددے خواستہ زروح نظام
شاید از لطفِ رحمتِ باری — روح خسرو نمایدم یاری

ان اشعار میں نظام سے مراد نظام الدین اولیا اور خسرو سے مراد امیر خسرو ہیں۔ یہ خالق باری کے وجود کا ایسا ثبوت ہے جو شک و شبہہ سے بالاتر ہے۔

محمود شیرانی نے اپنی حفظ اللسان میں فارسی ہندی کی متعدد لغات کی فہرست دی ہے جن میں اسمٰعیل کی رازق باری ۱۰۷۱ھ اور مصطفٰے کی رازق باری ۱۰۸۵ھ گیارھویں صدی ہجری کی ہیں۔[2]

اللہ خدائی میں محض خسرو اور نظام کی طرف اشارہ تھا۔ کتاب کا نثر میں واضح ذکر خان آرزو (۱۱۶۹ھ) نے اپنی تصنیف تصحیح غرائب اللغاتِ ہندی میں کیا۔ انھوں نے اسے رسالۂ منظومۂ امیر خسرو کہا ہے۔ اس کے اور خالق باری کے اندراجات کا مقابلہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی مراد خالق باری سے ہے۔ اس کتاب کی ناقص زبان و بیان، فنی اور معنوی اسقام کو دیکھ کر شیرانی سے پہلے بھی اس پر شبہہ کیا جاتا تھا کہ یہ خسرو کی تصنیف ہے کہ نہیں۔ ۱۹۱۸ء میں جواہرِ خسروی میں مولانا محمد امین نے اسے محنت سے ترتیب دیا اور تمہید میں اس سے متعلق شبہات کی تردید کی۔ ۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں، ثابت کیا کہ یہ کتاب امیر خسرو کی تصنیف نہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۴ء میں اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھ دی اور انجمن ترقی اردو کے ایک مخطوطے کی بنا پر انکشاف کیا کہ اسے عہد جہاں گیر کے ضیاء الدین خسرو نے ۱۰۳۸ھ میں تصنیف کیا۔ نسخے کی تاریخ کتابت ۱۱۸۷ھ ہے۔

---

[1] ڈاکٹر معین الدین عقیل: پاکستان میں اردو تحقیق، موضوعات اور معیار (کراچی ۱۹۸۷ء) ص ۴۰

[2] نذیر احمد، غالب نامہ ص ۹

Marfat.com

شیرانی کے جواب میں ڈاکٹر صفدر آہ نے اپنے مضمون 'امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر' میں کچھ دلائل دیے. انھوں نے خالق باری کے دو بیش بہا مخطوطوں کا ذکر کیا:۔

۱۔ نجیب اشرف ندوی کا نسخہ جس میں سالِ کتابت درج نہیں۔
۲۔ انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹیوٹ بمبئی کا نسخہ ۱۲۶۱ھ

ان دونوں کے آخر میں ایک مشترک قطعۂ تاریخ ہے جو یہ ہے ؎

چوں بگرفت ایں نسخہ طرز نوی — زتصنیف آں خسروِ پہلوی دہلوی
بہ تاریخِ نیکو سر انجام یافت — نصاب ظریفی نکو نام یافت
زہفت صد فزوں سی و شش سال بود — کہ طبع از خرد دست یاری نمود
کہ صبیاں برآئند از دام جہل — شود فیض الفاظ اشکال حل[1]

ندوی کے نسخے میں 'خسروِ پہلوی' تھا، انجمنِ اسلام کے نسخے میں خسروِ دہلوی. خسرو کا انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا. ڈاکٹر صفدر آہ نے مندرجہ بالا قطعے سے نتیجہ نکالا کہ کوئی نسخہ ۷۳۶ھ میں لکھا گیا اور اس میں یہ قطعۂ تاریخ کتابت لکھ دیا گیا. بمبئی کے دونوں نسخے اسی نسخے کی نقل ہیں۔

واضح ہو کہ نسخۂ ندوی کب کا غائب ہو گیا. صفدر آہ نے نوائے ادب جنوری ۶۲ء کے مضمون میں لکھا کہ یہ نسخہ کسی طرح نہیں مل سکا. مجھے پروفیسر عبدالستار دلوی نے بتایا کہ ندوی صاحب کے انتقال کے بعد ان کے مخطوطے ان کے فرزند امریکہ لے گئے. جہاں تک انجمن اسلام کے نسخے کا تعلق ہے وہ بھی اب غائب ہے۔ مجھے انجمن کے ڈائریکٹر نظام الدین گوریکر نے بتایا کہ اب وہ نسخہ کہیں موجود نہیں۔ لیکن محمود شیرانی اپنی کتاب حفظ اللسان لکھنے سے پہلے پروفیسر ندوی کا نسخہ دیکھ چکے تھے. ان کے نزدیک مصنف قطعہ نے ۷۳۶ھ اپنے نسخے کی تاریخ کتابت بیان نہیں کی بلکہ اپنی دانست میں خسرو سے منسوب خالق باری کی تاریخِ تصنیف درج کی ہے اور اس سلسلے میں انھیں غلط فہمی تھی. شیرانی کی توجیہہ کا یہ جواز ہو سکتا

---

[1] نوائے ادب جنوری ۱۹۶۲ء ص ۳۸. ۳۷

Marfat.com

ہے کہ پہلے شعر میں 'تصنیف' کا ذکر ہے دوسرے میں کتاب کا نام ہے۔ مجھے مزید دو اعتراضات ہیں۔

۱۔ خسرو نصابِ ظریفی جیسا لچر نام نہیں رکھ سکتے تھے۔

۲۔ قطعے میں تاریخ والا مصرع غیر موزوں ہے۔ ہفت صد کی جگہ 'ہفصد' ہونا تو درست تھا۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ شیرانی کی تاویل دور از کار ہے۔ دو نسخوں میں قطعے کی موجودگی سے لگتا ہے کہ یہ نصاب ۷۳۶ھ میں موجود تھا۔

خالق باری کے خسرو کی تصنیف ہونے کے ایک وکیل ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں جنھوں نے اپنی تاریخِ ادب میں اپنی تائید میں دو منظوم لغات کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ اشرف بیابانی مصنفِ نوسر ہار (۹۰۹ھ) کی واحد باری اور خسرو کی خالق باری کے آخری شعر یہ ہیں ؎

واحد باری ہوئی تمام　　دنیا میں رہے اشرف کا نام
خالق باری ہوئی تمام　　دو ہوں جگ رہیا خسرو نام

شیرانی نے پنجاب میں اردو میں یہ شعر یوں دیا ہے۔

دو جگ رہیا خسرو نام　　خالق باری ہوئی تمام

۲۔ جالبی کہتے ہیں کہ صاف ظاہر ہے اشرف بیابانی نے اپنا مقطع خالق باری کے مقطع سے ماخوذ کیا ہے۔ خسرو مقدم ہیں، اشرف موخر۔ ضیاء الدین خسہ و اشرف کے بعد کے ہیں۔

واحد باری کے مصنف کے بارے میں سب سے پہلے ڈاکٹر زور التباس کا شکار ہوئے ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدر آباد میں اس کا ایک نسخہ ہے۔ اس میں اشرف تخلص آیا ہے۔ اپنی فہرست میں اس کا ذکر کرتے وقت ڈاکٹر زورؒ نے اشرف بیابانی سمجھ بیٹھے[۲] اس کا ایک نسخہ سالار جنگ لائبریری میں بھی ہے۔ اس کی تفصیل دیتے وقت نصیر الدین ہاشمی نے واضح کیا کہ اس کا مصنف اشرف بیابانی نہیں

---

[۱] تاریخ ادب اردو جلد اوّل ص۳۳

[۲] تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اوّل ۱۹۴۳ء۔ ص۲۸۴

Marfat.com

آصفی دور کا ایک شاعر ہے جس کا نام اشرف الدین ہے اور جو سکندر جاہ کے عہد میں یہاں آیا۔[1]

رئیس سردار سکندر جاہ　　منیر روشن چند اماہ

مثنوی کے آخر میں تاریخ ۹ رمضان ۱۲۲۶ھ بروزِ جمعہ دی ہے جو ہاشمی کے نزدیک تاریخِ تصنیف و تاریخِ کتابت دونوں ہے۔ راقم الحروف نے بھی یہ مخطوطہ دیکھا ہے اس کا نام واحد باری عرف فوائد الطلبہ ہے۔ اس میں یہ تین اشعار ہیں۔

رئیس سردار سکندر جاہ　　منیر روشنی چند اماہ
اشرف دیں سے واحد باری　　ایسا نہیں کوئی جگ میں خواری
بانس بریلی وطن ہے میرا　　حیدرآباد میں رہا بسیرا

مصنف کے بارے میں کچھ اور تفصیل دیتے ہوئے ڈاکٹر حسینی شاہد نے بھی اس مغالطے کی طرف اشارہ کیا[2] ظاہر ہے پاکستان کے ڈاکٹر رانا احسان الٰہی کی واحد باری ۱۰۲۸ھ اس سے مختلف کتاب ہونی چاہیے۔

۳۔ دوسری کتاب کسی صفی کی 'مطبوع الصبیان' ہے۔ اس کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں ہے۔ صفی نے اس کا نام یوں دیا ہے۔

کتاب مطبوع الصبیان عرف خالق باری تصنیفِ امیر خسرو دہلوی قدس سرہ العزیز۔

یہ نسخہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظر سے گزرا ہے[3] ایک دوسرا مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو میں ہے اور ڈاکٹر زور نے اس کی تفصیلات دی ہیں۔ اس کی ابتدا میں ۲۸ فارسی اشعار کا ایک دیباچہ ہے جس میں کہا ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف تھی۔ اصلاً اس میں ۱۷۰ اشعار تھے۔ اس میں ۱۲۰ الحاقی اشعار شامل ہو گئے۔ ان کی میزان ۲۹۰ ہوتی ہے۔ آگے لکھتے ہیں۔

---

[1] کتب خانۂ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست۔ حیدرآباد، ۵۔ ۱۹ ص ۳۵۵

[2] سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیات اور کارنامے۔ ص ۲۶

[3] تاریخ ادبِ اردو　　جلد اوّل ص ۳۲

Marfat.com

چو بیت کہنہ و نورا کنی گنج　　شو ندسی صد دِگر پنجاہ و ہم پنج [1]

جمیل جالبی کے مطابق مزید الحاق کے بعد تعداد ۳۵۵ ہوئی. ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ صفی نے خالق باری میں اشعار شامل کر کے اپنے نسخے کی کل تعداد ۳۵۵ بنا دی. ادارہ ادبیات کا نسخہ نامکمل ہے. پاکستان کے نسخے میں فی الحال محض ۱۴۴ اشعار ہیں حیدرآبادی نسخے سے معلوم ہوتا ہے کہ صفی نے صرف لغت کے اشعار کا اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ خواہ مخواہ عشقیہ اشعار شامل کر دیے ہیں مثلاً

تن میں مرے فراق سوں تیرے ہا نہ پاس　　دکھلا سجن اپس کا درس تا پھکے ہو لاس
مشتاق تجہ وصال کا دن رات اے سجن　　درسن دکھا کے مجہ سوں مٹھے بول دو بچن

نیز فارسی کے عروض سے متعلق اشعار کا اضافہ بھی کیا ہے.

جالبی لکھتے ہیں

"ضیاء الدین خسرو نے 'خالق باری' کے ساتھ وہی عمل کیا جو صفی نے 'مطبوع الصبیان' میں کیا کہ 'خالق باری' کے اشعار میں اضافہ کر کے اسے ضرورتِ زمانہ کے مطابق نئی ترتیب اور اضافے کے ساتھ مرتب کر دیا" (تاریخ جلد اوّل صہ ۳۴۰)

ڈاکٹر جالبی نے صفی کا زمانہ نہیں دیا. ڈاکٹر زور نے اس کی زبان کی بنا پر قبل ۱۲۰۰ء لکھا ہے. انجمن ترقی اردو پاکستان میں صفی کی کتاب بدرِ انوار کا ایک مخطوطہ ہے. [2] مصنف کا نسخہ ہے جس میں اس کا نام صفی دکنی لکھا ہے اور تاریخ تصنیف ۱۱۶۳ھ. اس مثنوی کی زبان اور مطبوع الصبیان کی زبان میں مماثلت ہے. دونوں کتابوں میں ابیات کا شمار دیا ہے. قیاس چاہتا ہے کہ دونوں کا مصنف ایک ہی صفی دکنی ہے. مطبوع الصبیان اپنی زبان کے لحاظ سے ۱۱۶۳ھ کے لگ بھگ ہی کی معلوم ہوتی ہے. اس وقت تک خالق باری کو خسرو سے منسوب کیا جا چکا تھا اس لیے صفی کی شہادت زیادہ وزن نہیں رکھتی.

ڈاکٹر صفدر آہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے بعد محمود شیرانی کے موقف کے تیسرے

---

[1] تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اوّل صہ ۲۷۰

[2] فہرستِ مخطوطات جلد سوم ۱۹۷۵ء. صہ ۵۳

Marfat.com

پُرزور مخالف ممتاز حسین ہیں جنھوں نے اپنی کتاب امیر خسرو دہلوی میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا[1] ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے

۱۔ شیرانی لکھتے ہیں

"تاریخِ ادب میں خالق باری کا کہیں ذکر نہیں آتا . . . نہ کوئی اسے جانتا ہے اور نہ اس کے قدیم نسخے دستیاب ہوتے ہیں. جس قدر نسخے ملتے ہیں بارھویں تیرھویں صدی ہجری کے نوشتہ ہیں. صرف ایک نسخہ (ناقص) ایسا ہے جو گیارھویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے" لیکن مسعود حسن رضوی نے رسالہ ہندوستانی ۱۹۳۱ء میں اسی انداز کی ایک کتاب اللہ خدائی از تجلی تصنیف ۱۰۶۰ھ کا تعارف کرایا. اس کا مصنف لکھتا ہے۔

بہرِ مرغِ سخن نہادہ دام　　مددے خواستہ زروحِ نظام
شاید از لطفِ رحمتِ باری　　روحِ خسرو نمایدم یاری

ان اشعار میں نظام سے مراد حضرت نظام الدین اولیاء اور خسرو سے مراد امیر خسرو ہیں. چونکہ اللہ خدائی بھی منظوم نصابی لغت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خسرو مصنفِ خالق باری سے استمداد کر رہا ہے.

۲۔ محمود شیرانی نے مطبوعہ حفظ اللسان کا متن تیار کرنے میں بقول ممتاز حسین ایک پیوند کاری کی ہے. انھوں نے اس میں دو نسخوں کو ملا دیا. ایک انجمن ترقی اردو یا مولوی عبدالحق کا تھا جس میں تمہید اور ترقیمہ دونوں تھے. اس کا نام حفظ اللسان اور مصنف کا نام ضیاء الدین خسرو تھا. اس کا آخری شعر یہ ہے.

عاقبت انجام و آخر چیہ دیو را انصرام　　کرد ایں حفظ اللسان را خسرو والسلام

اس کے ترقیمے میں ہے.

"لہٰذا بحفظ اللسان موسوم و در سال نصیف آخر تاریخ بدیہہ مرقوم گردید" شیرانی نے "نصیف آخر" کو تاریخ مان کر اس سے ۱۰۳۰ھ تاریخ تصنیف برآمد کی. ممتاز حسین کے نزدیک یہ مادۂ تاریخ معلوم نہیں ہوتا بلکہ "تصنیف" کو سہو کتابت سے "نصیف"

---

[1] اصل پاکستانی ایڈیشن کراچی ۱۹۷۶ء۔ دلّی ایڈیشن فروری ۱۹۸۲ء صفحہ ۳۵۶-۶۵۔

Marfat.com

لکھ دیا گیا ہے شیرانی کا دوسرا نسخہ انڈیا آفس لندن کا مخطوطہ نمبر ۲۲۵ ہے۔ اس میں نہ کوئی تمہید ہے نہ ترقیمہ۔ اس میں کہیں کتاب کا نام حفظ اللسان یا مصنف کا نام ضیاالدین خسرو نہیں دیا۔ اس کا آخری شعر یہ ہے۔

خالق باری بھئی تمام دوہوں جگ رہیا خسرو نام

اس بیت کی وجہ سے شیرانی نے اس نسخے کو چھاپ دیا ہے لیکن اس پر انجمن ترقی اردو کے نسخے کی تمہید و ترقیمہ چسپاں کر کے اسے ضیاء الدین خسرو کی حفظ اللسان کہا ہے۔ دونوں نسخوں میں فرق ہے۔ انجمن کے نسخے میں ۲۱۸ شعر ہیں جن میں ۱۹ شعر لندن کے نیز مطبوعہ نسخے میں نہیں۔ لندن کے نسخے میں ۲۳۵ شعر ہیں جن میں سے ۲۸ شعر انجمن کے نسخے میں نہیں۔ اس اختلاف کی بنا پر یہ دونوں نسخے دو علاحدہ کتابیں ہیں۔ شیرانی کو لندن کے متن پر انجمن کے نسخے اور مصنف کا نام نہیں چھاپنا چاہیئے تھا۔

میں ممتاز حسین کی اس رائے سے متفق نہیں کہ کچھ اشعار کی کمی بیشی کے باعث یہ دونوں نسخے دو الگ مصنفوں کی الگ الگ کتابیں ہیں۔ ان میں تقریباً دو سو اشعار مشترک ہیں۔ پھر یہ مختلف کتابیں کیونکر ہوئیں۔ اختلاف نسخ کو اختلاف کتب نہیں کہہ سکتے۔

۳۔ ممتاز حسین صفی کی کتاب مطبوع الصبیان کا ذکر کرتے ہیں جس میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے ۷۰ اشعر خسرو کی خالق باری سے لیے ہیں بقیہ الحاقی ہیں گویا اس نے خالق باری میں حذف و اضافہ کے بعد اپنا نسخہ تیار کیا۔ ضیاء الدین خسرو نے بھی یہی عمل کر کے خسرو کی خالق باری کی بنا پر حفظ اللسان تیار کی ہو گی۔

مطبوع الصبیان میں صفی نے لکھا ہے کہ اس میں کل ۳۵۵ شعر ہیں جن میں محض ۷۰ اصل خالق باری کے ہیں۔ اس کے باوجود اس نے کتاب کو اپنی تصنیف یا تالیف قرار نہیں دیا۔ اس کے نسخے کا عنوان ہے۔

کتاب مطبوع الصبیان عرف خالق باری تصنیف امیر خسرو دہلوی قدس سرہ العزیز ممتاز حسین کو صفی کے زمانے کا علم نہیں تھا۔ وہ بارھویں صدی ہجری

Marfat.com

کے نصف دوم کا مصنف ہے۔

۴۔ نجیب اشرف ندوی کے نسخے میں یہ نہیں کہا گیا کہ خالق باری ۷۳۶ھ میں تصنیف ہوئی (خسرو کا انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا) بلکہ یہ کہ نصاب ظریفی جو خسرو کے نسخے پر مبنی ہے ۷۳۶ھ میں تالیف ہوئی۔

اس کے قطعۂ تاریخ کے دو شعر یہ ہیں

چو بگرفت ایں نسخہ طرزِ نوی — زتصنیفِ آں خسروِ پہلوی

بتاریخ نیکو سرانجام یافت — نصاب ظریفی نکو نام یافت

ان کے تین معنیٰ ہو سکتے ہیں۔

ا۔ 'یہ نسخہ خسرو کی تصنیف سے ہے۔ جب اس نے نئی طرز کی بنا ڈالی . . . ،

محمود شیرانی نے مندرجہ بالا معنی مراد لے کر اسے مسترد کیا۔

ب۔ 'خسرو کی تصنیف سے ماخوذ ہو کر اس نسخے نے نئی طرز اختیار کی اور اس کا نام نصاب ظریفی رکھا گیا'

یہ معنیٰ ممتاز حسین نے طے کیے ہیں۔

ج۔ خسرو کی خالق باری کی نئی نقل کی گئی ہے اور اس کا نام نصاب ظریفی رکھا گیا۔ (تاریخ کتابت ۷۳۶ھ)۔ یہ معنیٰ صفدر آہ نے لیے ہیں۔

۵ خان آرزو متوفی ۱۱۶۹ھ نے طویل عمر پائی تھی۔ گوالیار کے متوطن تھے۔ وہ ۱۱۰۰ھ سے پہلے پیدا ہوئے ہوں گے۔ اگر انھیں کے شہر میں ۱۰۳۰ھ میں ضیاء الدین خسرو نے خالق باری تصنیف کی ہوتی تو خان آرزو اسے امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب نہ کرتے۔ اسی طرح تجلی نے ۱۰۶۰ھ میں اپنی منظوم لغت اللہ خدائی لکھی۔ وہ امیر خسرو سے مدد طلب کرتا ہے۔ اگر یہ کتاب اس سے محض ۳۰ سال قبل کی تصنیف ہوتی تو اسے معلوم ہونا چاہیے تھا۔

ممتاز حسین کے آخری دو دلائل مضبوط ہیں۔ اس پہلو کو اہمیت نہ دیجئے کہ کسی مؤلف نے خالق باری کا نام 'نصاب ظریفی' لکھا ہے۔ اس پر بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ۷۳۶ھ تاریخ کتابت ہے یا سہواً تاریخ تصنیف ظاہر کی گئی ہے اہم یہ ہے کہ ۷۳۶ھ میں امیر خسرو کو ایک منظوم اردو لغت کا مؤلف قرار دیا گیا ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد ۱۰۶۰ھ میں تجلی نے اسے ایسی ہی لغت سے منسوب کیا۔

محمود شیرانی نے خالق باری کے اندراجات پر جو سوالات اٹھائے ہیں وہ بھی اہم ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ خسرو نے خالق باری ضرور لکھی لیکن موجودہ نسخے کی ناقص فنی ہیت لسانی اغلاط اور ادبی کم مائگی کے پیش نظر موجودہ ہیت کو خسرو سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا بنیادی ڈھانچا خسرو نے نظم کیا جس میں کثرت سے الحاق، ترمیم و تحریف ہوئی۔

خالق باری کی مسلسل روایت مل جاتی ہے لیکن بقیہ ہندی کلام کے بارے میں ایسا نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی روایت کتنی مختصر ہے۔ ایک دو ہا ساڑھے تین سو سال پہلے ملتا ہے، چند اشعار دو سو سال پہلے بقیہ چیزیں پچھلی ایک صدی میں سامنے آئی ہیں۔ سینہ بہ سینہ روایت کا جال کتنا پر فریب ہوتا ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ شمس تبریز کا ایک دیوان اور ابو سعید ابوالخیر کی رباعیاں ان کی نہیں۔ فیضی کو روایتاً داستان امیر حمزہ کا مصنف کہا جاتا تھا۔ میں نے اپنے تحقیقی مقالے میں ثابت کر دیا کہ داستان فیضی سے قبل موجود تھی۔ چار درویش کو خسرو سے منسوب کیا جاتا تھا شیرانی نے اسے خسرو کی جھولی میں سے نکال لیا۔ معراج العاشقین کو خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا جاتا تھا لیکن حسینی شاہد اور حفیظ قتیل نے شافی طریقے پر ثابت کر دیا کہ یہ ان کی نہیں ہے۔ ہمارے اپنے زمانے میں مضطر خیر آبادی کی غزل ع نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں، بہادر شاہ ظفر کو تفویض کر دی گئی۔

خسرو کے نام سے جو ہندی شاعری ملتی ہے، تحقیق کے اصولوں پر اس کی کوئی سطر چوکھی نہیں اترتی۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کچھ حصہ ان کی تخلیق ہو لیکن اس کی زبان بہت کچھ اصلاح پا چکی ہے۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں ان کے حق میں فیصلہ کرنا ممکن نہیں۔ ان کی جدید زبان ان کے جدید العصر ہونے کی بیّن دلیل ہے۔

امیر حسن سجزی (م ۷۳۸ھ)

یہ دلی میں پیدا ہوئے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ جب محمد تغلق نے

Marfat.com

دارالسلطنت دتی سے دولت آباد منتقل کیا تو سلطان المشائخ کے خلیفہ شاہ برہان الدین غریب کے ساتھ دوسرے کئی مرید امیر حسن سمیت، دولت آباد چلے گئے امیر حسن سجزی فارسی کے زبردست شاعر تھے. یہ خسرو کے پیر بھائی تھے اور انھیں کی طرح ان سے بھی بعض ریختے منسوب ہیں

علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں عبدالقادر سروری صاحب نے ان کی آٹھ اشعار کی غزل ریختہ دی ہے[1] اس میں ایک شعر پورے کا پورا اردو میں ہے۔ وہ اور مطلع و مقطع درج کیے جاتے ہیں۔

ہر لحظہ آید در دِلم دیکھوں اسے ٹک جائے کر
گویم حکایت ہجرِ خود با آں صنم جیولائے کر

بہکی سکھی میرا سہی جوتوں کی اس کے یو ہی
سوکن نہ بچھری مجھ کئیں تیرے پرو ل لگ دھائے کر

بس حیلہ کردم اے حسن بے (جاں) شدم از دم بہ دم
کیسے رہوں تجھ جیوبن تم لے گئے سنگ لائے کر

سروری صاحب نے اپنا ماخذ نہیں دیا کہ یہ غزل انھیں کہاں سے ملی۔ میر کے نکات الشعرا میں حسن نامی کسی شاعر کا ایک شعر ہے۔

جب تے سفرپی نے کیا تب تے غریب آوارہ ہوں
پی بیگ ہی آیا کریں یا مجکو لیں بلوائے کر

سروری صاحب کے بقول سخاوت مرزا کا یہ خیال ہے کہ یہ شعر بھی امیر حسن کا ہونا چاہیئے[2] جمیل جالبی کو انجمن ترقی اردو پاکستان کی ایک قدیم بیاض میں اس غزل کے چھے[3] شعر ملے جو سب کے سب سروری صاحب کے یہاں بھی ہیں[4]. اس کا ایک مصرع قابلِ توجہ ہے پھر پھر رہیا بھوتوں نگرا جہوں ملیانا / تامیلیا آئے کر۔

---

[1] علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو ص ۱۴۹۔ ۱۴۸۔
[2] ایضاً ص ۱۴۹
[3] تاریخ ادبِ اردو ص ۳۵

Marfat.com

رہیا، ملیا اور غالباً اجہوں بھی دکنی صیغے ہیں۔ شمالی ہند کا شاعر انھیں نہیں لکھ سکتا۔ نکات الشعرا کا شعر بھی دکنی انداز کا ہے۔ 'سے' کے لیے 'تے' غالباً شمال میں نہیں ملتا۔ بہر حال 'بیگ' بمعنی جلد خالص دکنی ہے۔ بیگ والا شعر تو کسی طرح امیر حسن کا ہو ہی نہیں سکتا۔ بقیہ اشعار کے بارے میں بھی ان کے دکنی عنصر کے سبب قوی شک ہے۔

سیّد نجیب اشرف ندوی کے کتب خانے میں ایک بیاض تھی جو بارھویں صدی کے اوائل کی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے مشمولات کو ابوالفضل سیّد محمود قادری (حال ریڈر اردو عثمانیہ یونیورسٹی) نے نوائے ادب بمبئی میں اپریل ۱۹۵۶ء سے لے کر چار پانچ شماروں میں شائع کیا۔ مضمون کی دوسری قسط جولائی ۱۹۵۶ء کے شمارے میں چھپی۔ اس میں ایک ریختہ چھاپا گیا جس میں حسن تخلص ہے۔ صاحب مضمون کا خیال ہے کہ یہ خسرو کے پیر بھائی خواجہ حسن ہیں۔ اس غزل میں پانچ شعر ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

اَے دل زعشقت دم زدم، ہیرے بھیتر آتش جلے
وزحسرتِ دیدارِ تو دو نین تھے پانی چلے
موزوں بسی یادار بی، برناں نبینا سرولی (کذا)
شاہاں کنندت چاکری یہ جیوں تج سوں کو ملے
درسینے (سینہ) من یہ آگ ہے، زلفینِ تو جوں ناگ ہے
دل صیدِ عشقت پاگ ہے، بواہ کیوں بگوں تجھ سوں گلے
نے صبر نے طاقت (مجھے)، نے مہر عادت ہے تجھے
ایں شعلہ آتش کیوں بجھے، بے چارہ عاشق تلملے
ہوشم زسر بگریختہ، عیشم بہ جاں آمیختہ
گوید حسن یہ ریختہ، سہنسار، دیکھو کیوں چلے

اس غزل میں بھیتر کو بھترا اور بجھے کو بھجے باندھنا دکنی انداز ہے۔ ہوسکتا ہے یہ کاتب

Marfat.com

کا اِملا ہو۔

معلوم ہوتا ہے قدیم زمانے میں بحرِ رجز مثمن سالم کی یہ زمین مقبول تھی. جالبی لکھتے ہیں۔

"اسی زمین میں امیر خسرو سے بھی ایک غزل منسوب ہے. دیکھیے فارسی پر اردو کا اثر از ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، اعلیٰ کتب خانہ، ناظم آباد، کراچی"[1]

یہ غزل وہی ہوگی جو محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں سراج الدین آرزو کی بیاض سے لے کر درج کی ہے ع ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر.

اس کی صاف زبان کے پیشِ نظر شیرانی نے لکھ دیا کہ وہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ امیر خسرو اس کے مالک ہیں.[2]

ان غزلوں کو امیر حسن سجزی سے منسوب کرنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان میں حسن تخلص آیا ہے حالانکہ ہر وہ شخص جس کے نام کا دوسرا جزو حسن ہو اس لفظ کو اپنے تخلص کے طور پر استعمال کر سکتا ہے. نجیب اشرف ندوی والی بیاض اگر بارھویں صدی کی ابتدا کی یعنی وجہی سے بھی بعد کی ہے تو یہ امیر حسن کے عہد سے تقریباً چار صدی بعد کی ہوئی. سروری صاحب اور ڈاکٹر جالبی کی منقولہ غزل کی بیاض کا زمانہ معلوم ہی نہیں۔ پھر ان غزلوں میں دکنی عنصر ہیں۔ ہم ان سے یہ کہہ کر درگزر کر سکتے ہیں کہ یہ بہت کم ہیں، ممکن ہے کاتب کی تحریف ہو۔ پھر بھی ان دونوں ریختوں کو امیر حسن سجزی سے منسوب کرنے کی سند کمزور ہے۔

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری م ۷۸۲ھ

مولوی عبدالحق نے ان کی تاریخ ولادت ۶۶۲ھ اور تاریخ وفات ۷۸۲ھ درج کی ہے[3] جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ ہجری سنہ سے ۱۲۰ سال کے ہوئے. منیر بہار کا

---

[1] تاریخ ادب اردو ص ۳۴

[2] پنجاب میں اردو ص ۱۵۷

[3] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۱۷

Marfat.com

ایک قصبہ ہے۔ یہ بہار سے حضرت نظام الدین اولیاء سے بیعت ہونے کو گئے لیکن ان کے پہنچنے سے قبل حضرت کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے یہ شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید ہو گئے۔ انھوں نے بہت سے منتر اور نسخے لکھے ہیں جن میں سے بعض کو کج مندرہ کہا گیا ہے۔ منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کی بیاض میں ایک اردو کج مندرہ دیا ہے جسے محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں نقل کیا ہے[1]۔ اس نثری عبارت میں ذیل کے دو دوہے بھی ملتے ہیں۔

کالا ہنسا نِر ملا۔ بسے سمندر تیر — پنکھ پسارے بِک ہرے نرمل کرے سریر

درد رہے نا پیر

شَرف حَرف مائل کہیں درد کچھو نہ بسائے — گرد چھوئیں دربار کی درد دور ہو جائے

دلینہ بہار کے حکیم محمدی دلینوی نے ایک کتاب شفاء الامراض لکھی تھی۔ اس کا مخطوطہ سید سلیمان ندوی[2] کی نظر سے گزرا۔ اس میں ذیل کا نسخہ یحییٰ منیری کے نام سے دیا ہے

لودھ پھٹکری مردہ سنگ — ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنک

افیون چنا بھر، مرچیں چار — اُرد پھر موتھا اس میں ڈار[3]

(اُرد بھر تھوتھا)

پوست کے پانی پوٹلی کرے — نینا پیرا پل میں ہرے

آنکھ کی دوا کا نسخہ درست ہے لیکن یہ کون جانے کہ یہ یحییٰ منیری ہی کی تصنیف ہے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے لکھا ہو لیکن بعد میں اس کی زبان میں اصلاح کر لی گئی ہو۔

معین الدین دردائی[4] نے ذیل کا فال نامہ اور ہندی شعر ان سے منسوب کیا ہے۔

دس چار کچھ اگم آوے — اٹھ پانچ پہل مانگے آوے

تین اگیارہ پنچے راج — نو سو سترہ کرے اکاج

---

[1] نقوشِ سلیمانی ص ۱۷۴ [2] آب حیات میں یہ مصرع یوں دیا ہے: ارد برابر تھوتا ڈار۔ تیسرے شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے۔ ترت پیڑ نینوں کی ہرے ص ۱۷۔ بار دوازدہم شیخ مبارک علی لاہور

[4] بہار اور اردو شاعری ص ۱۳۰۔ دسمبر ۱۹۴۷ء۔ اس حوالے کی نشان دہی لاہور کی تاریخ چھٹی جلد ص ۱۲۳۔

Marfat.com

شری گور ڈراون نہیں اندھیاری رات　　وان نہ پوچھے کون نمہاری جات

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند میں ان کے فال ناموں یا ہندی فقروں وغیرہ کے لیے ذیل کے مآخذ کی نشان دہی کی ہے۔

۱۔ سیّد سلیمان ندوی: مضمون 'بہار میں اردو' ندیم گیا، بہار نمبر جولائی اگست ۱۹۳۳ء صہ ۱۶۲۔ ۱۶۳ پیران کا فال نامہ اور ہندی الفاظ و فقرات دیے ہیں۔

۲۔ غلام مصطفٰے خاں: علمی نقوش صفحہ ۶۳ پیران کا فال نامہ موجود ہے۔

۳۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی: تعارفِ تاریخ اردو صفحہ ۱۸ پیران کا دوہا درج ہے۔

۴۔ رخشاں ابدالی: اردو نثر کے ارتقا میں ارباب بہار کا حصّہ۔ رسالہ ندیم گیا، بہار نمبر ۱۹۳۵ء۔ صفحہ ۱۵ پیران کے منظوم فقیری چٹکلے یا نسخے اور کچھ ہندی ملفوظات دیے ہیں[1]

میری نظر سے یہ چیزیں نہیں گزریں۔ معلوم نہیں ان میں مندرجہ بالا منظومات سے کیا کیا مزید ہے۔ ڈاکٹر اختر اورنیوی نے لکھا ہے کہ آپ بھاشا میں بھی شاعری کرتے تھے اور آپ کا تخلص شرف تھا[2]

مولانا مظفر بلخی م ۸۰۳ھ

یہ یحییٰ منیری کے خلیفہ تھے۔ مدینہ کی زیارت کے لیے گئے۔ واپسی پر عدن میں ۸۰۳ھ میں انتقال ہوا[3]۔ فارسی میں کئی کتابیں، مجموعہ، مکاتیب اور دیوان ان سے یادگار ہیں۔ خطوط میں ہندی اشعار بھی ملتے ہیں جنھیں معین الدین دردائی اور ڈاکٹر اختر اورنیوی نے سہواً، دوہا، کہا ہے۔ دردائی کی کتاب سے دو اشعار ملاحظہ ہوں

جی مگن میں ہے کہ آئی ہیں سہانی رتیاں　　جن کے کارن تھے بہت دن سے بنائی بتیاں
آئیں رات سہائیاں　　جن کارن ڈھٹیاں کھائیاں[4]

---

[1] چھٹی جلد صہ ۲۰۴-۲۰۳
[2] ایضاً صہ ۲۰۳　[3] ایضاً صہ ۲۰۴
[4] دردائی صہ ۱۴۔

Marfat.com

پہلا شعر اردو وزن میں ہے اور اس کی زبان چودھویں صدی عیسوی کے لیے بہت صاف ہے۔ اس زمانے میں اردو وزن میں شعر کہنا غیر متوقع ہے۔ بہ صورت موجودہ یہ شعر ان کا نہیں ہو سکتا۔

ان کے کلام کے نمونے ڈاکٹر اختر اورینوی کی کتاب 'بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء' اور معین الدین دردائی کی کتاب 'بہار اور اردو شاعری' میں دیے ہیں۔

شیخ نور الحق پنڈوی بنگالی م ۸۱۳ھ یا ۸۱۸ھ

وطن مالوف لاہور تھا لیکن بنگال کے موضع پنڈوہ، ضلع مالدہ میں ساکن ہو گئے۔ انھوں نے اپنے مکتوبات میں ایک فارسی شعر اور اس کے مترادف ہندی دوہا لکھا ہے۔[1]

ہمہ شب بہ زاریم شوکہ صبا نہ داد بوئے — نہ دمید صبح بختم چہ گنہ نہم صبا را

رین سب آئی سویا سیج نلدھا تھانوں اکلا — پیو نہ پوچھے پاتری، مجھ سہاگن نانوں

غالباً پہلے مصرع میں 'سوئیا' ہے۔ دوہا فارسی شعر کا ترجمہ نہیں۔ دوسرے مصرع میں 'پاتری' معنی پتر یعنی چٹھی ہوں تو 'پوچھے' کی جگہ 'بھیجے' کا محل ہے۔

شیخ امین الدین لکھنوی م ۸۲۹ھ

یہ ہندی کے شاعر تھے۔ سید سلیمانی ندوی کے بقول ان کے مکتوبات میں ہندی الفاظ، دوہے اور ہنڈولے ملتے ہیں۔ صوفیانہ گیتوں کی ایک صنف 'جکری' کے بارے میں آگے ذکر آئے گا۔ مشہور ہے کہ اس صنف کا تعلق گجرات سے ہے لیکن اہل گجرات سے پہلے انھوں نے جکری لکھی۔ اس کے بند عقدہ کہلاتے ہیں۔ نقوشِ سلیمانی سے ان کی جکری ملاحظہ ہو۔

کون پر اجت دیا گیتوں — شہ کل باتہہ نہ دئی کرسوتوں

عقدہ

---

[1] مکتوباتِ قلمی مخزونہ دار المصنفین اعظم گڑھ بحوالہ نقوش سلیمانی ۱۹۳۹ء۔ ص ۵۱

Marfat.com

مجھ برہا رین جگاوے ہور مرتیں چال بتاوے
جی ہوں نیہیوں بھول کندھیائے جو بھنج تن جڑ کانٹ کنیائے

عقدہ

جی ہوں سعد پیارے جی سوں سکھ دکھ پی کے بات کہی توں
ایمن الدین ماندھی جو دی پیو شہ کے درشن واری جیو[1]

شیخ صدرالدین کلیم مرید حضرت نصیرالدین چراغ دہلی نے اپنی کتاب صحائف السلوک میں نامعلوم شاعروں کے دو دو ہے نقل کیئے ہیں

سیس نسے سو دنہ کراوبھے باہنہ نمائے جس ہوں لوڑوں نہ لہوں اوجھر میری بھائے[2]

اور ایک فارسی کے شعر کے مفہوم کو کسی ہندو نے ذیل کے دو ہے میں ادا کیا.

نین بھیتر باہ کر آنکھیں بیچ دھرلوں ناں ہوں دیکھوں اُودھرنا تجھ دیکھن دوں[3]

ہندی کے شعراء کے یہاں اس طرح کے دو ہے بکثرت ملتے ہیں

مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی م ۸۳۷ھ

ان کا نام شیخ احمد تھا. حق حق کہنے سے عبدالحق کہلائے[4]

ان کے دو ہے شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے اپنی تصانیف رشد نامہ اور انوارالعیون میں نقل کیے ہیں. ان میں سے دو یہ ہیں

کنواں ہوئے تو پاٹوں سمند کہ پاٹن جائے بارا ہوئے تو برجوں جھیل کہ برجن جائے

انھوں نے کچھ زمانہ سنام پنجاب میں بسر کیا تھا. اوپر کے دو ہے میں 'کہ' دراصل 'کی' ہونا چاہیئے جس کے معنیٰ پنجابی میں 'کس' یا 'کس سے' ہیں. دوسرا دوہا یہ ہے.

---

[1] نقوش سلیمانی صہ ۵۱ تا ۵۲

[2] صحائف السلوک صہ ۱۶۲ مسلم پریس جھجر بحوالہ شیرانی: اردو کے فقرے اور دوہرے آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات سے. مقالات شیرانی جلد اوّل صہ ۱۴۵

[3] ایضاً صحائف السلوک صہ ۱۸۱. مقالات شیرانی جلد اوّل صہ ۱۴۶.

[4] سیر الاقطاب اردو ترجمہ خواجگان چشت مصنف حضرت الہدیہ مترجم محمد معین الدین دردائی صہ ۲۲۹ کراچی ۱۹۷۲ء

Marfat.com

ایک گسائیں سبھنا سوجو لکھن نہ جائے جو اس سیں نہ ناویے تس مانتھن لکھن جائے[1]

محمد بن قوام کرپی نظامی کی مثنوی مخزنِ اسرار کے شارح ہیں۔ ان کی ایک فارسی لغت فرہنگِ بحر الفضائل (۸۳۷ھ) کا تعارف شیرانی نے کرایا ہے۔ اس لغت میں کسی کاذیں کا ہندی شعر درج ہے۔

دیکھ پیکھ پیہ پر گھر جاوے تس نس نینو نیند نہ آوے

شیخ پیارے م ۸۶۵ھ

یہ شیخ عارف ابن شیخ احمد عبدالحق ردولوی کے مرید اور[2] خادم تھے۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہی ردولی ضلع بارہ بنکی یوپی کے رہنے والے تھے۔ ان کا ابتدائی زمانہ شیخ احمد عبدالحق کی خانقاہ میں گزرا۔ گو شیخ گنگوہی محمد بن عارف بن شیخ احمد کے مرید تھے لیکن آپ نے شیخ پیارے کی صحبت سے حقائق و معارف کے فیوض[3] اٹھائے۔ اس طرح شیخ پیارے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے غیر رسمی مرشد تھے۔ گنگوہی نے رشد نامے میں شیخ پیارے کے چند ہندی اشعار درج کیے ہیں۔ نمونہ یہ ہے[4]

بہت بودے بہ جاتوں دِھک جیون تیرا سائیں تھیں توں کی پہرا دیکھ کتب گنیرا

ایکو کام نہ آوسی جب پرسی بیرا چھوڑ پیارا سائیاں توں جانھن کیرا

شیخ احمد عبدالحق پنجاب میں بھی رہے تھے۔ ممکن ہے شیخ پیارے پنجابی ہوں۔ اوپر کے شعر میں آوسی، کیرا پنجابی ہیں۔ چھوڑ کو پنجابی میں چھاڈ کہتے ہیں۔ ممکن ہے چھوڑ اسی سے متاثر ہو یا پھر چھوڑ کو قدیم کتابت میں چھوڑ لکھا ہو۔ شیرانی

---

[1] رشد نامہ قلمی بحوالہ مقالات شیرانی جلد اوّل صـ۱۴۹

[2] مقالات شیرانی جلد اوّل صـ۱۴۹

[3] سیّد حسن عسکری: مضمون حضرت عبدالقدوس گنگوہی اور ان کا ہندی کلام رسالہ معاصر پٹنہ حصہ ۱۱۔ بابت دسمبر ۱۹۵۷ء۔ صـ۱۴۳

[4] مقالات شیرانی جلد اوّل صـ۱۴۹

Marfat.com

نے مزید تین مسلسل دوہے شیخ پیارے سے منسوب کیے ہیں[1] ان میں شیخ احمد عبدالحق، ان کے بیٹے شیخ عارف اور ان کے بیٹے محمد عرف لدّھن کی توصیف ہے۔ پہلا دوہا ہے

محمد محمد جگ کہے چنھے ناکوئے　　احمد میم گنوائیا کہو کیوں بھوجا ہوئے

لیکن معاصر پٹنہ میں سید حسن عسکری نے ایک طویل مضمون "حضرت عبدالقدوس گنگوہی اور ان کا ہندی کلام" میں تین کے بجائے چار مسلسل دوہے لکھے ہیں اور انھیں خود شیخ گنگوہی سے منسوب کیا ہے[2]۔ یہی درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان دوہوں میں شیخ عارف کا بیٹا شیخ محمد لدّھن کی توصیف بھی ہے۔ گنگوہی شیخ لدّھن کے مرید تھے جب کہ شیخ پیارے شیخ عارف کے مرید تھے۔ وہ اپنے خورد شیخ محمد کی توصیف کیوں کرتے۔

سید حسن عسکری نے رشد نامے کے اپنے نسخے سے مندرجہ بالا دوہا نقل کیا ہے۔ اس میں دوسرے مصرع کا نصف آخر یوں ہے۔ کہہ کیوں دوجا ہوئے

میراں سیّد محمد جونپوری م ۹۱۰ھ

حضرت سید محمد ۱۲ جمادی الاول ۸۴۷ھ کو جونپور میں پیدا ہوئے[3] سلطان حسین شرقی کے ساتھ جہاد میں شریک ہو کر گوڑ کے راجا دلپتی کو قتل کیا۔ ۸۷۲ھ سے ۱۵ سال تک آپ پر جذب کے آثار جاری رہے۔ ۴۰ سال کی عمر میں ۸۸۷ھ/ ۱۴۸۲ء ہجرت کر کے پیدل حج کے لیے روانہ ہوئے۔ ۹۰۱ھ میں حج ادا کیا اور تبھی ۵۴ برس کی عمر میں پہلی مرتبہ مہدی آخرالزماں ہونے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد ہندستان واپس آئے۔ جملہ ۲۳ برس سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور تقریباً دس ہزار میل

---

[1] مقالات شیرانی جلد اول ص ۱۴۹

[2] معاصر دسمبر ۱۹۵۷ء۔ ص ۱۴۴

[3] میرے ایک شاگرد نصرت مہدی نے میری نگرانی میں ایم فل کا مقالہ لکھا "اردو ادب کی ترقی میں مہدیوں کا حصّہ ۱۸۰۰ء تک، حضرت سید محمد کی سوانح اور کلام کے نمونے کا ماخذ خاص طور سے یہی مقالہ ہے۔

Marfat.com

کا سفر کیا۔ ان کے دعوائے مہدویت کی وجہ سے ان کی سخت مخالفت ہوئی جس کی وجہ سے جگہ جگہ ہجرت کرتے رہے۔ آخر بلوچستان میں فرح کے مقام پر ۱۹ ذی قعدہ ۹۱۰ھ م ۲۳ اپریل ۱۵۰۵ء کو انتقال کیا۔

ان کے مقلد مہدوی کہلاتے ہیں۔ حضرت سید محمد کی تعلیمات میں منجملہ دوسری باتوں کے ترکِ دنیا، عزلت از خلق، توکل، طلبِ دیدارِ خدا اور ہجرت خاص ہیں۔

مولوی عبدالحق نے اردو کی ابتدائی نشو و نما میں، شیرانی نے مقالات میں اور جمیل جالبی نے اپنی تاریخ ادب اردو میں حضرت مہدی کے سات اشعار دیے ہیں۔ نصرت مہدی نے مہدوی کتابوں سے لے کر یہ سات اشعار نیز دوسرے کئی اشعار پیش کیے ہیں۔ ان سب مآخذ کو سمو کر ذیل میں حضرت میراں کا ہندی اردو کلام درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ دوہا

کبوتر خانہ ڈہ پڑیا، مطبخ لاگی آگ　　جل موئی او پاپڑی چرب نیوالے لاگ[۴]

۲۔ خدا کو مخاطب کر کے کہا

اگر فضل کنی ایک جو　　جیوے جیوے جیوے
اگر عدل کنی یک جو　　موئے موئے موئے[۵]

ان اشعار میں "اگر" کے بجائے گر پڑھا جائے تو وزن مصرع ثانی کے مطابق ہو جائے گا۔

۳۔ جہاں سے ہے کر جانے وہاں نیں نیں کر ماں
جہاں نیں نیں کر جانے وہاں ہے کچھ ہر ماں

یعنی جو یہ سمجھتا ہے کہ میں سب کچھ ہوں سمجھو کہ وہاں کچھ نہیں۔ جو خود کو حقیر بنا کر پیش کرتا ہے سمجھ لو کہ وہاں کچھ ہے۔[۶]

---

[۱] ص ۲۶، ۲۷　[۲] جلد دوم ص ۱۹۸، ۲۴۹، ۲۵۰　[۳] ص ۱۳۴
[۴] میاں ولی جی: حاشیۂ انصاف نامہ ص ۱۱۵ بحوالہ نصرت مہدی
[۵] حاشیۂ انصاف نامہ ص ۲۱۷
[۶] " " ص ۱۲

Marfat.com

۴. جب حضرت بیدر پہنچے تو شہر کے قاضی علاء الدین کپڑے دھونے کی وجہ سے دیر میں حاضر خدمت ہوئے۔[1] انھیں مخاطب کر کے یہ دوہا کہا۔

ہیڑا نت پکھال توں، کپڑ دھوئے مدھوئے اوجل ہوئے پھوٹ سی اس نیدر مت سوئے

مختلف کتابوں میں اس دوہے کا متن مختلف ملتا ہے۔ میاں عبداللہ کے خط کے مطابق رحلت کے وقت حضرت کی زبان پر یہ دوہا تھا۔[2] یہی بات مولوی عبدالحق نے لکھی ہے۔[3] ممکن ہے قاضی بیدر کو مخاطب کر کے جو دوہا کہا ہو وقت رحلت اسی کا اعادہ کیا ہو۔

۵. اب لیجیے ع راول دیول کہیں نہ جائیں، والے تین اشعار کو۔ جیسا کہ شیخ فرید شکر گنج کے سلسلے میں لکھا گیا انجمن ترقی اردو پاکستان میں شیخ باجن کی تالیف خزائن رحمتہ اللہ میں پہلے دو اشعار ہیں[4] اور انھیں شیخ فرید سے منسوب کیا ہے لیکن لاہور میں اس کتاب کا جو نسخہ گلستانِ رحمت کے نام سے ہے[5] اس میں تین اشعار ہیں اور انھیں خود باجن سے منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن مہدوی روایات میں پہلے دو اشعار کو حضرت سید محمد جونپوری کی تصنیف کہا گیا ہے۔

شیرانی تاریخ غریبی سے نقل کرتے ہیں

نقل یو مہدی نیں فرمائی بھولے جن کو راہ دکھائی
جو ساری باتوں کا جیو نقل تم کوں بھوجن ہم کوں پیو
پھاٹا پہنیں ٹو کا کھائیں راول دیول کبھی نہ جائیں
اس گھر آئی یا ہی ریت پانی چاہیں اور مسیت[6]

---

[1] مقالۂ نصرت مہدی، نیز شواہد الولایت

[2] شیرانی: دائرے کے مہدویوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصہ۔ مقالات جلد دوم ص ۱۹۸

[3] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ ص ۲۶

[4] جمیل جالبی ص ۳۷ نیز ۶۱۲۔

[5] شیرانی: تاریخ غریبی ۱۱۷۔ ۱۱۶۴ھ؛ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۳۸ء، فروری ۳۹ء۔ باز طباعت مقالات شیرانی جلد دوم ص ۲۵۰۔ [6] ایضاً ص ۲۴۹

Marfat.com

شیرانی آخری دو اشعار کے بارے میں لکھتے ہیں

"یہ نہ سمجھا جائے کہ ان اشعار کے مالک سید محمد مہدی ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ ان کے راوی ہیں، نہ مالک۔ لیکن جس کثرت سے مہدوی روایات میں یہ شعر منقول ہیں ان سے تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت مہدی کے طبع زاد مانے گئے ہیں۔ دراصل ان شعروں کے مالک شیخ بہاء الدین باجن ہیں۔"[1]

اس کے آگے شیرانی نے گلستانِ رحمت سے تینوں شعر نقل کیے ہیں جہاں متن کچھ مختلف ہے بالخصوص پہلے شعر کے دونوں مصرعوں کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ 'تاریخ غریبی' کا مضمون ۳۹۔ ۱۹۳۸ء کا ہے لیکن اس کے بعد ۴۱۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے دائرے کے مہدویوں پر جو مضمون لکھا وہاں ان اشعار کا سیّد محمد مہدی سے انتساب بغیر احتجاج کے قبول کر لیا ہے۔ لکھتے ہیں،

زادالفقرا کے دیباچے میں منقول ہے کہ

"پیرِ پیراں یعنی میراں سیّد محمد مہدی موعود علیہ السلام در بیانِ صفتِ فقرا بہ زبانِ گوجری فرمودہ است وآں اینست۔ ساکھی:

پھاٹا پہنیں . . . ."[2]

نصرت مہدی زادالفقرا سے ان اشعار کو نقل کر کے مطلع کرتے ہیں کہ یہی اشعار نقلیاتِ میاں سیّد عالم ص ۱۱۱، انصاف نامۂ ولی جی ص ۲۸۷ نیز حاشیۂ انصاف نامہ ص ۱۱ پر بہ قدرے اختلاف متن ہیں

پھاٹا پہریں ٹوکا کھاویں　　راول دیول کہیں نہ جاویں
ہمرے گھر آئی یاہی ریت　　پانی لوڑیں اور مسیت

ٹوکا کے معنی روکھا سوکھا، راول دیول سے مراد امیروں کے مکان اور بت خانے

---

[1] مقالاتِ شیرانی جلد دوم ص ۲۵۰

[2] مضمون دائرہ کے مہدویوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصّہ، ادرنٹیل کالج میگزین نومبر ۴۰ء، فروری ۴۱ء باز طباعت مقالاتِ شیرانی جلد دوم ص ۱۹۸۔

Marfat.com

آخران اشعار کا مصنف کون ہے. لوڑیں خالص پنجابی ہے جو فریدالدین گنج شکر ہی کہہ سکتے تھے. باجن کے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ انھوں نے گلستانِ رحمت میں اس سلسلے کے تین اشعار لکھے ہیں جب کہ مہدوی روایات میں صرف دو ہیں. لیکن مہدوی کتابوں میں بالاتفاق انھیں ان کے ہادی سے منسوب کرنا ایک وزن رکھتا ہے. قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ باجن کے ہیں کہ حضرت میراں کے؟

۶. ان کے ایک پیرو عبدالمومن مومن مدراسی نے ۱۰۹۱ھ میں مثنوی اسرارِ عشق لکھی. پانچ ہزار اشعار کی اس مثنوی میں حضرت سیّد محمد کی سوانح اور ان کے جانشینوں کی توصیف ہے. اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ حضرت نے گوجری کے دو دوہروں میں مصطفےٰ کی ولایت کی صفت بیان کی. وہ دو ہے یہ ہیں

چندر کہے ترا بن کوں سورج دیکھو آئے　　ایسا بھگونت جو بھیٹے دُشت پاپ چھڑ جائے
تو روپ دیکھ جگ موہیا چندترا بن بھان　　انھیں روپ بہن ہوؤں کو وہی نہ ہوئے آن[1]

مومن لکھتے ہیں کہ ان کی کتاب انھیں دوہوؤں کی شرح و تفسیر ہے.

۷. آپ سے شہر کے دربان نے محصول مانگا تو آپ نے یہ جواب دیا

ناہم لاویں لونگ سپیاری　　نا پریت کا ادا
ہم بھریں پیو کے بچھنا　　دان کہاں سو لاگا[2]
۸ ایک موتی سیج بلائے　　ایک لالی لا بھلائے
ایک سوا کرت بنھائے　　دی کون سہاگن آئے
جو شد مکھ دیکھن چاہے
بہا چاہے تو آرسی　　مانجانہ رہا ہے آرسی
لاکی کائی ہونک دیکھا نہ جائے[3]

---

[1] عبدالحق: اردو کی ابتدائی نشوونما. صہ ۲۷-۲۶. مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو پاکستان جلد چہارم صہ ۲۴۲. جمیل جالبی صہ ۱۳۴

[2] حاشیہ انصاف نامہ صہ ۲۱۱ بحوالہ نصرت مہدی.

[3] شاہ قاسم: افضل المعجزاتِ مہدی صہ ۵۰ بحوالہ نصرت مہدی.

Marfat.com

۹۔ حج کے سفر میں یہ دوہا کہا

ہوں بلہاری سجنا، سجن مجھ بلہار ہوں سر ساجن سہرا، ساجن مجھ گل ہار

اس دلکش دوہے کے معنیٰ ہیں کہ میں ساجن پر نثار ہوں اور ساجن مجھ پر نثار ہے۔ میں ساجن کے سر کا سہرا ہوں اور ساجن میرے گلے کا ہار ہے۔ مولوی عبدالحق نے اردو کی ابتدائی نشوونما میں اسے بہت ناقص درج کیا تھا ؎

ہوں بلہاری سجنا ہوں بلہار ہوں سر جن سہرا ساجن مجھ گل ہار[1]

نصرت مہدی نے صحیح متن درج کیا[2]

ان اشعار میں بعض کی زبان فرسودہ ہے، بعض کی صاف، سب میں برج کا اثر واضح ہے مثلاً مندرجہ بالا دوہے میں 'ہوں' بمعنی ضمیر متکلم 'میں'۔

حضرت سیّد خوندمیر م ۹۳۰ھ

حضرت سیّد محمد جونپوری کے بیٹے سید محمد مہدویوں کے خلیفۂ اوّل تھے اور حضرت کے داماد سیّد خوندمیر خلیفۂ دوم تھے۔ ۱۳ شوّال ۹۳۰ھ ۳۰ اگست ۱۵۲۴ء کو مظفر شاہ کی ۱۶ ہزار فوج سے مقابلہ کر کے شہید ہو گئے۔ ان کا سر پٹن میں، جسم سدراسن میں اور پوست جاپانیر میں دفن ہے۔ ان کے دو دوہے ملتے ہیں۔

ایک ملامت بھوکھ دکھ عالم گیری بار چلن تمام رسول کے، جن کے یہ اختیار

شیرانی کے مطابق یہ زاد الفقرا میں ہے[3] جالبی کو ایک قدیم بیاض مملوکۂ افسر صدیقی میں ملا[4]۔ نصرت مہدی نے ایک اور دوہا نقل کیا ہے۔ کسی نے میاں خوندمیر سے کہا کہ فوج شاہی آرہی ہے۔ بہتر ہے نقلِ مکان کر لیا جائے۔ آپ نے یہ دوہا ارشاد فرمایا

---

[1] ص ۲۶

[2] شواہد الولایت ص ۹۰ بحوالۂ نصرت مہدی

[3] شیرانی: دائرہ کے مہدویوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصّہ، مقالاتِ شیرانی جلد دوم ص ۱۹۹

[4] تاریخ ادب ص ۱۳۴

Marfat.com

جو جھوجھوں تو ات بھلا، جو جیتوں تو راج　　دونوں پُوا اڑی ہے سکھی باجو آج[1]

دوسرا مصرع کسی قدر غلط نقل کیا گیا ہے۔ پہلے دوہے کی زبان اس سے صاف ہے۔

شیخ جمالی کنبوہ م ۹۴۲ھ

شیخ حامد بن فضل اللہ جمالی م ۱۰ ذی قعدہ ۹۴۲ھ/ ۱۵۳۶ء سکندر لودھی تا ہمایوں کے دور میں تھے[2]۔ نثر میں سیر العارفین اور نظم میں مثنوی مہرو ماہ کے مصنف تھے۔ شیرانی نے پنجاب میں اردو اور مقالات میں ان کا ایک ریختہ درج کیا ہے جس میں ایرانی انداز سے ٹ کو ت لکھا ہے اس کے دو شعر یہ ہیں

خوار شدم زار شدم لُت گیا　　در رہِ عشق تو کمر ٹُتا ہے
گاہ نہ گفتی کہ جمالی تو بیٹھ　　تھم کرو کیا اپنا کرم پُھتا ہے[3]

پیچھے امیر خسرو کے بیان میں لکھا جا چکا ہے کہ شمس اللہ قادری نے اسے امیر خسرو سے اور ڈاکٹر صفدر آہ نے کسی ایرانی حکیم سے منسوب کیا ہے۔ ظاہر ا شیخ جمالی ہی اس کے مصنف ہوں گے کیونکہ ان کا ایک اور ریختہ ملتا ہے جس میں ہندی لفظوں کی ٹ کو ت سے لکھا ہے۔ شیرانی کے کتب خانے میں فارسی کی ایک بیاض تھی جس کا مرتب جَے مَل نہار ہے۔ امیر خسرو کے سلسلے میں اس بیاض کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس میں مرتب نے ۱۰۶۲ھ اور ۱۰۶۷ھ میں دو یادداشتیں لکھی ہیں جن سے بیاض کا زمانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس بیاض میں چند فارسی اردو ریختے ہیں جن میں جمالی کا ایک ریختہ بھی ہے۔ اس میں صرف قافیے کا لفظ ہے یا ایک آدھ مزید لفظ ہندی ہے۔ اس کے دو شعر یہ ہیں

آں پری رخسارہ چوں شانہ بہ چوتی می کند　　جاں درازِ عاشقاں را عمر چھوتی می کند

---

[1] شیرانی: دائرہ کے مہدیلوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصّہ مقالات شیرانی جلد دوم صہ ۱۹۹۔

[2] سیر العارفین کا اردو ترجمہ۔ ابتدائیہ صہ ۱۹۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور۔ اپریل ۱۹۷۶ء۔ [3] پنجاب میں اردو صہ ۴۳۔ نیز مضمون دسویں صدی ہجری کے بعض جدید دریافت شدہ ریختے۔ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۹۔ باز طباعت مقالات شیرانی جلد دوم صہ ۷۷۔ ۷۶۔

Marfat.com

بر درت آیم، رقیبت گویدم، در خانہ نیست، ایں چنیں کم بخت با ما بات کھوتی می کند[1]

شیخ عبدالقدوس گنگوہی متخلّص بہ الکھ داس م ۹۴۴ھ

یہ ردولی ضلع بارہ بنکی میں ۸۶۰ھ م ۱۴۵۶ء میں پیدا ہوئے[2]۔ ان کے والد شیخ اسمٰعیل اور دادا شیخ صفی الدین بڑے صوفی بزرگ تھے۔ حضرت عبدالقدوس کا ابتدائی زمانہ ردولی میں مخدوم احمد عبدالحق کی خانقاہ و روضے کی خدمت گزاری میں گزرا۔ شیخ احمد عبدالحق ۸۳۷ھ میں انتقال کر چکے تھے اور جب عبدالقدوس سنِ تمیز کو پہنچے تو شیخ احمد کے بیٹے شیخ عارف بھی رحلت کر چکے تھے۔ اس لیے عبدالقدوس نے شیخ محمد بن شیخ عارف کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن حقایق و معارف کے فیوض شیخ پیارے مرید شیخ عارف سے حاصل کیے۔ شیخ عبدالقدوس کی شادی اپنے پیر شیخ محمد کی بہن سے ہوئی۔ ۴۶ سال کی عمر میں ۸۹۶ھ میں ردولی سے ترک وطن کر کے قصبہ شاہ آباد چلے گئے۔ تقریباً اتنی مدت وہاں گزار کر آخری عمر میں قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور میں جا بسے جو ان کا آخری مستقر تھا۔ وہاں ۸۴ برس کی عمر میں ۹۴۴ھ میں رحلت کی۔ چونکہ ان کا مزار گنگوہ میں ہے اس مناسبت سے گنگوہی کہلائے۔

ان کی تصانیف میں شرحِ قدسی (لمعات عراقی کی شرح)، معارف شرحِ عوارف، اسرار الاخیار، غرائب الفوائد، انوار العیون فی سر المکنون، رشد نامہ اور مکتوبات قدوسیہ ہیں۔ ڈاکٹر اطہر عباس رضوی اور شیلیش زیدی[3] نے رشد نامہ کو ہندی میں الکھ بانی کے نام سے ترجمہ کر کے ۱۹۷۱ء میں علی گڑھ سے شائع کیا۔

مولوی عبدالحق اس کے بارے میں لکھتے ہیں

---

[1] ایضاً مقالات جلد دوم ص ۷۷

[2] شیخ عبدالقدوس کے حالات اور تصانیف کی فہرست کا ماخذ ذیل کا مضمون ہے۔ سید حسن عسکری: حضرت عبدالقدوس گنگوہی اور ان کا ہندی کلام۔ معاصر پٹنہ حصہ ۱۱ بابت دسمبر ۵۷ء۔ ص ۱۴۲ تا ۱۵۶

[3] بحوالہ امرت رائے۔ A HOUSE Divided۔ ص ۲۰۱۔ ۳۰۹۔ دلی ۱۹۸۴ء

Marfat.com

، ہندی کے شاعر تھے اور الکھ داس تخلص کرتے تھے۔[1]

ان کے مکتوبات میں ہندی کے فقرے، جملے اور اشعار ملتے ہیں۔ ان سے زیادہ ان کی کتاب رشد نامہ میں ہیں جس کا موضوع تصوف ہے۔ اس میں دوہے، شبد، چوبدہ، عقدہ اور شرلوک (اشلوک) ہیں۔ سید حسن عسکری کہتے ہیں۔

"اس کتاب میں تقریباً براسی (؟ غالباً بیاسی) ہندی نمونے ہیں جو سب کے سب حضرت عبدالقدوس کے ہی معلوم ہوتے ہیں"[2]

ہندی کلام ہندوستانی راگ اور راگنیوں میں باندھا گیا ہے۔ پنجاب میں اردو اور سید حسن عسکری کے مضمون سے کچھ نمونے درج کیے جاتے ہیں۔

شبد
بن گرو بات نا نہیں — بن گرو بات نا نہیں
جان اجان سبھ کھیلنا لوئی — بن پی کھیلے نہ کھیلا کوئی
روتے سوتے گیان لگائے — رات کہے دن بیسر جائے

دوہا
بیرت بیرت ہے سکھی ہن دھن گئی مرائے — پڑیا بوند سمند منہہ کہہ کیوں میری جائے

چوپدا
گرو جو کیجے ایسا جان — سرب نرنتر آپ پروان
گرو ہیرا کر چیرا کُدار — کھودے نکسے ہیرا سار
(کدال)

عقدہ
اچی سوگر ہوں دھن تا کے چیلا — جن موہ بلیا کنت اکیلا

اشلوک
اپا ناست، پرا ناست، کنجت جگترا — بدھ با جا منو ناست، شتر دیوی اکل پتا

حسن عسکری کے مطابق اس اشلوک کے یہ معنی ہیں، جس طرح کنول کے پھول سورج کی گرم کرنوں سے کملا جاتے ہیں اسی طرح دنیا بھی فنا ہو جاتی ہے۔ ذات باری ہی پدر حقیقی ہے جس کی سو دیوتاؤں کی طرح تقسیم نہیں کی جاسکتی۔

یہ اشلوک سنسکرت کا معلوم ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ان کے دوسرے اشلوکوں کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الکھ داس ہندی کے شاعر ہیں لیکن ان کے دوہوں

---

[1] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام صہ ۳۸
[2] سید حسن عسکری کا مضمون معاصر۔ صہ ۱۷۸

Marfat.com

اور شبدوں کو ہندی کہا جائے اور خسرو، بوعلی قلندر اور سید محمد جونپوری کے دوہوں کو اردو میں شامل کر لیا جائے اس امتیاز کی کوئی لسانی وجہ سمجھ میں نہیں آتی.

سلطان بابر

سلطان ظہیر الدین بابر اردو کا شاعر تو نہیں لیکن اس کے یہاں اردو اور ترکی کا ایک ریختہ شعر ملتا ہے جس کا سوا مصرع اردو ہے۔ مشہور شعر ہے۔

مُج کا نہ ہوا کُج ہوسِ مانک و موتی فقا اہلیفہ بس بولفوسید در پانی ور وتی

پہلا مصرع بہت صاف ہے، دوسرا مصرع شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہے اور ظاہرا غیر موزوں ہے۔ ہاں ترکی تلفظ میں لفظ سکوڑ کر بولے جاتے ہوں تو دوسری بات ہے۔

حامد حسن[1] قادری نے تاریخ داؤدی سے نقل کیا ہے کہ جب پانی پت کی پہلی لڑائی میں ابراہیم لودی کا سر کاٹ کر بابر کے سامنے لایا گیا تو کسی نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے۔

نوے اوپر بتّیا پانی پت میں بھارت دیسا
اٹھئیس رجب، سکروارا بابر جیتا، براہیم ہارا

یعنی ۸ رجب ۹۳۲ھ بروز جمعہ

اجے چند بھٹناگر مصنفِ اَجے چند نامہ۔ ۹۶۰ھ

فارسی بولنے والوں کو اردو اور اردو بولنے والوں کو فارسی سکھانے کے لیے کئی صدیوں تک فارسی ہندی مترادفات کی منظوم لغات لکھی گئیں۔ ان میں مشہور ترین کتاب خالق باری ہے لیکن اس کے زمانے میں اور مصنف کے بارے میں شدید اختلاف ہے جیسا کہ امیر خسرو کے سلسلے میں دکھایا گیا۔ موجودہ روپ میں خالق باری امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ مترادفات کی سب سے پہلی مستند منظوم لغت اجے چند بھٹناگر کی اجے چند نامہ ہے۔ شاعر کا نام اس شعر میں آیا ہے

اجے چند بھٹناگر بندہ پسرِ دیپ چند شعر کنندہ

---

[1] حامد حسن قادری: تاریخ و تنقید ص ۵۶۔ تاریخ اشاعت ندارد۔ نیز داستانِ تاریخ اردو ص ۲۱

Marfat.com

وہ بتاتا ہے کہ اس کا وطن دہلی کے پاس شہر سکندر آباد ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سکندر آباد ضلع بلند شہر کی شمالی تحصیل ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے مطابق یہ قصبہ کائستھوں کا مرکز رہا ہے چنانچہ غالب کے شاگرد ہرگوپال تفتہ اور ہمارے عہد کے سائنس داں اور اردو شاعر شانتی سروپ بھٹناگر سکندر آباد ہی کے تھے۔ اجے چند اپنی مثنوی میں جگہ جگہ نام ہی کو تخلص کے طور پر استعمال کرتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا اور کوئی تخلص نہ تھا۔ آخر میں ایک شعر ہے

اجے چند پیر زال ضعیف　　بہتر است بخشیدن وظیف

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کی تصنیف کے وقت وہ خاصا مسن ہے، ملازمت میں ہے اور پنشن کا خواہش مند ہے۔ شاعر کے بارے میں مزید کچھ معلوم نہیں نظم کی ملفوظی تاریخ یہ ہے

در تہہ صد شصت حسابے　　بے تدقیق شد ایں کتابے

یہ وہ زمانہ ہے جب ہمایوں شکست کھا کر ہندوستان سے فرار ہو چکا تھا اور دلی میں سکندر لودی حکمراں تھا۔[1]

اس مثنوی کے دو نسخے ملتے ہیں۔ ایک مولوی عبدالحق کے پاس تھا۔ انھوں نے اس کا تعارف رسالہ اردو جنوری ۱۹۵۲ء میں مثلِ خالق باری کے نام سے کرایا۔ بعد میں یہ مضمون ان کے مجموعے قدیم اردو میں شامل ہوا۔ اب یہ مخطوطہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں ہے۔ اس کا ذکر فہرستِ مخطوطاتِ انجمن جلد اوّل صہ ۴۵۶ پر ہے۔ سے افسر امروہوی نے مثل خالق باری کے عنوان سے رسالہ اردو جولائی ۸۳ء اور اکتوبر ۸۳ء میں دو حصّوں میں شائع کر دیا۔[2] دوسرا نسخہ مولانا آزاد سنٹرل لائبریری بھوپال (سابق حمیدیہ لائبریری) میں اَجے چند نامہ کے نام سے ہے جس کا تعارف ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے مضمون 'اجے چند نامہ' مشمولہ رسالہ غالب نامہ، دلّی جنوری ۱۹۸۶ء میں کرایا۔

---

[1] ڈاکٹر نذیر احمد: اجے چند نامہ۔ غالب نامہ جنوری ۱۹۸۶ء صہ ۹۷

[2] ڈاکٹر معین الدین عقیل: پاکستان میں اردو تحقیق، موضوعات اور معیار (انجمن ترقیِ اردو پاکستان کراچی۔ ۱۹۸۷ء) صہ ۴۰

Marfat.com

تعارف کے بعد انھوں نے پورا نسخہ چھاپ دیا ڈاکٹر نذیر احمد نے بھوپال نسخے کے کاتب کا نام 'حکیم جین رائے' دیا ہے۔ کم امکان ہے کہ ایسا نام ہو۔ غالباً صحیح نام 'حکیم چیتن رائے' ہے۔

راقم الحروف نے اردو مثنوی پر اپنی تحقیق قیام بھوپال میں کی۔ اس وقت مولانا آزاد لائبریری میں مثنویوں کے جملہ مخطوطات دیکھے۔ اس وقت یہ نسخہ کہیں نظر نہ آیا۔ اتفاق سے ڈاکٹر نذیر احمد کو مولوی عبدالحق کے مضمون اور نسخے کا علم نہیں۔ بھوپالی نسخے کے ترقیمے میں اس کا نام 'اجے چند نامہ' دیا ہے۔ مولوی عبدالحق کے نسخے میں کوئی نام نہیں جس کی وجہ سے انھوں نے 'مثل خالق باری' جیسا بے ڈھنگا نام دے دیا۔ یہی نام انہوں نے ایک اور منظوم لغت مکتب نامہ عرف تجنیس اللغات کو دیا ہے۔ اس قسم کی تسمیہ لغات کے نام ان کی ابتدا کے دو ایک الفاظ کی بنا پر دے دیے جاتے ہیں۔ مولوی صاحب اس کے پہلے دو الفاظ کی بنا پر اسے 'باری تعالیٰ' کہہ سکتے تھے۔ بھوپالی نسخہ پاکستانی نسخے کے مقابلے میں بہت زیادہ مکمل ہے۔ پاکستانی نسخے میں ۲۹ عنوان اور ۷۰۳ شعر ہیں جب کہ بھوپالی نسخے میں ۳۵ یا ۳۶ عنوان اور ۵۰۶ شعر ہیں۔ یہ نظم خالق باری کے برخلاف زیادہ تر اردو میں ہے کمتر فارسی میں۔ نظم کے مختلف اجزا کے عنوانات فارسی میں ہیں۔ تمہیدی اشعار کے بعد عنوان ہے

فہرست کارخانۂ پادشاہاں گوید

اور اس کے بعد ۳۶ عنوانات کی فہرست ہے جن میں سے ہر ایک کے آخر میں خانہ آتا ہے۔ ان میں شتر خانہ بھی شامل ہے لیکن نظم میں یہ غائب ہے۔ اس طرح جملہ ۳۵ کارخانوں کے عنوانات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

دفاتر خانہ، عطریات خانہ، مطبخ خانہ، تنبوں خانہ، فراش خانہ، شمع خانہ، شہ ابدار خانہ، سلح دار خانہ، جنگ خانہ، بیوہ خانہ وغیرہ۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے اس نظم کے اور خالق باری کے بعض مماثل اشعار کو پیش کر کے قیاس کیا ہے کہ خالق باری اجے چند کے پیش نظر رہی ہے یا بصورتِ دیگر خالق باری کے شاعر نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ چند مماثل شعر یا مصرعے یہ ہیں [1]

---

[1] اجے چند نامہ مشمولہ غالب نامہ ص ۹۹-۹۸

Marfat.com

اجے چند نامہ	خالق باری
ساعت گھڑی، پہر ہے پاس	ساعت گھڑی، پہر ہے پاس
شہر ماہ در ہندوی ماس	شہر آمد ماہ ہندوی ماس
چاند گہن بنویس خسوف	ہے چند گہن خسوف می دان
بدا ک سورج گہن کسوف	ہم سورج گہن کسوف می مان
ہانڈی دیگ کفچہ ہے ڈوئی	دیگ ہانڈی کفچہ ڈوئی بے خطا
کزغاں کہوں کڑا ہی جان	تابہ کزگان است کڑاہی وتوا
مشرق کہوں جو پورب نانو	مشرق جو کہوں پورب کا نانو
مغرب بداں ہندوی پچھانو	مغرب در ہندوی پچھانو
کنجد تلی، ارزن چیناں	خردل رائی، ارزن چینا
دادستد ہے، لیئے دیوا	دادستد ہے دینا لینا

نظم کی ابتدا کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں. ان میں خوبی یہ ہے کہ یہ لغات مترادفات بھی ہیں اور حمد پر مشتمل بھی

باری تعالیٰ نام گائی	بسے بزرگی، بہت بڑائی
خالق، جن جگ پیدا کیا	رازق، سب کوں بھوجن دیا
واحد ایک، پرستش پوجا	لاشریک، کوئی اور نہ دوجا
بے چگوں، جنھ روپ نہ دیکھا	بے غوں وہ جائے نہ دیکھا
بے نیاز، جو سنگ نہ مانیں	بے قیاس، کوئی انت نہ جانیں

اور بیوہ خانہ میں بیوہ کے لوازمات دیکھیے

بیوہ خانہ کہیے رنڈسالہ	بختہ روئی باغندہ گالا
چرخہ نام رہٹ ہے جان	دوک بیار جو تکلا آن
ہے پیچک در ہندوی پونی	شد کلاوہ ککڑی، ہونی

ذیل میں اس کے کچھ ایسے الفاظ درج کیے جاتے ہیں جن کا تلفظ فرسودہ ہے یا جو نسبتاً غریب لفظ ہیں ۔ قوسین میں جدید تلفظ یا معنی درج کیے جاتے ہیں

ساتو (ستو)، منھ پونچھن (منھ پوچھنا)۔ لاگا (لگا)۔ بچھانا (بچھونا)۔ یکیلا (فرد)۔

Marfat.com

اونٹ وال (شتربان)۔ گاڈی (گاڑی)۔ بڈائی (بڑائی)۔ بکروٹا (بکری کا بچہ) بھڑہا (بھیڑیا)۔ لوکھڑی (لومڑی)۔ کھرہا (خرگوش)۔ کوکڑا (مرغ)۔ کرک را (کیکڑا)۔ تروار (تلوار)۔ گھیو (گھی)۔ کچھو (کچھ)۔ ماپا (ناپ)۔ جوتکی (جیوتشی)۔ رکھوارا (رکھوالا)۔ جڈ کالا (جاڑے کا کال یعنی جاڑے کا موسم)۔ دھکالا (دہک + کال یعنی گرمیوں کا موسم)۔ بٹمار (رہزن)۔ رتلا (سرخ)۔ ہریا (ہرا) ڈانگ (دامنِ کوہ)۔ اندھاری (اندھیری)۔ اُچھ (رہ)۔ آننا (لانا)۔ ناٹھ (بھاگ)۔ گھوڑسار (گھڑسال)۔ پسی (لسی)۔ پنڈت سالا (بندی خانہ)۔

آخری لفظ باغ و بہار کے پنڈت خانے کی یاد دلاتا ہے۔ مندرجہ بالا الفاظ میں ساتو، لاگا، تروار، رکھوارا، کچھ میں برج کا اثر ہے تو بڈائی، گاڈی، ناتھا، کوکڑا میں پنجابی و ہریانی کا۔ پہلے زمانے میں ڑ کی جگہ ڈ لکھتے تھے اس لیے یہ واضح نہیں کہ بڈائی اور گاڈی کو شاعر نے ڈ سے باندھا ہے کہ ڑ سے۔ فی الوقت ڈ ہی مانا جائے گا۔

اپنی قدامت کی وجہ سے یہ منظوم لغت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ بہتر ہے کہ اس کے دونوں نسخوں کا مقابلہ کر کے اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔

شہنشاہ اکبر

ہندی شعرا کے تذکرے شوسنگھ سروج میں پہلا نام "اکبر کوی شری محمد جلال الدین اکبر بادشاہ" کا ہے۔ اس کے نام سے دو دو شعروں کی تین نظمیں درج ہیں[1]۔ ان کی زبان اتنی ٹھیٹھ اور قدیم برج بھاشا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ دور اکبری کی ہے، خود اکبر کی ہو کہ نہ ہو۔ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے ہند آریائی اور ہندی میں اکبر کے دو دوہے درج کیے ہیں[2]۔ ان کی تفصیل یہ ہے

۱۔ جاکو جس ہے جگت میں جگت سرا ہے جاہی تاکو جنم سپھل ہے کہت ہے اکبر ساہی

ماخذ دیا ہے رام نریش تیواری (ترپاٹھی) کی کویتا کومدی جلد اوّل (الہ آباد جلد ششم سمبت ۱۹۹۰)

---

[1] شیو سنگھ سینگر: شوسنگھ سروج۔ مرتب ڈاکٹر کشوری لال گپت (ہندی ساہتیہ سمیلن الہ آباد، ۱۹۷۰ء) ص ۱۱

[2] ہند آریائی اور ہندی۔ مترجم عتیق احمد صدیقی (نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا دلی ۱۹۷۷ء) ص ۱۷۳

Marfat.com

ص ۴۹۔ ۴۸۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو طبعِ ششم میں ص ۶۹۔ ۱۶۸ پر یہی دوہا کویتا کودی کے حوالے سے دیا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ شیوسنگھ سروج میں ص ۲۰۵ پر اکبر کے بہت سے دوہے اور گیت درج ہیں۔ مجھے اس کتاب میں اکبر کا کوئی دوہا نہ مل سکا۔

۲۔ چترجی لکھتے ہیں کہ چار مصرعوں کی دو اور نظمیں جن پر اکبر کے دستخط ہیں کویتا کودی میں شامل ہیں۔ اس کے بعد چترجی نے یہ دوہا درج کیا ہے

پیتھلا سوں مجلس گئی، تان سین سوں راگ ہاسی بو، رمی بو، بولی بو گیو بیربل ساتھ

شرح کی ہے کہ پیتھلا سے مراد راجہ پرتھوی راج ہے۔ مسعود حسین خاں نے بھی اس دوہے کو چترجی سے مع شرح کے نقل کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اکبر پرتھوی راج کو کیوں یاد کرے گا۔ دوسرے مصرع میں بھوج پوری انداز کا 'بو' محلِ نظر ہے۔ معلوم ہوتا ہے دوہے کا متن مسخ ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب کی طبع ہفتم ۱۹۸۷ء میں ان دوہوں کو حذف کر دیا ہے۔

حامد حسن قادری لکھتے[1] ہیں کہ شمس العلما مولانا محمد عبدالغنی ایم اے، ایم لٹ پروفیسر ناگپور یونیورسٹی نے تاریخ ہمایونی قلمی سے لے کر اپنی تصنیف 'تاریخ ادبِ فارسی در عہد سلاطینِ مغلیہ' جلد سوم میں دو فقرے درج کیے ہیں۔ قادری نے انھیں نقل کیا ہے۔

جب اکبر نے جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی اور اکبر و جہانگیر دلہن کی پالکی کو خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلے تو راجہ نے کہا

ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری ہم باند گُلام رے،

اکبر نے جواب دیا

تمہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی تم صاحب سردار رے

نثری شاعری کا قدیم نمونہ ہے۔ اگر واقعی ان عمائد نے یہ مترنم فقرے کہے تو ہماری

---

[1] تاریخ و تنقید ص ۵۹۔

Marfat.com

تمہارے، تمہاری تو نہ کہا ہوگا. ہمری، تمری، یا مھاری نھاری جیسا کچھ کہا ہوگا۔
راویوں نے زبان کو صاف کر دیا ہے۔

نوری

قائم نے مخزن نکات میں ملا نوری کا ذکر کیا ہے۔ یہ اعظم پور کے قاضی زادے تھے اور فیضی کے دوست۔ قائم لکھتا ہے کہ ان کی دو تین غزلیں بطور ریختہ کے سنی تھیں بالفعل ایک مقطع ہی یاد ہے

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد بے چارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

شعر بہت معمولی اور غیر شاعرانہ ہے۔ ان سے بس یہی شعر یادگار ہے اور قائم سے لے کر مختلف تذکرہ نگار لکھتے چلے آئے ہیں۔

بہرام بخاری سقّا، م ۹۷۰ھ، موید اور مشہدی

درویش بہرام بخاری سقّا ایران سے ہندوستان آئے اور زندگی کا کافی حصّہ شمالی ہند بالخصوص دلّی اور آگرے میں گزارا[1]۔ وہ عہد ہمایوں یا پھر عہد اکبر میں ہندوستان آئے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے عقیدت رکھتے تھے۔ اکبر بادشاہ ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ ان کے کوئی مرشد زادے ہندوستان آئے تو سقّا نے اپنی پونجی اس کے حوالے کر دی اور خود فقیرانہ لباس پہن کر مشک لے کر آگرے کی گلیوں میں لوگوں کو پانی پلانے لگے۔ بعد میں یہ آگرہ سے بنگال کے لیے روانہ ہوئے۔ دورانِ سفر بیں بردوان میں ان کا انتقال ہوگیا جہاں ان کی قبر موجود ہے۔

وہ فارسی کے شاعر تھے۔ ترکی اور عربی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ایک روز جذب کے عالم میں اپنے دواوین دریا میں ڈال دیے۔ ان کے فارسی دیوان کے چند نسخے

---

[1] امیر حسن عابدی: عہد ہمایون و اکبر کی دو اردو غزلیں، رسالہ تحریر دلّی، شمارہ ۲، ۱۹۶۸ء، سقّا کے حالات اور کلام اسی مضمون سے درج ہیں. نیز ملاحظہ ہو۔ مقالات شیرانی جلد دوم صہ ۸۷، بیران کے حالات اور ریختہ

Marfat.com

خدا بخش لائبریری میں اور ایک نسخہ بھنڈار کر اورنیٹل ریسرچ انسٹیٹوٹ پونا میں ہے۔ ان کی دو ریختہ غزلیں ملتی ہیں۔ پہلی غزل کی ردیف مخطوطے میں 'بول پری' لکھی ہے جس کی قرأت امیر حسن عابدی نے 'بھل پڑے' طے کی ہے۔ مطلع اور مقطع یہ ہیں

رہ بہ سوئے دَیر بردم بھُل پڑے — دُرد دُردِ بادہ خوردم، بھُل پڑے
ہم رہاں رفتند اے سقا! بدہ — یک دمے آبے بہ ماہم، بھُل پڑے

دوسری غزل کے تین شعر یہ ہیں

باز ہندو بچہ قصدِ دلم دھرتی ہے — کچھ نہیں جانوں ازیں خستہ کیا کرتی ہے
چیں برابر وزدہ، بر بستہ کٹاری بہ میاں — چل چل اے دل منگر، تجھ کنے اوہ لڑتی ہے
چپ کہ اے دل شدہ سقا! زغم یار منال — گر جفا رفت بہ جانِ تو مبا (ح) کرتی ہے

خطی نسخوں میں ہر جگہ یائے معروف یا ئے مجہول لکھی ہوئی ہے جسے عابدی نے درست کر دیا ہے۔ خواہ فعل مذکر ہو لیکن شاعر نے اسے یائے معروف ہی سے لکھا ہے کیونکہ اس زمین میں دوسرے دو ایرانی شعرا کی ایک ایک غزل ریختہ ملتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔ پہلے کس نے لکھی اور بعد میں کس نے، یہ واضح نہیں۔ یہ غزلیں ڈاکٹر نذر احمد کو کتب خانۂ جیب گنج کی ایک بیاض میں ملیں جو ان کے مطابق ۹۶۴ھ تا ۹۸۰/۱۵۶۱ء کے درمیان مرتب ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے مضمون[2] 'سلاطین مغلیہ کا نیا کلام' میں اس کا تعارف کرایا۔ مرتب انھیں غزل ملمع کہتا ہے۔

ان میں پہلے شاعر موید بیگ کور ہیں۔ ان کا تخلص موید ہے پھر یہ کور بہ معنی اندھا چہ معنی۔ معلوم نہیں قرأت میں کچھ غلطی تو نہیں۔ ان کی غزل کے دو شعر درج ذیل ہیں

ہر گہ آں ساقی ہندی کہ طرب کرتی ہے — کاسۂ مئے ز شراب لب خود بھرتی ہے (بھرتی)

---

[1] ایضاً رسالہ تحریر صہ ۲۰۶ کا فٹ نوٹ۔
[2] ڈاکٹر نذیر احمد: 'سلاطینِ مغلیہ کا نیا کلام' فکر و نظر علی گڑھ جنوری ۱۹۶۳ء

Marfat.com

خواہم احوالِ دلِ خویش بگویم باتو — لیمک از نازکیِ طبع توام درتی ہے (ہم ڈرتے)
گشت چوں قصہ وافسانہ بہ ہر پیر وجواں — کہ موید زغمِ عشق بتے مرتی ہے

اس سلسلے کا تیسرا شاعر مشہدی بخاری ہے۔ اس کی غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے

ہندوِ چشم تو گفتم کہ بہ من لرتی ہے — رخت درخندہ وگفتا کہ مغل درتی ہے
دست بردامنِ آں دلبرِ ہندو چوزدم — گفت ازناز کہ اے میر تو کیا کرتی ہے

پروفیسر مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں

"ان شعروں میں ایرانی شاعروں نے غالباً ناواقفیت کی بنا پر مذکر فاعلوں کے لیے مونث فعل استعمال کیے ہیں۔ موید ایک شعر میں متکلم کی جگہ غائب کا صیغہ لایا ہے"[1]

حق یہ ہے کہ کچھ ناواقفیت، کچھ ردیف وقافیہ کی مجبوری سے ہر جگہ مرتی ہے، کرتی ہے لایا گیا ہے اس طرح نہ صرف مذکر مونث کا التباس ہے بلکہ واحد جمع، متکلم وغائب سب کا مثلاً 'کرتا ہے' کی جگہ 'کرتی ہے'، 'ہم ڈرتے ہیں' کی جگہ 'ام درتی ہے' لائے ہیں۔

ان غزلوں کی تاریخی اہمیت ہے۔ ان کی زبان کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے لیکن ادبی اعتبار سے ان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں۔ مشہدی کی غزل کی روح تو بہت بعد کے مرزا معز فطرت اور فائز کی غزلوں کی سی ہے جن میں کوئی ایرانی یا مغل ہندو عورت سے بے تامل اظہار تعشق اور چھیڑ خانی کرتا ہے۔ ظاہرا مشہدی اور موید دونوں سقا بخاری کے ہم عصر رہے ہوں گے۔

شیخ علی متقی محدّث م ۹۷۵ھ

ان کا آبائی وطن جونپور تھا۔ ولادت برہان پور میں ہوئی۔ مانڈو میں شاہانِ مالوہ کے یہاں ملازمت کی۔ شیخ بہاءالدین باجن کے مرید تھے۔ آخر میں مکہ ہجرت کر گئے۔ مرض الموت میں یہ شعر کہا تھا

---

[1] مسعود حسن رضوی: مراثیِ ریختہ۔ تحریر دلی اپریل تا جون ۱۹۷۱ء، ص ۷

Marfat.com

سن سہیلی پریم کی باتا یوں مل رہی جیوں دودھ نباتا[1]

سولہویں صدی کے اس شعر کی زبان بالکل صاف ہے. وزن ہندی ہے. چونکہ شمالی ہند کے شاعر ہیں اس لیے زبان میں مغائرت نہیں.

ملّا شیری

سعدی کے نام سے جو ریختہ مشہور ہے وہ ڈاکٹر نورالحسن کی تحقیق کے مطابق ملّا شیری کا ہے. ہاشمی نے علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو میں شیری کی تفصیل دی جس کا خلاصہ یہ ہے' ملّا شیری پنجاب کے کسی قصبہ گکوال کے شیخ زادوں میں تھا. اکبر بادشاہ اس کی زود گوئی سے خوش ہوا اور اپنے دربار میں اچھے منصب پر فائز کردیا. شیری قصیدہ اور قطعہ کہنے میں ممتاز تھا گو اس نے غزلیں بھی کہی تھیں. اپنے زمانے میں اس کا فارسی دیوان معروف و مقبول تھا. اکبر نے جب مہابھارت کا فارسی ترجمہ کرایا تو اس میں یہ بھی شریک تھا. بیربل کی ہم راہی میں سوات کے یوسف زئی افغانوں کی جنگ میں ۹۹۴ھ م ۱۵۸۶ء میں مارا گیا. مآثرالامرار کے مطابق اس کی وفات کی تاریخ ۹۸۹ھ ہے.

ڈاکٹر ہاشمی کو انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۰۲۰ھ ملا جس میں یہ غزلِ ریختہ شیری کے نام سے ہے. وہاں اس میں ۶ شعر ہیں. یہ اس ریختے کی قدیم ترین روایت ہے. اس کے بعد اسے ہر جگہ سعدی کے نام سے درج کیا گیا ہے. سعدی کے نام سے اس کی قدیم ترین روایت[2] نجیب اشرف ندوی کی مملوکہ اس بیاض میں ہے جس کا تعارف ڈاکٹر ابوالفضل سید محمود قادری (حال پروفیسر اردو عثمانیہ یونیورسٹی) نے نوائے ادب میں ۵۷-۱۹۵۶ء میں کرایا. اس بیاض کا زمانۂ کتابت بارہویں صدی عیسوی کا آغاز یا شاید گیارہویں صدی کا آخر ہو.

---

[1] نقوش سلیمانی صہ ۵۶. ۵۵.

[2] جلد اوّل صہ ۴۸۸

[3] ابوالفضل محمد قادری: اوراق پارینہ. نوائے ادب جولائی ۱۹۵۷ء. صہ ۴۱.

Marfat.com

اس میں اس غزل کے پانچ شعر سعدی کے نام سے ہیں. تیسرا حوالہ میر کے نکات الشعرا میں ہے جہاں اسے سعدی دکھنی کے نام سے درج کیا ہے. میر کہتے ہیں کہ جو اسے شیخ سعدی سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں. میر کے بعد اس غزل کے چند شعر گردیزی کے تذکرہ گلشنِ راز، قائم کے مخزنِ نکات، شفیق کے چمنستان شعرا، قاسم کے مجموعۂ نغز اور دوسرے تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہیں.

گردیزی نے بھی اسے سعدی شیرازی سے الگ سعدی دکنی قرار دیا اور یہ میر کی تقلید میں ہے. قائم نے مخزنِ نکات میں اسے پہلی بار سعدی شیرازی بتایا. لکھتا ہے کہ جب سعدی شیرازی سومنات آئے تو یہاں کی زبان میں ایک دو غزلِ ریختہ بھی کہیں. شفیق نے لکھا ہے کہ سعدی کا مرقد برہان پور کے جوار میں ہے. قاسم نے مجموعۂ نغز میں لکھا ہے کہ ریختے کا مصنف دکن کا شاعر ہے اور ولی سے پہلے کا ہے. قاسم کے مطابق سودا نے اپنے تذکرے میں اسے سعدی شیرازی سمجھ لیا. قاسم کا یہ بیان سودا کے تذکرے کے وجود کی سب سے بڑی [illegible] ہے. میر نے جو نکات الشعرا میں لکھا ہے کہ جو اسے سعدی شیرازی سمجھتے ہیں غلطی پر ہیں، یہ اشارہ سودا کے تذکرے کی طرف ہی ہو سکتا ہے. آزاد نے آبِ حیات میں قاسم کے بیان ہی کو دہرا دیا ہے لیکن یہ اضافہ کر دیا ہے کہ ریختے والا سعدی خود کو ہندوستان کا سعدی سمجھتا تھا. نساخ نے اسے ولی کا ہم عصر کہا ہے.

لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید جلد چہارم میں لکھا ہے کہ یہ احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے اور شیخ عبداللہ کرمانی سے تحصیلِ علم و مشورۂ سخن کیا. شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم[1] میں دوسرے تذکروں کے بیانات کا ذکر کر کے فیصلہ کیا ہے کہ سعدی کاکوروی کے رہنے والے تھے. ملا نظام الدین احمد نے طبقاتِ اکبری [illegible] میں ان کے لیے لکھا ہے کہ یہ کاکوری کے باشندے تھے. بختاور خاں نے لکھا ہے کہ سعدی فارسی اور ہندی میں شعر کہتے تھے. ملا عبدالقادر بدایونی کہتے ہیں کہ یہ شیخ حمد کے بیٹے تھے اور ۱۰۰۲ھ میں انتقال کیا. شمس اللہ قادری نے ان تینوں فارسی ماخذ

---

[1] اردوئے قدیم ص ۱۲۳۔ تیج کمار بک ڈپو لکھنو ۱۹۶۷ء

Marfat.com

کا ذکر کر کے طے کیا کہ سعدی شمالی ہند کا باشندہ تھا۔

قاضی عبدالودود شمس اللہ قادری کے بیان پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں "کاکوروی بزرگ کا نام سعدی تھا، تخلص نہ تھا اور ان کا شاعر ہونا مطلقاً ثابت نہیں شفیق اورنگ آبادی نے دکنی لکھا ہے اور یہ کہیں زیادہ قابل قبول ہے۔"[1]

قادری نے نظام الدین، بختاور خاں اور ملّا عبدالقادر کے بیانات سے عہد اکبر کے سعدی کے بارے میں تو معلومات ہو جاتی ہیں لیکن یہ کہاں طے ہوتا ہے کہ یہ مبینہ ریختے کا مصنف بھی ہے۔ محمود شیرانی نے اپنے ایک[2] مضمون میں سب کی رائیں دے کر لچھمی نراین شفیق سے اتفاق کیا ہے کہ وہ برہان پور کا باشندہ تھا۔ روائح النفائس[3] کے مطابق شیخ سعدی ہندی حضرت نظام الدین اولیا کے مرید حضرت برہان الدین کے مرید تھے۔ یہ برہان پور سے ۶ میل دور قصبۂ سپر پور مدفون ہیں۔ حامد حسن قادری[4] نے اس کا نام کمال الدین مخدومی سعدی کاکوروی اور سنہ وفات ۱۰۰۲ھ م ۱۵۹۳ء درج کیا ہے۔

سعدی کاکوروی، سعدی برہان پوری اور سعدی دکنی کو اس لیے ریختے کا مصنف نہیں مانا جا سکتا کہ قدیم ترین روایت میں اس کا انتساب ملّا شیری سے ہے۔ فارسی اردو رسم الخط میں نقطے حسب منشا حذف کر دیے جاتے ہیں اس لیے شیری کو سعدی پڑھنا ممکن ہے۔

مختلف نسخوں میں ملا کر اس غزل کے نو شعر دستیاب ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں انھیں ترتیب دیا ہے۔ ان میں شیری سے منسوب متن کو زیادہ

---

[1] معاصر حصہ ۹ صہ ۱۸۷، نیز عیارستان صہ ۱۸۷، دراصل صہ ۴۷

[2] شمالی ہند میں اردو دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں۔ اورنیٹل کالج میگزین مئی و اگست ۱۹۳۱ء باز طباعت مقالاتِ شیرانی جلد دوم - ۶۱-۶۰

[3] بہ حوالۂ مبارز الدین رفعت: شیخ سعدی ہندی کا مدفن۔ اردو نامہ کراچی شمارہ ۱۰ اکتوبر تا دسمبر ۶۰۲ - صہ ۲۳

[4] حامد حسن قادری: تاریخ و تنقید۔ صہ ۶۰

Marfat.com

اہمیت دی ہے. میراطے کیا ہوا متن حسبِ ذیل ہے

فتنہ چو دیدم بر رخش، گفتم کہ یہ کیا دیت ہے — گفتا کہ دُر ہو باورے، اِس شہر کی یہ ریت ہے
اے مردماں شہرِ شما کیسی بری یہ ریت ہے — ہے ہے نمی پرسد کسے پردیسیا ماریت ہے
جانا تمہارے جیو کوں، میرے بہت پریتیت ہے — جاں می دہم، با خود ببر تن من جو جیو سمیت ہے
جیولے کے تم یہ دُکھ دیا، تیرا ہموں، کہہ، کیا کیا — تم وہ کیا، ہم یہ کیا، کتنی بھلی پریت ہے
گردم بہ گردِ کوئے تو، جاں دادہ ام بر روئے تو — دو گوشۂ ابروئے تو، سجدہ ہماری ریت ہے
دونین کی کھپر کرو، روئے روئے زخونِ دل بھرو — پیشِ سگِ کویت دھرو، بھوکا نہ جاوے میت ہے

بندم بہ عشق تو کمر، نت اٹھ کروں سینہ سپر — کھیلوں جو اپنے سر اپر، لیکھن تمہاری جیت ہے
دونین اورے پیو چووے، ندیاں بھرے پوکھر کوئے — در فرقتِ تو ہم موئے، کچھ بھی ہماری جیت ہے
شیری غزل انگیختہ، شیریں شکر آمیختہ — دُر ریختہ در ریختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

انجمن کی بیاض میں شیری کے نام سے چھ اشعار دیے ہیں. پہلا دوسرا اور ساتواں موجود نہیں. قدیم ترین روایتیں انجمن کی بیاض اور بیاضِ ندوی ہیں. دونوں کے مشترک اشعار کے متن میں بہت کچھ مشابہت ہے. معلوم ہوتا ہے ابتدائی دو مطلع شیری کے نہیں کسی دوسرے کے ہیں.

اس طرف دھیان دیا جائے کہ اس ریختے کے ہندی حصے میں دکنیت بالکل موجود نہیں. برہان پور تک کی زبان میں بعض دکنی عناصر پائے جاتے ہیں. لسانی رنگ و روپ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ریختہ شمالی ہند کے شاعر کی تخلیق ہے.

بہاء الدین برناوی م ۱۰۳۰ھ

خاتم النارکین مخدوم بہاء الدین برناوی برناوہ ضلع میرٹھ یوپی کے رہنے والے تھے. ان کے حالات مخدوم علاء الدین ثانی برناوی کی تالیف کتاب چشتیہ میں ملتے ہیں جہاں سے لے کر شیرانی نے پنجاب[1] میں اردو میں دیے ہیں. خلاصہ یہ ہے.

---

[1] ص ۲۰۴ تا ۲۰۷.

Marfat.com

زمانۂ طالب علمی ہی میں یہ اتنے اہل تھے ایک عربی قصیدہ لکھ کر استاد کی خدمت میں پیش کیا۔ تحصیل علم کے بعد انھیں شکار کا شوق ہوا۔ اس نواح میں پہلے شخص تھے جس نے بندوق سے شکار کھیلنا اختیار کیا۔ جدّامجد مخدوم شیخ فریدالدین برناوی کے مکہ جانے کے بعد انھوں نے اپنی تمام املاک دنیوی مثلاً جاگیر، وظائف، اثاث البیت، گھوڑا، ہتھیار وغیرہ ترک کر دیے اور اس بنا پر خاتم التارکین کہلائے۔ انھوں نے ملک میں شمال و دکن میں جگہ جگہ سفر کیا۔ سلطان اکبر اور سلطان جہانگیر سے ملاقات کی

ہندوستانی موسیقی کے بہت بڑے ماہر تھے۔ شیرانی لکھتے ہیں

"مسلمانان ہندوستان میں صرف دو شخص فن موسیقی میں یگانۂ روزگار مانے گئے ہیں۔ امیر خسرو اور مخدوم بہارالدین۔ امیر اس کا دیباچہ ہیں اور مخدوم اس کا تمت ہیں" [1]

یہ بہت بڑا مبالغہ ہے۔ انھوں نے تان سین، سلطان حسین شرقی والیِ جونپور، محمد شاہ کے درباری موسیقار میاں سدارنگ وغیرہ سب سے بہارالدین کو بڑھا دیا۔ بہرحال ان کے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ہندی میں شاعری کرتے تھے جس میں جکری، خیال، قول، ترانہ، ساورہ، دھرپد، بشن پد وغیرہ میں اشعار لکھے ہیں۔ انھوں نے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کا کلام دوسروں کے نام سے مشہور ہوگیا۔ نمونہ یہ ہے

ان نینن کا یہی بسیکھ ہوں تجھ دیکھوں توں مجھ دیکھ

یہ شعر باغ و بہار کے تیسرے درویش کی سیر میں اس ترمیم کے ساتھ ہے [2]

ان نینوں کا یہی بسیکھ وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ

برناوی نے جہانگیر اور خرم کی جنگ کے وقت یہ 'ساورہ' کہا،

اے رے بھائی جیتا مصاف ساہن سرتاج جس ری تو ملا، نت نت راج

خواجہ خضر کے لیے

---

[1] ایضاً ص ۲۰۴

[2] باغ و بہار ص ۲۰۶ مکتبۂ جامعہ دلّی۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء

Marfat.com

دائم حیات، کائم کرامات، ملاکات نعمت پاوہم
ندی نیر دام بھاری بہیر پھیر برہت ہو تھیاں تھیائی رم پرم

ان کے کلام کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں ہندی زبان کی شدت ہے۔ خواجہ خضر سے متعلق دو اشعار ہیں۔ پہلے مصرع میں اردو الفاظ ہیں بقیہ میں ہندی ہے۔ ہندی رنگ دینے کے لیے عربی فارسی الفاظ کو ہندیا لیا ہے مثلاً کائم (قائم) ملاکات (ملاقات) کھواجہ کھدر (خواجہ خضر)۔ در ہندی اشعار برائے طلب بقائے سلطان الاولیا ہیں لیکن ان کی زبان بھی ثقیل ہندی ہے۔ اس طرح انھیں اردو کے بجائے ہندی کا شاعر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اب تک شمالی ہند کے شعرا کا جو کلام پیش کیا گیا اس کے دو واضح دھارے ہیں۔ ایک دولسانی ریختے ہیں جن کا بیشتر جز و فارسی ہے اور جو فارسی اوزان میں ہیں۔ دوسرا وہ ہے جو ہندی وزن، ہندی لفظیات اور ہندی ادبی روایت میں ہے۔ ادبی دیانت داری کا تقاضا ہے کہ آخرالذکر کو اردو نہ کہہ کر ہندی کہا جائے۔ اگر یہ اردو ہے تو اردو ہندی کی تفریق بے معنی ہو جاتی ہے۔ تب اردو اور ہندی ادب کو ملا کر ایک تاریخ ادب لکھنی چاہیے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنے ایک مضمون[1] اور اپنی کتاب اردو کی کہانی[2] میں یہی کیا ہے کہ اردو کے علاوہ دیوناگری رسم خط میں کھڑی بولی کے عہد بہ عہد نمونوں کو لے کر کھڑی بولی کی ایک مسلسل روایت تشکیل کی ہے۔ وہ اردو اور ہندی کے فرق کے قائل نہیں۔ ذیل میں ان کی تحریروں، رام چندر شکل کے ہندی ساہتیہ کا اتہاس، نیز دوسری کتابوں کی مدد سے ہندی اور پنجابی شعرا کے بیان سے کھڑی بولی شاعری کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان نمونوں کو صرف شمالی ہند کے شعرا تک محدود رکھا گیا ہے۔ مہاراشٹر کے سنت گیانیشور، ان کی بہن مکتا بائی اور نام دیو کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک لسانی رنگ و روپ کا تعلق ہے ان میں اور نیچے درج کیے ہوئے نام نہاد اردو اشعار میں کوئی فرق نہیں۔

---

[1] اردو کا قدیم ترین ادب، نقوش شمارہ ۱۰۲، مئی ۱۹۶۵ء
[2] اردو کی کہانی۔ ص ۱۶۰ تا ۱۹۸۔ لاہور ۱۹۷۵ء

Marfat.com

رامانند

یہ بہت بڑے رام بھگت سنت تھے۔ ان کے زمانے کے بارے میں بہت سی روایتیں ہیں لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۵۲۰ء کے آس پاس موجود تھے۔ ان کے چیلوں میں کبیر اور روی داس (یا رے داس) بہت مشہور ہیں۔ رامانند بنارس میں رہتے تھے لیکن انھوں نے ملک بھر کی سیاحت کر کے تبلیغ کی۔ ان سے دو سنسکرت کتابیں یادگار ہیں۔ بقیہ ان کے نام پر بہت کچھ الحاق کر دیا گیا۔ ہندی کے دو تین بدھی انھوں نے لکھے۔ ایک پد سے کچھ آسان سطریں درج کی جاتی ہیں

آرتی کیجے ہنومان لَلَہ کی — دُشٹ دَلَن رگھو ناتھ کلا کی
گھنٹا تال جھالری باجے — جگ مگ جوتی اودھ پور چھاجے
جو ہنومان جی کی آرتی گاوے — بسی بیکُنٹھ، پرم پد پاوے[1]

کبیر

کبیر کے سال ولادت و وفات کے بارے میں اختلاف رائے ہے لیکن کبیر پدا ولی کے دیباچے میں ڈاکٹر رام کمار ورما نے اندازہ کیا ہے کہ کبیر کا عرصۂ حیات ۱۳۹۸ء تا ۱۵۱۸ء تھا۔ کبیر کی سوانح عقیدت کے دھندلکوں سے مبہم بلکہ متنازع ہے۔ ہم اس سے صرف نظر کر کے ان کے ایسے کلام سے نمونے درج کرتے ہیں جو کھڑی بولی سے قریب ہے۔ پہلے دو اشعار گرو گرنتھ صاحب سے لیے ہیں

کبیر لوٹنا ہے لوٹ لے رام نام ہے لوٹ — پھر پاچھے پچھتاہوگے پران جاہیں چھوٹ
کبیر میرا مجھ منھ کچھ نہیں جو کچھ ہے سو تیرا — تیرا مجھ کو سوپے کیا لاگے میرا[2]

---

[1] رام چندر شکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ صہ ۱۱۷۔ مطبوعہ سمبت ۲۰۲۲ بکری (۱۹۶۵ء)
[2] بحوالہ مسعود حسین خان: مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو صہ ۱۵۹۔ ایڈیشن ۱۹۷۸ء

Marfat.com

ذیل کے اشعار ڈاکٹر رام کمار ورما کی مرتبہ کبیر پداولی کے ترجمے شعر کبیر سے ماخوذ ہیں[1]

مادھو جل کی پیاس نہ جائی ص ۱۱۴
پانی میلا، ماٹی گوری اس ماٹی کی پُتری جوری ص ۱۲۶
نر و مرے نر کام نہ آوے پَسو مرے دس کاج سوارے
اپنے کرم کی گت میں کیا جانوں میں کیا جانوں بابا رے
ہاڑ جلے جیسے لکڑی کرتو لا کیس جلے جیسے گھاس کا پولا ص ۱۳۱
کہہ کبیر تب ہی نر جاگے جم کا ڈنڈ مونڑ مہ لاگے ص ۱۳۲
کھسم مرے تو نار نہ روودے آس رکھوارا اور ہووے
نیک سہاگن جگت پیاری سگلے جیہ جنب کی ناری ص ۱۳۳
کیا پڑھی ہے کیا گنی ہے کیا بید پرانا سنی ہے ص ۱۴۱
دیکھو بھائی گیان کی آئی آندھی سبھے اُڑانی بھرم کی ٹاٹی رہے نہ مایا باندھی ص ۱۵۶
کوّا کہاں کپور چرائے کہ بسیر کو دودھ پیائے
(بس والا سانپ)

ہم مسکین کھدائی بندے تمرا جس من بھاوے اللہ اول دین کو صاحب جور نہیں پھر ماوے
خرابی (زور) (فرماوے)

یہ پندرھویں صدی عیسوی کی شمالی ہندوستان کی کھڑی بولی ہے۔ اس میں برج اور اودھی کی پٹ کم سے کم ہے۔ بعض مصرع تو بالکل آج کی زبان میں ہیں۔
مثلاً
ایک سہاگن جگت پیاری
کیا پڑھی ہے، کیا گنی ہے
دیکھ بھائی گیان کی آئی آندھی
کوّا کہاں کپور چرائے

مندرجہ بالا اشعار کبیر کے مستند کلام سے لیے گئے ہیں۔ ان کی زبان دکن کی معاصر شاعری سے کہیں زیادہ صاف ہے۔ کبیر کے نام سے زبانوں پر جو عوامی دوہے چڑھے ہیں

---

[1] ڈاکٹر محمد انصار اللہ مرتب: شعر کبیر یعنی کبیر پداولی اردو حروف میں۔ ۱۹۷۹ء علی گڑھ۔

Marfat.com

ان کی زبان ترمیم و اصلاح کے سبب بالکل جدید ہو گئی ہے۔ کبیر کے نام سے بعض غزلیں بھی منسوب کر دی گئی ہیں۔ ایک غزل کا مطلع یہ ہے

ہمن ہے عشق مستانہ، ہمن کو ہوشیاری کیا　　رہیں آزاد یا جگ میں، ہمن دنیا سے یاری کیا[1]

اس کی زبان اتنی صاف ہے کہ مجھے لکھتے ہوئے بھی تامل ہوتا تھا۔ ہمن کے علاوہ اس کے تمام الفاظ بیسویں صدی کی زبان کے ہیں۔

سنت رَوی داس یا رَے داس۔

رامانند کے بارہ چیلوں میں کبیر کی طرح رَے داس بھی تھے۔ یہ ذات کے چمار تھے۔ بنارس کے رہنے والے تھے۔ ان کی کوئی مستقل کتاب نہیں ملتی۔ جستہ جستہ پد ہی ملتے ہیں۔ بھ پدگرو گرنتھ صاحب میں محفوظ ہیں۔ رے داس کی زبان بھی پوربی ہے لیکن جا بجا کھڑی جیسی ہو جاتی ہے نمونہ

مادھو کیا کہیے پربھو ایسا　　جیسا مانیے ہوئے نہ جیسا
نریت ایک سنگھاسن سوتیا　　سنے بھیا بھکھاری
اچھت راج بچھرت دکھ پائیا　　سوگت بھئی ہماری[2]

پرانی کیا میرا کیا تیرا　　جیسے تنرور پنکھ بسیرا
جاکی چھوت جگت کو لاگے　　تا پر توہی ڈھرے
نیچ اوچ کرے میرا گرو کا ہوتے نہ ڈرے[3]
کہے روی داس کھلاس چمارا　　جو ہم سہری سو میت ہمارا
اوچے مندر سندر ناری　　رام نام بن باجی ہاری
دکھیا درد وند در آیا　　بہت پیاس جواب نہایا[4]

ان میں شہری، بازی دردمند، درآنا، جواب جیسے اردو الفاظ آئے ہیں گو ان میں سے بیشتر کا تلفظ ہندیا لیا گیا ہے۔

---

[1] حامد حسن قادری: تاریخ و تنقید۔ ص ۵۶
[2] رام چندر شکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ ص ۸۴، ۸۳۔
[3] سہیل بخاری: اردو کی کہانی ص ۱۶۷۔
[4] ایضاً ص ۱۷۶، ۱۷۵۔

Marfat.com

دھرم داس

یہ کسوندھن باندھوگڑھ ـــــ کے مہاجن بنیے تھے۔ کبیر کے انتقال پر انھوں نے اپنی ساری مال متاع خیرات کر دی اور کبیر کے خلیفہ ہو گئے۔ پندرہ بیس سال کے قریب سجادہ نشینی کر کے یہ انتقال کر گئے۔ انھوں نے بھی پوربی زبان کا استعمال کیا ہے لیکن ان کے یہاں بھی کھڑی بولی نما اشعار مل جاتے ہیں۔ نمونے

کوئی کوئی لاوے کانسا پیتل، کوئی کوئی لونگ سپاری ہم تولادیو نام دھنی کو پورن کھیپ ہماری
پونجی نہ ٹوٹے نفع چوگنا، بنج کیا ہم بھاری ہاٹ جگائی، روک نہ سکھے، نر بھے گیل ہماری[1]
سکھ گرجے، گھن بجلی چمکے، لہری اٹھے سو بھاوری نہ جائے
سنت محل سے امرت برسے، پریم انند ہوئے، سادھو نہائے[2]

گرو نانک ۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۹ء

یہ سکھ دھرم کے بانی ہیں۔ ان کا کلام گرو گرنتھ صاحب میں ملتا ہے۔ بعد کے بعض گرو بھی اپنا کلام نانک کے نام سے گرنتھ صاحب میں شامل کرتے رہے۔ گرو نانک کا مستند کلام گرنتھ صاحب کے جزو جپ جی میں ملتا ہے۔ انھوں نے پنجابی کے علاوہ برج اور کھڑی میں بھی لکھا ہے۔ کھڑی بولی سے مماثل کلام کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں

گرو پرسادی بوجھے تو ہوئی، بنبرا گھر گھر نام نرنجنا سوٹھاکر میرا
آوت کو جاتا کہیں، جاتے کو آیا پر کی کرا پنی کہیں، اپنو نہیں بھایا
میٹھے کو کڑوا کہیں، کڑوے کو میٹھا دانے کو نندا کرہتیں، ایسا کل باہی دیٹھا[3]
ٹھاکر کا سیوک آگیا کاری ٹھاکر کا سیوک سدا پیجاری

---

[1] نقوش سلیمانی ص ۸۸
[2] رام چندر شکل ص ۸۴
[3] ڈاکٹر مسعود حسین خاں: مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو ص ۱۶۴

Marfat.com

جے تو میرا پت صاحب قدرت کون ہماری چارے کونٹ سلام کریں گے گھر گھر صفت تمہاری
درگہ، محلاں، ہستی، گھوڑے چھوڑ ولایت دیس گئے
(ہاتھی) پیر، پیکامبر، سالک، صادق، چھوڑی دنیا تھائیں پئے[1]

اردو الفاظ کی کثرت قابلِ غور ہے۔

بھیکن

یہ گرو نانک کے ہم عصر تھے۔ گرنتھ صاحب سے ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو

ایسا نام رتن نر مولک پن پدارتھ پایا اینک جتن کر ہردے راکھا رتن نہ چھپے چھپایا[2]

کرشن منی

یہ پندرھویں صدی عیسوی کے بھگت ہیں۔ سارنگ گڑھ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ تجارت کے لیے مرہٹواڑہ گئے تو سادھو ہو کر وہیں کے ہو رہے۔ انھوں نے پنجاب میں مہان بھاؤ پنتھ کی تبلیغ کی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

جڑ مول بن دیکھا ایک درخت گولر کا
اس کو انت اپار گولر لاگے، شمار نہیں پھولوں کا
زمین آسمان برابر دیکھے، دو دو چندا سورج دیکھے، نو لاکھ تارے
چودھا بھون، ساتوں دریاؤ، میرو پربت، ندی نالے کئی ہزار[3]

یہ زمین پندرھویں صدی عیسوی کے اعتبار سے کہیں زیادہ صاف ہے۔ اشعار ضرور کرشن منی کے ہوں گے لیکن زبانی روایت نے زبان کی فرسودگی کو فصاحت میں بدل دیا ہوگا۔

---

[1] گرنتھ صاحب۔ بحوالہ اردو کی کہانی ص ۱۷۸
[2] گرنتھ صاحب ص ۶۵۹۔ بحوالہ اردو کی کہانی ۱۷۹
[3] مشر بندھو وِنود (ہندی کتاب) حصہ اول۔ ص ۱۸۷ بحوالہ اردو کی کہانی ص ۱۸۰ نیز نقوش مئی ۱۹۶۵ء۔ ص ۸۹

Marfat.com

میرابائی

ان کی ولادت ۱۵۱۶ء میں راجستھان کے چوکڑی گاؤں میں ہوئی. شادی اودے پور کے مہارانا کمار بھوج راج جی سے ہوئی۔ یہ ابتدا ہی سے کرشن بھگت تھیں. شادی کے بعد جلد ہی ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا. یہ مندر میں جاکر کرشن کی مورتی کے سامنے عالم وجد میں ناچتی گاتی تھیں. چونکہ یہ وطیرہ راج خاندان کے خلاف تھا اس لیے گھر والے ان سے خفا رہتے. انھیں زہر تک دیا گیا لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا. آخر یہ بندرابن اور دوارکا وغیرہ کے مندروں میں گھوم گھوم کر بھجن گانے لگیں. ان کا انتقال دوارکا (گجرات) میں ۱۵۴۶ء میں ہوچکا تھا۔

ان کے نام سے بہت صاف زبان کے بھجن گیت مشہور ہیں. ان کی موجودہ زبان کی صحت کی کون ضمانت دے. ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو

موہنی مورتی، سانوری صورتی، نینا بنے رسال　　مور مکٹ مکراکرت، کنڈل اُڑن، تلک دیے بھال

سور داس مدن موہن

یہ دورِ اکبری میں سنڈیلے کے امین تھے. ان کی جو آمد ہوتی اسے سادھوؤں کی سیوا میں لگا دیتے تھے. ایک بار سنڈیلہ تحصیل کی مال گزاری کے کئی لاکھ روپیے سرکاری خزانے میں آئے. انھوں نے سادھوؤں کو کھلا پلا دیے اور خزانے کے صندوقوں میں کنکر پتھر رکھ کر بھیج دیا. ساتھ میں کاغذ پر یہ شعر لکھ دیا

تیرہ لاکھ سنڈیلے آئے، سب سادھن ملی گنکے　　سور داس مدن موہن آدھی رات ہی شکے[1]

اور خود آدھی رات کو فرار ہو گئے. بادشاہ نے ان کی تقصیر معاف کر کے انھیں بلایا لیکن یہ نہ آئے اور بندرابن میں رہنے لگے. روایت ہے کہ انھیں کرشن بھگوان کے درشن ہوئے تھے جس کے بعد انھوں نے اپنی آنکھیں پھوڑ لیں تاکہ کچھ اور نہ دیکھ سکیں. ان کی شاعری کا زمانہ ۱۵۲۳ء اور ۱۵۴۳ء کے بیچ ہے. ہندی کے نمبر ایک کے شاعر سمجھے جاتے ہیں.

---

[1] سور داس کے احوال رام چندر شکل کے ہندی ساہتیہ کا اِتہاس ص ۱۸۱ سے ماخوذ ہیں.

Marfat.com

ان کی شاعری کی زبان برج بھاشا ہے۔

تلسی داس

۱۵۳۲ء میں پیدا ہوئے اور سترھویں صدی کی ابتدا میں فوت ہوئے۔
حامد حسن قادری[1] نے ان کے حسب ذیل دو دوہے لکھے ہیں

جو مبنا میں ناکہے، میٹھی شکر کھائے — جو بکری بیں بیں کرے سہج ہی ماری جائے
تلسی سیدھی چال سے پیادہ ہوئے وزیر — فرزیں شاہ نہ ہو سکے، گت ٹیڑھی ناخیر

تلسی داس اودھی میں لکھتے تھے۔ مندرجہ بالا دونوں دوہے ایسی صاف کھڑی بولی میں ہیں کہ ان کا کوئی لفظ متروک و فرسودہ نہیں۔ اگر یہ واقعی تلسی داس کے ہیں تو ان کی قدیم زبان کو کسی نے صاف کر دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ دوہے معتبر نہیں۔

عبدالرحیم خانخاناں

ان کا عہد ۱۵۵۳ء تا ۱۶۲۵ء ہے۔ دربار اکبری کے بڑے امیر تھے۔ برج بھاشا میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی کتاب مدنا شٹک میں کچھ چیزیں اردو سے قریب ہیں مثلاً

کلت للت مالا دا جواہر جڑا تھا — چپل چکھن والا چاندنی میں کھڑا تھا
کھٹ تٹ نچ میلا بیت سیلا نویلا — البن البیلا یار میرا اکیلا[2]

ٹوڈرمل

ان کا زمانۂ حیات ۱۵۲۳ء تا ۱۵۸۹ء ہے۔ پہلے یہ شیر شاہ سوری کے یہاں اونچے عہدوں پر رہے، بعد میں اکبر کے یہاں آ گئے۔ انھوں نے شاہی دفتروں میں فارسی کو رائج کیا۔ ان کے کبت ملتے ہیں۔ شوسنگھ سروج میں مندرج دو کبتوں کے یہ نمونے ملاحظہ ہوں

---

[1] تاریخ و تنقید ص ۵۸
[2] سہیل بخاری: نقوش مئی ۱۹۶۵ء ص ۹۰

Marfat.com

گن بن کمان جیسے، گرو بن گیان جیسے — مان بن دان جیسے، جل بن سر ہے
کنٹھ بن گیت جیسے، ہیت بن پریت جیسے — بیسیارس ریت جیسے، پھل بن تر ہے
جار کو بچار کہا، گنکا کو لاج کہا — گرہا کو پان کہا، آندھرے کو آمی ہے[1]

ان کی زبان کھڑی بولی اور برج کا مرکب ہے۔

پرمانند داس

قنوج کے باشندے اور بلبھ آچاریہ کے چیلے تھے۔ ان کا ذکر 'چوراسی ویشنوؤں کی وارتائیں' ہے۔ ان کی کھڑی بولی کا نمونہ یہ ہے۔ کرشن کی مدح میں

دیکھو ری یہ کیسا بالک رانی جسمت جایا ہے — سندر بدن، کمل دل لوچن دیکھت چند لجایا ہے
پورن برہم الکھ ابناسی، پرگٹ نند گھر آیا ہے — پرمانند کرشن من موہن چرن کمل چت لایا ہے[2]

عالم

یہ مسلمان کوی ہے۔ اس نے عہد اکبر میں ۹۹۱ھ میں مادھونل و کام کندلا کا قصہ اودھی نظم میں لکھا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اس کے اردو نما کلام کا یہ نمونہ دیا ہے

نازتے نواج کے بجیک ہی نہال کیا — جیونے کی جوک ہیں جدائی کا زوال کیا
غم کے نصیب سے غنی ہے جیسے راج پائے — عاشق غریب کو گمان منی مال کیا
وہ اس روز سے خراب ہوا خاک ہی ہیں — خیر نہیں خونی بیچ تیرا خیال کیا
دل دے جو آوے ہو دلاسا بھی نہ پاوے تو — یار دلدار ایسے بیدل کا حال کیا[3]

یہ غزل نہیں، بندی کبت معلوم ہوتا ہے۔ جنھیں شعر کے دو مصرع سمجھا گیا ہے وہ کبت کی ایک سطر ہے۔ کبت میں چار طویل مصرع ہوتے ہیں۔

---

[1] شونگھ سروج (الہ آباد ۱۹۷۰ء) ص ۲۰۳-۲۰۲۔
[2] ایضاً نقوش۔ ص ۹۰۔ اردو کی کہانی ص ۱۸۳
[3] نقوش ص ۹۰۔ اردو کی کہانی ص ۱۸۳

Marfat.com

سوامی پنٹ نرنجن

یہ بھی اسی عہد کے شاعر ہیں. ان کے بعض اشعار میں برج بھاشا اور کھڑی بولی ملی جلی ملتی ہے۔

چھن مد چھکا جا کے چھکے تے اچھک ہوت — اچھک چھکا ہے گھوم گھومت خماری کا
نس دن نس دن جب سدھ آوت ہے — تب اپجاوے سدھ صاحب شماری کا
پنٹ نرنجن امر مرنے کا نہیں — ایک بار مارو، نام آوے نادو باری کا
ہوں تو متوالا اوچھے مدکا نہ لیں والا — پور کر پیالہ کھوج رہے ناخماری کا[1]

یہ بھی کبت معلوم ہوتا ہے۔ ان دونوں شعرا کی زبان پر اردو کا شدید اثر قابل توجہ ہے۔

جمال

یہ بھی ہندی کا مسلمان شاعر ہے۔ اس کی شاعری کا عہد ۱۵۷۰ء کے آس پاس ہے۔ اس کی تخلیقات راجستھانی میں بہت مقبول ہیں. دو دوہے یہ ہیں

جملا ایسی پریت کر، جیسی کیس کرائے — کے کالا، کے اجلا، جب تب سر سیوں جائے
منسا تو گاہک بھئے، نینا بھئے دلال — دھنی بست، بیچے نہیں کس ودھی بنے جمال

دادو دیال

ان کا عہد حیات ۱۵۴۴ء تا ۱۶۰۳ء ہے۔ یہ احمد آباد میں پیدا ہوئے لیکن چونکہ ان کی بیشتر زندگی راجستھان میں گزری اس لیے اس باب میں ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ گو یہ کبیر کے مقلد تھے لیکن ان سے ایک فرقہ دادو پنتھ شروع ہوا۔ کچھ لوگ انہیں گجراتی برہمن مانتے ہیں کچھ موچی یا نداف کہتے ہیں۔ ان کے مقلد اکثر نیچی ذات کے ہوتے ہیں۔ ان کی زبان پر برج اور راجستھانی کا اثر ہے۔ رام چندر شکل نے ان کے کلام کے جو نمونے دیے ہیں اس کے دو شعر یہ ہیں

---

[1] نقوش ص ۹۰

Marfat.com

یہ مسیت، یہ دیہرا ستگرو دیا دکھائی　　بھیتر سیوا بندگی، باہر کاہے جائی
کیسے پارکھ پچی موئے، قیمتی کہا نہ جائی　　دادو سب حیران ہیں، گونگے کا گڑ کھائی[1]

ڈاکٹر سہیل بخاری نے ان کے کلام کا جو نمونہ دیا ہے وہ بہت اردو آمیز صاف زبان میں ہے۔ اس کی زبان دیکھتے ہوئے مجھے اس کے استناد میں شبہ ہے۔

عشق اللہ کی ذات ہے، عشق اللہ کا رنگ　　عشق اللہ اوجود ہے عشق اللہ کا رنگ
عاشق معشوق ہوگیا، عشق کہاوے سوئے　　دادو اس معشوق کا اللہ ہی عاشق ہوئے
دیکھے کا اچرج نہیں، ان دیکھے کا ہوئے　　دیکھے اوپر دل نہیں، اَن دیکھے کوں روئے[2]

یہ ایک ہندو پنتھ کے بانی کی زبان نہیں۔ کوئی ہندو سنت، اللہ، کیوں کہتا، بھگوان یا ایشور یا پرماتما کیوں نہ کہتا رام چندر شکل کے نمونے اور سہیل بخاری کے نمونے کی زبان میں واضح فرق ہے۔

اب ایک پنجابی شاعر کے یہاں اردو کا رنگ دیکھئے۔

شاہ حسین۔ ۹۴۵ھ تا ۱۰۰۸ھ

یہ پنجابی کے عظیم شاعر ہیں۔ انھوں نے کافی کی ایجاد کی۔ ان کے پنجابی کلام کے بعض حصے اردو سے بہت قریب ہیں۔ کافی راگ "تلنگ" ملاحظہ ہو۔ دو۔ ے کے وزن میں ہے۔

جہاں دیکھو تہاں کپٹ ہے، کہوں نہ پیو چین　　دغا باز سنسار تے گوشہ پکڑ حسین
من چاہے محبوب کو تن چاہے سکھ چین　　دوئے راجے کی سیدھ میں، کیسے بنے حسین[3]

ایک طرف ہندی اور پنجابی کے ان شعرا کی زبان دیکھیے دوسری طرف ۱۳ باب کے پہلے جزو میں بیان کردہ نام نہاد اردو شعرا کا کلام دیکھیے۔ اردو کے نمونوں میں چند فارسی اردو ریختوں کو چھوڑ دیں تو جو کچھ بچتا ہے وہ سب ایسے دوہے ہیں جو برج بھاشا کی شاعری معلوم

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۸۰۔
[2] نقوش ص ۹۲، اردو کی کہانی ص ۱۹۶
[3] کافیاں شاہ حسین۔ ص ۱۴۔ ناشر مجلس شاہ حسین لاہور ۱۹۶۶ء۔ بحوالہ تاریخ ادب اردو جلد اوّل از جالبی ص ۶۲۳۔

Marfat.com

ہوتے ہیں. ہندی شعرا کے کلام سے جو نمونے دیے گئے ان میں بیشتر برج ہے اور اس سے کم اودھی ہے. ان میں کھڑی بولی کی پٹ ملتی ہے یا یوں کہیے کہ کھڑی بولی مائل بہ برج ہے. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۰۰ء تک شمالی ہند میں اردو اور ہندی میں کوئی فرق نہ تھا. رسم الخط کی بنا پر زبانوں کی تقسیم نہیں کی جاسکتی.

ابتدائی صدیوں میں کچھ ایسی چھین جھپٹ دکھائی دیتی ہے کہ اپنی قدامت دکھانے کے لیے اردو والے ہندی لفظیات، ہندی اوزان اور ہندی ادبی روایات سے بھرپور اشعار کو اپنانے میں کوئی عار نہیں سمجھتے. دوسری طرف ہندی والے فارسی رسم الخط میں لکھی دکنی کو ہندی کہتے ہیں. دکنی کا بہت سا جزو ایسا ہے جس پر ہندی کا اطلاق مناسب نہ ہوگا. اگر اردو ہندی والے فراخ چشمی سے مجبور ہو کر قدیم ہندوستانی کے پورے سرمائے کو اپنی زبان کے حصار میں کھینچ لیتے ہیں تو بعد میں اسی اصول اور پیمانے سے کیوں کام نہیں لیتے. اہل اردو سولھویں صدی میں جس ہندی آمیز زبان کو اردو مانتے ہیں انیسویں اور بیسویں صدی میں اس سے بھی زیادہ صاف ہندی کو اردو کیوں نہیں کہتے. اگر دونوں طرف سے ہندی اردو کے اشتراک کا جذبہ اور نظریہ باقی رہتا تو دو زبانوں کی تقسیم کیوں ہوتی.

Marfat.com

ہماری مطبوعات

آندھی میں چراغ	خواجہ غلام السیدین	73/-
ابوالکلام آزاد۔شخصیت، سیاست پیغام	پروفیسر رشید الدین خاں	21/-
ابوالکلام آزاد۔ایک ہمہ گیر شخصیت	پروفیسر رشید الدین خاں	58/-
اتر پردیش کے لوک گیت	اظہر علی فاروقی	120/-
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (دوسری طباعت)	احتشام حسین	70/-
اردو کے ابتدائی ادبی معرکے (ابتدا سے عہد مرزا و میر تک)	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	22/-
اردو کے ادبی معرکے (انشاء سے غالب تک) ترمیم واضافے کے ساتھ (دوسرا ایڈیشن)	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	30/-
اردو کی کہانی	احتشام حسین	21/-
اردو لغت نگاری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر مسعود ہاشمی	30/-
ارنیسٹ ہمنگوئے (حیات وفن کا تنقیدی مطالعہ) (دوسری طباعت)	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں	8/40
امریکی ادب کا مختصر جائزہ	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں	زیر طبع
انتخاب غزلیات میر	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	15/-
انتخاب کلام حسرت	ڈاکٹر فضل امام	9/-
اردو زبان کی تدریس	معین الدین	40/-
انشاء کا ترکی روزنامچہ	سید محمد نعیم الدین	4/50

Marfat.com

انیس کے سلام	علی جواد زیدی	60/-
انیس کے مرثیے اوّل (دوسری طباعت)	صالحہ عابد حسین	36/-
انیس کے مرثیے دوم (دوسری طباعت)	صالحہ عابد حسین	40/-
برنارڈ شا	عبدالمغنی	35/-
بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقاء	پروفیسر اختر اورینوی	18/-
بیسویں صدی میں اردو ناول	ڈاکٹر یوسف سرمست	58/-
پشکن (دوسری طباعت)	ظ۔انصاری	زیر طبع
پھول بن	ابن نشاطی	زیر طبع
تذکرہ علمائے بلخ	صفی الدین واعظ / مترجم پروفیسر نذیر احمد	12/-
تالستائے	ڈاکٹر محمد یٰسین	زیر طبع
جنت سنگار	پروفیسر سیدہ جعفر	180/-
جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن	ظفر محمود	38/-
چکبست	رام لال نابھوی	18/-
چے خف (دوسری طباعت)	ظ۔انصاری	10/-
حیات جاوید (تیسری طباعت)	الطاف حسین حالی	48/-
خسرو شناسی (دوسری طباعت)	ظ۔انصاری / ابوالفیض سحر	24/-
دانتے	زیڈ۔اے۔ عثمانی	8/25
دستنبو (غالب)	(مترجم) پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	12/-
درس بلاغت (تیسری طباعت)	قومی اردو کونسل	47/-
قدیم اردو نظم (حصہ اول)	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	40/-
دکن میں اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	42/-
دکنی ہندو اور اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	15/50
دکنی نثر کا انتخاب	پروفیسر سیّدہ جعفر	45/-

Marfat.com